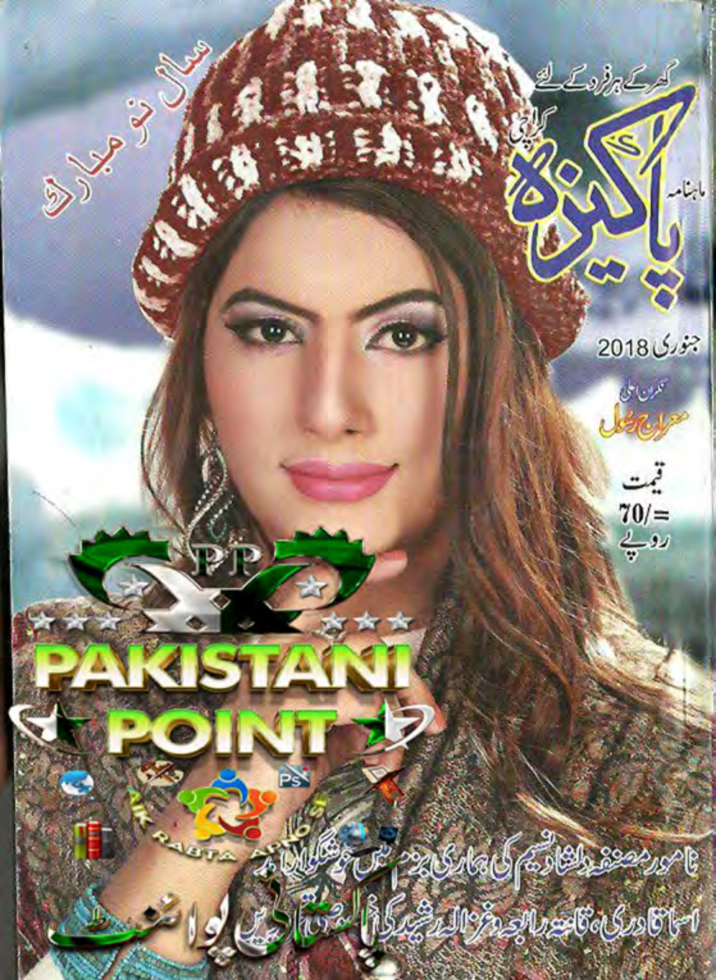

گھر کے ہر فرد کے لئے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
جنوری 2018
مدیرِ اعلیٰ
معراج رسول
قیمت
70/=
روپے
سال نو مبارک
نامور مصنفہ دلشاد نسیم کی ہماری بزم میں خوشگوار
اسما قادری، قانتہ رابعہ و غزالہ رشید کی

Happy New Year 2018

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313 -35802552 , E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

مجھے کچھ کہنا ہے......!

قارئینِ کرام! السلام علیکم......!

سالِ نو مبارک ہو

اکیسویں صدی کے اٹھارویں برس کا آغاز ہو چکا ہے۔ یعنی سال 2018ء اور اٹھارواں برس انسانی زندگی میں کس اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس سے تو آپ سب آگاہ ہیں کہ جب نوعمر فرد بالغ عمری کے ساتھ، ساتھ بالغ فکری اور بالغ نظری کی جانب بڑھ رہا ہوتا ہے۔ یہی وقت ہوتا ہے جب اس کے روشن مستقبل کے لیے بہتر سے بہتر راہیں متعین کی جارہی ہوتی ہیں۔ من حیث القوم اس نئے سال کو اگر ہم اسی طرح لیں کہ گزشتہ برسوں میں اگر کوئی واضح راہ متعین نہ کرپائے تو وقت اب بھی ہاتھ سے نہیں گیا کیوں نہ اس نئے سال کی آمد پر ہم اپنے آپ سے عہد کریں کہ اپنی معاشرتی اقدار، تہذیبی روایات اور اسلامی تعلیمات کی پاسداری کرتے ہوئے مستقبل کا لائحہ عمل طے کریں گے اور ایک فلاحی معاشرے کی تشکیل میں اپنا مثبت کردار ادا کریں گے۔ فلاحی معاشرہ بھی جب ہی بنتا ہے جب اس کا ہر فرد اپنی، اپنی ذمے داریوں اور فرائض سے آگاہ بھی ہو اور انہیں پورا بھی کرے۔

قارئینِ محترم، اوّل دن سے ہمارے ادارے کی یہ کوشش رہی ہے کہ آپ کے ذوقِ مطالعہ کی ہر ممکن تسکین کی جائے، یہی وجہ ہے کہ ادارے کے چاروں پرچے مختلف المزاج ہیں اور الگ، الگ موضوعات پر مبنی تحریریں، اور بے انتہا معلوماتی اور تفریحی سلسلے اپنے جلو میں رکھتے ہیں۔ اس اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے کے لیے کن، کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے......اس کی تفصیل یہاں بتانا مقصود نہیں۔ بس اتنا ہی کہیں گے کہ گزشتہ کئی ماہ مالی دباؤ میں گزارنے کے باعث اِک کڑا فیصلہ رسالے کی قیمت میں اضافے کی صورت کیا گیا ہے۔ امید ہے آپ ہماری مجبوریوں کو سمجھتے ہوئے اسے خوش دلی سے قبول کریں گے، اس لیے کہ پاکیزہ تو آپ کے گھر کی رونق ہے......آپ کی سہیلی ہے اور ناصح بھی......اور دوستی کا حق ادا کرنا آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔

نئے سال کی آمد پر تمام اہلِ وطن کے لیے نیک تمناؤں اور پُرخلوص دعاؤں کا تحفہ حاضر ہے۔

مدیرہ

نزہت اصغر

اس نے فرمایا اے میری قوم مجھ میں کوئی گمراہی نہیں بلکہ میں تو سب جہانوں کے پروردگار کی طرف سے رسول ہوں۔ (۶۱) میں تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہیں نصیحت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو۔ (۶۲) کیا تم نے تعجب کیا کہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت تم میں سے ہی ایک مرد پر آگئی۔ تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور اس لیے کہ تم متقی ہو جاؤ، اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (۶۳) پھر انہوں نے اس کو جھٹلایا۔ پھر ہم نے اس کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دے دی۔ اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔ بے شک وہ کور دل قوم تھی۔ (۶۴) اور عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو (مبعوث) کیا اس نے کہا اے میری قوم! تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔ تمہارے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں ہے۔ پھر کیا تم (عذاب خدا سے) نہیں ڈرتے؟ (۶۵) اس کی قوم میں سے جو سردار کافر ہو گئے انہوں نے کہا۔ یقیناً ہم تمہیں جہالت میں (پھنسا ہوا) دیکھتے ہیں۔ اور ہم تجھے یقیناً جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں۔ (۶۶) اس نے کہا اے میری قوم! مجھ میں جہالت کی کوئی چیز نہیں بلکہ میں تو تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے رسول ہوں۔ (۶۷) میں تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں، اور تمہارے لیے ایک امانت دار نصیحت کرنے والا ہوں۔ (۶۸) کیا تم نے تعجب کیا کہ تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک نصیحت تم میں سے ہی ایک مرد پر آگئی، تاکہ وہ تم کو ڈرائے۔ اور وہ وقت یاد کرو جبکہ نوح کی قوم کے بعد تمہیں جانشین بنایا۔ اور تمہیں (اپنی) مخلوق میں وسعت (قوت و قامت کے لحاظ سے) زیادہ کیا۔ پس تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ (۶۹) وہ بولے کیا تم اس لیے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف خدائے واحد کی عبادت کریں اور ان کو ہم چھوڑ دیں جن کو ہمارے باپ، دادا پوجتے تھے۔ اگر تم سچوں میں سے ہو تو جس (عذاب) کا ہم سے وعدہ کرتے ہو، اسے لے آؤ۔ (۷۰) (حضرت ہودؑ نے) فرمایا کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب تو آچکا ہے۔ کیا تم مجھ سے ایسے ناموں کے بارے میں جھگڑتے ہو جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے نامزد کیا، (اور) اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں کوئی حجت نازل نہیں کی۔ پس تم بھی انتظار کرو، اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ (۷۱) پس ہم نے اس کو اور ان کو جو اس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے نجات دی۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، اور وہ مومن نہیں تھے، ان کی ہم نے نسل قطع کر دی۔ (۷۲)

(سورۂ اعراف ۷، پارہ ۸۔ آیات ۶۱ تا ۷۲)

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِنِ السَّیِّدِ التِّهَامِیِّ ط

افضل الانبیاء ختمی مرتبت، سید المرسلین، حبیب پاک حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نسبی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا تہامی بھی ہے۔ جس کے معنی و مفہوم تہامی، مکہ مکرمہ والے کے ہیں۔

مورخین کے مطابق تہامہ سے مراد وہ سرزمین ہے جو نجد کا نچلا علاقہ حجاز کے شہر کی طرف ہے اس کا نام تہامہ اس لیے پڑ گیا کیونکہ اس کی ہوا بدل جاتی ہے۔

ابن فارس کہتے ہیں کہ تہامہ "تہم" سے ہے جس کے معنی سخت گرمی اور ہوا کے بند ہو جانے کے ہیں۔ غرض آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ اسم گرامی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسی علاقے کی نسبت ہے۔ (مکہ کی گرم آب و ہوا کی وجہ سے اس کا یہ نام پڑ گیا)

2۔ القرآن۔ ترجمہ: اور وہی ذات ہے جس نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیئے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیے، وادیِ مکہ، میں بعد اس کے کہ تمہیں ان پر قابو دے دیا تھا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔

(سورۂ فتح آیت 24)

3۔ الحدیث: 1۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا۔ "یقیناً مکہ شہر کو اللہ تعالیٰ نے اسی دن سے محترم ٹھہرایا ہے جس دن سے اس نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا۔ چنانچہ یہ اللہ کے حکم سے قیامت تک کے لیے ادب و احترام کی جگہ قرار پا چکا ہے۔ مجھے صرف دن کی ایک ساعت کے لیے جنگ کی اجازت ملی تھی اور اب پھر حسب سابق قیامت تک کے لیے اللہ کی طرف سے حرمت ہے۔ نہ تو اس کا کانٹا توڑا جائے نہ شکار کیا جائے اور نہ اس شہر کی گری پڑی چیز کو اٹھایا جائے۔ سوائے اس شخص کے جو اس چیز کو اس کے مالک تک پہنچائے اور نہ یہاں کی گھاس اکھاڑی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوائے اذخر کے (اذخر مکہ کے گرد و نواح میں پائی جانے والی گھاس ہے) کیونکہ یہ مکہ کے سناروں، لوہاروں اور گھروں کے استعمال میں آتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "ہاں، سوائے اذخر کے۔"

(بخاری و مسلم)

4۔ الوانیہ: ۵۶۸ء میں جسٹی نین کی موت کے چار سال بعد سرزمین عرب کے شہر میں وہ شخص (پیغمبر اسلام) پیدا ہوئے جنہوں نے نسل انسانی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا۔

(مغربی مورخ، جان ولیم ڈریپر)

الفضائل: 1۔ جو کوئی بھی اس اسم مبارک کا کثرت سے ورد کرتا ہے تو اس کا کلمہ محبت مقبول ہوگا۔

2۔ اس کے ورد کرنے والے دل میں محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ذوق و شوق پیدا ہوگا۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس



اللہ اور اس کا نور



باب دوازدھم

قرآن پاک سے عشق کی پُرنور داستان ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے

قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کا آسان طریقہ

لوگ اپنے بچوں کو ناظرہ قرآن پڑھا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ بچوں کو چاہیے کہ جب وہ خود سمجھدار ہو جائیں تو پورے قرآن کا ترجمہ کم از کم ایک بار تو ضرور پڑھیں۔

عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ایک غلط خیال رائج ہے کہ ہم قرآن حکیم کے معنی پڑھیں گے تو ہماری سمجھ میں نہیں آئیں گے، اس کو سمجھنے کے لیے کسی عالم فاضل کی مدد ضروری ہے، ایسا بالکل نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی استاد نہ ہو تو ہم باترجمہ قرآن ہی نہ پڑھیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ قمر میں فرمایا۔ ''اور ہم نے القرآن کو سمجھنے کے لیے آسان کر دیا ہے۔ پھر ہے کوئی توجہ دینے والا۔'' یہ آیت چار بار دہرائی گئی ہے۔ آیت (40, 17، 22، 32) اللہ تعالیٰ پکار، پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ کتاب آسان ہے، اسے سمجھو، دھیان دو۔

قرآن پاک میں جتنے بھی احکام دیے گئے ہیں وہ سب بے حد واضح اور صاف ہیں، ان میں کوئی ابہام نہیں۔ جن باتوں سے روکا گیا، جنہیں حرام قرار دیا گیا، وہ بالکل صاف، صاف بیان کی گئی ہیں۔ میں یہاں پر بہت مختصر بات کر رہی ہوں اس لیے صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گی۔

سورۂ انعام آیت نمبر 152 میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔
''کہو کہ (لوگو) آؤ میں تمہیں وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے پروردگار نے تم پر حرام کر دی ہیں۔

(1) خدا کے ساتھ شریک ٹھہرانا۔
(2) ماں، باپ سے بدسلوکی کرنا۔
(3) اپنی اولاد کو ناداری کے اندیشے سے قتل کرنا۔

(4) بے حیائی کا کام ظاہر یا پوشیدہ۔
(5) کسی کو ناحق قتل کرنا۔
(6) یتیم کے مال کے پاس جانے کی ممانعت۔
(7) ناپ تول انصاف کے ساتھ کرنے کا حکم۔
(8) کوئی بات کہو تو انصاف سے کہو گو وہ تمہارا رشتے دار ہی ہو۔ اور خدا کے عہد کو پورا کرو۔

ان باتوں کا خدا تم کو حکم دیتا ہے، تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔''

اوپر بیان کی گئی آٹھ باتوں میں سے کون سی ایسی بات ہے جو سمجھ سے باہر ہے؟

سورۂ حجرات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔
(1) ''مومنو! کوئی قوم کسی سے تمسخر نہ کرے، ممکن ہے وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں سے۔ ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں۔
(2) (اپنے مومن بھائی) کو عیب نہ لگاؤ۔
(3) اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔
(4) بہت گمان سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں۔
(5) تجسس نہ کیا کرو۔
(6) کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی یہ بات پسند کرے گا کہ اپنے مرے بھائی کا گوشت کھائے۔
(7) خدا کے نزدیک تم میں سے عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔''

ان باتوں کے علاوہ بھی سورۂ حجرات میں لکھی گئی باتیں سب کے لیے ہدایت کا باعث ہیں، میں نے صرف دو جگہ کی مثالیں دی ہیں۔ اس طرح قرآن پاک میں شراب، جوا، بت، پانسے وغیرہ کے پاس جانے سے منع کیا کہ یہ سب شیطانی کام ہیں، سچ بولنا، وعدہ پورا کرنا، معاف کر دینا، صلح رحمی، نرمی، حیا، حقوق و فرائض کی ادائیگی غرض یہ کہ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر آسان زبان میں بات نہ کی گئی ہو۔

اللہ تعالیٰ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر 7 میں فرماتا ہے۔ ''وہی تو ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی جس کی بعض آیتیں محکم ہیں۔ (اور) وہی اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ ہیں تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کا اتباع کرتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور مرادِ اصلی کا پتا لگائیں۔ حالانکہ مرادِ اصلی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ علم میں کامل دست گاہ رکھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو عقل مند ہی قبول کرتے ہیں۔''

اوپر لکھی گئی آیت کا ترجمہ پڑھ کر آپ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے کہ ہمیں ان تمام احکامات کو سمجھ لینا چاہیے جو بالکل واضح ہیں اور ان پر عمل کرنا چاہیے۔ (اگر آپ کو آیت سمجھ نہیں آتی تو مت سمجھیں۔ یہ کام آپ ریسرچ کرنے والوں، عالموں اور مفتی بننے والوں کے لیے چھوڑ دیں۔)

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہم زندگی میں اسکول، کالج وغیرہ میں جو کچھ پڑھتے ہیں وہ استاد صرف ایک بار پڑھاتا ہے۔ یعنی ہم ایک سبق زندگی میں صرف ایک بار پڑھتے ہیں اور ساری عمر یاد رکھتے ہیں تو پھر قرآن حکیم کا ترجمہ ایک بار بھی پڑھ لینے سے احتراز کیوں؟ کم از کم اتنا تو ذہن میں رہ جائے گا کہ کون سی باتوں سے روکا گیا ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن پاک سمجھنے کے لیے عربی زبان کا سیکھنا ضروری ہے۔ چونکہ ہر کسی کے لیے عملی طور پر عربی زبان سیکھنا ممکن نہیں، اس وجہ سے میں یہاں آپ کو ایک مفید مشورہ اور معلومات دے رہی ہوں، قرآن پاک میں کل الفاظ 77934 ہیں۔ (بحوالہ قرآن نمبر سیارہ ڈائجسٹ)

لیکن ایک ہی لفظ چونکہ بار، بار دہرایا جاتا ہے اس وجہ سے پورے قرآن پاک میں استعمال ہونے والے الفاظ 2000 ہیں۔ (حوالہ: ترجمہ قرآن ... مؤلف: مولانا محمد آصف قاسمی)

اس میں سے 500 الفاظ وہ ہیں جو ہم روزمرہ اردو بول چال میں استعمال کرتے ہیں، مثلاً دین، دنیا،

آخرت، سزا، جزا، خیر، شر، جنت، جہنم، عالمِ موت، حیاتِ ارض وغیرہ وغیرہ......

اب صرف 1500 الفاظ بچتے ہیں۔ ان کے معانی یاد کرنا ہے تو آپ کو قرآن پاک پڑھتے ہوئے سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔ صرف سعیِ خالص کی ضرورت ہے۔

بندوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت

آج سے تقریباً ساڑھے چودہ سو سال قبل بنی نوعِ انسان کی فلاح اور ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے اپنی شریعت دینِ اسلام کے نام سے مکمل فرمائی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آخری کتابِ ہدایت قرآن نازل فرما کر یومِ آخرت تک انسان کے لیے نوشتۂ ہدایت عطا فرما دیا ہے۔ اس نوشتۂ ہدایت اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جب تک مسلمان عمل کرتے رہے، دین و دنیا میں سرخرو ہے۔ پھر جیسے، جیسے کتاب و سنت سے دوری ہوتی گئی، مسلمان بھی زبوں حال ہوتے گئے اور آج صورت حال زمانہ قبل از اسلام جیسی ہوگئی ہے۔ ہم بظاہر تو مسلمان ہیں لیکن ہمیں احکاماتِ الٰہی یاد نہیں۔ ہماری زندگی دنیا کے عیش و عشرت کی عادی ہوگئی۔ ہر طرف فسق و فجور کا بازار گرم ہے اور ہمارے اعمال کے نتیجے میں ہی ہمیں ایسے حاکم ملتے ہیں کہ جو ہمارا جینا دوبھر کردیتے ہیں۔ آج ایک بار پھر شدت سے اس بات کی ضرورت ہے کہ اللہ کے احکامات کو عام کیا جائے تاکہ راہ گم کردہ قوم ایک بار پھر جادۂ مستقیم پر آجائے اور اللہ تعالیٰ ہمیں پھر سے دین و دنیا کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔

مضمون ہذا میں قرآن پاک کی آیات محکمات کا ترجمہ پیش کیا ہے تاکہ عوام الناس فیض حاصل کرسکیں۔ اللہ پاک ہم سب کو راہ ہدایت پر قائم رکھے۔ آمین!

سورۂ فاتحہ: 1۔

یہ پوری دعا ہے۔ سورۂ فاتحہ ہر نماز میں پڑھی جاتی ہے۔ اسے سورۂ شفاء بھی کہتے ہیں...... الحمد بھی کہتے ہیں۔ تمام امراض میں اسے پڑھ کر پھونکنے اور پڑھے ہوئے پانی کو پینے سے آرام آتا ہے۔

ترجمہ: ''ہر قسم کی تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے، بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، روزِ جزا کا مالک ہے۔ اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہم کو سیدھے راستے پر چلا، ایسے لوگوں کے راستے پر جن پر انعام فرمایا ہے، نہ ان کے راستے پر جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ گمراہوں کے راستے پر چلا۔''

سورۂ بقرہ 2:

1۔ ''لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو، جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔ تاکہ تم (اس کے) عذاب سے بچو۔'' (آیت 21)

2۔ ''اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور سچی بات کو جان بوجھ کر نہ چھپاؤ۔'' (42)

3۔ ''اور نماز پڑھا کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور (خدا کے آگے) جھکنے والوں کے ساتھ جھکا کرو۔ (43)

4۔ ''اور (رنج، تکلیف میں) صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔'' (45)

5۔ ''سحر منتر سیکھنے کی ممانعت۔'' (102)

6۔ ''(کہہ دو کہ ہم نے) اللہ کا رنگ اختیار کرلیا ہے اور خدا سے بہتر رنگ کس کا ہوسکتا ہے اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔'' (138)

7۔ ''اور تم جہاں سے نکلو مسجد محترم کی طرف منہ (کرکے نماز پڑھا) کرو۔'' (105)

8۔ ''سو تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کیا کروں گا اور میرا احسان مانتے رہنا اور ناشکری نہ کرنا۔'' (152)

9۔ ''اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد لیا کرو۔ بے شک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' (153)

10۔ ''اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے جائیں ان کی نسبت یہ نہ کہنا کہ وہ مرے ہوئے ہیں (وہ مردہ نہیں) جبکہ زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے۔'' (154)

11۔ ''لوگو! جو چیزیں زمین میں حلال طیب ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔'' (168)

12۔ ''اے اہل ایمان! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو عطا فرمائی ہیں، ان کو کھاؤ اور اگر خدا ہی کے بندے ہو تو (اس کی نعمتوں کا) شکر بھی ادا کرو۔'' (172)

13۔ ''اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو اور سؤر کا گوشت اور جس چیز پر خدا کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے، حرام کردیا ہے۔'' (173)

14۔ ''جو لوگ (خدا کی) کتاب سے ان (آیتوں اور ہدایتوں کو) جو اس نے نازل فرمائی ہیں چھپاتے ہیں اور ان کے بدلے تھوڑی سی قیمت (یعنی دنیاوی منفعت) حاصل کرتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں محض آگ بھرتے ہیں، ایسے لوگوں سے خدا قیامت کے دن نہ کلام کرے گا اور نہ ان کو (گناہوں سے) پاک کرے گا اور ان کے لیے دکھ دینے والا عذاب ہے۔'' (174)

15۔ ''خدا، فرشتوں، کتاب اور پیغمبروں پر ایمان لانا، مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتے داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دینا اور... گردنوں کے چھڑانے میں خرچ کرنا، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، جب عہد کریں تو اس کو پورا کرنا، سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار میں ثابت قدم رہنا۔'' (177)

16۔ ''مقتولوں کے بارے میں قصاص کا حکم۔'' (178)

17۔ ''وصیت کرنے کا حکم۔'' (180)

18۔ ''وصیت کا سننے کے بعد بدلنے والا گنہگار۔'' (181)

19۔ ''مومنو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تاکہ تم پرہیزگار بنو۔'' (183)

20۔ ''روزے کے بارے میں احکامات۔'' (185)

21۔ ''جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔'' (186)

22۔ ''روزوں کی راتوں میں تمہارے لیے اپنی عورتوں کے پاس جانا جائز کردیا گیا ہے، وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔'' (187)

23۔ ''ایک دوسرے کا مال ناحق مت کھاؤ، اور نہ اس کو (رشوتاً) حاکموں کے پاس پہنچاؤ۔''

24۔ ''اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں، تم بھی خدا کی راہ میں ان سے لڑو مگر زیادتی نہ کرنا۔'' (190)

25۔ ''اور خدا کی راہ میں مال خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو۔ بے شک خدا نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔'' (190)

26۔ ''اور خدا کی خوشنودی کے لیے حج اور عمرے کو پورا کرو۔'' (203.196) حج کے احکامات۔

27۔ ''مومنو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہوجاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو۔ وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔''

28۔ ''(اے محمدؐ) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کس طرح کا مال خرچ کریں، کہہ دو کہ (جو چاہو خرچ کرو، لیکن) جو مال خرچ کرنا چاہو وہ (درجہ بدرجہ اہلِ استحقاق یعنی) ماں، باپ کو اور قریب کے رشتے داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو (سب کو دو)۔'' (215)

29۔ (مسلمانو!) تم پر (خدا کے راستے میں) لڑنا فرض کردیا گیا ہے۔'' (216)

30۔ ترکِ شراب اور جوئے کا حکم (فائدے کم نقصان زیادہ) (219)

31۔ ''مشرک عورتیں جب تک ایمان نہ لائیں، نکاح نہ کرنا اسی طرح مشرک مرد۔'' (221)

32۔ ''ایام حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو۔'' (222)

33۔ بیچ کی نماز (عصر) کی نماز التزام کے ساتھ ادا کرنے کا حکم۔ (238)

(جاری ہے)



......یہ کہاں کی چیز کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں . . .

سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے . . .

دل کو رویا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے . . .

کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، باریاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

الزام تراشیوں کا ایک طوفان بد تمیزی برپا ہو جاتا ہے۔

دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے . . .

آج کا انسان بہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دل اور سونے کا بچھڑا . . .

عبادات، معاملات . . .

جنت گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی . . .

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قسط 18

پرنس ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو سلمان اس کے انتظار میں اضطراری انداز میں ٹہل رہا تھا۔ پرنس نے بصارت کی مدد سے دیکھا اور بصیرت کی روشنی سے اس کے احساسات یوں جذب کیے جیسے مقناطیس کے ٹکڑے پر لوہے کا ٹکڑا اُڑ کر چپکتا ہے۔

سلمان کے تاثرات بالکل بھی دوستانہ نہیں تھے...... بلکہ نگاہوں میں اعلیٰ درجے کی بے مروتی آشکار تھی۔

”السلام علیکم......!“ پرنس نے محتاط انداز میں سلام کر کے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا...... جو سلمان نے تھامنے کے بجائے چھو کر چھوڑ دیا۔

"have a seat please" پرنس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا...... سلمان نے اس کی پیشکش نظر انداز کر کے کڑے تیور سے پرنس کی طرف دیکھا۔

''کب سے چل رہا ہے یہ چکر......؟'' سلمان کا جملہ ایسے ہی تھا گویا بے خبری میں پشت سے حملہ کر دیا جائے۔

پرنس نے ازراہِ تجاہل بھی لفاظی کرنا ضروری نہ سمجھا...... نہ انجان بن کر سلمان کو مزید کچھ کہنے کا راستہ دیا۔ اس نے بہت اعتماد سے سلمان کی آنکھوں میں دیکھا۔

''آپ اپنی مسز سے اسپتال میں ملے ہیں...... کسی لگژری گیسٹ ہاؤس میں نہیں، یہ ٹھیک ہے لوگ روڈ پر پڑے زخمی کو اسپتال لے جاتے ہوئے گھبراتے ہیں...... مگر سب نہیں...... سو میں سے ایک انسان ایسا ضرور ہوتا ہے جو اپنے ضمیر کی آواز نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ثوبان جیسا معصوم بچہ اگر اپنے کسی پڑوسی سے آ کر ہیلپ مانگتا ہے تو کوئی بھی اگنور نہیں کر سکتا۔''

''سوال تو یہی بنتا ہے...... قریب ترین پڑوسیوں کو چھوڑ کر وہ آپ سے ہی کیوں مدد مانگنے آیا......؟'' سلمان کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے اور لب زہر خنداں...... سچے آدمی کو سچ بیان کرنے کے لیے سوچ بچار کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی......

''اس لیے کہ ثوبان مجھے جانتا ہے۔''

''کیسے جانتا ہے بھئی......؟'' سلمان نے بدتمیزی و اکھڑ پن سے سوال کیا اور قطع کلامی کی تھی۔

''مسجد میں ملا تھا...... رو، رو کر اپنی ماں کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔'' پرنس نے بھی بلا توقف مگر بہت صبر و تحمل سے جواب دیا۔

"very clever... very sharp" سلمان نے شک کی بھڑکتی آگ کے اونچے، اونچے شعلوں کا لباس پہن لیا تھا۔ آگ مزید بڑھے یا کم ہو اب اس احساس سے تو وہ کم از کم فارغ ہو چکا تھا۔

''سچ تھوڑا ہوتا ہے...... اور جھوٹ...... بہت اور بے تحاشا ہوتا ہے۔ میرے پاس آپ کی ان تمام باتوں کا صرف یہی جواب ہے۔ آپ بے شک اپنی طرف سے نئی، نئی بات نکالیں مگر میرے پاس صرف یہی ایک بات ہے جو آپ کی خدمت میں عرض کر چکا ہوں۔''

''عادی مجرم بہت پکے ہوتے ہیں۔'' سلمان نے غیظ و غضب کے عالم میں گھورا۔

''آپ تو ابھی میرے ایک جرم کا ثبوت پیش نہیں کر سکے...... عادی مجرم کے پاس تو جرائم کی طویل فہرست ہوتی ہے۔'' پرنس نے متانت سے مسکرا کر جواب دیا۔

''جرم نشان چھوڑ جاتا ہے...... جس دن گرفت میں آؤ گے تو وہ کروں گا جو سوچ بھی نہیں سکتے۔'' سلمان نے اپنی آواز کو دبانے کی کوشش میں مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

''انشاء اللہ وہ دن کبھی نہیں آئے گا...... آپ بیٹھیں، ایک گلاس ٹھنڈا پانی پئیں پھر گھر جا کر ریسٹ کریں...... you know...... ان نیچرل زندگی گزارنے والے اللہ کی بخشی ہوئی زندگی کی نعمت کو miss use کرتے ہیں۔ مجھے آپ سے بہت ہمدردی ہے کیونکہ آپ کو پتا ہی نہیں کہ زندگی کیا ہے؟'' پرنس نے سادگی سے کہا تھا...... نہ لہجہ ذومعنی تھا نہ طنزیہ اور نہ ہی استہزائیہ...... سلمان تو یہ سن کر گویا غصے سے ناچ، ناچ گیا۔ پرنس کا پُرسکون انداز تو اس کے اندر کی آگ کو مزید بھڑکا رہا تھا۔

''تم ایک نمبر کے عیاش...... اس گھر کے گیٹ سے داخل ہوتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہاں حرام کی دولت آ نہیں رہی...... زمین سے ابل رہی ہے۔ اور عورت کو کیا چاہیے...... اسی دولت کی خاطر تو عورت خود کو جانوروں کی سطح سے بھی نیچے لے جاتی ہے۔'' سلمان کف اڑا رہا تھا...... پرنس سر جھکائے اپنے پاؤں کے انگوٹھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سلمان کے خاموش ہوتے ہی اس نے سر اٹھا کر دیکھا...... سادگی سے مسکرایا۔



''آپ تو کسی بھی انسان کو مشتعل کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں...... آپ یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ شاید میں ابنارمل ہوں اگر ایسا بھی سمجھ لیں تو میں مائنڈ نہیں کروں گا۔''

''تم عادی مجرم کی طرح پکے ہو۔'' سلمان نے دانت پیسے، پرنس کا تحمل سلمان کے وجود میں آتش فشاں کا دھواں بھر رہا تھا جو پھٹنے سے پہلے آتش فشاں کے مرکز سے اٹھنا شروع ہوتا ہے۔

''نہیں...... میں زندگی کے موجودہ لمحے کو مثبت استعمال کرنا چاہتا ہوں۔'' پرنس نے اسی طرح تحمل سے اختلاف کیا۔

''اور یہ اس لیے کہ اس لمحے میں، میں نے ذرا سا بھی لوز کر دیا تو بہت سے لوگوں کے لیے اتنا بڑا بوجھ بن جائے گی کہ اس بوجھ کو کندھا دینے والے دھنس جانا پسند کریں گے، قیاس اور اندازوں پر زندگی کو کھیل تماشا نہ بنائیں مسٹر سلمان...... آپ کا ایک معصوم، پیارا سا بیٹا بھی ہے...... جو آنے والے دنوں میں آپ کی شناخت اور خاندان کی بقا کی ضمانت ہے۔''

پرنس کا پُرسکون و فطری انداز اب سلمان پر اثر انداز ہونے لگا تھا کیونکہ وہ پرنس کو مشتعل کرنے کی اپنی سی کوشش کر کے حقیقتاً نڈھال ہو چکا تھا۔

''او کے......!'' اب وہ قدرے بدلے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

''اب میں تمہیں ایک سچ بات بتادوں...... میں اپنی بیوی پر اعتبار نہیں کرتا۔'' سلمان گویا ہوا تو پرنس کو یوں لگا ایک ساتھ کئی شہابِ ثاقب ٹوٹ کر گرے اور زمین کانپ اٹھی۔

تمام تر فراست کسی نادیدہ سامری جادوگر نے سلب کرلی...... اس نے بہ مشکل نظر اٹھا کر سلمان کی طرف دیکھا جواب اس کی طرف دیکھنے کے بجائے دیوار کو گھور رہا تھا۔

''دوسروں کی انسلٹ کرتے، کرتے آپ نے اپنے آپ پر ہی خودکش حملہ کردیا۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی پر بھروسا نہیں کرتا مگر اس کے ساتھ رہ رہا ہے تو یہ تو اس کی اپنی نااہلیت ہوئی...... دین میں تو کوئی زبردستی نہیں...... جس عورت پر اعتبار نہیں، اس کے ساتھ رہنا بھی مجبوری نہیں، آپ اسے آزاد کرکے نیا انتخاب کرسکتے ہیں۔ یہ فل ٹائم میلی یا رچہ کیوں برداشت کررہے ہیں؟ اگر آپ کے پاس ثبوت ہیں...... ثبوت کی وجہ سے یقین ہے تو یہ بندھن واقعی عذاب ہے۔ اور یہ تو ویسے بھی خون کا رشتہ نہیں ہوتا...... اعتبار کا رشتہ ہوتا ہے۔ دونوں کے درمیان سے اعتبار کو نکال دیا جائے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک چھپر کے نیچے دو جانور بندھے ہوں۔''

درحقیقت ایک عورت کی سرِ عام رسوائی وہ بھی اس کے محرم کے ہاتھوں پرنس کے لیے انتہائی اذیت ناک امر و مرحلہ تھا۔

''اس عورت کو برداشت کرنا میری مجبوری ہے...... دو احمق اور جذباتی عورتیں مجھے چھوڑ کر جاچکی ہیں...... اگر اسے بھی چھوڑ دیا تو چوتھی پھر بازار سے ملے گی۔''

''لاحول ولاقوۃ......!'' پرنس کی برجستگی نے سلمان کا منہ بند کرادیا۔

اس نے الجھی ہوئی نظروں سے پرنس کی طرف دیکھا۔

''بہت کمزور انسان ہیں آپ...... کتنی سخت مجبوری ہے آپ کی...... مگر قابلِ رحم بالکل بھی نہیں ہیں، اپنی مجبوریوں کی وجہ سے آپ نے انسان کے بنیادی حقوق سلب کیے ہوئے ہیں...... یہ تو سب سے بڑا ڈاکا ہے...... آپ تشریف لے جاسکتے ہیں، آپ ایک معزز خاتون کو اپنی مجبوریوں کی وجہ سے جگہ، جگہ رسوا کرنے کو تو تیار ہیں مگر چھوڑنے یا آزاد کرنے کے لیے تیار نہیں۔'' پرنس نے طنز کے بجائے بہت دکھ سے کہا تھا۔

''تمہارے لیے آزاد کردوں؟'' سلمان نے گویا مٹھی بھر بارود پرنس کے پیروں پر پھینک دیا، پرنس دو قدم پیچھے ہٹ گیا...... بحیثیتِ انسان جذبات غضبناک ہوکر حملہ آور ہوگئے مگر علم و تربیت کی ڈھال نے پھر سنبھالا دیا۔

سلمان کڑے تیور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''آپ جاسکتے ہیں...... میری طرف سے خدا حافظ......'' اس نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

''اے مسٹر......!'' سلمان نے بدلحاظ لہجے میں اسے آگے بڑھنے سے روکا۔

''میرا نام پرنس شہر علی خانزادہ ہے۔'' پرنس نے صبر و تحمل اور مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ پلٹ کر جواب دیا۔

''آئندہ کسی بھی حوالے سے میری فیملی کے آس پاس بھی نظر آئے تو میں extreme پر چلا جاؤں گا۔'' سلمان نے اب کھلی دھمکی دی۔

''عورت کی عزت کرنا میری کمزوری ہے ورنہ میں میڈیا کو بلا کر اس مظلوم عورت کو ایک موشی سے نجات دلانے کی کوشش کرتا...... خدا حافظ......'' یہ کہتے ہی پرنس ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔

''مجھے پہلے شک تھا مگر اب یقین ہے...... یہ تو اس انتظار میں ہے کہ میں صندل کو کل کے بجائے آج طلاق دے دوں......'' سلمان نے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر گھونسا مارا تھا۔ غیر اخلاقی سرگرمیوں میں زندگی گزارنے والوں کی نظر سکس بائی سکس ہونے کے باوجود ان کے دل اندھے ہوتے ہیں...... فراست و بصیرت تو فطری زندگی

گزارنے والوں کو عطیہ کی جاتی ہے۔

☆☆☆

''گیسٹ آئے ہوئے ہیں؟'' لیڈی صوفیہ نے چونک کر انجیلا کی شکل دیکھی۔

''یس میم، کافی دیر پہلے کی بات ہے...... شاید چلے بھی گئے ہوں......'' انجیلا نے سر کو خم دے کر مودبانہ عرض کیا۔

"how strange" لیڈی صوفیہ نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو ایک خاص انداز میں حرکت دی جو تعجب کے اظہار کی بے ساختگی تھی۔

''جب کوئی اس طرح منہ اٹھا کر چلا آتا ہے تو میں بہت worried ہوتی ہوں۔ you know...... شہر میں کیا ہورہا ہے یہ تو تمہیں پتا ہی ہے...... میرے بیٹے پر تو معلوم نہیں، کس، کس کی نظریں ہوں گی۔ میں دیکھتی ہوں۔'' انہوں نے بیڈ سے اترنے کی کوشش میں مدد کے لیے انجیلا کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اس نے بہت پیار سے تھام لیا اور بیڈ سے اترنے میں انہیں مدد دی۔ لیڈی صوفیہ قدم جما کر کھڑی ہونے کے قابل ہوئیں تو اپنا سراپا جانچا۔

''میری ڈریسنگ ٹھیک ہے......؟ کچھ دیر پہلے ہی چینج کیا ہے۔''

"mam you are looking so good" انجیلا نے ان کی ساڑی کا آنچل درست کرتے ہوئے روایتی خادمانہ انداز میں سراہا۔

''اوتھینکس ڈیئر......'' لیڈی صوفیہ فوراً بچے کی طرح خوش ہوگئیں۔

''شاید مجھے پرفیوم لگانا چاہیے...... زیادہ فریش نظر آؤں گی۔'' ان کی نظریں ڈریسنگ کی طرف اٹھیں۔

''اوکے...... میں لے کر آتی ہوں......'' انجیلا میکانکی انداز میں ڈریسنگ کی طرف دوڑ گئی...... اور اسی رفتار سے دوڑتی ہوئی پرفیوم لے کر آئی اور اسپرے کرنے لگی۔ تھوڑا سا گردن پر پھر ساڑی پر...... پھر لیڈی صوفیہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا...... وہ پرفیوم اپنی جگہ رکھنے بڑھی تو لیڈی صوفیہ نے آنچل سنبھال کر نکلنے کے لیے پر تولے۔

☆☆☆

پرنس گھر کے اندر جانے کے بجائے اسٹوڈیو چلا آیا...... دادی کا سامنا کرنے سے پہلے اس نے اپنی روحانی منتشر کیفیت کو مرتب کرنا تھا...... مراقبے کی مشق سے اعصابی مضبوطی تو اسے حاصل تھی جو اس کے اعتماد کی ٹھوس بنیاد تھی۔ وہ خود پر ہنس رہا تھا۔

اسے یوں لگا گویا قدرت اسے زندگی کے ایک حیرت انگیز ذائقے سے روشناس کرارہی ہے...... شاید خیال کے کسی غیر محسوس لمحے میں اس نے اپنی پارسائی کو سوچ لیا ہو شاید اس لمحے سے لطف اندوز بھی ہوا ہو۔

بس ایسا ہی کوئی لمحہ اسی آن اپنی ضد بھی تخلیق کرتا ہے...... کیونکہ زندگی کا ہر پہلو دو رخوں پر قائم ہے۔ یکتائی رب کائنات نے صرف اور صرف اپنے لیے مخصوص کی ہے۔

ایک شادی شدہ لڑکی جو ایک نونہال کی ماں بھی ہے۔ تہمت...... اگرچہ پوشیدہ تھی مگر سنگِ تہمت سے لگنے والا زخم بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس وقت وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس نہیں کررہا تھا...... ایک پوشیدہ زخم اپنے موجود ہونے کا احساس دلا رہا تھا۔

معاً اسے صندل کی بے بسی و مظلومیت کا ادراک ہوا...... مرد پر لگنے والی تہمت زندگی میں پیچھا ضرور کرتی ہے مگر تہمت زدہ عورت، وہ بھی پارسا عورت کو اپنی موت تک گھنے جنگل کا سفر لاحق ہوجاتا ہے۔ ہوا سے پیدا ہونے والی سرسراہٹ سے جھاڑیوں میں کسی بھیڑیے کے چھپے ہونے کا گمان ہوتا ہے۔

غریب کی جورو تو پھر بھی سب کی بھابی ہوتی ہے...... مگر تہمت زدہ عورت کو تو لوگ ''باجی'' بھی نہیں بناتے۔ جو رشتوں کی طاقت، تعلقات کی چاشنی سے محروم ہو جاتی ہے۔ اس نے صندل کی آنکھوں میں مظلومیت کے ساتھ، ساتھ وہ حجاب بھی ملاحظہ کیا تھا۔ جو ایک پارسا اور دیانت دار صابر عورت کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ جسے محسوس کر کے خود بخود احترام کے جذبات غالب آجاتے ہیں۔

''میں اپنی بیوی پر اعتبار نہیں کرتا۔'' پرنس کے کانوں میں سلمان کی آواز گونجنے لگی۔

''پرنس کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا یا اسی کی طرح کوئی نوجوان ہوتا تو جواب میں ایسی بات کہتا کہ سلمان کی طبیعت ہری ہو جاتی۔

مگر پرنس نے تو اپنے گھر کے ماحول میں ملازمین تک سے کوئی عامیانہ بات نہیں سنی تھی۔ کثرت مطالعہ کے باعث انسانی جذبات کی ترجمانی کرنے والے تمام الفاظ تک رسائی تو تھی...... مگر ادائیگی کے حوصلے نہیں تھے۔

''میں ثوبان کے لیے دعا کروں گا کہ اللہ اسے اپنی ماں کے لیے صدقۂ جاریہ بنا دے۔'' اب ذہن ہر طرف سے ہٹ کر ثوبان کی محبت کی طرف متوجہ ہوا۔

پھول کا تصور قائم ہوا تو وہ خود بخود پھول کی طرح ہلکا ہو گیا۔

☆☆☆

سلمان، پرنس کے باہر جاتے ہی ڈرائنگ روم سے نہیں نکلا تھا۔ پرنس کا اسے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر خدا حافظ کہہ کر نکل جانا اس کی انا پر گویا ضرب کاری تھی۔

اس کے حساب سے ''مراسم'' اتنے گہرے ہو چکے تھے کہ پرنس اسے کوئی حیثیت، اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔

''تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور میرے فرشتوں کو خبر نہیں ہوئی۔'' شک کی آگ نے اس کا ذہن مفلوج کر دیا تھا۔

وہ ان مردوں میں سے تھا جو جب تک چِلّا، چِلّا کر اپنی بھڑاس نہیں نکال لیتے۔ معمول کے ٹریک پر واپس نہیں آتے...... کمزور شخصیت پاگل پن کی ہی ایک قسم ہے۔ پاگل بے اختیار ہوتا ہے، اسے دماغ کا چل پڑنا بھی کہتے ہیں، جیسے گاڑی کے بریک فیل ہو جاتے ہیں۔ دوئم وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ آج تو اسے اس گھر میں داخلہ مل گیا...... آئندہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی اسے اندر آنے دے...... ایک بے کلی لاحق تھی۔ گویا کوئی جاسوس جان جوکھوں میں ڈال کر مطلوبہ نتائج حاصل کر کے ہی دم لے۔

''اسے تو قتل بھی کر دوں گا تو وہ زبان نہیں کھولے گی...... جو پتا چلے گا...... اسی سے پتا چلے گا۔ فیس نہیں کر سکا...... اسی لیے چلا گیا......'' سلمان یوں بے چینی سے اِدھر، اُدھر ٹہل رہا تھا گویا اپنے گھر میں ہو۔

''میں اس سے facts اگلوا کر ہی یہاں سے جاؤں گا...... اگر یہ سچ بول پڑا تو صندل کے ساتھ وہ کروں گا کہ وہ موت کی تمنا کرے گی...... مگر میں اسے مرنے نہیں دوں گا۔'' اس نے ڈرائنگ روم سے باہر آ کر کسی ملازم کو دیکھنا چاہا تا کہ وہ اس کے ذریعے پرنس تک پیغام پہنچا دے کہ وہ ابھی اس کے گھر میں ہی ہے...... کیونکہ ابھی تک فیصلہ کُن بات نہیں ہوئی۔

آج وہ اس شخص کو اس کے نوکروں کے سامنے بے عزت کیے بغیر تو نہیں جائے گا۔ وسیع لاؤنج میں دور، دور تک کوئی نظر نہ آیا...... وہ اس حد سے جانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا، اسے ملازم کا انتظار کرنا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم سے باہر آ کر لاؤنج میں ٹہلنے لگا...... بے قراری ایسی تھی گویا چاند کی چودہ کو سمندر میں جوار بھاٹا۔ پل، پل کرنٹ کی طرح ایک لہر اٹھتی تھی اور ٹھک سے دماغ پر لگتی تھی۔ معاً وہ اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

گھر کے اندرونی حصے سے ایک بوڑھی طرح دار بنی سنوری خاتون ایک نوجوان لڑکی کے ہمراہ نمودار

ہوئی تھیں۔

''یہ کیا...... یہ تو گڑبڑ ہو گئی......'' سلمان بوکھلایا بھی اور سٹپٹایا بھی...... خالی الذہن بس تکتا رہ گیا۔

لیڈی صوفیہ کے چہرے پر حیرت و ناگواری کے ملے جلے تاثرات ابھرے تھے۔

''یہ کون بدتمیز ہے؟ آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر دیکھ رہا ہے...... اسے اتنی تمیز نہیں کہ بڑوں کو سلام کرنا چاہیے۔ who are you?'' وہ ایک بے ادب سے اسی طرح بات کر سکتی تھیں۔ سلمان کا ذہن بالکل منجمد تھا...... جیسے کوئی دلدل میں گردن تک دھنس چکا ہو۔

''جینٹل مین...... میں آپ سے بات کر رہی ہوں...... you are a stranger, what are doing here...'' وہ بدتہذیب شخص سے اب بہت شاہانہ و تحکمانہ انداز میں بات کر رہی تھیں۔ لیڈی صوفیہ کا "aura" اتنا strong تھا، وہ اک پل میں اس پر غالب آگئیں، ان کی روح سے پھوٹنے والی طاقتور لہروں نے اس کی کمزور شخصیت کو مسمار کر کے رکھ دیا تھا۔

''جی...... وہ...... میم...... میں پرنس شہپر سے ملنے آیا ہوں......'' وہ بہ مشکل بول پایا۔

''شبیر حسین......'' لیڈی صوفیہ نے اپنے ملازم کو آواز دی...... زور سے بولنے کی وجہ سے آواز بہت مہین محسوس ہوئی۔

ملازم گرتا پڑتا آیا تھا...... ملازم...... مالکوں کی tone سے ایسے ہی آشنا ہوتے ہیں جیسے حاذق حکیم مریض کی نبض سے۔

''یس میم......'' نیلے یونیفارم میں ملبوس ملازم نے سہمے، سہمے انداز میں لیڈی صوفیہ کی طرف دیکھا۔

"آپ نے گیسٹ کو ڈرائنگ روم میں نہیں بٹھایا؟ ایک اَن نون گیسٹ کو آپ نے لاؤنج میں بٹھا دیا؟" وہ غضب ناک نظر آئیں۔

وہ اس اجنبی سے چنداں خوف زدہ نہیں ہوئیں کیونکہ سلمان کا پہناوا رئیسوں کی طرح تھا...... قد آور اور خوب صورت مرد تھا۔ حدا من فضل ربی تو رئیس کی شکل پر لکھا ہوتا ہے...... اسی لیے انہوں نے جینٹل مین کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

"میم...... ان کو ڈرائنگ روم میں ہی بٹھایا تھا......" ملازم نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"ان کا کوئی sweet name بھی ہوگا...... نام نہیں پوچھا تھا آپ نے؟" وہ سب کچھ بھلا کر اب شبیر حسین کی خبر لے رہی تھیں۔

"میم...... شاید سر واپس جا رہے ہیں، خانزادہ صاحب تھوڑی دیر پہلے "سر" کے ساتھ ڈرائنگ روم میں ہی تھے۔" ملازم خود دریائے حیرت میں غوطہ زن تھا۔ لیڈی صوفیہ کو ایک جھٹکا لگا۔

"تو پرنس کہاں ہے؟" انہوں نے ایک نگاہِ غلط سلمان پر دوڑا کر اِدھر اُدھر دیکھا...... سلمان نے بڑی بے بسی کی کیفیت محسوس کی۔ اس کے سامنے جو بارعب خاتون کھڑی تھیں۔ ان کو مطمئن کرنا ناممکن لگ رہا تھا۔

لیڈی صوفیہ کا بلا کا اعتماد...... غیر معمولی انداز، ملکہ جیسا جاہ و جلال...... ایک بوڑھی ناتواں خاتون جو اپنی خادمہ کا سہارا لے کر آئی تھی...... کس قدر زور آور تھی کہ اس کی زبان پتھرا گئی تھی۔

"جی میں پرنس سے اجازت لے چکا ہوں...... اپنے ڈرائیور کا ویٹ کر رہا تھا۔" بالآخر اس کے ذہن کے خلیے چارج ہونا شروع ہوئے، مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق......

"اوہ......" بوڑھی جان معصوم بچے کی طرح بہل گئی۔

"میرا خیال ہے ڈرائیور آ گیا ہوگا...... میں چلوں گا...... خدا حافظ......" سلمان سر پر پاؤں رکھ کر یوں بھاگا...... پیچھے مڑ کر نہ دیکھا......

"how strange" لیڈی صوفیہ نے دور تک سلمان کا نگاہوں سے تعاقب کیا...... اور بڑبڑائیں۔

"پتا کرو...... پرنس کہاں ہے...... مجھے ابھی اس سے ملنا ہے۔" انہوں نے ملازم سے تحکمانہ انداز میں کہا۔

ملازم حکم بجا لانے کے لیے مستعد ہو گیا...... اور پرنس کی تلاش میں چل پڑا۔

"I am feeling, something is wrong" لیڈی صوفیہ اپنے حواس سے کچھ نامانوس سی کیفیت کشید کر رہی تھیں۔

"میم آپ لاؤنج میں ہی پرنس کا انتظار کریں گی......" انجلا پوچھ رہی تھی...... لہجہ مؤدبانہ اور مہربان تھا۔

"اوہ یس...... آف کورس......" لیڈی صوفیہ اب غائب دماغی کی کیفیت میں جا رہی تھیں...... اجنبی ان کے حواس پر بوجھ کی طرح آن گرا تھا...... یہ ان کے گھر کا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ جسے وہ نظر انداز کر ہی نہیں سکتی تھیں۔

☆☆☆

سفینہ، تاجور کے آفس میں ان کا انتظار کر رہی تھی۔ آج اس کی فلائٹ بھی تھی جیسے، جیسے وقت گزر رہا تھا سفر سر پر سوار ہو رہا تھا۔ تاجور سپر وائزر کے چیمبر میں ضروری میٹنگ بھگتا رہی تھیں۔ معاملات پر کافی حد تک قابو پا لیا گیا تھا۔ دو تین گرفتاریاں عمل میں آ چکی تھیں۔ مزدور کے گھر تعزیت کر کے بھی آ گئی تھیں، ایک لاکھ کا چیک بھی دے دیا

تھا تاکہ آئندہ کی کسی ناخوشگواری سے بچت ہو سکے۔ کفن دفن کا انتظام بھی اپنے سر لیا تھا...... اور یوں ایک بھیانک صورتِ حال کو کسی حد تک اپنے حق میں کر لیا تھا۔

سفینہ اس سارے عمل میں ان کے ساتھ، ساتھ رہی تھی...... اس وقت شدید قسم کی تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی۔

تنہائی کے ان لمحات میں بار ہا اسے پرنس کا خیال آیا تھا۔

"اُدھر تو ابھی پتا ہی نہیں کہ ہم لوگ اس وقت کس مشکل سے گزر رہے ہیں۔ ماڈرن ٹیکنالوجی کے اس دور میں بھی ہمارا کانٹیکٹ ہونا اتنا مشکل ہے۔" وہ معصومانہ حیرت سے سوچ رہی تھی۔

جیسے کبھی سوہنی ماہیوال کے بیچ چناب بہتا تھا۔

ذہن قدرے پُرسکون ہوا تو پرنس کی یاد ٹوٹ کر آئی...... رات کے مناظر فلم کی طرح ذہن کے پردے پر چلنے لگے۔

معاً اس کے سیل فون کی رنگ نے چونکا دیا...... ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھا سیل اٹھا کر دیکھا۔ لینڈ لائن نمبر سے کال آ رہی تھی۔

دل قدرے خوشگوار انداز میں دھڑکا...... رومان کی ایک مخصوص لہر نے گدگدایا۔

"شاید......" بس شاید سوچتے ہی کال وصول کر لی تھی۔

"ہیلو......" انداز بہت محتاط تھا۔

"کیسی ہیں سفینہ......؟"

سفینہ کا دل خوشگوار انداز میں اچھلا۔

پرنس کی بھاری مردانہ وباوقار آواز نے اسے نہال کر کے رکھ دیا۔

"اوہ...... آپ؟" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"جی...... میں...... اب بتایئے کون......؟" پرنس کا انداز چھیڑ چھاڑ والا تھا۔

"پرنس......" سفینہ نے محجوب انداز میں جواب دیا۔

"آپ مجھے پرنس نہیں کہیں گی...... کیونکہ سب مجھے پرنس کہتے ہیں۔" پرنس کے انداز میں اتنی نرمی اور اپنائیت تھی کہ سفینہ مسحور سی ہو گئی۔

"پھر کیا کہوں؟" سفینہ کو بات بڑھانے میں لطف آنے لگا۔

"میرا اپنا ذاتی نام...... شہیر......" پرنس کی آواز کا دھیما پن ایسا تھا گویا...... کھلنے کے عمل کے دوران پھول سے خوشبو پھوٹ رہی ہو...... سفینہ پر جادو کا سا اثر ہونے لگا...... وہ مجسم دل بن کر متوجہ تھی...... سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

"کتنا خوب صورت نام ہے آپ کا......" اس نے ہمت کر کے اپنی خُفتہ رومانی حس کو جگایا۔

"ہم سر سے پاؤں تک خوب صورت ہیں۔" پرنس کی آواز سماعت سے ٹکرائی تو سفینہ چونک پڑی۔

خود...... اپنی تعریف...... کم از کم پرنس سے وہ توقع نہیں کر سکتی تھی...... چند ثانیے لب بستہ سی بیٹھی رہی۔

"ہیلو......؟" پرنس کو گمان گزرا کہ شاید رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔

"جی...... میں سن رہی ہوں۔" سفینہ نے فوراً خود کو سنبھالا۔

"لوگ بھی کہتے ہیں...... آئینہ بھی کہتا ہے...... مگر مجھے یقین تب آیا جب سفینہ کی آنکھوں میں خود کو دیکھا۔"

سفینہ شرما کر ہنس پڑی...... کتنا خوب صورت اظہارِ محبت تھا......

"مجھے ایک بات کی بہت خوشی ہے۔" پرنس کہہ رہا تھا وہ ہمہ تن گوش تھی......

''کہ LUMS میں پڑھنے والی سفینہ کو میں نے بازیافت کیا ہے..... اس برف کے مجسمے کو میں نے پگھلایا ہے۔''
پرنس کی بات سن کر سفینہ حیران ہی ہوگئی۔
''میری تو آپ سے بہت کم بات ہوئی ہے۔''
''ارے نہیں..... تم تو مجھ سے اتنی باتیں کرتی ہو کہ رات کو سونے نہیں دیتیں۔'' پرنس نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اچک لی۔
''جی.....؟'' اب سفینہ حیران سے زیادہ پریشان ہوئی۔
''تم سوچتی ہو..... میں سنتا ہوں..... یقین نہیں آئے تو میرا امتحان لینا..... میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ کل رات تم کتنے بجے سوئی تھیں۔''
''لیکن کل رات تو میں سوئی ہی نہیں۔'' سفینہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ پرنس کا ہلکا سا قہقہہ سماعت سے ٹکرایا۔ اس ہلکے سے قہقہے میں بلا کی مقناطیسیت تھی..... سفینہ کو دل تھامنا پڑا۔
''ہاں کل رات ہم disconnected تھے۔ میں نے چند سیکنڈ تمہیں سرچ کیا..... مگر تم ''راڈار'' پر نہیں تھیں۔''
''کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' معصوم سی سفینہ گھبراہٹ کا شکار ہونے لگی......
''اسے محبت کہتے ہیں سفینہ..... چاہت فطرت کی طرح خالص، پیور ہو تو یقین دلانے کے لیے کسی میڈیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔''
سفینہ کو عجیب سی الجھن محسوس ہوئی۔ کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔
''ایک بات کہوں..... آپ برا تو نہیں مانیں گے۔'' وہ ہچکچاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
''میں بڑی جلدی ''اچھا'' مان لیتا ہوں..... ڈونٹ وری.....'' برجستہ جواب آیا۔
''دل کی حالت جاننا تو بس اللہ ہی کا کام ہے..... کوئی انسان کیسے دعویٰ کر سکتا ہے؟'' اس نے قدرے اٹک، اٹک کر اپنی بات مکمل کی۔
''اللہ ہمارے الفاظ بھی ریکارڈ کرتا ہے..... میں نے صرف احساسات کی بات کی ہے..... وہ شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا''

اب سفینہ کو پرنس کی معنی خیز پُراسرار باتوں کی سمجھ آئی اور اس نے کھل کر گہری سانس لی۔
''آپ بہت گہرے ہیں۔''
''آپ بہت پیاری ہیں.....'' پرنس نے برجستگی و شوخی سے قطع کلامی کی۔
سفینہ بے ساختہ کھلکھلائی۔ انوکھی و خالص مسرت کا احساس رگ و پے میں سرائیت کر گیا..... ایسی روحانی مسرت جس کو پانے کے لیے خلائی سفر بھی آسان لگے..... زندگی کا پہلا، انوکھا تجربہ......
''میرے کانوں میں چاندی کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔'' پرنس کی مسحور آواز سماعت سے ٹکرائی ہی تھی کہ ساحل دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔
سفینہ نے فوراً خود کو سنبھالا۔
''میں آپ کو تھوڑی دیر بعد فون کرتی ہوں۔'' اس نے گھبراہٹ میں یوں رابطہ منقطع کیا جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔

''جی.....'' پھر اس نے سیل کان سے ہٹا کر ساحل کی طرف دیکھا..... جو سفینہ کو بس دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر چاہے جانے کا مان پورے چاند کے جیسا تھا۔
خوب صورت تو بے شمار انسان ہوتے ہیں۔ مگر کچھ چہروں میں ایسی مقناطیسیت ہوتی ہے کہ دل کھنچے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ چہرے ان انسانوں کے ہوتے ہیں جنہیں فطرت محبت کا شعور فیاضی سے عطا کرتی ہے۔
چاہے جانے کی قدر بھی وہی کرتا ہے جسے چاہت کے مفہوم سے آگاہی ہوتی ہے۔ ساحل کے اندازِ نظر سے سفینہ کو ناگواری کی کیفیت نے آن گھیرا تھا۔
''آپ کو مجھ سے کوئی کام.....؟'' سفینہ اب سرد مہری پر مجبور ہوگئی۔
ہر، ہر بات پر اداکاری کرنے کی عادت پڑ چکی تھی..... اب کیوں باز آتا..... بلکہ اب تو زیادہ پوز دینے کا مرحلہ تھا۔
حسین رئیس زادی سامنے بیٹھی تھی اور مکمل طور پر متوجہ تھی۔ وہ بڑے اسٹائل سے مسکرایا۔ جیسے کیمرے کے سامنے ڈائریکٹر کی ہدایات پر شاٹ دے رہا ہو۔
کیا کمال لڑکی ہے..... وہ بے انتہا متاثر ہو رہا تھا..... یار زندگی کے سفر میں اس جیسا ساتھی ہو تو زندگی، زندگی ہے۔
''جی..... میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔'' سفینہ اپنی طرف اس کی نگرانی سے بیزار ہوگئی..... جھنجلا گئی۔
ایک تو اس کی دخل در معقولات نے ''اوائلی'' رومان کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا تھا دوسرے کچھ کام کی بات بھی ابھی تک نہیں کی تھی۔
''جی..... میم کا میسج ہے، وہ لیٹ ہو رہی ہیں، ان کا حکم ہے کہ پہلے آپ کو گھر ڈراپ کر دوں اس کے بعد... ائرپورٹ۔'' وہ بڑی خاکساری سے اب سر جھکا کر کہہ رہا تھا۔
''کیوں..... ڈرائیور کہاں ہے؟'' سفینہ کی کوفت حیرانی میں بدل گئی۔
''جی ڈرائیور میم کے ساتھ رہے گا..... میم کو ابھی کئی جگہ جانا ہے۔'' ساحل نے سابقہ انداز میں جواب دیا۔
''اماں..... ابھی یہاں آفس میں نہیں ہیں.....؟'' سفینہ پریشان نظر آنے لگی۔
''جی وہ آفس میں ہی ہیں، کانفرنس روم میں میٹنگ کر رہی ہیں۔''
''لیکن میں اماں سے مل کر جانا چاہتی ہوں۔'' سفینہ کو اب سب کچھ گڑبڑ لگنے لگا۔
''جی..... میم نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ یہاں سے ڈائریکٹ ائرپورٹ پہنچیں گی آپ کو سی آف کرنے کے لیے۔'' ساحل مختصر بات بھی طویل کر رہا تھا کیونکہ اس دوران جی بھر کر سفینہ کو دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔
''اوہ.....'' اب سفینہ سمجھ گئی کہ تاجور بری طرح پھنس گئی ہیں اور اس کے لیٹ ہونے کے خیال سے انہوں نے یہ راستہ نکالا ہے۔
''اوکے..... میں ریڈی ہوں، آپ کتنا ٹائم لیں گے؟'' سفینہ نے اپنا سیل فون اٹھا کر شولڈر بیگ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔
''جی..... میم کا آرڈر ہونے کے بعد مجھے تو ریڈی ہونا پڑتا ہے۔'' ساحل نے اپنی فرمانبرداری سے سفینہ کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔
''آپ کی گاڑی ہے؟'' سفینہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔
''آپ ہی کی ہے..... کمپنی کی گاڑی کا مطلب یہ ہے کہ اونر تو آپ ہیں۔'' ساحل نے اپنی ٹائی کی ناٹ چھو کر سر کو ہلکا سا خم دیا۔

''بہت بولتا ہے۔'' سفینہ نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

ساحل نے بہت مؤدبانہ انداز میں ہاتھ کے اشارے سے سفینہ کو باہر نکلنے کا عندیہ دیا۔ سفینہ بہت اعتماد سے اس کی طرف دیکھے بغیر باہر کی طرف بڑھی...... ساحل نے اس کی تقلید کی۔

اس کے چہرے سے مسرت کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ قیمتی کار میں ساتھ لڑکی بھی ایسی ہونی چاہیے۔ لوئر مڈل کلاس لڑکیاں...... جو چہرے پر سرخی پاؤڈر لگا کر باہر نکلتی ہیں تو پاؤڈر دور سے ہی نظر آجاتا ہے۔ سستی لپ اسٹک ہونٹوں پر یوں چمکتی نظر آتی ہے جیسے پہلوان کے بدن پر سرسوں کے تیل کی مالش کے بعد چمک نظر آتی ہے۔ اور یہ اپر کلاس لڑکیاں...... ان کا تو کھایا، پیا ہی ان کا میک اپ ہوتا ہے۔ وہ سفینہ کے تعاقب میں چلتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

پرتعیش قیمتی و منفرد ڈیزائن کے فون سیٹ کی طرف یوں دیکھ رہا تھا۔ گویا وہاں سے کسی بھی لمحے سفینہ کی آواز ابھرے گی۔

سلسلۂ کلام اچانک منقطع ہوگیا تھا...... دل پر ایک بوجھ سا آپڑا تھا۔

''میں تمہاری خاطر اپنی طبیعت کے خلاف آئی فون بھی یوز کرسکتا ہوں...... مگر میرا رومانس kill ہوجائے گا۔ مجھے نہ تم سے وعدے کرنے ہیں...... نہ قسمیں اٹھانی ہیں...... جو میرے اختیار میں نہیں...... وہ خواب تمہاری آنکھوں میں سجانے کا جرم ہرگز نہیں کروں گا۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں...... ہم جی بھر کر ایک دوسرے کو محسوس کریں، کھوکھلے الفاظ...... جذبوں کی طاقت چوس لیتے ہیں...... موجودہ لمحہ ہی تو ہمارا ہوتا ہے۔ ماضی...... وہ وقت ہے جو ریت کی طرح ہمارے ہاتھ سے پھسل چکا...... مستقبل...... یہ ایک دھوکا ہے...... محبت تو یہ ہے کہ کہکشاؤں کے فاصلے بھی جدائی نہ ڈال سکیں...... میں تمہارے خیال میں ہوں...... تم میرے خیال میں ہو...... کتنی اچھی زندگی ہے...... کتنی مکمل زندگی ہے۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھا...... روحانی توانائی سے آنکھیں چمک رہی تھیں، چہرہ دمک رہا تھا۔

☆☆☆

سفینہ کو احساس تھا کہ ساحل ان کا ڈرائیور نہیں ہے بلکہ اب ان کے بزنس سرکل کا ایک اہم حصہ ہے...... اس پر بڑی بھاری ذمے داریاں ڈال دی گئی ہیں...... وہ ماں کے تمام بزنس امور سے مکمل آگاہی رکھتی تھی۔ تاجور اس سے سب کچھ شیئر کرتی تھیں۔

اس کے حساب سے جو انسان ان کی دولت میں اضافہ کرنے کے لیے بھرپور کردار ادا کر رہا تھا وہ خصوصی اہمیت و احترام کے لائق تھا۔

وہ کسی نفسیاتی پیچیدگی یعنی احساسِ برتری یا کمتری کا شکار نہیں تھی...... بہت اعتماد سے وہ فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی تھی...... یہ امر ساحل کے لیے خوشگوار حیرت کا موجب تھا...... ورنہ اس نے تو بیک مرر سے دیدار پر بھی اکتفا کرلیا تھا۔

دن کے تین بجے کا عمل تھا...... دھوپ میں ابھی شدت تھی۔ سفینہ نے بیٹھتے ہی قیمتی ڈارک گلاسز آنکھوں پر چڑھا لیے...... اس کی شخصیت کا حسن دوبالا ہوگیا تھا...... صبیح چہرے پر سیاہ گلاسز غضب ڈھا رہے تھے...... ساحل کا دل تو یوں بھی سینے کے بجائے ہتھیلی پر سجا رہتا تھا...... اس نے اپنے پھڑکتے جذبات کو یوں سنبھالا جیسے قربانی کی گائے کو جان لڑا کر زمین پر لٹا رہا ہو۔

ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی اس نے محسوس کیا وہ سولہ سو سی سی کار کے بجائے بہشتی براق اڑانے چلا ہو۔

سفینہ بہت پُراعتماد تھی...... اور یہ فطری اعتماد تھا...... ایسا اعتماد جو معصوم بچے کا خاصہ ہوتا ہے جو سانپ اور بلی کے بچے کو ایک انداز میں چھو سکتا ہے۔ سفینہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی...... ساحل کن آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیسا رعب تھا کہ چرب زبانی میں اپنا ثانی نہ رکھنے والے کو جرأت کلام نہیں تھی۔

''میں آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لوں گی...... مگر آپ کو آدھا گھنٹا انتظار کرنا ہوگا۔'' سفینہ اسی طرح بات کر رہی تھی جیسے ''ٹیکا'' ''مستری'' ''چھوٹے'' سے بات کرتا ہے۔

''شیور! مجھے میم نے آپ کی خدمت کے لیے ہی فری کیا ہے۔'' سفینہ کو غیر ضروری عاجزی اور چاپلوسی کی بو نے کوفت میں مبتلا کر دیا...... وہ اس کو عزت کا حق دار گردان رہی تھی...... وہ زمین پر لمبا لیٹا جا رہا تھا۔

''بہت complexed اور کانشس ہے۔''

وہ پُرسکون ذہن کی مالک اور کم گو تھی...... اسی طرح کے لوگ ٹھیک، ٹھیک انداز سے لگانے کی فطری اہلیت رکھتے ہیں۔

''آپ ابھی کتنا عرصہ لاہور میں گزاریں گی۔'' چند منٹ کی گہری خاموشی ساحل کو ہی توڑنا پڑی...... عادت سے مجبور تھا خاموشی اسے ہیجان و خلجان میں مبتلا کرتی تھی۔

سفینہ نے گردن موڑ کر اس کی طرف ایک نگاہ دیکھنے کا بھی تکلف نہیں کیا۔

''سوری ٹو سے...... آپ پرسنل ہو رہے ہیں۔'' سفینہ نے کہا۔ ایسا ٹکا سا جواب...... ساحل پر گویا گھڑوں پانی پڑ گیا۔

اس نے خیال ہی خیال میں دونوں ہاتھوں سے اپنے کانوں کی لوؤں کو چھولیا...... وہ اب خاموش ہوگیا...... یوں جیسے سفینہ اس سے پوچھے گی کہ کیا آپ نے میری بات کا برا منایا ہے؟

چلو...... فی الحال یہ بھی بہت ہے کہ دیکھنے والے اس کی طرف بہت رشک سے دیکھ رہے ہیں...... قیمتی کار...... حسین دولت مند لڑکی...... اندر کہیں کچھ ''ٹھنڈک'' سی تو ہو رہی ہے...... اس نے کھل کر گہری سانس لینے تک کا ارادہ ملتوی کر دیا...... مبادا...... ہم سفر کی طبع نازک پر گراں گزرے۔

☆☆☆

زارا لاؤنج میں ڈھیر سارے کاجو، بادام کے ساتھ صوفے پر دراز اپنے آئی فون پر کوئی دلچسپ وڈیو دیکھ رہی تھی یہ جو چند منٹ پہلے اس کی کسی دوست نے شیئر کی تھی۔ دیکھتے ہوئے لطف اندوز ہو رہی تھی...... کھل کر مسکرا بھی رہی تھی۔

سفینہ عجلت بھرے انداز میں داخل ہوئی تو زارا کی محویت خود بخود ٹوٹ گئی...... اس نے پلکیں اٹھا کر ایک بے تاثر نگاہ سفینہ پر دوڑائی۔

''اماں بھی آگئی ہیں؟'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی گویا پہاڑ دھکیلنے کا مرحلہ تھا۔

''نہیں، ایک منٹ تم ذرا ٹھیک سے بیٹھ جاؤ...... ساحل اندر آرہا ہے۔'' سفینہ نے معمول کے انداز میں بات کی مگر زارا چونک پڑی۔

''ساحل...... وہ کیوں آرہا ہے؟'' اس کا سارا موڈ غارت ہوگیا...... سیل ایک طرف پٹخ دیا...... سفینہ کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ زارا کی اداؤں پر توجہ دیتی...... اس پر سفر سوار ہوچکا تھا۔

''اسے wait کرنا ہے۔'' وہ مشینی انداز میں کہہ کر آگے بڑھی۔

''کس کا......؟'' زارا اب حیران ہوئی۔

''اُفوہ...... بھئی...... مجھے اس کے ساتھ ائرپورٹ جانا ہے......اس وقت میں جلدی میں ہوں......لیٹ ہورہی ہوں......ٹریفک کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔فلائٹ سے پندرہ منٹ پہلے بورڈنگ کلوز ہوجاتی ہے۔''

سفینہ نے یہ ساری بات آگے بڑھتے، بڑھتے مکمل کی تھی اور موڑ پر غائب ہوگئی تھی۔زارا گہری سانس لے کر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''ساحل ائرپورٹ ڈراپ کرے گا۔'' زارا کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔پرنس کو کہتیں تو یہ خوب صورت کام تو وہ بھی کرسکتا تھا......درحقیقت اسے کچھ سمجھ نہیں آئی تھی......اس سے پیشتر کہ اپنی جگہ چھوڑتی...... ساحل بڑے ترنگ میں کی رنگ اپنی انگلی پر نچاتا اندر داخل ہوا......مگر ایک جھٹکے سے رک گیا......زارا اس کی طرف بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''اوہ......آپ......'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

زارا نے کوئی جواب دینا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔

''اچھا تو آپ کو ڈرائیور کی جاب بھی مل گئی ہے۔مجھے ساڑھے آٹھ تک لازمی کالج پہنچنا ہوتا ہے......گاڑی ساڑھے سات تک بالکل ریڈی ہونی چاہیے۔ویسے بھی مینول گاڑی کو رات کو ہی چیک کرلینا چاہیے۔'' یہ کہہ کر زارا بڑی طرح کے ساتھ مسکرائی اور لاؤنج سے چلی گئی۔ساحل ڈرائنگ روم میں جانے کے بجائے لاؤنج میں ہی بیٹھ گیا......اس کی نظر ٹیبل پر رکھے کاجو، بادام پر پڑی......طنزیہ مسکرانے لگا۔

''اس قدر بادام کھائے گی تو پتا نہیں کتنوں کے دماغ اور کتنوں کی جان کھائے گی۔'' جی بھر کر توہین کر کے گئی تھی......خون کھولنے لگا تھا۔

''تم اپنی بہن کے سامنے بیچتی کیا ہو؟ پتا نہیں کس بات پر اتنا نخرہ ہے......'' ساحل جوابا بے عزتی تو نہیں کرسکتا تھا......مگر خیال کی حد تک بدلہ لے لیا......''سفینہ جیسی مس ہوگئی تو تم پر غور کیا جاسکتا ہے۔otherwise تو میرے حساب میں نہیں آتیں۔اُف مجھے کیا ہوگیا تھا......تم جیسی خوفناک لڑکی کے بارے میں کیوں سوچنے لگا تھا۔ شاید سفینہ سامنے نہیں آئی تھی اس وجہ سے......تمہارے بارے میں کسی سخت مجبوری کی وجہ سے ہی سوچا جاسکتا ہے۔'' وہ اندرونی مکالمے میں مبتلا تھا......یہ بھی بے بسی کی کیفیت کی عام حالت ہوتی ہے۔

☆☆☆

''وہ کون تھا پرنس......؟ اور تم اسے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟'' لیڈی صوفیہ اتنی زیادہ فکرمند تھیں کہ پرنس کا انتظار کرنے کے بجائے اسے تلاش کرتی اسٹوڈیو میں چلی آئی تھیں۔

پرنس اپنی عادت کے برخلاف بری طرح چونک گیا تھا......ذہن سلمان کی طرف گیا تو فوراً ہی دوسرا خیال آیا کہ گرینڈ مام نے تو سلمان کو دیکھا تک نہیں......شاید کسی ملازم نے بتادیا ہو......مگر گرینڈ مام تو یہ بھی پوچھ رہی ہیں کہ تم اسے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے۔

اس کا پُرسکون ذہن مدتوں بعد خلفشار میں مبتلا ہوا تو وقتی طور پر پریشان ہوگیا۔

''کس کی بات کررہی ہیں گرینڈ مام......؟'' اس نے اپنی تسلی کے لیے وضاحت چاہی۔

''اسی گیسٹ کی......جو تم سے ملنے آیا تھا......مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی......وہ لاؤنج میں تھا اور اکیلا تھا۔'' وہ اپنی چھڑی پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر غور سے پرنس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

پرنس نگاہ چرا گیا۔

''لاؤنج میں......؟'' اسے نئے سرے سے حیرت نے آلیا۔

''ہاں...... دیکھنے میں تو جینٹل مین لگ رہا تھا......مگر ہمارے گھر میں یہ بہت امیزنگ ہے، مجھے تو تمہاری فکر ہے......یہ کون ہے......؟ تم سے ملنے کیوں آیا تھا۔''

پرنس کے لیے جھوٹ بولنا ایسا ہی تھا جیسے پہاڑ کھود کر پانی کی نہر نکالنا......اس نے چند ثانیے توقف کر کے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''گرینڈ مام......وہ سلمان تھا......ثوبان کا فادر......میں اس بچے کی بات کررہا ہوں، جو کل رات ہمارے گھر میں تھا۔تھینک یو کہنے آیا تھا......'' اس نے وہ جھوٹ بولا جو درحقیقت لیڈی صوفیہ کے لیے ''دوا'' کا مقام رکھتا تھا کہ ان کے کمزور اعصاب ایک انسان کی اعلیٰ درجے کی بدتہذیبی برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے۔

''اوہ......سو نائس......وہ شکل سے تو بہت معقول دکھائی دے رہا تھا۔'' اب لیڈی صوفیہ ہلکی پھلکی ہو کر مسکرانے لگیں۔

''یہ تو اچھی بات ہے اسے تمہارے قیمتی وقت کی ویلیو کا احساس ہوا۔'' اب وہ پرسکون ہوچکی تھیں اور پرنس مطمئن۔

''اچھا، اب یہ بتاؤ تمہارا سفینہ سے کانٹیکٹ ہوا؟''

لیڈی صوفیہ کے انداز میں پھول کھلنے جیسی بے ساختگی تھی......سفینہ اس گھر کی خوشی کا استعارہ بن چکی تھی۔ جس کا ذکر ہی خوشی کی ضمانت وروحانی سرور کا مخزن تھا۔

پرنس کے لبوں پر دل نواز مسکراہٹ بکھر گئی......ساری کائنات کا رومان سمٹ کر اس کا دل بن گیا۔

''جی......مگر اس وقت وہ بہت بزی ہے......چار بجے اس کی فلائٹ ہے......میرا خیال ہے وہ ائرپورٹ کے لیے نکل گئی ہوگی......'' پرنس کے لیے موضوع بدل جانا غنیمت تھا۔

''اگر تم اسے سی آف کرنے جاتے تو کوئی حرج تھا......؟''

پرنس کلاک پر وقت دیکھ رہا تھا اور لیڈی صوفیہ اسے دیکھ رہی تھیں۔پرنس دادی کی چھیڑ چھاڑ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکرادیا۔

"Two things awe me most, the starry sky above me and the moral law with in me" (سب سے زیادہ دو چیزوں کو سراہتا ہوں......ایک تاروں بھرا آسمان جو میرے اوپر چھایا ہے۔دوسرے وہ اخلاقی قانون وضابطے جو میرے اندر ہیں۔)

''میں اس نئی نویلی شناسائی کو اپنی کسی بے ساختگی سے متاثر نہیں کرنا چاہتا......ابھی اسے محسوس کرنے دیں......خوش ہونے دیں......سوچنے دیں......دریا اپنے راستے پر بہتا ہے تو کتنا خوب صورت لگتا ہے......'' یہ کہہ کر پرنس دھیرے سے ہنس پڑا۔

لیڈی صوفیہ نے مسکرانے میں اس کا ساتھ نہیں دیا، وہ گہری سوچ میں تھیں۔''میرا خیال ہے تم نے اس جرمن فلاسفر Immanuel Kant کو qoute کیا ہے جس کے قیمتی فلسفے کو بیسویں صدی میں ہٹلر نے خاک میں ملادیا تھا......اگر وہ racism (نسل پرستی) پر یقین رکھتا تھا۔تو اس نے Kant کی فلاسفی کو کیوں اہمیت نہیں دی......کیوں دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا۔لوگ اپنے خون سے چراغ جلا کر جاتے ہیں......ایک شخص پھونک مار کر سارے چراغ بجھادیتا ہے۔آخر ظالم لوگ پیدا ہوتے ہی کیوں نہیں مرجاتے......؟ ان کی نسلیں تیار ہوتی ہیں......دنیا اندھیروں میں ڈوب جاتی ہے۔'' لیڈی صوفیہ کو پھر اپنا محبوب شوہر یاد آرہا تھا......وہ پھوٹ، پھوٹ کر رورہی تھیں۔

''گرینڈ مام......'' پرنس شدید احساسِ جرم میں مبتلا ہونے لگا......اس نے جرمن فلسفی کے چند الفاظ اس لیے

ادا کیے کہ وہ اس کی یادداشت میں رہتے تھے...... وہ کلاسکی ادب کا دل دادہ تھا...... سفینہ کے دھیان میں بے ربط ہو کر بھول گیا کہ جرمنی کے حوالے سے کچھ کہنا ہی گویا اپنی شامت بلانا تھا...... جرمنوں کی شروع کی ہوئی جنگ نے ہی تو ان کا محبوب چھین لیا تھا۔

''مجھے رونے دو پرنس...... میں بہت دنوں بعد رو رہی ہوں...... مجھے اچھا لگ رہا ہے، وہ میرے قریب ہی تو ہے...... مجھے دیکھ رہا ہے، میں اسے چھو سکتی ہوں، جب درد کی شدت کمال ہوتی ہے تب ہی تو وہ میرے پاس آتا ہے۔'' پرنس کی حساس طبع پر دادی کے آنسو انگاروں کی طرح برس رہے تھے......

یہ اس نے انجانے میں کیا کر دیا؟ وہ متاسف تھا......

گم گشتہ محبتیں ماحول میں بال بکھرائے ماتم کناں تھیں...... تازہ محبتیں یوں حیرت زدہ تھیں گویا تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی میں پورے چاند کا عکس...... اور چاند کا اپنے عکس کو محویت سے تکنا......

☆☆☆

''اماں...... میں نشا کی طرف جا رہی ہوں...... ہم نے کل کمبائنڈ اسٹڈی پلان کی ہے...... ایک دن وہ میرے گھر آئے گی اور ایک دن میں اس کے گھر جاؤں گی۔''

زارا، تاجور سے فون پر جانے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔ اور گھر سے باہر جانے کی اتنی مضبوط وجہ بیان کی تھی کہ تاجور اس کے بعد اسے روکنے کے لیے کوئی دلیل دینے سے عاجز ہو گئیں۔

''ٹھیک ہے، میں ڈرائیور کو تو نہیں بھیج سکتی...... ائرپورٹ جا رہی ہوں تم نشا سے کہو کہ وہ اپنی گاڑی بھیج کر تمہیں پک کر لے۔''

''اماں...... میں اپنی کار سے جا سکتی ہوں......؟ پہلے بھی تو ڈرائیو کرتی تھی ناں...... آپ نے تو بس......''

''اچھا بس ابھی میں بزی ہوں...... زیادہ بات نہیں کر سکتی...... جیسا کہا ہے ویسا ہی کرو...... خدا حافظ......''

تاجور کا انداز حتمی و دوٹوک تھا۔

کچھ کہنے کی نیت تھی منہ کھلے کا کھلا رہ گیا...... فون بند ہو گیا......

''میری کار کوئی خاص نہیں ہے اماں...... ڈاکوؤں کو تو بالکل بھی پسند نہیں آئے گی......'' وہ طیش پر قابو پانے کی کوشش میں دانت پیس رہی تھی۔

☆☆☆

''میں نے بھی ایم بی اے کیا ہے مگر LUMS سے نہیں...... اسی لیے جاب کی تلاش میں بہت ٹائم ضائع ہوا...... آپ تو بلیسڈ لوگ ہیں...... LUMS تو جابز بھی پرووائڈ کرتی ہے......'' ساحل ایک سگنل پر رکا تو اس نے سفینہ کی جامد خاموشی میں تغیر برپا کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن مجھے تو اپنا بزنس سنبھالنا ہے...... کہیں باہر جاب تو کرنی ہی نہیں ہے۔'' سفینہ نے بڑے سادہ مگر پُر وقار انداز میں جواب دیا۔

ساحل نے کن انکھیوں سے سفینہ کی طرف دیکھا۔

''پھر تو آپ super blessed ہوئیں ناں...... جس شے کی آپ کو آرزو نہیں، وہ آپ کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔''

''تھینک گاڈ...... مگر یہاں کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا...... میں سمجھتی ہوں کہ سب سے بڑی blessing تو یہ ہے کہ آپ orphan (یتیم) نہ ہوں...... باپ کی کمی بھی بہت بڑی کمی ہوتی ہے...... میرے فادر بہت

early چلے گئے...... میری ماں کو بہت بھاری ذمے داریاں اٹھانا پڑیں...... مجھے یہ دکھ بھی تو ہے کہ میری ماں نے لائف انجوائے نہیں کی...... بس اپنی ڈیوٹیز ادا کی ہیں۔''

سفینہ بہت ذہین تھی۔ اس نے ساحل کی باتوں سے اس کے احساسِ کمتری و خودترسی کو محسوس کیا تھا، اب وہ اسے حوصلہ دے رہی تھی کہ ہر انسان کے پاس سب کچھ نہیں ہوتا...... اس لیے رشک کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا...... ساحل کا دل خوشی سے دھڑکا۔

وہ کم آمیز باقاعدہ اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی...... اس کا انداز ہمدردانہ تھا۔

راہ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

اسے بے اختیار شعر آ گیا...... مگر وہ حد درجہ محتاط تھا...... سفینہ کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی...... اس سے ہر موضوع پر بات نہیں کی جا سکتی تھی۔

''بیسٹ آف لک...... میری دعا ہے کہ آپ ہر قدم پر کامیاب ہوں۔'' ساحل نے بڑے سنجیدہ و باوقار انداز میں اس گفتگو کا اختتام کیا جو اس نے خود شروع کی تھی۔

''تھینک یو...... آپ بہت ambitious اور hardworker ہیں اسی طرح کام کرتے رہے تو boost کر جائیں گے۔''

سفینہ لاشعوری طور پر بحیثیت سیکنڈ باس بات کر رہی تھی...... مگر دوسری طرف بے صبرا اور جلد باز دل...... ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ خوش فہمیاں بارش کی طرح برسنے لگیں۔

پرسنالٹی تو اس کی زبردست ہے...... کوئی اگنور کر ہی نہیں سکتا...... بس فی الحال کوئی اس کا گھر دیکھنے کی تمنا نہ کرے...... جہاں گزارے کے لیے ہر سیکنڈ ہینڈ چیز جمع کی گئی تھی۔ بیڈ، صوفہ، کارپٹ، مائیکرو ویو اوون، فوڈ فیکٹری، شوریک...... حتیٰ کہ سیل فون بھی سیکنڈ ہینڈ لیا تھا...... آفس میں اپنی دھاک بٹھانے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ بندے کے ہاتھ میں apple سے کم تو سیل فون نہیں ہونا چاہیے۔

''جی...... میں اس وقت بہت پرائڈ فیل کروں گا جب لوگ مجھے سیلف میڈ کے طور پر تسلیم کریں گے۔''

''میں اور اماں تو پہلے ہی consider کر چکے ہیں...... آپ جیسے لوگ ہی ایک دن asset بن جاتے ہیں......'' سفینہ کا انداز اختیاری طور پر نہیں بے ساختہ پن سے "Bossy" تھا...... مگر ساحل تو بے پنکھ ہواؤں میں اڑنے لگا۔ اتنا تو اسے خود پر اعتماد تھا کوئی لڑکی آسانی سے اس کو نظرانداز نہیں کر سکتی۔

''thank God زمین ہموار ہے...... پتھریلی نہیں...... پھول بھی نکلیں گے...... انشاء اللہ...... پھل بھی آئیں گے۔''

ائرپورٹ کا نظارہ اب سامنے تھا...... وہ اس ملاقات کا حسن برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ جس میں آس و امید کے ستارے جھلملا رہے تھے...... مزید کوئی بات کر کے اس تاثر کو ضائع کرنے کی خطرناک غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

خود کو بہت سنجیدہ، بردبار register کرانے کی نیت سے خاموشی اختیار کی...... اس نے کہیں پڑھا تھا کہ خاموشی میں بہت رعب ہوتا ہے۔

سفینہ بھی ائرپورٹ پر نگاہ پڑتے ہی سب کچھ بھلا کر اب گاڑی سے اترنے کی جلدی میں تھی...... ساتھ ہی وقت دیکھ رہی تھی...... اب اسے ماں کا بھی انتظار تھا جنہوں نے آدھے گھنٹے میں پہنچنے کی یقین دہانی کا فون بھی کیا تھا۔

خوش رنگ قیمتی لباس میں ملبوس مہکتی حسین دوشیزہ اس کے پہلو میں تھی۔ اسے یوں لگا اس کے خواب زیادہ عرصہ بے تعبیر نہیں رہ سکتے۔ ایک ایسی سرشاری کی کیفیت تھی جس سے نکلنے کو دل نہیں چاہتا......

''اماں بھی بس پہنچنے والی ہوں گی......'' سفینہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہی تھی۔

''اماں؟'' ساحل چونک پڑا۔

شاید یہ کائنات کے مالک کے اسکرپٹ میں لکھا ہوا ہے...... جب رومان اوجِ کمال پر پہنچے گا...... اماں یا ابا کی مداخلت لازمی ہوگی۔

سفینہ کے ایک بے ساختہ جملے نے سارا خمار...... غبار کی طرح اڑا دیا تھا۔

☆☆☆

زارا کی ساری پلاننگ غارت ہوکر رہ گئی تھی۔ ڈرائیور کو لے کر وہ پرنس کے گھر کیسے جاسکتی تھی۔ وہ فی الحال یہ بات تاجور سے چھپانا چاہتی تھی کیونکہ اگر وہ بتا دیتی تو تاجور کسی طور پر بھی اسے وہاں جانے کی اجازت نہیں دیتیں کہ ایک دن بعد ہی وہاں دوبارہ جانا بغیر کسی وجہ کے مناسب نہیں۔

وہ اپنے شیطانی دماغ کو گھمانے لگی کہ کامیابی کے لیے کون سا راستہ نکالنا چاہیے۔ معصوم انسانوں کی سوچ بہت محدود ہوتی ہے...... اور شیطان کو رہنما بنانے والوں کے پاس تدبیروں کی کمی نہیں ہوتی۔ فوراً ہی اسے سوجھ گیا کہ کیا کرنا چاہیے...... آئیڈیا ہاتھ لگتے ہی اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے بے ساختہ چٹکی بجائی تھی۔

پرنس کے گھر کے تمام لینڈ لائن نمبرز اس کے ہاتھ لگ چکے تھے، اس نے اپنے سیل سے ہی نمبر ملایا جو آپریٹر نے اٹینڈ کیا۔

''جی میں...... زارا بات کر رہی ہوں...... کائنڈلی لیڈی صاحبہ سے بات کرا دیجیے......'' آپریٹر کے کال ریسیو کرتے ہی اس نے مدعا بیان کیا...... آپریٹر نے او کے کہا اور کال ہولڈ ہوگئی...... ہلکا، ہلکا میوزک اسٹارٹ ہوگیا...... زارا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ایک، ایک پل صدی کے لگ بھگ لگ رہا تھا۔

''ہیلو، میم...... لیڈی صاحبہ لائن پر ہیں بات کیجیے......'' آپریٹر کی آواز ابھری...... ساتھ ہی لیڈی صوفیہ کی مہین...... دھیمی سی آواز آئی۔

''ہیلو......؟''

''السلام علیکم مام......'' زارا نے لہجے میں مقدور بھر چاشنی سمو کر بڑے مہذبانہ انداز میں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام...... کیسی ہو زارا......؟'' لیڈی صوفیہ بہت محبت سے پوچھ رہی تھیں۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، اینچو ئیلی آپ بہت یاد آرہی تھیں...... رات ڈنر پر تو آپ سے ٹھیک سے بات ہی نہیں ہوسکی...... آپ سے تو one to one بات کرنے میں مزہ آتا ہے...... جب کوئی تھرڈ پرسن درمیان میں انٹرفیئر نہ کرے۔'' زارا نے یوں کہا جیسے شبِ ہجر گزارنے کے بعد محبوب سے شرفِ کلام حاصل ہو......

''oh so sweet...... تم کتنی پیاری لڑکی ہو...... ایک بوڑھی عورت کو یاد کرتی ہو...... اس پر اپنا precious time قربان کرنے کو تیار رہتی ہو...... تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو تو موسٹ ویلکم......'' لیڈی صوفیہ تو اپنی اہمیت محسوس کرتے ہوئے خوشی سے نہال ہو رہی تھیں۔

"oh thank you" زارا کامیابی کے احساس سے جھوم اٹھی۔

''اب دیکھیے ناں...... سفینہ تو لاہور ہوتی ہے...... اس کی کمی تو مجھے پوری کرنی چاہیے، آپ کا خیال رکھنا چاہیے۔ آپ کو وقت دینا چاہیے۔ اماں کی مصروفیت کا تو یہ حال ہے کہ سنڈے کو بھی آفس کے کام کر رہی ہوتی

ہیں۔'' زارا نے اعلیٰ درجے کی فرض شناس ہونے کا گویا یقین دلا دیا۔

''تم کتنی duty ful ہو زارا...... اتنی چھوٹی سی عمر میں تم سب کچھ سوچ لیتی ہو۔ امیزنگ...... میں نے اس ایج میں کسی لڑکی کو اتنا کانشس نہیں دیکھا۔ میں گاڑی بھیجتی ہوں...... جتنی دیر تمہیں آنے میں لگے گی...... اتنی دیر میں، میں تمہارے لیے خود کو vacant کرلیتی ہوں...... تاکہ تمہاری کمپنی کو انجوائے کرسکوں......'' لیڈی صوفیہ ایک خوشگوار مصروفیت کے احساس سے سرشار تھیں۔

''او کے...... مام......'' وہ جان بوجھ کر ''مام'' سے پہلے ''گرینڈ'' نہیں لگا رہی تھی۔

''مام......'' کہنے میں وہ اپنائیت تھی جو ماں، بیٹی کے رشتے میں ہی محسوس ہوتی ہے۔

''ٹیک کیئر...... سویٹ ہارٹ......''

سلسلۂ کلام منقطع ہوگیا...... زارا کے اندر جذبات کی شدت نے ایندھن بھر دیا۔ ''سفینہ کو کسی شے کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... مگر مجھے پڑتا ہے......'' اس نے پہلے کی طرح ضمیر کے چلانے پر شٹ اپ کال دی۔

☆☆☆

''شادی شدہ عورت کرپشن کی ٹھان لے تو اسے کسی قسم کا خوف تنگ نہیں کرتا...... وہ ایک احمق شوہر کا "TAG" لگا کر جو مرضی کرسکتی ہے...... نکلو......'' سلمان جنونی انداز میں صندل کو دھکے دے رہا تھا۔

''آپ مجھ سے حلف اٹھوالیں...... میں نے اسپتال میں فرسٹ ٹائم پرنس کو دیکھا تھا۔ میں نہیں جانتی ان کا گھر کہاں ہے...... وہ اسی بلاک کے کس گھر میں رہتے ہیں؟'' صندل لڑکھڑاتے ہوئے بہت بے بسی سے یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''سب کرپٹ عورتیں اسی طرح کے ڈرامے کرتی ہیں۔'' سلمان نے پھر اسے دھکا دینے کی کوشش کی...... صندل تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔

''میں اس قید خانے میں کب سے قید ہوں...... پڑوس کے لوگوں نے میرا سایہ نہیں دیکھا......'' صندل نے روتے ہوئے کہا۔

''ہوں...... قید خانہ......'' سلمان نے خون کا گھونٹ پیتے ہوئے گردن کو جنبش دی۔ ''گھر کو قید خانہ سمجھتی ہو تب ہی تو آزادی کے راستے تلاش کرنا شروع کردیے (گالی) ایک اجنبی...... اچانک سے اتنا ہمدرد کیسے ہوگیا...... اٹھا کر اسپتال لے گیا...... جنرل وارڈ میں ایڈمٹ کرانے کے بجائے وی آئی پی duluxe میں ایڈمٹ کرایا...... تمہیں پتا ہے اس وارڈ کے ایک دن کے چارجز کتنے ہوتے ہیں؟''

سلمان نے صندل کے بال مٹھی میں دبوچ کر زور سے جھٹکا دیا۔ صندل کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی۔

اسی وقت ثوبان نے بیڈ روم کا دروازہ دھڑ دھڑا دیا۔

''ماما، ماما......''

''دفع ہوجاؤ...... مر گئی تمہاری ماما۔'' سلمان زور سے دھاڑا...... مگر ثوبان ماں کی محبت میں شیرِ جوان بن چکا تھا...... ماں کی چیخ نے سارے خوف پچھاڑ کر رکھ دیے تھے۔

''ماما، ڈور کھولیں...... ماما...... پلیز ماما......''

''تم چلے جاؤ ثوبان ورنہ اٹھا کر نیچے پھینک دوں گا۔'' سلمان کے وجود میں اونچے، اونچے شعلے اٹھ رہے تھے۔ پرنس سے مل کر تو اس کا احساسِ کمتری جو اخلاقی جرائم کی کثرت کی وجہ سے پیدا ہونا فطری امر ہے...... بڑھ کر دوچند ہوچکا تھا۔

صندل نے ایک دم بلی کی طرح غرا کر سلمان کی طرف دیکھا تھا۔
''میں ہر طرح کا ظلم اپنے بچے کی خاطر برداشت کرتی ہوں...... اگر اولاد نہ ہوتی تو مجھے موت سے عشق ہو جاتا...... اور اب مرنے سے اس لیے گھبراتی ہوں کہ میں مر گئی تو میرا بیٹا...... بھری دنیا میں تنہا رہ جائے گا۔ خبردار اگر تم نے کبھی اس کو ہاتھ لگانے کا سوچا......'' صندل بالکل نئے اور چونکا دینے والے روپ میں سامنے آئی تھی۔
سلمان کے الفاظ...... ''اٹھا کر پھینک دوں گا'' کو اس نے سنجیدگی سے لیا تھا۔ کیونکہ اس جنونی اور خود پرست و عیاش مرد سے ہر طرح کی توقع کی جا سکتی تھی۔ بیڈ روم فرسٹ فلور پر تھا۔ اور اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ بچے کو بالکنی سے اٹھا کر ہی پھینک دے۔
پہلے تو سلمان بے زبان کو شعلہ بیانی کرتا پا کر بری طرح چونکا...... پھر فوراً ہی اسے یقین ہو گیا کہ اس تبدیلی کے پیچھے یقیناً پرنس شہپر کی تھپکی ہے۔ اسے تو اپنا شک ہی یقین لگتا تھا۔ لفظ شک تو اس کے نزدیک کوئی معنی ہی نہیں رکھتا تھا۔ اس کا ہر خیال یقین کی قوت سے مالا مال ہوتا تھا۔
''ماما، پلیز......'' اچانک چھا جانے والی خاموشی سے ثوبان بری طرح بدحواس ہو گیا۔
''تم اپنے بیڈ روم میں جاؤ ثوبان...... میں تمہارے پاس آ رہی ہوں۔'' صندل نے اپنے بکھرے بال جو کٹی ہوئی جھاڑیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے اضطراری انداز میں سمیٹتے ہوئے حتی المقدور لہجے کو نارمل ظاہر کرتے ہوئے ثوبان سے کہا۔
سلمان پلکیں جھپکائے بغیر ایک ٹک صندل کی طرف گھور رہا تھا۔ غصہ و طیش انتہائی حیرت و تعجب میں تبدیل ہو چکا تھا۔
''یہ change بہت بڑا change ہے۔ تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔'' پرنس کا سکون و اعتماد تو ویسے ہی اس کو پُریقین بنا چکا تھا...... اتنا سکون و اعتماد تب ہی ہوتا ہے جب انسان خود پر کلیئر ہوتا ہے...... اسے کسی کے غصے و سخت ردِعمل کی پروا ہی نہیں ہوتی۔
''ارے...... تم کیا سمجھتی ہو...... تم سچ بولو گی تو میں تمہیں خوشیاں منانے کے لیے آزاد کر دوں گا؟ تم نے مجھے دھوکا دیا...... تو سزا بھی میں ہی دوں گا......'' وہ سفاکی سے مسکرایا۔
''دیں سزا...... جو مرضی سزا دیں...... مگر مجھے...... ثوبان میرا ہی نہیں آپ کا بھی بیٹا ہے۔ اگر اب اس پر شک ہے تو D.N.A کرا لیں۔'' صندل کا چہرہ آتشیں ہو رہا تھا۔ سلمان کے ظالمانہ تھپڑوں کے نشان جلدی نہیں مٹتے تھے۔
''exellent تو تم مان رہی ہو کہ تم مجھے چیٹ کر رہی تھیں۔'' سلمان، صندل کی اتنی جرأت کسی طور ہضم نہیں کر پا رہا تھا۔
''میں کچھ بھی کہوں گی آپ نے اس پر یقین نہیں کرنا...... تو پھر ٹھیک ہے جو آپ سوچ رہے ہیں اس پر یقین کر لیں۔'' صندل نے بہت پُرسکون انداز میں کہا تو سلمان کے دماغ کے پرخچے اڑ گئے۔ ایک مغرور و انا پرست مرد کی بدترین شکست یہی ہے کہ جس عورت پر اسے اختیار حاصل ہو وہ اس کے سامنے کسی اور مرد سے وابستگی کا اعتراف کر لے۔ ساری مردانگی کچرا کنڈی کے کچرے کی طرح جل کر خاکستر ہو جاتی ہے...... ثوبان شاید ماں کے کہنے پر بادلِ ناخواستہ وہاں سے ہٹ گیا تھا۔
''میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔'' سفاکی کی انتہا پر سلمان کی آنکھیں شعلوں کی طرح دہک رہی تھیں۔
''آپ جیل کی زندگی سے کمپرومائز نہیں کر سکتے...... عیاش انسان کو ایک گلاس ٹھنڈا پانی نہ ملے تو اس کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔'' صندل طنزیہ مسکرائی۔ اسے اپنے آپ پر حیرت تھی کہ اچانک اتنا ڈھیر سارا اعتماد اس کے اندر

کیسے آ گیا...... شاید ہر وقت کا یہ احساس کہ اس کی back کمزور ہے، اس کا ذہن و زبان مفلوج رکھتا تھا۔ پہلی بار ہمدردی کا ذائقہ چکھا تھا تو حال و زندگی میں لاشعوری طور پر تبدیلی محسوس ہوئی تھی۔
''البتہ میری موت کے بعد آپ کو پتا چل جائے گا کہ ''قید خانے'' میں دن و رات کیسے ہوتے ہیں......'' صندل اپنے بال سمیٹ کر جوڑا بنا چکی تھی...... چہرے کی آتشیں تمازت ہنوز تھی...... مدتوں بعد وہ اپنے گھر میں بالکل پُرسکون تھی...... سو سنار کی ایک لوہار کی، کے مصداق اس نے آج تمام مظالم کا بدلہ لے لیا تھا۔
ایک کہاوت کہ ''ظلم حد سے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے......'' اللہ نے اس کے حال پر رحم کی نگاہ کی تھی۔
سلمان کی دستار اس کے اپنے پاؤں تلے پڑی تھی۔
''او کے...... ابھی میرا ذہن بالکل ماؤف ہے...... مگر تھوڑی دیر میں use ' will کرنے کے قابل ہو جاؤں گا...... پھر تمہیں بتاؤں گا اور بہت اچھی طرح بتاؤں گا۔'' یہ کہہ کر سلمان نے ایک غضبناک نگاہ اس پر کی اور واش روم کی طرف بڑھ گیا...... صندل بہت اعتماد سے آگے بڑھی اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا...... چند لمحے سوچ میں رہی پھر آہستہ قدموں سے ثوبان کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

''واہ گرینڈ ماما آج تو آپ نے بہت برائٹ کلر کی ساڑی پہنی ہے۔'' پرنس نے بہت حیرت اور مسرت آمیز لہجے میں لیڈی صوفیہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا جو فیروزی سلک کی ساڑی میں بہت نکھری، نکھری و تر و تازہ سی محسوس ہو رہی تھیں۔ ساڑی کے بارڈر پر سفید ریشم کا نازک سا کام تھا...... کسی ہنرمند کے فنکارانہ ہاتھوں کا کمال سراہے جانے کے قابل تھا۔
گلے میں سچے موتیوں کی لڑی...... کانوں میں ٹاپس سیدھے ہاتھ کی کلائی میں موتیا کی کلیوں کے کنگن...... ہونٹوں پر پیازی لپ اسٹک کی چمک...... مسکارے سے بوجھل لمبی، لمبی پلکیں اور سب سے بڑھ کر...... پُرمسرت مسکراہٹ کی آرائش...... جو زیبائش پر حاوی ہو رہی تھی۔
''میری دوست آ رہی ہے...... میں اس کی کمپنی کو انجوائے کرنا چاہتی ہوں۔ اس عمر میں بچوں کو رنگ اچھے لگتے ہیں...... اس لیے آج بہت مدت بعد میں نے اس ساڑی کا انتخاب کیا ہے۔'' وہ اسی طرح پُرمسرت لہجے میں گویا ہوئیں۔
''دوست......'' پرنس چونک پڑا...... فوراً ہی لیڈی صوفیہ کی تمام دوست نظروں کے سامنے گھوم گئیں۔ مگر وہ تو لفظ بچوں استعمال کر رہی تھیں؟ وہ الجھا۔
''زارا آ رہی ہے...... دیکھو وہ تمہاری sister in law تمہیں بھی اس کے لیے کچھ وقت نکالنا ہوگا......'' وہ انگلی اٹھا کر تاکید کے ضمن میں کہہ رہی تھیں۔
''او شیور...... میں تو ویسے ہی آپ کو کمپنی دینے آ گیا تھا...... آپ نے تو مجھے بتایا ہی نہیں۔'' اسے حیرت تھی کہ لیڈی صوفیہ نے زارا کی آمد کے بارے میں اسے مطلع کیوں نہیں کیا۔
''میں سمجھ رہی تھی تم اسٹوڈیو میں بزی ہو...... میں نے انجیلا کو کہہ دیا تھا کہ تھوڑی دیر بعد تمہیں انفارم کر دے کیونکہ اس کے آنے میں کچھ وقت ہے ڈرائیور ابھی اس کے گھر پہنچا ہوگا......'' لیڈی صوفیہ نے ایک نظر وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''او کے جب آپ مجھے بلانا چاہیں تو بتا دیجیے گا۔ میں عصر کی نماز کے بعد فری ہوں۔''
پرنس نے لیڈی صوفیہ کا ہاتھ تھام کر ہتھیلی کی پشت پر مہرِ محبت ثبت کی۔ لیڈی صوفیہ نے بھی اس کا چہرہ تھام کر

پیشانی چوم لی......

''میں بہت خوش ہوں...... اچانک ہی ہمارے گھر میں رونق ہوگئی ہے۔ زارا، سفینہ کی باتیں ہوتی ہیں...... بہت اچھا لگتا ہے۔'' لیڈی صوفیہ نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور ڈریسنگ کی طرف بڑھ گئیں........ پرنس بے اختیار مسکرا دیا۔

''سفینہ کی باتیں ہوتی ہیں۔'' صرف اتنا ہی کہنا کافی تھا...... وہ سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

پرنس کے گھر سے وہ گاڑی پک کرنے آئی تھی جس میں بیٹھنے کے ساتھ ہی انسان خود کو ہواؤں میں اُڑتا محسوس کرتا ہے...... اسے یوں لگا گویا پروں والے گھوڑے یعنی رتھ پر بیٹھ کر چاند کے سفر پر جا رہی ہو۔

یونیفارم میں ملبوس شوفر نے گاڑی کا دروازہ کھول کر بہت مؤدبانہ انداز میں سر کو خم دیا تھا۔

گاڑی کے اندر بھینی بھینی خوشبو بکھری ہوئی تھی...... وہ ٹیک لگا کر یوں بیٹھ گئی جیسے اسے یقین ہو کہ یہ شاندار گاڑی اس کی اپنی ہے۔

''پرنس میری دریافت ہے...... اور اس حقیقت کی گواہی وہ پینٹنگ ہے جو میرے بیڈ روم میں لگی ہوئی ہے...... یہ تم بیچ میں کہاں سے آگئیں؟''

جوان کسی ہوئی جلد پر ناگواری کے جذبات سے لکیریں تو نہیں ہی مگر بھوؤں کے درمیان ہلکا۔۔ سا بھنور ضرور پڑ گیا تھا۔

☆☆☆

پرنس کو زارا کا انتظار نہیں تھا، نہ ہی اسے زارا کے ساتھ کچھ وقت گزارنے سے دلچسپی تھی۔ وہ تو اسے بچوں کی طرح ٹریٹ کرتا تھا...... اس کی بے ساختگی، مغز سے خالی باتیں...... بات، بات پر کھلکھلا کر ہنسنا...... سب کچھ بچوں جیسا ہی لگتا تھا...... وہ دادی کے ساتھ نہیں...... پردادی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔

جب اس نے ہوش سنبھالا تو وہ ستر کا عشرہ گزار چکی تھیں اور اس سے اپنی عمر و تجربے کے لحاظ سے باتیں کرتی تھیں...... اس لیے اس کے شعور کی سطح بہت بلند تھی...... بالغ نظری کی وجہ سے پچیس، چھبیس سال کی عمر میں دادی کو بہترین رفاقت مہیا کرتا تھا ان کے vision کے لحاظ سے گفتگو کرتا تھا...... ان کے پسندیدہ موضوعات پر بات کرتا تھا...... کلاسیکل ادب بھی زیرِ بحث آتا تھا...... جس کا ذوق وراثتاً منتقل ہوا تھا...... یہ زبردستی کا سودا نہیں تھا۔ پھول کھلنے کی طرح کا فطری عمل تھا۔

وہ اسٹوڈیو میں اپنی وہ تخلیقات نوٹ بک پر درج کرنے لگا جو کچھ دنوں بعد خلیجی ملک میں ہونے والی ایک نمائش کے لیے لے جانا چاہتا تھا...... کیونکہ تخلیق کار کے لیے یہ بات اہم ہوتی ہے کہ اس کی تخلیق کس کے سامنے پیش ہونے جا رہی ہے۔

اسی لمحے فون کی گھنٹی نے اس کی محویت میں دخل اندازی کی تھی۔ خیال فوراً زارا کی طرف گیا۔ اس نے پُرسکون انداز میں ریسیور اٹھا کر کال ریسیو کی۔

''جی......؟'' وہ آپریٹر سے مخاطب تھا۔

''سر مسٹر اینڈ مسز سلمان آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' آپریٹر کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

(جاری ہے)



نہیں شکایتِ ہجراں

غزالہ رشید

''بہت جلدی میں رہتی ہیں آپ......'' یہ جملہ اس کی سماعتوں میں اکثر ہی گونجنے لگا تھا...... کیا یہ ہی سچ تھا؟ وقت، خواب کو تعبیر نہیں بننے دیتا...... ہم اکثر وقت پر پہنچنے کے ہی چکر میں کچھ کام ادھورے چھوڑ دیتے ہیں...... کچھ فیصلے جلد بازی میں کر لیتے ہیں۔

مس رحمان نے بھی ایسے ہی اس کا ہاتھ دیکھا تھا بالکل سرسری سا اور وہ ہاتھ کی لکیروں پر یقین نہیں رکھتی تھی...... اسی لیے جلدی سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے...... پوائنٹ نکل جانے کا بہانہ کیا...... ساتھ ہی ساتھ مونا کو بھی گھورا جو اسٹارز کے اور کبھی ہاتھ کی لکیروں کے چکر میں کالج کے میلے میں اسے بھی ساتھ گھسیٹ لائی تھی۔

جملے...... رویے...... اور تیور ساری زندگی ہمارے

ساتھ چلتے ہیں...... ہم لاکھ ان سے بچنا چاہیں...... لیکن وہ تو اپنا جال ہمارے گرد بنتے ہی چلے جاتے ہیں......

ایسا نہ تھا کہ وہ فلسفے کی طالبہ تھی...... مصنفہ تھی یا پھر کوئی لیکچرار جو اپنی قابلیت کی دھاک بٹھانے کے لیے سامنے والے کے دل و دماغ پہ چھا جانے کے لیے ایسے ایسے جملے تراشتی ہیں کہ سامنے والا پلک بھی نہ جھپکے...... اور دل ہی دل میں انہیں پوجنا شروع کردے۔

وہ تو عام سی عورت تھی جو دال میں نمک زیادہ ہونے پہ بھی کڑھتی تھی اور چاولوں میں پانی زیادہ پڑجائے تو بھی پریشان ہوجاتی کیونکہ دسترخوان ہی وہ واحد جگہ تھی جو اَب گھروں میں بیٹھنے کا بہانہ تھی...... پھر کیوں رات سے وہ اس جملے کی بازگشت میں کھوئی ہوئی ہے...... یہ کون سا کوئی ایسا خاص جملہ ہے جو اسے برسوں بیت جانے پہ، آج بار، بار یاد آرہا ہے۔ وہ رات کی نیند اور دن کا چین کھو بیٹھی ہے...... ہاں ناں ایسا ہی ہوا ہے...... آج فائزہ فاروقی بنت حسین احمد فاروقی کے ساتھ.........

☆☆☆

کالج کے دن یادگار تھے لیکن گزر گئے...... اسے معلوم ہی نہ ہوا، کب وہ خالہ جان کو اتنی عزیز ہوئی کہ انہوں نے منیب احمد سے اس کی منگنی کی بات ہی صرف نہ کی بلکہ امی سے وعدہ لے لیا کہ دبئی میں نوکری کے لیے جانے کے بعد منیب احمد جب پہلی رخصت لے کر کراچی آئیں گے تو وہ فائزہ کو اپنی بہو بنا کے اپنے گھر لے جائیں گی...... انکار کی صورت میں وہ دوبارہ اس دہلیز پہ قدم بھی نہیں رکھیں گی...... یہ دھمکی خاصی کارگر ثابت ہوئی، کسی کو بھی اعتراض نہ تھا، فائزہ کو بھی نہیں...... یوں چاروں جانب سے مبارک بادیں ملنے لگیں اور پھر موتیا گلاب کی مہک نے اسے کچھ اور سوچنے بھی نہ دیا لیکن شاید منیب احمد کو مسکرانے کی عادت ذرا کم، کم ہی تھی...... یا پھر ترقی کرنے کا جنون تھا اور پھر ایسی ہی ایک خوب صورت شام میں مخروطی انگلیوں میں، مہندی کے رنگ سجنے لگے اور خالہ جان کو تو واری صدقے ہونے کے سوا کچھ یاد نہ رہا تھا...... امی کا دھیما مزاج بہن کو خوش دیکھ کر مطمئن تھا کہ بچی کی ناقدری نہ ہوگی۔

اُف...... بہت یادگار دن تھے...... اسے لگتا تھا، وہ خوابوں میں ستاروں کے سفر پہ ہے...... زمین والوں کی منافقت سے دور ہے...... بہت دور......

☆☆☆

''آج شام کو میں نے تمہاری خالہ جان کو کھانے پر بلالیا ہے میٹھا تم بنانا، مجھ سے ہمیشہ چینی کم رہتی ہے۔'' وہ جانتی تھی، ایسا کچھ بھی نہیں ہے...... امی کو ڈانٹنا آتا ہی نہ تھا...... ویسے بھی کون سی ان کی اتنی زیادہ اولادیں تھی کہ جو اُن سے نہ سنبھلتیں، وہ تو دو بچوں میں ہی بے حد خوش تھے، مطمئن رہنے والوں میں سے تھے۔

''بجو...... آپ کے ہاتھ کا ذائقہ فائزہ کے ہاتھ میں بھی ہے۔'' خالہ جان کو ہمیشہ سے ایسے ہی امی پہ پیار آتا تھا۔

''جی خالہ جانی...... اس بات سے تو میں بھی متفق ہوں۔'' نادیہ نے پلاؤ کی ڈش منیب کی طرف بڑھائی۔

''جی خالہ جانی......'' منیب نے بھی تائید کی۔

گرین ٹی کے ساتھ دیر تک گپ شپ کے بعد...... بچپن کی کہانیاں شروع ہوئیں تو ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتیں...... اگر خالو جان نے گاڑی کی چابی نہ اٹھائی ہوتی۔

''لگتا ہے ابو آپ کا پسندیدہ 'ٹاک شو' ختم ہوگیا ہے۔'' نادیہ نے بے دلی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''واقعی اتنا مزہ آرہا تھا بجو سے، آنٹی نور جہاں کے قصے سننے میں۔'' خالہ جان نے اٹھنے کے لیے منیب کا ہاتھ تھاما۔

''چلو اب کسی دن بجو کو اپنے ہاتھ کا چکن تکہ اور مچھلی کی بریانی کھلانے کے لیے انوائٹ کرلینا۔'' خالو جان مسکرائے۔

''وہ آنے والی تو نہیں...... بجو کا تو گھر سے نکلنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ پتا نہیں بیٹی سے ملنے بھی آیا کریں گی کہ نہیں۔'' خالہ جان کا شکوہ لبوں پہ آ گیا۔

''آؤں گی...... ضرور آؤں گی...... جس دن منیب احمد دبئی کے لیے روانہ ہوں گے۔'' امی مسکرائیں۔

''لے لو، یہ پروگرام بنایا ہے انہوں نے......'' خالہ جان نے منہ بنایا۔

''آپ دونوں ایک ساتھ دبئی کا پروگرام بنایئے گا...... میرے پاس آنے کے لیے......'' منیب احمد نے کن انکھیوں سے مسکراتے ہوئے فائزہ کی طرف دیکھا۔

''یہ ہوا ناں پروگرام...... چلو فائنل کرو......'' اب کی بار نادیہ نے فائزہ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

موسم میں بھی خنکی بڑھنے لگی تھی۔ دلوں کی گرم جوشی بھی ساتھ ساتھ سفر کررہی تھی۔

☆☆☆

منیب احمد دبئی کے لیے روانہ ہوئے تو دونوں ہی گھروں میں سناٹے بولنے لگے۔ دسمبر، جنوری کی سرد شامیں اداسیوں میں خود کو سمیٹتی رہیں...... اور فائزہ، امی نے زندگی بتانے کے گُر خاموشی سے اور کبھی دھیمی سرگوشیوں میں سیکھنے لگی۔

کاش زندگی ہمیشہ پُرسکون...... خوشیوں اور خوشبوؤں کی ہم سفر رہے...... ان ہی دنوں جب دونوں گھروں میں منیب احمد اور فائزہ کی شادی کے پروگرام بن رہے تھے...... کبھی گوٹا کناری دوپٹوں پہ لگ رہا تھا اور کبھی کاریگروں کی ناسمجھی پر ڈیڑھ گھنٹے تک بازار سے واپسی پر تبصرہ ہوتا تھا...... اچانک ہی شہر میں...... چاروں طرف دہشت گردی کے واقعات کی خبریں نہ صرف ریڈیو، ٹی وی پہ بلکہ گھروں میں بھی گونجنے لگیں۔

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اکثر سوچتی کہ ہم اتنے کم افراد ہیں اور گھر میں آئے دن کی مہنگائی کے تذکرے کرتے رہتے ہیں تو ان گھروں کا کیا حال ہوگا...... جہاں پر روزانہ کی اجرت پر کام کرنے والے ہیں جو پورا شہر بند ہونے کے باعث گھر سے باہر نکل ہی نہیں پاتے...... شاید کچھ لوگوں کے لیے یہ عام سی بات ہو لیکن فائزہ کو اچانک ہی منیب احمد کی گھر سے دوری کھلنے لگی تھی۔

خالہ جان نے گھر میں نادیہ کو اکیلے تو کبھی نہ چھوڑا تھا...... لیکن اب تو وہ اعصابی مریضہ بنتی جارہی تھیں...... ذرا سی تیز آواز سے ان کا بلڈ پریشر لو ہونے لگتا۔ دنوں میں ان کی صحت گرنے لگی تھی۔ پھر ایک دن تو حد ہی ہوگئی...... جب وہ رکشے سے اتر کے آرہی تھیں...... کسی بے درد نے انہیں موبائل چھینتے ہوئے دھکا دے کے گرادیا...... وہ روڈ پہ بے ہوش پڑی تھیں...... حسنِ اتفاق کہ محلے کے کسی نوجوان نے ان کی مدد کی اور انہیں پہلے کلینک لے کر گیا...... اور پھر گھر والوں کو اطلاع دی۔

اس واقعے کے بعد ان کو بس ایک ہی رٹ لگی تھی...... کہ وہ نادیہ کی شادی بھی جلد از جلد کردیں اور منیب بھی ان کے پاس آجائے۔

''میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔'' وہ فائزہ کا ہاتھ پکڑ کر رو دیں۔

''آپ ایسے نہ سوچا کریں خالہ جان...... اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا......'' وہ اب اکثر ہی ان کے پاس چکر لگاتی رہتی۔

کل ہی کی بات ہے، جب وہ اپنے گھر میں نادیہ کے ساتھ کھانے کی تیاری کررہی تھیں تو...... اچانک ہی بلڈ پریشر لو ہوگیا، وہ بے ہوش ہوگئیں...... نادیہ کا فون آیا...... تو وہ امی کو لے کر ان کی طرف دوڑی۔

ان کی اس حالت کی وجہ سے دبئی میں منیب بھی پریشان رہنے لگا تھا...... وہ اکثر ہی امی سے کہتا۔ ''آپ انہیں سمجھائیں وہ تو پنج وقتہ نمازی خاتون ہیں، یہ ان کو کیا ہوتا جارہا ہے، مجھ سے بھی کہتی ہیں کہ یا تو اپنے پاس بلالو...... یا پھر واپس آجاؤ......'' وہ بھی متفکر تھا۔

وقت اپنی اسی رفتار سے گزر رہا تھا۔ موسموں اور سازشوں کو اپنے ساتھ ساتھ لیے ہوئے۔

☆☆☆

گھر میں اب شادی سے زیادہ خالہ جان کی اعصابی کیفیت پر بات ہونے لگی تھی...... آج بھی وہ سب ان ہی کے پاس تھے، سب ہی لائٹ موڈ میں بات کررہے تھے کہ اچانک لائٹ چلی گئی۔ دھماکا شدت کا تھا لیکن خالہ جان سے بیٹھا نہ گیا۔

''شہر میں کہیں بم گرا ہے...... کوئی بلڈنگ گرگئی ہے...... کچھ ہوا ہے ایسا...... تم لوگ اپنے گھر جاؤ...... ایسا نہ ہو کہ راستے بند ہوجائیں......'' وہ بولتی رہیں۔

اس دن کے بعد تو خالو جان بھی پریشان ہوگئے۔

تھے..... ان کو ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا..... سکون آور دوائیں کب تک ساتھ دیتیں..... آخر ان کے لیے سائیکاٹرسٹ سے بھی ٹائم لیا جانے لگا۔ کیونکہ وہ جب بھی گھبرا کے اٹھتیں۔ ایک ہی بات کرتیں۔

''کیا ہوا..... کسی کے ہاں ڈکیتی ہوئی ہے......؟''

دوسرا سوال بھی بس ایسا ہی ہوتا..... اور پھر ایسے ہی بیٹھے، بیٹھے منیب کو آوازیں دینے لگتیں۔

وضو کر کے نماز کے لیے کھڑی ہوتیں تو بھول جاتیں کہ فرض پڑھ رہی ہیں یا سنت..... ان کی طبیعت روز بروز بگڑتی جا رہی تھی..... نادیہ بھی گم صم رہنے لگی تھی..... وہ جو بے حد شوق سے نور جہاں آنٹی کے قصے سنتی ..... اب تو جیسے مسکرانا بھی بھولتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ امی کے ساتھ اسٹور میں تھی کہ مسلسل فون کی بیل ہوئی..... واٹس ایپ پہ اچانک ہی ایک عرصے بعد مونا کی کال آئی..... اور اسے جب پتا چلا کہ وہ بھی رخصت ہو کر دبئی آنے والی ہے تو وہ خوشی سے نہال ہی ہو گئی...... باتوں، باتوں کے دوران ہی اسے معلوم ہوا کہ مونا کا شوہر وقاص احمد اور منیب احمد..... آفس کولیگ ہیں۔ اکثر ہی تو منیب احمد جمعہ کی شام ان کے ساتھ ہی گزارتے ہیں اور پھر دبئی کی رونقیں..... وہاں کے مالز کے قصے وہ اکثر ہی مونا سے سنتی تھی۔

اسے بھی اچھا لگنے لگا تھا یہ سب، منیب احمد وہاں کیا کرتا ہے، کن لوگوں سے ملتا ہے اور بہت کچھ..... مونا سے اس کی کالج میں دوستی بھی بہت تھی۔ لیکن شادی کے بعد پہلے مستقل رخصت ہو کر گئی ...... پھر اچانک ہی غائب ہو گئی..... اسے کیا پتا تھا کہ وہ اب ملے گی تو وقاص احمد اسے بھابی کہیں گے۔ اکثر ہی اب مونا سے وقاص اور منیب کی تصویر اسے واٹس ایپ پہ موصول ہونے لگی تھیں۔

☆☆☆

آج کل امی نے پھر سے اس کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں..... خالہ جان کی حالت بھی پہلے سے بہتر تھی..... وہ اکثر ہی شام کو ان کے پاس چلی آتی...... وہ اسے دیکھ کے بے حد خوش ہوتی تھیں..... طبیعت بھی سنبھلنے لگی تھی لیکن ایک تبدیلی جو اسے بہت محسوس ہوتی تھی..... وہ جب ان کے پاس سے اٹھنے لگتی..... وہ اس کا ہاتھ بے حد مضبوطی سے تھام لیتیں..... ان کی آنکھوں سے آنسو رکتے ہی نہ تھے...... وہ گھر آ جاتی لیکن دل پہ بوجھ سا رہنے لگا تھا..... خالہ جان کی آنکھوں کے آنسو اسے اپنے دل پہ گرتے محسوس ہوتے تھے۔ وہ دیر تک نماز میں ان کے لیے دعا کرتی..... ان کی ہمت کے لیے..... ان کی اس مسکراہٹ کے لیے، جو اسے بچپن سے ہی اچھی لگتی تھی۔

وہ جب ان کے گھر آتیں تو وہ ان کو بات، بات پہ مسکراتے دیکھ کے خوش ہوتی..... اسے اپنی خالہ جان بالکل موتیا کے پھولوں جیسی لگتیں جو مسکراتیں تو فضا معطر ہو جاتی......... یہ محبت تھی، چاہت یا پھر عقیدت، اسے لگتا تھا کہ وہ مسکراتی ہیں تو روشنی ہو جاتی ہے..... منیب احمد بھی اسے اسی طرح مسکراتا اچھا لگتا تھا..... خالہ جان جیسا..... ان کی خالص محبت جیسا......

☆☆☆

مونا ہمیشہ کی طرح اسی شوخی سے کل کی پکنک کی کہانیاں سنا رہی تھی..... وہ سب دوست ان کی فیملی...... حتیٰ کے مقام پر گئے تھے، جو بہت مشہور پکنک پوائنٹ ہے، وہاں Hatta Dam، Hatta Haritage، جو عمان اور حتیٰ روڈ پر ہے۔ یہاں پہ Mountain Haiking Village اور نہ جانے کیا، کیا تھا..... سب نے خوب مزے کیے..... وہ رکتی تو وہ کوئی اور بات کرتی..... ساتھ ساتھ وہ بار، بار یہ بھی کہتی..... تم آؤ گی تو پھر اور بھی مزہ آئے گا...... یہاں پہ حرا اور طارق، سامعہ اور رحمان..... ان فیملیز سے تو میری بے حد دوستی ہے۔ ہم اکثر ان کے گھروں پر ون ڈش کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ مال بھی ساتھ جاتے ہیں...... بہت مزہ آتا ہے..... واٹس ایپ پر تصویریں بھی ساتھ، ساتھ بھیجتی چلی جاتی تھی۔

وہ ان تمام تصاویر میں صرف اور صرف منیب احمد کو ڈھونڈتی...... وہ بھی خاصے فریش ہوتے جا رہے تھے..... سب میں نمایاں نظر آتے اور وہ سوچتی کہ خالہ جان ان کے لیے کتنی فکر مند رہتی ہیں..... کیا ان کو وہ اتنی ہی یاد آتی ہوں گی..... عجیب سی اس سوچ میں اسے مونا کی آواز..... اجنبی لگنے لگتی..... اس کا جی چاہتا کہ وہ اس سے کہے کہ منیب احمد سے کہو..... وہ جو ہر جمعہ کو دو بجے فون کرتے ہیں..... اس کو بھول نہ جایا کریں کیونکہ خالہ کی بار، بار بے چینی کی کاش وہ ویڈیو بنا کے انہیں بھیج پاتی..... انتظار کے لمحے کتنے تکلیف دہ ہوتے ہیں......

یہ احساس اسے خالہ جان کو دیکھ کے سمجھ آیا تھا..... ورنہ تو اسے عجیب لگتا تھا کہ یہ جو بڑے، بزرگ لوگ ہوتے ہیں..... ہر کوئی، ہر کسی کو بس وقت کا احساس ہی دلاتا رہتا ہے..... جانے کیوں ہر گھر کی دیوار پر وال کلاک ضرور بجی رہتی ہے..... تجربے مشاہدے ہماری کس طرح تربیت کرتے ہیں..... وہ بھی سیکھ رہی تھی..... شاید یہی..... یا پھر کچھ اور بھی.....!

☆☆☆

منیب احمد کو شادی سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ وہ نئی ملازمت تلاش کرے، جہاں اس سے زیادہ تنخواہ ملے تاکہ وہ شادی کے بعد اپنی گھریلو ذمے داریوں کو سنبھال سکے..... یوں اس نے اس بار پھر پاکستان آنے کا ارادہ فی الحال ترک کر دیا..... خالہ جان کی طبیعت تو اس بات کو سن کر ہی پھر سے خراب ہونے لگی..... ڈاکٹر بھی سمجھاتے..... وہ سب بھی اپنی سی کوشش کرتے لیکن اب وہ ایک ہی بات کو کئی بار دہرانے لگی تھیں۔

نادیہ کا بھی ان دنوں رشتہ ہو گیا..... منیب احمد نے معذرت کرنی چاہی لیکن اس بار خالو جان نے سختی سے کہا تو وہ صرف دو دن کی رخصت پہ پاکستان آئے..... وقت اور حالات نے اسے بے حد پریکٹیکل کر دیا تھا..... اور شاید خوب صورت بھی، خالہ جان تو خوشی سے نہال ہوتی جا رہی تھیں..... ان کو زبردستی میڈیسن دینی پڑتی تھی...... ورنہ ان کا کہنا تھا۔

''ہمیں نہیں کھانی یہ نیلی پیلی دوا..... ہم کہاں بیمار ہیں.....'' سب ہی مسکرا دیتے۔

☆☆☆

نادیہ کی رخصتی کی شام تھی..... جب منیب احمد نے یہ دھماکا کیا، خالہ جان کے سامنے نہیں بلکہ امی جان کے قدموں میں بیٹھ کے..... ہاتھ جوڑتے ہوئے..... معافی مانگتے ہوئے..... وہ امی کے کپڑے استری کر کے، ان کے کمرے میں دینے ہی تو آ رہی تھی..... جب اس نے منیب احمد کی آواز سنی..... دل پہلے سہما پھر جیسے اس کی دھڑکنوں کی آواز کانوں میں محسوس ہونے لگی۔

''خالہ جان پلیز..... آپ امی کو سمجھا لیں گی ناں..... میں فائزہ سے، آپ سب سے معافی مانگنے کو تیار ہوں..... میں آپ سب کے ساتھ ہی بارات لے کے جانا چاہتا ہوں..... لیکن آپ سب کی رضا مندی سے..... مجھے اپنی آفس کولیگ پسند ہے..... وہ میرے ساتھ بہت مخلص ہے، ہماری اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے..... لیکن میں امی کی خواہش کے سامنے کچھ بول نہیں پایا..... کیونکہ میں پہلے دعا احمد علی کے والدین کے سامنے کچھ بن کے دکھانا چاہتا تھا......''

''منیب..... تمہیں اس وقت ہی مجھے بتانا چاہیے تھا جب تمہاری امی نے یہ فیصلہ کیا تھا..... کم از کم فائزہ کو یہ تکلیف تو نہ اٹھانی پڑتی..... چلو اب بھی کچھ نہیں بگڑا...... تم اپنے والدین کو منا لو..... ہماری فکر نہ کرو......'' امی کی آواز میں لرزش تھی..... مگر پھر بھی وہ بھانجے کو تسلی دے رہی تھیں۔

''آپ مان جائیں گی..... تو انہیں منانا آسان ہو گا..... پلیز خالہ جانی پلیز......'' وہ چھوٹے بچوں کی طرح ضدی ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی بات منوانے کے لیے صحیح راستہ ڈھونڈا تھا۔

اس کے قدم بھاری ہو رہے تھے..... وہ شاید مزید کھڑی نہ رہ سکتی تھی...... بڑی مشکل سے واپس اپنے کمرے تک آئی..... بہت دیر تک واش بیسن پہ کھڑی آنسوؤں سے چہرہ دھوتی رہی اور پھر اس نے وضو کیا، جائے نماز پہ کھڑے ہو کر نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد.....

اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی اپنے صبر کی، اپنے بھرم کی......!

دعا کی طاقت کا اندازہ بھی آپ کو تکلیف کے وقت ہی ہوتا ہے...... اس نے جائے نماز کو تہ کیا اور پُرسکون سے انداز میں نادیہ کی رخصتی میں جانے کی تیاری کرنے لگی...... وہ مسکرا کے درد کو شکست دینے کا ہنر سیکھنے کے لیے اپنے رب کی بارگاہ میں اپنا پہلا درد اور پہلی تکلیف ڈال کے مطمئن ہو چکی تھی...... اسے یقین تھا کہ سب بہتر ہونے والا ہے، وہ رب کریم اتنا ہی آزمائے گا، جتنا اس میں سہنے کی تاب ہے...... اسے اپنی خالہ جانی کو بھی تو سب کے سامنے شرمندگی سے بچانا تھا۔

☆☆☆

نادیہ اپنے گھر آنگن رخصت ہو چکی تھی...... اور وہ بم جو خالہ جانی کو کئی مہینوں سے دنیا کی دہشت گردی محسوس ہو رہا تھا...... آج سمجھ آیا ہوگا...... شاید امی جان انہیں بہتر طریقے سے سمجھاتیں...... لیکن منیب احمد کو دعا کو پانے کی اتنی جلدی تھی کہ وہ جاتے، جاتے خالو جان کو بھی بتا گیا۔

منیب احمد کے جانے کے پورے چار دن کے بعد...... جب امی جان نے اسے اطلاع دی تو اس نے مسکرا کے کہا......

''کیا ہوا امی جان...... ایہ بات جب پریشانی کی ہوتی...... جب پردیس میں، میں اکیلی ہوتی...... منگنی کا بندھن کوئی ایسی مجبوری بھی نہیں ہے...... منیب احمد کو یہ حق تو ہمارے مذہب نے بھی دیا ہے...... اچھی بات یہ ہے کہ ہمیں پہلے انہوں نے خود بتا دیا...... مجھے تو سچ پوچھیں...... ویسے بھی اپنا ملک اور آپ سب سے دور رہنے کا تصور ہی ہولائے دے رہا تھا...... خالہ جانی کو بھی سمجھا دیجیے گا...... تاکہ وہ ہنسی خوشی منیب احمد کی بارات لے کے جائیں...... میرا بھی فیصلہ سنا دیجیے گا...... مجھے پاکستان میں ہی رہنا ہے...... آپ سب کے ساتھ...... ہر وقت آپ کی ایک آواز پہ آپ کے قریب...... جی امی!......'' وہ مسکرائی۔

تقدیر کے فیصلے، ہمارے لیے زیادہ بہتر ہوتے ہیں...... نادیہ کی شادی کے فوراً بعد ہی، برابر والے گھر سے ہی اس کا رشتہ آ گیا...... اور پھر چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کا محاورہ اسی پہ صادق آیا...... سمیر علی ایک بہت اچھے شوہر ثابت ہوئے...... ان کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ انہوں نے میڈیکل کے بعد ملک سے باہر جانے کے بجائے یہیں اپنے ملک، اپنے شہر، اپنے والدین کے پاس رہنے کو ترجیح دی...... یہ ہی تو اس کی بھی خواہش تھی...... چاہ بھی اور شاید فیصلہ بھی۔

☆☆☆

مونا حسبِ روایت پھر سے غائب ہو چکی تھی اور آج بڑے دنوں بعد جب اس کا فون آیا تو اس نے برسوں پرانا...... مس رحمان والا جملہ دُہرایا۔

''تم بہت جلد باز ہو، بہت ہی...... تمہیں منیب بھائی کو چھوڑنا نہیں چاہیے تھا......'' وہ بولتی رہی...... وہ سنتی رہی۔

اسے بتایا ہی یہ گیا تھا کہ فائزہ فاروقی نے خود منگنی توڑ دی تھی......'' وہ مونا کا یہ جملہ سن کے شاید پتھر کی ہی ہو گئی تھی۔

وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی، یہ بھی نہیں کہ وہ میرا خالہ زاد، میرا بچپن کا سنگی ساتھی...... جس کے نام کی انگوٹھی وہ دن میں کئی بار دیکھا کرتی تھی...... اس انگوٹھی کے بعد اس نے کبھی اس رنگ کا نگینہ نہ پہنا...... نہ اس رنگ کا سوٹ...... وہ اس کی کسی بات پہ بھی اسے بددعا بھی نہ دے سکتی تھی لیکن منیب احمد نے خود کو محفلوں میں باوقار رکھنے کے لیے جھوٹ بولا...... وہ بھی ایسا جھوٹ جو اس کی روح کو زخمی کر رہا تھا...... لیکن آج پھر اس نے خود کو سمجھایا...... وضو کیا...... سجدے میں سر جھکایا...... روح کو سکون، دل کو قرار آتا گیا...... بالکل اسی طرح...... جس طرح اس روز اس کے رب نے اس پہ مہربانی کی تھی، اس کا بھرم رکھا تھا...... مٹی کے انسان کے غرور پہ، اشرف المخلوقات ہونے کا فرق سمجھایا تھا...... حسنِ سلوک کا درس دیا تھا...... بے حد سچائی سے راز کو راز ہی رکھنے کا ہنر دیا تھا۔

حذر

اسما قادری



''تیزاب اور اساس کو آپس میں ملائیں تو تعامل کے نتیجے میں نمک اور پانی بنتا ہے۔''

''ویر میرا گھوڑی چڑھیا گھوڑی چڑھیانی سیّو گھوڑی چڑھیا۔''

''خوردنی نمک اور پانی کے تعامل سے شورے کا تیزاب اور اساس حاصل ہوتے ہیں۔''

''چھوٹے، چھوٹے بھائیوں کے بڑے بھیا، آج بنے ہیں کسی کے سیّاں۔''

''کھانے کے سوڈے اور پانی کو آپس میں ملانے سے اساس اور کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس تیار ہوتی ہے۔''

''اے خدا شکر تیرا، شکر تیرا کہ میرا یار چلا باندھ کے سر پہ سہرا۔''

''نیلے لٹمس پیپر کو تیزاب میں ڈبونے سے وہ سرخ ہو جاتا ہے۔ نہیں، نہیں سرخ لٹمس پیپر تیزاب میں ڈبوئے جانے پر نیلا ہو جاتا ہے۔ نہیں، شاید سرخ لٹمس پیپر اساس میں ڈبونے پر نیلا ہو جاتا ہے۔'' بہ آواز بلند اپنے کیمسٹری کے پرچے کی تیاری کرتا تیرہ سالہ سہیل آخر کار گڑبڑا ہی گیا اور دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ لیکن کان بند کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا کہ فل آواز میں چلتے ڈیک کی آوازیں اب بھی پوری قوت سے اس کی سماعت تک پہنچ رہی تھیں۔

''آج میرے یار کی شادی ہے، یار کی شادی ہے، میرے دلدار کی شادی ہے۔''

سارے تیزاب، اساس اور نمکیات اس کے دماغ میں گڈمڈ ہو چکے تھے اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ کل ہونے والے پرچے میں کیمیائی عناصر کے خواص کے بجائے شادی بیاہ کے گیت لکھ کر آ جائے گا۔

''کیا ہوا بیٹا! ایسے کیوں بیٹھے ہو؟'' سہیل کی ماں اسے دودھ کا گلاس دینے آئی تو اسے یوں بیٹھا دیکھ کر چونک گئی۔

''مجھے کچھ یاد نہیں ہو رہا امی...... اتنی تیز آواز میں گانے چل رہے ہیں کہ سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہوئے جا رہا ہے۔'' تیرہ سالہ سہیل کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔ وہ اوسط درجے کا طالب علم تھا اور پہلی بار بورڈ کے پیپر دینے جا رہا تھا اس لیے تھوڑا گھبرایا ہوا بھی تھا ایسے میں چوہدری صاحب کے بیٹے کی شادی اس کے لیے بڑی آزمائش بن گئی تھی۔

''کیا کروں بیٹا، تمہیں معلوم تو ہے کہ میں کل چوہدری صاحب کے گھر بات کرنے گئی تھی اور ان سے درخواست کی تھی کہ میرا بیٹا نویں جماعت کے بورڈ کے پرچوں کی تیاری کر رہا ہے، آپ کے تیز آواز میں گانے چلانے سے اس کی پڑھائی خراب ہوتی ہے لیکن اُدھر کسی نے کان ہی نہیں دھرے، چوہدری صاحب کی بڑی بیٹی ہنس کر بولی۔

''چاچی ہمارا اکو... ایک تو ویر ہے، اس کے بیاہ پر ہم اپنے سارے ارمان نکالیں گے تو اپنے پتر سے کہہ تھوڑی بوٹیاں، شوٹیاں ہٹا کر لے جائے پرچے کے لیے پاس ہو جائے گا۔'' سہیل کی ماں اس سے بھی زیادہ بے بس تھی۔

چوہدری صاحب اس محلے کے سب سے زیادہ صاحب حیثیت آدمی تھے اور اس محلے کی معمولی حیثیت کے افراد کے مقابلے میں کافی پہنچ والے بھی تھے۔ ان کے دو منزلہ گھر میں دن رات دو، دو اسپلٹ چلتے رہتے۔ پورے گھر کی بتیاں پورے طمطراق سے روشن رہتیں۔ بورنگ کی موٹر پانی کھینچتی رہتی اور بجلی کا بل چند سو سے زیادہ نہ آتا۔ وہ پورے دھڑلے سے کنڈے کی بجلی استعمال کرتے رہتے نہ تو کبھی ان کے گھر چھاپا پڑتا اور نہ ہی بل کے ساتھ بھاری جرمانہ لگ کر آتا۔ بات صاف ظاہر تھی انہوں نے میٹر ریڈر سے لے کر دیگر متعلقہ افراد تک سب سے بنا کر رکھی ہوئی تھی اور مزے کر رہے تھے۔ علاقہ کونسلر تھانیدار اور یونٹ انچارج سب ان کے دوستوں میں شامل تھے ایسے میں اہلِ محلہ ان سے دبتے نہ تو اور کیا کرتے اور پھر چوہدری صاحب اہلِ محلہ پر بھی بڑے مہربان تھے۔ پانی نہ آتا تو دن بھر ان کی بورنگ کی موٹر چلتی رہتی اور اہلِ محلہ پائپ لگا، لگا کر اپنے گھروں میں پانی بھرتے رہتے انہوں نے کبھی کسی کو پانی کے لیے نہ نہیں کہا۔ کسی کے گھر کا گٹر بھر جاتا تو چوہدری صاحب کی سفارش سے کے ایم سی کے دفتر میں جانے والی اس کی درخواست پر فوراً ایکشن لیا جاتا اور کونسلر صاحب صفائی کے لیے جمعداروں کو دوڑا دیتے۔ علاقے کے تھانے کا رشوت خور تھانیدار چوہدری صاحب کے ساتھ جا کر ایف آئی آر کٹوانے والوں کو خصوصی رعایت عطا کرتا۔ محلے کی غریب بچیوں

کی شادی بیاہ کے موقع پر چوہدری صاحب دل کھول کر تحفے تحائف دیتے تو ایسے تھے چوہدری صاحب اور اب ان ہی چوہدری صاحب کے اکلوتے فرزند کی شادی تھی تو ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔

تین بیٹیوں سے فارغ ہونے کے بعد چوہدری صاحب اب اپنے اکلوتے بیٹے کو بیاہنے چلے تھے تو ان کی شان ہی الگ تھی۔ پندرہ دن پہلے سے ہی دھوم دھڑ کا شروع ہو گیا تھا۔ دن رات ڈیک پر شادی بیاہ کے گانے بجتے رہتے تھے۔ دور دراز علاقے سے آئے ہوئے ان کے مہمانوں نے الگ رونق میلا لگا رکھا تھا۔ رات، رات بھر ان کے گھر سے ناچنے گانے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ گھر کے سامنے دونوں طرف قناعتیں لگا کر انہوں نے راستہ بند کر دیا تھا اور اب ان کے گھر کے سامنے سے گزر کر کوئی گلی پار نہیں کر سکتا تھا۔ محلے داروں کو زحمت تو ہو رہی تھی لیکن چوہدری صاحب کی مروت میں سب سہہ رہے تھے۔ ان دو قناعتوں کے بیچ چوہدری صاحب نے مستقلاً باورچی بٹھا رکھا تھا جو ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک انواع و اقسام کے کھانے تیار کرتا رہتا تھا۔ ان کھانوں سے چوہدری صاحب کے ہاں ٹھہرے ہوئے مہمان تو مستفید ہوتے ہی تھے محلے والوں کے بھی مزے تھے۔ کھانے کے وقت محلے کی جتنی بھی عورتیں اور بچے چوہدری صاحب کے گھر میں موجود ہوتے سب کو بہ اصرار دسترخوان پر بٹھا لیا جاتا۔ یار باش چوہدری صاحب جو اکثر گلی کے نکڑ پر مردوں کے ساتھ محفل جما کر بیٹھ جاتے تھے کھانے کا وقت ہونے پر گھر کا رخ کرتے تو سارے یارانِ محفل بھی ان کے ساتھ ہوتے۔ مہمان بن کر گھر پر ٹھہرے ہوئے برادری کے لوگوں کو ایک وقت کا پکا کھانا دوسرے وقت کھلانا خلافِ شان تھا اس لیے بچا ہوا کھانا ٹرے بھر، بھر کر آس پاس کے گھروں میں بھیج دیا جاتا۔ مایوں، مہندی، رتجگے سے لے کر شادی، ولیمہ کی تقریبات تک تو سارے اہلِ محلہ مدعو تھے ہی سو خوب رج کر دعوتیں اڑا رہے تھے ایسے میں چوہدری صاحب کے بیٹے کی... پُرہنگامہ شادی میں محلے کے جن افراد کو انفرادی زحمتیں اٹھانی پڑ رہی تھیں ان کے خلاف کون صدائے احتجاج بلند کرتا کوئی ہلکی پھلکی سی کوشش کرتا بھی تھا تو اسے چوہدری صاحب اور ان کے اہلِ خانہ چٹکیوں میں اڑا دیتے تھے جیسا کہ سہیل کی ماں کی درخواست کو بڑی بے اعتنائی سے رد کر دیا گیا تھا۔

اسی محلے میں ایک خاندان واجد علی کا بھی تھا۔ واجد علی کا باپ دمے کا مریض تھا۔ بیچارے کے دن رات کا بیشتر حصہ اپنی چارپائی پر پڑے کھانس، کھانس کر گزرتا تھا اور مشکل سے دو چار گھنٹوں کے لیے نیند آ پاتی تھی۔ اس مشکل سے آنے والی نیند کے لیے بھی چوہدری صاحب کے بیٹے کی شادی مصیبت بن گئی اِدھر بوڑھے کی آنکھ لگتی اُدھر چوہدری صاحب کے گھر کی چھت پر نصب ڈیک سے تان اٹھتی۔

''چلو ہم آئے دولہا بھیا کے باراتی بن کے۔''

دولھے بھیا کے باراتی تو ناچ، ناچ کر جشن مناتے رہتے اور بوڑھے کا کھانس، کھانس کر یہ حال ہو جاتا کہ دم الٹنے کو آ جاتا۔ واجد علی نے باپ کی مشکل دیکھ کر چوہدری صاحب سے مؤدبانہ عرض کی کہ کم از کم رات کے وقت بلند آواز میں ریکارڈنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا جائے تو اس کا بوڑھا بیمار باپ چند گھنٹے سکھ کی نیند لے لیا کرے۔ چوہدری صاحب نے اس کا مدعا سن کر قہقہہ لگایا اور بولے۔

''پیو کی بیماری سے نہ گھبرا پتر، اس کی کھانسی تو زندگی کا ساز ہے۔ میں تو جب سے اس محلے میں آیا ہوں ایسے ہی اسے منجی پر پڑا کھانستا ہوا دیکھ رہا ہوں جس دن وہ نہیں کھانسے گا اس کی سانس کی ڈور بھی ٹوٹ جائے گی۔ تو اسے ایسے ہی کھانس، کھانس کر جینے دے اور میرے پتر کے ویاہ کا جشن خراب نہ کر۔ روز، روز یہ ہنگامے تھوڑی ہوتے ہیں، تھوڑے دن کی گل ہے میری خوشی میں خوش ہونے والوں کو ہلا گلا کرنے دے۔'' اپنے آخری جملے میں انہوں نے

جتادیا کہ ان کے گھر جاری ہنگامے پر وہی لوگ معترض ہوسکتے ہیں جو ان کی خوشی میں خوش نہیں تھے۔

واجد علی کو غصہ تو بہت آیا لیکن چوہدری صاحب سے جھگڑا ابھی نہیں کرسکتا تھا۔ بحث ومباحثے سے بات بڑھنے کا اندیشہ تھا۔ بات بڑھتی تو اس کا نوجوان بیٹا جو ذرا تیز طبیعت کا مالک تھا خود بخود اس معاملے میں ملوث ہوجاتا۔ ادھر چوہدری صاحب کی پوری برادری جمع تھی ایسے میں نقصان سراسر خود اسے اٹھانا پڑتا۔ اس لیے صبر کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ گھر والوں کو بھی یہ کہہ کر خاموش کروادیا کہ دو چار دن کی بات ہے کرنے دو چوہدری صاحب اور ان کے گھر والوں کو ہلا گلا......

جس دن بارات نکلنا تھی اس دن تو یہ ہنگامہ عروج پر پہنچ گیا۔ اتنی آتش بازی کی گئی کہ دور تک آسمان رنگ د نور میں نہا گیا۔ منٹ، منٹ پر چھوڑے جانے والے پٹاخوں نے لوگوں کو کانوں میں انگلیاں دینے پر مجبور کردیا۔ اور ہوائی فائرنگ کے شور سے دل دہلنے لگے۔ علاقے کا تھانیدار خود سفاری سوٹ چڑھائے چوہدری صاحب کے ساتھ کھڑا تھا۔ پھر بھلا کون تھا جو اس ہنگامے کو رکواتا، مائیں اپنے ڈر جانے والے بچوں کو سینے سے لگا کر بہلاتی رہیں۔ بورڈ کے پرچوں کی تیاری میں مصروف سہیل کانوں میں ائر پلگ لگا کر بیٹھنے کے باوجود ڈسٹرب ہوتا رہا۔ واجد علی کو اپنے باپ کو... ایمرجنسی میں اسپتال لے کر بھاگنا پڑا اور یوں چوہدری صاحب کے بیٹے کی بارات پورے طمطراق اور باجوں' گاجوں کے ساتھ روانہ ہوئی۔ دلہن کو رخصت کروا کر لانے کے بعد بھی دیر تک اسی طرح کا سلسلہ چلتا رہا اور پوری رات ناچنے گانے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ باقاعدہ خسرے منگوا کر انہیں گھنٹوں نچوایا گیا اور چوہدری صاحب کی برادری کے مرد موج مستی کرتے رہے۔ ولیمے کی تقریب نمٹی تو اللہ، اللہ کر کے محلے والوں کو سکون کی سانس نصیب ہوئی۔

یہ اور بات کہ سہیل کے نویں جماعت کے پرچے زیادہ اچھے نہیں ہوسکے اور واجد علی کا باپ ولیمے کے دوسرے دن دم توڑ گیا۔ اس کی میت پر کڑوی روٹی کا انتظام چوہدری صاحب کی طرف سے ہی کیا گیا اور لوگ ان کی فیاضی کے گُن گاتے رہے کہ جیسا انہوں نے اپنی خوشی میں دل کھول کر لٹایا ویسے ہی دوسروں کی غمی میں بھی حصہ ڈالنے سے نہ چوکے' واجد علی نے باپ کی موت کو اللہ کی رضا جان کر قبول کرلیا اور دل میں جو ایک پھانس سی چبھی تھی اس کا کسی سے ذکر کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا جو ہونا تھا ہوچکا تھا کچھ کہنے سے الٹا مسائل بڑھتے اور چوہدری صاحب کی شان وشوکت کے متاثرین اس کے خلاف ان کے کان بھرنا شروع کردیتے سو خاموشی ہی بہتر تھی۔

☆☆☆

وقت کا کام گزرنا ہے دن' ہفتے اور ہفتے، مہینوں میں تبدیل ہوتے پتا بھی نہیں چلتے۔ چوہدری صاحب کے بیٹے کی شادی کو بھی مہینوں گزر گئے۔ نئے دولہا' دلہن کی دعوتوں کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا اور خوشخبری بھی سننے کو مل گئی کہ خیر سے دلہن بیگم کا پاؤں بھاری ہے۔ اس خبر کے چوہدری صاحب کے گھر سے نکلتے ہی محلے والوں کو انتظار سا لگ گیا کہ جن چوہدری صاحب نے اکلوتے بیٹے کی شادی پر یوں دل کھول کر لٹایا تھا دیکھو وہ پہلے پوتے یا پوتی کی آمد پر کیسا جشن مناتے ہیں، یہ جشن تو اپنے وقت پر ہی منایا جاتا، اس سے قبل نئے سال کی آمد کا غلغلہ اٹھ گیا۔

نیویارک کے ٹائمز اسکوائر سے لے کر سڈنی تک اس موقع پر جو ہنگامہ بپا کیا جاتا ہے ٹی وی کی اسکرین پر سب ہی دیکھتے ہیں اور کئی سالوں سے وطنِ عزیز میں بھی اغیار کی طرز پر اس موقع پر موج مستی کرنے کی ہوا چل پڑی ہے۔ چوہدری صاحب کے نو بیاہتا بیٹے اور بہو کو بھی اس ہوا نے چھولیا اور اکتیس دسمبر کی رات دونوں شہر کی رونقیں "انجوائے" کرنے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

پابندی کے باوجود سی ویو کا رخ کرنے والے منچلوں کی کمی نہیں تھی۔ ان دونوں میاں بیوی نے بھی وہیں کا رخ کیا۔ وہاں بڑا ہنگامہ تھا، دونوں اس ہنگامے سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ٹھیک بارہ بجے آتش بازی اور فائرنگ کا سلسلہ چھڑ گیا لیکن عین موقع پر پولیس کی آمد نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ پولیس کے لاٹھی چارج پر مظاہرین گھبرا کر منتشر ہونے لگے لیکن چند جی دار منچلوں کی طرف سے آتش بازی اور فائرنگ کا سلسلہ نہ رکا۔ گھبرا کر راہِ فرار اختیار کرنے والوں میں چوہدری صاحب کا بیٹا اور بہو بھی شامل تھے۔ وہ دونوں بائیک پر تھے اور بائیک پر بیٹھ کر واپسی کے لیے روانہ ہوچکے تھے کہ جانے کہاں سے دو اندھی گولیاں آگئیں۔ ایک گولی نو بیاہتا لڑکی کے سر میں لگی اور وہ دوسری سانس بھی نہ لے سکی۔ دوسری گولی چوہدری صاحب کے بیٹے کی کمر میں لگی اور بائیک پر سے اس کا کنٹرول ختم ہوگیا۔ بائیک ایک سمت میں اور اس کا تڑپتا ہوا جسم دوسری سمت میں جاگرا۔ سارے ہنگامے یک لخت ختم ہوگئے اور بہتے ہوئے خون کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

☆☆☆

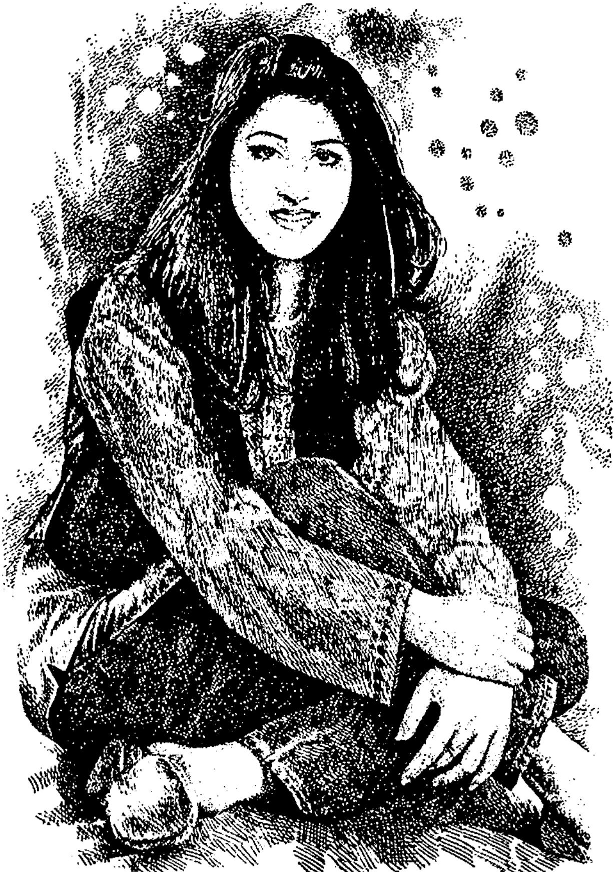
چوہدری صاحب کے خاندان پر گزرے سانحے کو جس نے سنا افسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔ دکھ کا اظہار کرتے ہوئے ہر ایک کی زبان پر ان کے بیٹے کی دھوم دھام سے کی گئی شادی کا قصہ ضرور آتا۔ کہنے والوں نے یہاں تک بھی کہا کہ چوہدری صاحب کی خوشیوں کو حاسدوں کی نظر کھا گئی۔ کوئی معمولی سانحہ تو پیش نہیں آیا تھا۔ چوہدری صاحب کی جوان حاملہ بہو اپنی جان سے چلی گئی تھی اور اکلوتے بیٹے کی حالت مُردوں سے بھی بدتر تھی۔ اس کے جسم سے گولی نکال کر اس کی جان تو بچالی گئی تھی لیکن چلتی ہوئی بائیک سے گرنے پر ہاتھ پیروں کی ہڈیاں ٹوٹنے کے علاوہ ریڑھ کی ہڈی پر ایسی مہلک چوٹ لگی تھی کہ اس کا سارا جسم مفلوج ہوگیا تھا اور وہ نیم مُردہ سی حالت میں بستر پر پڑا ماں، باپ اور بہنوں کو خون کے آنسو رُلاتا تھا۔

دکھی اپنے پرائے سب ہی تھے سو وقتاً فوقتاً

چوہدری صاحب کا غم بٹانے ان کے پاس جاتے رہتے تھے۔ اس دن بھی واجد علی اور سہیل کا باپ ان سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ بات کرتے، کرتے چوہدری صاحب نے ایک سرد آہ بھری اور بڑے غمگین لہجے میں بولے۔

"اللہ کی لعنت ہو ان لوگوں پر جو فرنگیوں کی نقل میں حد سے گزر جاتے ہیں۔ نیا سال تو ہر بارہ مہینے بعد آتا ہی رہتا ہے اس کے لیے بھلا اتنا ہنگامہ مچانے کی کیا ضرورت ہے۔ خوشی منانی بھی ہے تو ایک حد میں رہ کر مناؤ۔ اپنی خوشی میں حد سے گزر جانے والے دوسروں کے نقصان کا نہیں سوچتے۔ ہائے میرا اکلوتا ایک پتر، میرا جوان شیر کیسا منجی پر آگیا ہے۔ اسے اس حالت میں دیکھتا ہوں تو میرا کلیجا منہ کو آتا ہے۔ خدا غارت کرے اپنے پلے گلے میں حد سے گزر جانے والوں کو۔" چوہدری صاحب غم سے نڈھال دہائیاں دے رہے تھے اور واجد علی اور سہیل کا باپ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔

واجد علی کو وہ لمحہ یاد آگیا تھا جب کھانس، کھانس کر نڈھال ہوئے اس کے باپ نے آنکھیں پھیر لی تھیں اور چوہدری صاحب کو اپنے بیٹے کی بارات کی روانگی کے وقت بپا ہنگامے میں مگن اس کی بے بسی کا اندازہ بھی نہیں ہوسکا تھا۔ دوسری طرف تیرہ سالہ سہیل کیمسٹری کے پرچے میں فیل ہوگیا تھا۔ باقی پرچوں میں بھی وہ زیادہ قابلِ ذکر نمبر حاصل نہیں کرسکا تھا اور اس کے ماں، باپ کو مسلسل اس کے مستقبل کی فکر دامن گیر تھی، یہ سب اپنی خوشی میں حد سے گزر جانے والے ان چوہدری صاحب کی وجہ سے ہوا تھا جو آج اپنی بربادی پر دوسرے حد سے گزر جانے والوں کو... بددعائیں دے رہے تھے۔ اب بھلا انہیں کون بتاتا کہ حد کیا ہے اور حد سے گزر جانا کیا ہوتا ہے کیونکہ یہاں تو ہم میں سے ہر ایک نے اپنی، اپنی مرضی کی حدود بنا رکھی ہیں اور کسی کو یاد نہیں کہ اللہ نے کس معاملے میں کیا حد مقرر کر رکھی ہے۔





ناولٹ

دوسرا حصہ

محبت لفظ ہے لیکن.......

”ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کے بولا کرو کیونکہ کبھی کبھی ان کے
سامنے بولا گیا کوئی بھی برا یا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔“

خوب صورت جذبوں کی باریکیاں بیان کرتی حیا بخاری کی ایک دل نشیں تحریر

”کہاں تھے تم دونوں؟“ گھر جلدی پہنچنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود انہیں واپسی پہ شام ہوگئی تھی۔ اور حسب توقع زرینہ بیگم ان کے استقبال کے لیے دروازے پر ہی موجود تھیں۔

”آپ کو بتا کر تو گئے تھے۔“ حمزہ بائیک اندر لا کر جامن کے درخت کے نیچے کھڑی کرتے ہوئے بولا۔ اقرا البتہ خاموشی سے اندر چلی گئی تھی۔ وہ بھی اندر آگیا۔ زرینہ اس کے پیچھے تھیں۔

’’یہ نہیں بتایا تھا کہ تم لوگ نالو کے گھر بھی جاؤ گے؟‘‘ حمزہ کے بڑھتے قدم رک گئے تھے۔ وہ مڑا۔
’’آپ کو کس نے بتایا؟‘‘ اس کی تیز نظریں ماں پر جمی تھیں۔
’’تم جانتے ہو رضیہ میری پرانی دوست ہے۔‘‘ وہ نظریں چراتے ہوئے سبین کی پڑوسن کا نام لیتے ہوئے بولیں۔ حمزہ کی آنکھوں میں بے یقینی سی دوڑ گئی۔
’’امی..... آپ..... اوہ مائی گاڈ!‘‘ بے بسی سے وہ سر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر وہیں صوفے پر ڈھے گیا۔
’’ہاں تو کیوں جاتے ہو وہاں.....؟‘‘ زرینہ بھلا کب ہار ماننے والی تھیں۔
’’تو کیا فرق پڑتا ہے امی..... وہ ہماری نانی کا گھر ہے، ہمارے سگے ماموں کا گھر ہے۔‘‘ وہ غصے سے چلا اٹھا تھا۔
’’فرق پڑتا ہے حمزہ.....‘‘ انہوں نے بھی آواز دھیمی نہ کی تھی۔
’’میں نہیں چاہتی کہ اماں کی طرح مجھے بھی کسی ان چاہی بہو کو قبول کرنا پڑے۔‘‘ ان کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔
’’یہ صرف آپ کی سوچ ہے امی..... ورنہ نالو سبین مامی سے بے حد محبت کرتی ہیں۔‘‘ اس نے اٹھ کر ماں کو کندھوں سے تھام لیا۔
’’یہی تو جادو آتا ہے ان ماں، بیٹی کو..... اماں کو بس میں کر رکھا ہے انہوں نے۔‘‘ وہ فوراً ہی اپنی بات سے مکر گئی تھیں۔ حمزہ تاسف سے انہیں دیکھے گیا۔
’’اور پھر وہ لالہ اُف چلتی پھرتی آفت ہے۔ اگر اس کا جادو تم پر چل گیا ناں تو گئی میں کام سے۔‘‘ انہوں نے ہاتھ جھاڑے۔
’’وہ ایسی بالکل بھی نہیں ہے۔‘‘ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
’’اوہو..... ہمدردی ہونے لگی ہے..... ارے جتنی معصوم وہ دکھتی ہے ناں، ویسی ہے ہی نہیں، اپنا معاملہ خود نہ سیٹ کر لے تو نام بدل دینا۔‘‘
’’امی..... پلیز.....‘‘ تیز لہجے میں ٹوکتا وہ کمرے میں گھس گیا۔ البتہ دروازہ زور سے بند کرنا نہ بھولا تھا۔ زرینہ منہ بنا کر رہ گئیں۔
’’توبہ کریں امی..... لالہ ایسی بالکل بھی نہیں ہیں۔ بلکہ ہمارے جانے پہ تو کمرے سے باہر بھی نہیں نکلتیں.....‘‘ اقرا نے فریج سے سیب نکال کر دانتوں سے کترتے ہوئے کہا تو وہ مزید چڑ گئیں۔
’’یہی تو ادائیں ہیں بی بی! کہ تم لوگ اس کا نوٹس لو..... سب حمزہ کو اپنی طرف راغب کرنے کے انداز..... ہائے، ہائے۔‘‘ وہ اپنے دونوں ہاتھ مسلنے لگیں۔ ’’کہیں میرے سینے پہ مونگ دلنے کے لیے بیٹھی نہ رہ جائے۔‘‘ ان کو فکر ستائی۔ سیب کھاتی اقرا نے برا سا منہ بنایا۔
’’اور تم کیا یہ ہر وقت ٹھونستی رہتی ہو۔‘‘ ان کی نظر اقرا پر پڑ چکی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اللہ سے مدد مانگی تھی۔ امی اب اس کے پیچھے پڑ چکی تھیں۔
’’کچھ اس منحوس سے ہی سیکھ لے..... کچھ حلیہ ہی درست کر لیا کر۔‘‘ ان کو فکر لاحق ہوئی۔
’’اور ہاں یہ ہر وقت بھائی، بھائی کہہ کر شاویز سے نہ لپٹ جایا کر۔ ایک دفعہ اس کے دل میں بہن کی صورت چڑھ آگئی ناں تو ساری عمر بہن بنی رہ جائے گی۔ شاویز سے اچھا لڑکا بھلا کہاں ملے گا۔ کچھ فاصلہ رکھا کر..... تاکہ تیرے اس کترانے کے بارے میں سوچے.....‘‘ زرینہ نہ جانے کیا، کیا کہے جا رہی تھیں۔ اقرا کانوں کو ہاتھ لگائے گئی اور حمزہ دل ہی دل میں ماں کی دوغلی شخصیت سے متنفر سا ہوا تھا۔

☆☆☆

سکندر، اپنی بیٹی امن کے ساتھ مل کر ایک ساتھ دو تین بزنس چلا رہے تھے..... وہ زیادہ تر آفس کا کام دیکھتے۔ سائٹ کا تقریباً سارا کام امن کے ذمے تھا..... اسے سائٹ پہ ورکرز سے کام کروانے، صحیح مشینری کا انتخاب کرنے اور کم وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے میں کمال مہارت حاصل تھی۔
تمام نئے اسپلائرز میں سے قابل لوگ اس نے اپنے ساتھ رکھ لیے تھے۔ جن میں باریال ولی خان کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ باریال نہ صرف یہ کہ بے حد

ذہین تھا بلکہ اپنے کام کے ساتھ بے حد مخلص بھی..... امن کے ساتھ، ساتھ سکندر صاحب نے بھی نوٹ کیا تھا کہ وہ وقت کی پروا کیے بغیر اپنے کام میں مگن رہتا، ڈیزائننگ اور انٹیریئر میں اس کا ذہن کمال کا تھا۔ کسی بھی عمارت کی کنسٹرکشن یا ڈیکوریشن میں درپیش کوئی بھی مسئلہ وہ چٹکیوں میں حل کر لیتا..... بہت جلد اس نے سکندر اور امن کی نگاہوں میں ایک خاص مقام بنا لیا تھا۔ امن کے ساتھ تو اس کی اچھی خاصی فرینڈشپ ہو چکی تھی۔ اور ان دونوں کے درمیان باس اور ورکر کا رشتہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ امن ہمیشہ اسے ایک دوست کی طرح ٹریٹ کرتی..... اور آفس سے ہٹ کر اس کی نجی زندگی میں بھی دلچسپی لینے لگی تھی۔
آفس ٹائم کے دوران ہی ایک مرتبہ باریال کو ایمرجنسی میں گھر جانا پڑ گیا تھا کہ دیدے کی طبیعت بے حد خراب ہو گئی تھی۔ تب امن نہ صرف خود اسے گھر لے گئی۔ بلکہ دیدے کو اسپتال بھی پہنچانے میں مدد کی۔ اور جب تک ان کی طبیعت سنبھل نہ گئی، وہ سایہ بن کر باریال کے ساتھ رہی۔ اس واقعے نے امن کی قدر باریال کے دل میں اور بھی بڑھا دی تھی۔ وہ احسان مند تھا اور امن..... وہ جس طرح سے اپنے اور باریال کے تعلق کو سوچنے لگی تھی۔ باریال کو اس کا شائبہ تک نہیں تھا۔

☆☆☆

’’یہ کہاں کی دوستی ہوئی؟ اپنے ٹائم تو ہمیں ساتھ لے کے گھومتا پھرے اور جب ایسی موج آئے ہاتھ تو ٹھنڈا مار دے۔‘‘ زید نے باہر آتے ہی ضیا کو گالی سے نوازا تھا۔ اس نے گلی میں پڑے ایک پتھر کو زوردار ٹھوکر رسید کی۔ پتھر اڑتا ہوا سامنے والے بنگلے کی کسی کھڑکی کا شیشہ توڑ گیا تھا۔
’’جلدی بیٹھو۔‘‘ ابراہیم ڈرائیونگ سیٹ سنبھال چکا تھا۔ فوراً چلایا۔ اوپر سے کسی نے انہیں غلیظ گالی دی تھی۔ ان کے بیٹھتے ہی ابراہیم نے گاڑی تیزی سے آگے بڑھا دی تھی۔
’’میں تو خود بھی اٹھنا چاہ رہا تھا۔‘‘ ابراہیم نے سامنے دیکھتے ہوئے سادہ لہجے میں کہا۔
’’سچ..... اگر ضیا سے پرانی دوستی نہ ہوتی تو کبھی اس کے ساتھ یہاں نہ آتا۔‘‘ وہ گاڑی مین روڈ پر لے آیا تھا۔
’’تم تو خیر بہت لکی ہو ابراہیم، تمہیں دایاں بازو مانتا ہے وہ۔‘‘ زید رشک سے بولا تھا۔
’’اسکول کے زمانے سے ساتھ رہا ہے ہمارا..... اور سچ کہوں تو یہ سب ضیا کا ہی احسان ہے کہ آج میں تعلیم یافتہ ہوں۔‘‘ وہ موڑ کاٹتے ہوئے بولا۔
’’اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی دوستی نے تمہیں بھی کچھ کم فائدہ نہیں پہنچایا۔‘‘ ابراہیم کی بات پہ وہ دونوں خباثت سے ہنس دیے۔
’’لیکن ایک بات پہ بہت حیران ہوں۔‘‘ شاہد ہاتھ سر کے پیچھے رکھتا سیٹ پر تقریباً لیٹ گیا۔
’’کس بات پر.....؟‘‘ زید دو سیٹوں کے درمیان ذرا آگے ہوا۔
’’اپنا ضیا ایسا تھا نہیں..... اور خاص کر ایسی عورتوں کو منہ لگانے والا تو ہرگز نہیں۔‘‘ شاہد بولا۔
’’شراب اور شباب کی لت تو اسے اس کے بابا نے ڈال دی ہے۔‘‘ ابراہیم نے انکشاف کیا۔
’’وہ کیوں.....؟‘‘ وہ حیران رہ گئے۔
’’شاید ان کے اندر کوئی خوف ہے ضیا کے بارے میں۔‘‘ ابراہیم نے اندازہ لگایا۔
’’اکلوتا سپوت ہے، ڈرتے ہوں گے کسی حسینہ کے پلو سے ہی نہ بندھ جائے۔‘‘ زید نے اندازہ لگایا۔
’’شاید.....‘‘ ابراہیم نے مختصر جواب دیا۔
’’پھر تو یہ خوف بے معنی ہے، عشق ہوتے وقت بھلا کہاں کچھ یاد رہتا ہے۔ اسے بھی جب محبت ہوگی تب لت وت سب بھول جائے گا۔‘‘ وہ دونوں قہقہہ لگا کے ہنس پڑے۔ ابراہیم دھیرے سے مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆

’’دیدے..... میں ذرا شاویز کی طرف جا رہا ہوں۔ آپ دروازہ بند کر لیں۔‘‘ بائیک کی چابیاں اٹھاتا، دیدے کو آواز دیتا وہ باہر کی طرف بڑھا۔
’’پھر تو تم کھانا بھی کھا کر آؤ گے۔‘‘ دیدے اداس ہو گئیں۔ وہ مسکراتا ہوا اُن کے قریب آ گیا۔

''آپ تو جانتی ہیں دیدے، نوکری نہ ملنے کی وجہ سے پریشان ہے وہ۔ بس اسی لیے جا رہا ہوں۔ ورنہ سچ کہوں تو نوکری کے بعد اب میں خود بھی فراغت کو ترسنے لگا ہوں۔ پھر بھی وعدہ ہے کہ وہاں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ آپ کے ساتھ ہی آکر کھاؤں گا۔'' اس نے ماں کو تسلی دی۔

''شاویز تو ماشاء اللہ سے گولڈ میڈلسٹ ہے ناں......؟'' انہوں نے استفسار کیا۔

وہ اثبات میں سر ہلا گیا۔

''پھر بھی ابھی تک اسے نوکری نہیں ملی؟'' وہ حیران ہوئیں۔

''اس ملک میں ڈگری نہیں دیدے، سفارش چلتی ہے۔'' وہ تلخ ہوا۔

''یہ تو ہم بندوں کے مفروضے ہیں بچے...... ورنہ ملتا وہی ہے جو اس مالک کا حکم ہوتا ہے۔'' انہوں نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا۔

''لیکن حق تلفیاں صرف یہیں ہوتی ہیں دیدے...... نیچے زمین پر...... چھوٹے سے چھوٹے عہدے سے لے کر بڑے عہدوں تک جس کی جس قدر طاقت ہے، ہڑپ کر جاتا ہے اور مزے کی بات یہ کہ ہضم بھی کر جاتا ہے۔'' اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''پتا ہے دیدے، خود مجھے آفس کے منیجر نے بتایا ہے کہ میری سیٹ پر بہت تگڑی سفارش تھی لیکن صرف میم امن کی وجہ سے یہ سیٹ مجھے ملی ہے۔ کیونکہ انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ انہیں سفارشی نہیں قابل آدمی چاہیے اگر وہ اسٹینڈ نہ لیتیں تو میں بھی ابھی تک جگہ جگہ دھکے کھا رہا ہوتا۔ جب تک یہ نظام تبدیل نہیں ہوتا، شاویز جیسے قابل لوگوں کو ہمیشہ اسی مایوسی کا شکار رہنا پڑے گا۔'' دیدے اس بار خاموش رہیں کیونکہ اس کی بات میں وزن تھا۔

''اچھا، تم جاؤ دیر ہو رہی ہے، رات کو جلدی واپس آنے کی کوشش کرنا، ورنہ دل ہولتا رہتا ہے۔'' انہوں نے باریال پہ دم کرتے ہوئے اسے ہدایت کی۔ وہ سر ہلاتا مڑ گیا۔ دیدے دروازے تک اس کے پیچھے آئیں۔

''اور کھانا وہیں کھا لینا۔ شاویز خوش ہو جائے گا۔'' ان کی آواز سن کر باریال ولی خان کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ وہ دروازہ بند کر چکی تھیں۔

اس کی ماں تھی ہی ایسی...... پُر وقار...... پُر خلوص، وفا کا پیکر...... محنت شعار...... جوانی میں ہی بیوگی کی چادر اوڑھ لینے کے باوجود سخت ترین حالات کا سامنا ہونے کے بعد بھی انہوں نے بہت حوصلے سے بڑی عزت اور شان والی زندگی گزاری تھی۔ بقول دیدے کے اس کے باپ نے کافی سارا زیور اور پیسہ ان کے لیے چھوڑا تھا۔ جوان دونوں کے لیے کافی تھا۔ باریال یہ سب جانتا تھا۔ لیکن پھر بھی انہوں نے یہ سرمایہ محفوظ کر رکھا تھا، باریال کے لیے...... اپنی گزر بسر کے لیے انہوں نے ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کر لی تھی۔ تنخواہ میں ان دونوں کا گزارا بہ آسانی ہو جاتا تھا۔ سرٹیفکیٹ سے ملنے والا منافع بھی وہ کمیٹیوں میں استعمال کر کے جمع کرتیں۔ اور کچھ رقم جمع ہوتے ہی نئے سرٹیفکیٹ بنوا لیتیں۔

باریال کی تعلیم کے بعد تو وہ اس کی نوکری کے بھی خلاف تھیں...... وہ چاہتی تھیں کہ باریال اپنا ہی کوئی بزنس شروع کر دے۔ لیکن وہ نئے دور کے تقاضوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے کسی اچھے پروجیکٹ میں کام کر کے تجربہ حاصل کر لے، کاروبار کی اونچ نیچ سمجھ لے، تبھی کہیں اپنا مال انویسٹ کرے...... وہ نہیں چاہتا تھا کہ جلد بازی یا کم عقلی سے کسی بھی قسم کا نقصان اٹھائے اور جنت بی بی اس بات پہ متفق بھی ہو گئی تھیں۔

جاب اچھی تھی، سیلری پیکج بھی اچھا تھا۔ لیکن اس جاب میں سب سے بڑی خوشی باریال کو یہ تھی کہ اسے آفس اور سائٹ دونوں جگہ کام سنبھالنے کا موقع ملا تھا۔ اور اس طرح کہ کنسٹرکشن اور منیجنگ کے حوالے سے بہت سے اہم نکات وہ بہت جلدی اور سمجھ گیا تھا۔ اب وہ دن زیادہ دور نہیں تھا جب وہ بہت جلد اپنے خواب کی بنیاد رکھ دیتا، دنیا کے سب سے سستے اور معیاری ہوٹل

بنانے کا خواب...... جہاں سب کو یکساں سہولت ملے۔ اور اسے یقین تھا کہ منزل اب زیادہ دور نہیں تھی۔

☆☆☆

''سبین، بات سنو بیٹا......'' وہ عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئیں تو اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی اماں نے پکار لیا، وہ سیدھی ان کی طرف آگئیں۔

''جی اماں......''

''اِدھر آؤ...... میری بات سنو......'' ان کو ہاتھ سے پکڑ کر وہ اندر لے آئیں۔

''بیٹھو اِدھر......'' اپنے ساتھ بستر پر بٹھاتے ہوئے وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

''کیا ہوا ہے اماں؟'' سبین الجھ گئیں۔

''ابھی رضیہ آئی تھی ناں......'' انہوں نے اپنی پڑوسن کا کہا۔

''خالہ رضیہ......؟''

''ہاں، ایک دو رشتوں کا بتا رہی تھی اپنی لالہ کے لیے۔'' اماں بتانے لگیں۔ نہ جانے کیوں سبین کا چہرہ بجھ سا گیا۔

''خاندانی لوگ ہیں، لڑکے بھی اچھی پوسٹوں پر ہیں۔''

''لیکن اماں......''

''لیکن ویکن کیا سبین...... سچ کہوں تو زرینہ کے رویے نے میرا دل توڑ دیا ہے۔'' وہ تاسف سے کہتی تکیے سے ٹیک لگا گئیں۔ خود بخود سبین کی آنکھیں جھک گئیں۔ جیسے یہ سب ان کا ہی قصور ہو۔

''تم کیوں نظریں جھکاتی ہو'' اماں نے ہاتھوں کا پیالا بنا کر ان کا چہرہ اس پیالے میں بھر لیا۔

سبین ان کے بیٹے ارتضیٰ کی محبت تھی، کتنا مان، کتنی محبت دی تھی اس نے سبین کو...... بے شک سبین نے اپنے گھر سے بھاگ کر ارتضیٰ کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن وہ گواہ تھیں کہ ان کے بہو، بیٹے نے کوئی غلط اقدام نہ اٹھایا تھا۔ شریعت کے تمام اصولوں کے مطابق عزت سے ایک دوسرے کو اپنایا تھا۔

''ارتضیٰ ہوتا تو تب میں دیکھتی زرینہ کیسے کوئی بات کرتی ہے تیرے بارے میں۔ میں تو ماں ہوں...... مجبور ہو جاتی ہوں خاموش رہنے پر۔'' وہ شرمندہ تھیں۔

''ارے نہیں اماں......'' انہوں نے فوراً اماں کے ہاتھ تھام لیے۔

''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ زرینہ کیا کہتی ہے، آپ ارتضیٰ، شاویز اور لالہ کے بعد مجھے کسی اور رشتے سے کوئی مطلب رہا ہی نہیں...... لیکن۔'' وہ کچھ سوچنے لگیں۔

''لیکن کیا؟''

''بات لالہ کی ہے اماں...... ابھی تو حمزہ کے متعلق کی گئی آپ کی طرف سے رشتے والی بات پر ہی غصہ ہے، ایسے میں ان نئے لوگوں کے متعلق کوئی بھی بات اسے اور نہ بھڑکا دے۔'' وہ الجھی گئی تھیں۔

''تم اس کی فکر نہیں کرو...... اسے میں سمجھا لوں گی۔ ویسے بھی میری بات نہیں ٹالے گی وہ...... تم دیکھ لینا۔'' انہوں نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

''دیکھ لیں آپ...... میں تو بس یہ چاہتی ہوں میری بیٹی خوش رہے۔''

''آمین...... آمین۔'' اماں نے فوراً ہاتھ کھڑے کر دیے تھے دعا کے لیے۔ سبین دھیرے سے مسکرا دی تھیں۔

☆☆☆

یہ کمرا بے حد کشادہ تھا۔ جہازی سائز بیڈ پر تازہ گلابوں کی پتیاں اس کی سانسیں مہکائے دے رہی تھیں، عجیب سی مدہوشی ذہن پر چھائی جا رہی تھی۔ نہ جانے یہ کمرے کے خوب صورت و معطر ماحول کا اثر تھا یا اس مشروب کا جو اسے یہاں آتے ہی نوازا گیا تھا۔ تبھی ایک طرف لگی موتیوں کی لڑیاں گنگنا ئیں۔ اس نے چونک کر سامنے دیکھا۔ وہ وہی اپسرا تھی۔ لیکن اس وقت وہ سلک کے پھسلتے ریشمی لباس میں ملبوس تھی جو مکمل طور پر سادہ تھا۔ چہرہ میک اپ سے عاری تھی۔ وہ دھیرے، دھیرے چلتی اس کے قریب ہی آکر بستر پر بیٹھ گئی۔ ضیا کی نگاہیں اس کی کشادہ پیشانی سے ہوتی اس کے عنابی لبوں پر آٹھہریں۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' اس کے لبوں کو تکتے اس نے سوال کیا تھا۔

''زمزمہ......'' ننھا سا گلابی دہانہ ذرا سا وا ہوا

اور عنابی لب دوبارہ سے ایک دوسرے سے جڑ گئے۔

''کہاں کی ہو؟'' اس کی خوب صورت کالی آنکھوں میں حیرت جاگی تھی لیکن ضیا کی آنکھیں ابھی تک اس کے لبوں پر جمی تھیں۔ ایسے ہی لب اس نے کہیں دیکھے تھے...... لیکن کہاں، کب اسے یاد نہیں آرہا تھا۔

''یہاں سے دور ایک گاؤں ہے، وہاں سے آئی ہوں۔'' اس نے گاؤں کا نام بتا کر جواب دیا۔ اور لمبے بالوں کی ایک لٹ نکال کر اسے انگلی پر لپیٹنے لگی۔

''باپ نے بیچا؟'' ضیا کی آواز میں تاسف ابھرا...... وہ چونکی پھر اس کی آنکھوں میں خفگی اتر آئی۔

''باپ بھی کبھی بیچ سکتا ہے۔''

''اس دنیا میں کچھ بھی ہوسکتا ہے؟'' وہ مسکرایا۔ اور بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائی۔

''مثلاً۔''

''جیسے تم یہاں آگئی ہو۔ ورنہ تم نے کبھی سوچا ہوگا بھلا......؟ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی...... اس بار زمرمہ خاموش رہی۔

''اور جیسے میں...... ضیا علی خان...... صرف ایک رات کے تعلق کے لیے اتنے پیسے اڑا کر تمہارے پاس بیٹھا ہوں......'' دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھتے ہوئے وہ شرارت سے بولا تھا۔ نہ جانے کیوں سر چکرانے لگا تھا۔

''کم از کم میں نے تو کبھی نہیں سوچا تھا۔''

''کیا مطلب......'' زمرمہ کی آنکھوں میں حیرانی ابھری۔

''مطلب یہ کہ میں ایسے تعلقات پر یقین نہیں رکھتا۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

''تو پھر تم نے اتنے پیسے کیوں ضائع کیے؟''

اسے ضیا کے لیے اتنا افسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود بھی حیران تھی۔ کیونکہ وہ اب جس جگہ سے تعلق رکھتی تھی وہاں صرف پیسہ اہمیت رکھتا تھا، احساسات اور جذبات یہاں کبھی سانس نہ لیتے تھے۔ تو اسے ضیا کے اس نقصان پر افسوس ہونا...... واقعی اچنبھے کی بات تھی۔

''تمہارے لبوں کی وجہ سے۔'' ضیا کی بات پر وہ قہقہہ لگا کے ہنس دی تھی۔

''سچ کہہ رہا ہوں۔'' اسے برا لگا۔

''مطلب تم جس سے محبت کرتے ہو اس کے ہونٹ میرے لبوں سے ملتے ہیں۔''

''محبت......؟'' وہ چونک کر سیدھا ہوا۔

''ہاں، اتنی تڑپ سے تو یہی ظاہر ہے۔'' زمرمہ نے کندھے اچکائے۔

''نہیں۔'' ضیا نے نفی میں سر ہلایا۔

''ایسی کوئی بات نہیں...... بلکہ میں تو یاد بھی نہیں کر پا رہا کہ ایسے ہی لب میں نے دیکھے کہاں ہیں؟''

''تم پاگل ہو۔'' زمرمہ کو وہ پاگل ہی لگا۔

''شاید......'' اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ لہجہ بھی لڑکھڑانے لگا تھا۔

''اگر ایسی جگہوں پہ نہیں آتے تو ڈرنک بھی نہ کرتے۔'' وہ کمرے میں رکھے فریج سے اس کے لیے لیمن جوس نکالتے ہوئے بات بدل گئی۔

''مجھے یقین تھا، یہ مجھے نشہ نہیں دے پائے گی۔'' وہ پھر سے ٹیک لگا گیا۔ زمرمہ نے گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

''کچھ شرابیں اور حسن بہت خاص ہوتے ہیں، مدہوش کر ہی دیتے ہیں۔'' ضیا نے دھیرے سے گلاس تھام لیا تھا۔ وہ مڑنے لگی کہ ضیا نے ہاتھ تھام لیا۔

''یہاں بیٹھو...... میں تمہیں کچھ دیر یونہی اپنے قریب محسوس کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ ضیا جوس پینے لگا۔

''جس کی ایک جھلک نے تمہیں اس قدر دیوانہ بنا دیا ہے خان! اس کی قربت تو تمہیں مار ہی دے گی۔'' اسے پھر سے اپنے لبوں کو تکتا دیکھ کر وہ دھیمے سے مسکرائی تھی۔

''ضیا علی خان مٹنے کے لیے نہیں مٹانے کے لیے پیدا ہوا ہے۔'' اس نے زمرمہ کی نازک کلائی اس قدر مضبوطی سے پکڑی کہ وہ کراہ اٹھی۔

''خان، چھوڑو......'' اس کی موٹی کالی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ ضیا نے فوراً ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور اس کے بیڈ کو چھوتے کالے ریشمی بال ہاتھوں میں لے لیے تھے۔

''مجھے لگا تم لوگوں کو درد سہنے کی عادت ہوگی۔''

وہ پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کر رہا تھا۔ زمرمہ نے آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو بہہ جانے دیا تھا۔

''ہمیں درد محسوس ہی نہیں ہوتا...... لیکن آج نہ جانے کیوں بھر لگا کسی اپنے نے درد دیا ہو جیسے۔'' ضیا کی آنکھوں میں دیکھتی وہ بکھری گئی۔ بلا ارادہ ہی ضیا نے اس کے گالوں پر لڑھکتا وہ موتی اپنی پوروں میں چن لیا تھا۔ اور پھر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں چلوں گا۔'' اٹھتے ہوئے وہ ذرا سا لڑکھڑایا۔ زمرمہ نے تیزی سے اسے بازوؤں سے پکڑ کر سنبھالا دیا تھا۔

''ابھی مت جاؤ خان...... طبیعت سنبھل جائے تو......'' ضیا نے ہاتھ اٹھا کر اسے جیسے مزید بولنے سے منع کیا تھا۔ پھر جیب سے والٹ نکال کر چند نیلے نوٹ زمرمہ کے قدموں میں اڑائے تھے۔ اور مڑ کر باہر نکل گیا تھا۔

''خان......!'' اس کی آواز گلے میں ہی دم توڑ گئی تھی۔

☆☆☆

شاویز کے گھر سے نکلتے، نکلتے اسے واقعی دیر ہوگئی تھی۔ رات کے بارہ سے بھی اوپر کا ٹائم ہو چلا تھا۔ اسے یقین تھا ڈیڈی اس کے انتظار میں ابھی تک جاگ رہی ہوں گی۔ تبھی اس کی بائیک ہوا سے باتیں کر رہی تھیں۔ مین سڑک سے ذیلی سڑک پر موڑ کاٹتے ہوئے بھی اس نے بائیک کی رفتار کم نہ کی تھی۔ اور اگلے ہی لمحے اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ صرف چند قدم کے فاصلے پر پڑا بے حس و حرکت وجود دیکھ کر اس نے تیزی سے بریک لگائی تھی۔ جس قدر تیزی سے بریک لگی تھی اسی قدر شدت سے اس کی بائیک ہوا میں اچھلی تھی۔ اس نے ہینڈل چھوڑ دیے تھے۔ ذرا دیر ہوا میں رہنے کے بعد وہ زور سے سڑک کے کنارے اگی خودرو جھاڑیوں میں جا گرا تھا۔ موٹر سائیکل بھی کچھ فاصلے پر جھاڑ جھنکار سے الجھ کر سڑک سے نیچے جانے سے بچ گئی تھی۔ درد کی تیز لہر نے اس کے وجود کو اپنے حصار میں لیا تھا۔ ایک درخت کا سہارا لے کر کپڑے جھاڑتا وہ اٹھا اور پھر اچانک یاد آتے ہی وہ تیزی سے اس بے جان وجود کے پاس آیا تھا۔

تئیس، چوبیس کی عمر کا وہ لڑکا ہوش و خرد سے مکمل طور پر بیگانہ تھا۔ اس کے چہرے اور بازوؤں پر ہلکی چوٹوں کے نشان تھے۔ آج کل شہر میں لوٹ مار کی وارداتیں بڑھ گئی تھیں۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں وہ سمجھ گیا تھا کہ مین روڈ پر ضرور اس کی کسی بدمعاش گروپ سے جھڑپ ہوئی ہوگی۔ وہ اسے لوٹنا چاہ رہے ہوں گے اور اس کی مزاحمت پہ وہ اسے مار پیٹ کے یہاں پھینک گئے ہوں گے۔

لڑکا کسی اچھے خاندان سے لگ رہا تھا۔ چاند کی روشنی میں اس کا قیمتی لباس اور اس کا بھرا، بھرا چہرہ اور صحت مند وجود اسے کسی امیر فیملی کا سپوت ظاہر کر رہا تھا۔ ہاریال نے چند پل اس کا چہرہ تھپتھپایا، وہ ذرا کسمسایا پھر آنکھیں موند گیا۔ ہاریال نے دیکھا اسے کوئی سیریس چوٹ نہیں لگی تھی۔ پھر بھی نہ جانے کیوں وہ اٹھ نہیں پا رہا تھا۔ ہاریال نے اسے ذرا سا سائڈ پر کیا۔ پھر اپنی بائیک کھڑی اور سڑک سے ذرا نیچے کنارے پر بنی چھوٹی سی نالی جو شاید قریبی کھیتوں میں پانی پہنچانے کے کام آتی تھی میں سے پانی ہاتھ کی مٹھی میں بھر کر اس نوجوان کے چہرے پر ڈالنے لگا۔ ذرا سی کوشش کے بعد اس لڑکے نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''امیر طبقے کی بگڑی ہوئی اولاد......'' ایک پل میں ہاریال کی سوچ اس کے متعلق بدل چکی تھی۔

''اگر تمہارا گھر یہیں قریب ہے تو میں تمہیں چھوڑ سکتا ہوں وہاں تک۔'' اس کے لہجے میں اب متوقع نرمی مفقود تھی۔

''یہیں قریب ہی فارم ہاؤس ہے میرا۔'' اس نے لڑکھڑاتے لہجے میں جواب دیا۔

''اتنی زیادہ پی رکھی تھی تو گھر سے باہر نہ نکلتے۔''

''میں شراب نہیں پیتا۔'' وہ اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے جھوٹ بول گیا...... کیوں؟ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

''حیرت ہے، حالت تو انہی جیسی ہی ہے۔''

باریال اس کی مدد کرنے لگا۔
''ٹیکسی سے آرہا تھا نہ جانے انہوں نے کیا کھلا دیا، لگتا ہے سب لوٹ کر لے گئے۔'' اب وہ اپنی جینز کی پاکٹیں ٹٹول رہا تھا۔ حسبِ توقع سب جیبیں خالی تھیں۔
''چلو تمہیں فارم ہاؤس تک چھوڑ دوں۔'' باریال بائیک پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
''شکریہ.....'' وہ بے جھجک اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ بائیک درست حالت میں تھی بس کئی جگہ سے رگڑ کھائی تھی۔
''ویسے تمہاری قسمت اچھی تھی۔ ورنہ میں یہ شارٹ کٹ کبھی نہیں لیتا۔ ہمیشہ مین روڈ سے جاتا ہوں۔'' بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے باریال مسکرایا۔
''قسمت تو آج خراب تھی میری، ورنہ میں بھی کبھی اس طرح ٹیکسیوں میں سفر نہیں کرتا۔'' اس کے سر میں شدید درد ہورہا تھا۔ اس نے سر باریال کے کندھے پر رکھ دیا۔
''خیال سے بیٹھو، اب نیچے گر گئے تو میں نہیں سنبھال پاؤں گا۔'' باریال کندھے پر اس کے سر کا بوجھ محسوس کرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں بولا۔
''بس یہ لیفٹ والی پکی سڑک.....'' مین روڈ سے کافی آگے جا کر اس نے باریال کو مخاطب کیا تھا۔ اس نے بائیک موڑ دی تھی۔
''آج رات یہاں رک جاؤ، اس طرف راستہ ویسے بھی سنسان ہے۔ کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔'' بڑے پھاٹک کے سامنے بائیک رکتے ہی اس نے اتر کر باریال کو آفر کی تھی۔
''نہیں، میری ماں میرا انتظار کررہی ہوگی۔'' مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے بائیک واپس موڑ لی تھی۔
نہ کوئی تعارف ہوا نہ کوئی اہم بات...... پھر بھی نہ جانے کیوں وہ شخص ضیا علی خان کو بے حد اپنا سا لگا تھا...... وہ دیر تک اس کی بائیک کی گرد کو تکتا رہا تھا۔

☆☆☆

ہمیشہ جس بات سے ان کو ڈر لگتا تھا وہی ہوجاتی تھی۔ آج بھی بالکل ویسا ہوا تھا۔ جیسا ہونے کا ان کو ڈر تھا۔ دادی نے لالہ کے رشتے کے لیے جس فیملی کو مدعو کیا تھا۔ ان میں سے ایک عورت ان کے پرانے گھر کی ہمسائی نکلی...... اور سب کے سامنے اس نے سبین اور ارتضٰی کی ڈرامائی شادی کے متعلق سب کچھ بیان کردیا۔ ان کی ذو معنی باتیں سن کر دادی انہیں خود ہی منع کرکے جانے کا کہنے والی تھیں۔ لیکن کیا کیجیے کرموں کا کہ اسی وقت لالہ بھی اس دن جلدی چھٹی لے کر گھر آگئی۔ اور بالکل اتفاقیہ طور پر نہ صرف گھر آئے مہمانوں کی زیارت ہوگئی بلکہ دادی اور ان کے کڑوے کسیلے جملوں کا تبادلہ بھی...... اور اب ان سب کے جانے کے بعد اس نے ایک طوفان مچا رکھا تھا۔ میز پر دھرا کھانے پینے کا سارا سامان زمین بوس ہوچکا تھا۔ کراکری کے نئے سیٹ شور مچاتے کرچیوں کی صورت یہاں وہاں بکھرے پڑے تھے۔ دادی چپ کا دامن تھامے کمرے میں جا گھسی تھیں۔ اور اب لالہ کے غصے کی توپ کا رخ براہِ راست ماں کی طرف تھا۔
''جب تک آپ اپنا یا میرا مذاق نہ بنوا لیں، آپ کو چین کیوں نہیں پڑتا امی......'' اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ماں کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالے۔
''اس میں میری کیا غلطی ہے لالہ؟'' وہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔
''غلطی...... کیا غلطی ہے آپ کی...... ابھی آپ یہ بھی مجھ سے پوچھ رہی ہیں؟'' اسے اور غصہ آیا۔
''لالہ، بچے اتنا غصہ کیوں کرتی ہو تم؟'' وہ اس کے قریب آکر اس کے ہاتھ تھام گئیں، لالہ نے ایک جھٹکے سے ان کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے تھے۔
''کیونکہ صرف یہ غصہ ہی میرے اختیار میں ہے، خودکشی حلال ہوتی تو شاید وہی کرلیتی۔'' اس نے ہاتھ کی پشت سے سختی سے گالوں پر لڑھکتے آنسو رگڑ کے مٹا ڈالے، سبین ساکت سی اسے دیکھے گئیں۔
یہ ان کی لالہ تو نہ تھی۔ ان کی لالہ میں تو ان کی جان تھی، کم گو، بے حد نفیس اور نفس کھری سی لالہ...... لیکن ارتضٰی کی موت کے بعد جیسے زرینہ اور خاندان والوں نے نظریں پھیری تھیں۔ لفظوں کے تیروں سے ان کے وجود کو چھلنی کرنا شروع کیا تھا، تب سے ان کی لالہ بھی کہیں کھو گئی تھی۔ حد تو یہ تھی کہ اسے ماں کے آنسو نظر نہ آتے تھے، صرف لوگوں کے طعنے اور رویے وہ محسوس کرلیتی تھی۔ اور رفتہ، رفتہ ان سے کتنی دور ہوتی جارہی تھی۔
''میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں امی...... یوں لوگوں کو گھر میں بلا کر میری انسلٹ نہ کروایا کریں۔'' وہ رو دی۔
''ان کی زبانی مجھے بار، بار یہ یاد نہ کرایا کریں کہ میں ایک گھر سے بھاگی ہوئی عورت کی بیٹی ہوں۔'' اس کی ہچکیاں بندھنے لگیں۔ سبین کو لگا ان کی ٹانگیں ان کا ساتھ چھوڑ گئیں۔ وہ وہیں پاس رکھی کرسی پر ڈھے سی گئیں۔
''اگر آپ کو میری طرف سے کوئی فکر ہے ناں!'' وہ ایک دم تیز لہجے میں کہتی ہوئی ان کے قریب آئی۔
''کہ میں بھی کہیں آپ کی طرح کوئی ایسا ویسا قدم نہ اٹھا لوں۔'' سبین کا دل کٹنے لگا۔
''تو بے فکر رہیے...لیکن پلیز آئندہ کسی بھی ایسے ڈرامے کا اہتمام ہوا ناں اس گھر میں...... تو میں قسم کھاتی ہوں میں خود کو ختم کرلوں گی۔'' چلا کر کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔
سبین کے دل میں اٹھنے والی درد کی تیز لہر کس قدر شدید تھی۔ لیکن وہ ہاتھ سے سینہ مسلتے ہوئے دوبارہ خاموشی سے کام میں لگ گئی تھیں۔ کھڑکی سے جھانکتی دادی کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

☆☆☆

''تم نے مجھے اتنی ایمرجنسی میں یہاں کیوں بلایا؟'' اقرا کے بائیک پر بیٹھتے ہی اس نے سوال کیا۔
''کالج کے پیچھے نہر پر چلو پھر سب بتاتی ہوں۔'' وہ بے فکری سے چیونگم چباتے ہوئے بولی۔ آغا نے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ پائنچے اوپر کیے نہر کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈبوئے بیٹھی تھی۔ جامن کے قد آور درخت سے ٹیک لگائے آغا نے کچھ دیر سینے پر ہاتھ باندھے خاموشی سے اس کے بولنے کا انتظار کیا تھا پھر خود ہی بول پڑا۔

''اب کچھ بولوگی بھی...... یا پکنک منانے آئی ہو؟'' اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔
''بتاتی ہوں، اتنا چڑ کیوں رہے ہو؟'' اقرا نے چیونگم چباتے ہوئے اسے گھورا تھا۔
''ہاں تو چڑ چڑا نہ ہوں تو اور کیا کروں......'' وہ آستین چڑھاتا اس کے قریب ہی ہری گھاس پر بیٹھ گیا۔
''سارا دن نوکری کی تلاش میں اِدھر اُدھر دھکے کھاؤ اور پھر میڈم کا فون آئے تو بھاگتے آؤ، ورنہ پھر ان کے مزاج ہی نہیں ملتے۔'' وہ اب اسے چڑا رہا تھا۔
''تم جانتے ہو، ہمیشہ تمہی بلاتے ہو، میں نے پہلی مرتبہ بلایا ہے۔'' وہ بھلا کہاں ہارنے والی تھی۔ فوراً منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔
''اب بات بھی کرلو، میں نے پھر ضروری کام سے بھی جانا ہے۔''
''توبہ ہے آغا...... ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہو۔'' وہ خفا ہوئی۔
''اچھا، خفا تو نہ ہو۔'' آغا نے اس کا مرمریں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔
''اماں ناں میرے اور شاویز بھائی کے متعلق سوچنے لگی ہیں۔'' آغا کے تھامے ہاتھ میں پہنے بریسلیٹ سے کھیلتے ہوئے اس نے بتایا۔
''کیا سوچنے لگی ہیں؟'' وہ ناسمجھی سے بولا۔
''ان کے اور میرے رشتے کے بارے میں...... اور کیا؟'' آغا کے ہاتھ سے ایک دم ہی اس کا ہاتھ چھوٹ گیا۔
''پھر تم نے کیا کہا؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔
''میں نے ابھی تو کچھ نہیں کہا۔ لیکن تم جانتے ہو میرا جواب کیا ہوگا۔'' وہ دلکشی سے مسکرائی۔
''اور اگر وہ نہ مانیں تو؟'' اس کا دل نہ جانے کیوں دھڑک سا اٹھا تھا۔
''تو تم جانتے ہو، میں نے صرف دو کام کرنے ہیں۔''
''وہ کیا......؟'' اس نے پوچھا۔
''یا تیرے ساتھ بھاگ جاؤں گی...... یا......''

وہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''یا زہر کھالوں گی۔'' اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ وہ تم سے تو پرا آ گئی تھی۔

''میری خاطر اتنا سب چھوڑ دے گی۔'' وہ حیرانی سے مسکرایا۔

''تمہیں پا بھی تو لوں گی ناں......''

''اچھا زیادہ ہیروئن نہ بن۔ تیری اماں، بھائی کو پتا چل گیا ناں تو لگ پتا جائے گا، اس ٹائم پوچھوں گا۔'' آغا نے مذاق اڑایا۔

''تو کیا پوچھے گا۔ میں خود بتا دوں گی۔'' اس نے بھی دونوں ہاتھ جھاڑے۔

''آغا تو اپنی ماں کو بھیج ناں......'' اقرا کو اچانک ہی خیال آیا۔

''کوئی فائدہ نہیں یار......خالہ نے فوراً انکار کر دینا ہے، دعا کر کوئی اچھی نوکری مل جائے تب شاید بات بن جائے۔''

''آمین......میری تو یہی دعا ہے کہ کم از کم شاویز بھائی سے پہلے تجھے نوکری مل جائے کیونکہ پھر اماں ضرور کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کر دے گی میرے لیے۔'' وہ پریشان سی ہو گئی۔

''اچھا۔ تو پریشان نہ ہو......اب چل تجھے کالج کے گیٹ تک چھوڑ دوں۔ تیرا بھائی پہلے آ گیا ناں تو بہت مسئلہ ہو جائے گا۔''

''ہاں، صحیح ہے۔'' اقرا نے بھی تائید کی اور دونوں بائیک کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

''میں سوچ رہی تھی تمہیں اب آفس کی طرف سے گاڑی مل جانی چاہیے۔'' وہ سائٹ سے آفس واپس آئے تو اسے اپنی بائیک کی طرف واپس جاتا دیکھ کر اس نے کہا۔

''میرے خیال میں تو ابھی بائیک ہی صحیح ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''ہاں لیکن پھر بھی...... سائٹ وغیرہ پہ جانے کے لیے تو کافی مسئلہ ہو جاتا ہے ناں......''

''آفس کی اتنی گاڑیاں ہیں، کہیں بھی کام پہ جانے کے لیے ہر وقت تیار ہوتی ہیں، ایسا بھی کوئی ایشو نہیں۔'' سفید شرٹ اور بلیک پینٹ میں اس کی سفید ملائی سی رنگت کچھ مزید نکھری گئی تھی۔

''اگر کوئی شخصیت سحر کر سکتی ہے پہلی ہی نظر میں ختم کر سکتی ہے تو وہ واقعی باریال ولی خان کی شخصیت ہے۔'' باریال کی طرف دیکھتے ہوئے امن نے خود سے دل میں اعتراف کیا تھا۔

''میرے خیال میں مجھے چلنا چاہیے۔'' اس کی طویل خاموشی پہ وہ ذرا اونچی آواز میں بولا۔ امن چونک گئی۔

''میں پھر بابا سے بات کرتی ہوں۔'' امن کے کہنے پر وہ نفی میں ہلا گیا۔

''میں نے کہا ناں، ضرورت نہیں ہے۔''

''اچھا ہے ناں...... گاڑی ہو گی تو کبھی، کبھی مجھے بھی ڈراپ کر دو گے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"you can drive"

''پھر بھی کبھی، کبھی دل کرتا ہے کوئی ایسا دوست بھی ہو ناں جو ڈرائیو کرے اور ہم مزے سے بس گانے سنیں......'' اس کی بات پہ باریال نے قہقہہ لگایا۔

''یہ کام تو پھر میری بائیک بھی کر سکتی ہے، گاڑی کی کیا ضرورت ہے۔'' اس نے آفر کی۔

''مطلب تم مجھے آج اپنی بائیک پہ گھر چھوڑنے کے لیے تیار ہو؟'' وہ اچھلی۔

''بالکل!'' وہ بائیک پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''لیکن آہستہ چلاؤ گے۔'' وہ بے حد خوش تھی۔

''وعدہ......''

امن اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ اس نے ایک ہاتھ باریال کے کندھے پہ رکھ دیا۔

''چلیں......'' باریال نے پوچھا۔

''یس......'' اس نے سرخوشی سے جواب دیا۔ اور اس دن امن کو احساس ہوا تھا کہ ہواؤں میں اڑنا دراصل کسے کہتے ہیں۔ وہ بے حد خوش تھی......بے انتہا خوش......

☆☆☆

''خان، آج ساتھ والے قبیلے کے لوگوں کے کچھ ڈنگر (جانور) ہمارے کھیتوں میں آگھسے تھے۔'' بید کی چھڑی گھماتے سہراب علی خان کے ہاتھ ایک دم رک سے گئے تھے۔

''نقصان ہوا؟'' بھاری لہجے میں پوچھا گیا۔

''جی خان...... خاصی فصل خراب کردی ہے۔ لیکن ساتھ والے گاؤں کے لوگ جرمانہ بھرنے کا کہہ رہے ہیں۔'' منشی علمدار نے بتایا۔

''انہیں کہہ دو...... ہمیں جرمانہ نہیں چاہیے۔''

''جی خان......'' منشی حکم ملتے ہی سلام کرتا چلا گیا۔

''شاہ سوار......'' وہی بھاری آواز گونجی۔

''جی حضور۔'' ایک تومند سا آدمی فوراً آگے کو جھکا۔

''جانتے ہو ناں حویلی کے اصول......؟''

''جی خان......'' وہ مؤدب لہجے میں بولا۔

''کان کے بدلے کان، عزت کے بدلے عزت......'' خان نے چھڑی گھمائی۔

''فصل کے بدلے فصل، خان..........'' شاہ سوار کے چہرے پر خبیث سی مسکراہٹ رینگ گئی۔

''آگ لگا دو کھڑی فصلوں کو......اور خیال رہے کہ کوئی بندہ نظر میں نہ آئے۔'' انہوں نے ہدایت کی۔

''جی خان......'' وہ سر ہلا گیا تھا۔

☆☆☆

وہ تھا ہی اتنا پُر وقار اور ساحر شخصیت کا مالک کہ جو دیکھتا، مڑ کر ایک بار ضرور دوبارہ دیکھتا...... اس کی چال میں شیر جیسا دبدبہ تھا۔ جیسے دنیا کو فتح کرنے نکلا ہو...... سفید شلوار قمیص پر کندھوں پہ ڈالی کریم کلر کی بڑی سی مردانہ شال اس کی شخصیت کو چار چاند لگا رہی تھی۔

فزکس ڈیپارٹمنٹ کے لان میں بیٹھا ہر فرد اس وقت اگر کسی طرف متوجہ تھا تو وہ صرف ضیا علی خان کی ہی ذات تھی۔ لوگوں کو مسلسل اپنی طرف تکتا پا کر خود بخود اس کے لبوں پر مسکراہٹ مچلی تھی۔ اور اس کے دائیں گال میں ذرا اوپر بننے والا ڈمپل بے حد گہرا اور اس قدر خوب صورت تھا کہ کتنے دلوں کو اپنی دھڑکنیں اس ڈمپل میں دھڑکتی محسوس ہوتی تھیں۔

انہی میں سے ایک گل لالہ بھی تھی...... برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی لالہ کی نگاہ یونہی بھٹکی تھی۔ اور جیسے ضیا علی خان کے اس خوب صورت روپ میں کھو کر رہ گئی تھی۔ اس کے یاقوتی لب حیرانی سے ذرا سے وا ہوئے تھے اور تبھی بالکل اتفاقیہ طور پر ضیا علی خان کی نگاہ ان لبوں پر پڑی تھی۔

ملائی جیسی رنگت میں دہکتے انگاروں کے جیسے یاقوتی ہونٹ اور ان کے بالکل اوپر لبوں پر کالا تل...... وہ بے اختیار سا ہوا تھا۔ اور پھر سب لوگوں نے دیکھا تھا بے اختیار ضیا علی خان ایک شان سے لالہ کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر لالہ بھی چونک گئی تھی۔ پرس اور دیگر چیزیں سنبھالتی وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس کے قریب آنے سے پہلے وہاں سے ہٹ جانا چاہتی تھی...... لیکن عین اسی وقت اس کا پین نیچے گرا تھا۔ وہ جھکی...... ضیا کے پشاوری چپل میں مقید پاؤں اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ جھٹ سے پین اٹھا کر وہ سیدھی ہوئی تھی۔ ضیا اس کے قریب، بے حد قریب کھڑا تھا۔ اس کی نظریں اب بھی اس کے ہونٹوں پر جمی تھیں۔

''کوئی بات کرو......'' وہ کسی روبوٹ کے سے انداز میں بولا تھا۔ وہاں موجود لڑکے، لڑکیاں... سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔

"are you mad?" لالہ کو ایک دم سے غصہ آنے لگا۔ اور ان لبوں کو ہلتا دیکھ کر ضیا علی خان کے ہونٹ پھر سے مسکرا دیے تھے۔

''کمال ہو تم......''

اس کی بات سن کر لالہ جھٹ سے وہاں سے مڑی تھی۔

''میری پہلی وش پوری کرنے کے لیے شکریہ مس لالہ......'' اور قدم بڑھاتی لالہ کے قدم پتھر کے ہوئے تھے۔ ''وہ اس کا نام جانتا تھا...... لیکن کیسے......؟ جبکہ اس نے اس سے پہلے کبھی اسے دیکھا نہیں تھا۔ نہ ہی اسے وہ جانتی تھی۔ پھر وہ کون تھا......؟'' مسکراتا وہ اس کے قریب سے گزرا تھا۔ اور وہ کتنے ہی پل اس کی خوشبو کو اپنے اردگرد محسوس کرتی رہی تھی...... دھڑکتے

دل کے ساتھ......

☆☆☆

''لالہ......رکو......'' وہ اپنی ہی سوچوں میں مگن، گم صم کلاس کی طرف جا رہی تھی۔ جب نمرہ کی آواز نے اسے رک جانے پر مجبور کیا، نمرہ کلاس کی وہ واحد لڑکی تھی جو لالہ سے دوستی بڑھانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ لالہ کسی سے بھی زیادہ بات کرنے کی روادار نہ تھی۔ لیکن نہ جانے نمرہ کی شخصیت کی معصومیت تھی یا اس کا خلوص کہ وہ اس کے قریب آ گئی تھی۔

''یہ کزن ہے تمہارا......؟'' نمرہ نے کلاس روم کی گلاس ونڈو سے ٹیک لگائے ضیا علی خان کی طرف اشارہ کیا جو دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا، لالہ نے اس سمت ابھی نگاہ ڈالی اور پھر سے پھیر لی۔

''میں اسے نہیں جانتی۔'' لالہ نے سرنفی میں ہلاتے ہوئے صاف انکار کیا۔ نمرہ کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

''کیا مطلب نہیں جانتی؟'' وہ حیران تھی۔

''نہیں جانتی...... مطلب نہیں جانتی، اس شکل کے کسی بھی شخص سے میری کوئی واقفیت نہیں ہے نمرہ......'' اس نے وضاحت دی۔

''پھر یہ تمہارا نام کیسے جانتا ہے لالہ......؟'' نمرہ اب بھی حیران تھی۔ ''جبکہ آج اس کا یہاں پہلا دن ہے۔'' اور نمرہ کی بات سن کر وہ مزید الجھ گئی تھی۔

''مجھے کیا پتا......؟'' وہ چڑ کر کہتی آگے بڑھ گئی۔

''مجھے تو دال میں کچھ کالا لگتا ہے؟'' نمرہ اس کے ہم قدم ہوئی۔

''بیٹا یونیورسٹی مت جاؤ...... میں نہیں چاہتی لالہ...... میرے ماضی کا کالا سایہ تمہارا حال یا مستقبل گہنا دے۔'' سبین کی آواز نے اس کی روح کے کواڑ بجا دیے تھے۔ وہ سر جھٹک گئی۔

''دال کالی ہو یا پیلی، مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں نمرہ...... میری چاہ صرف میرے خواب ہیں۔'' اس نے اندر ہی اندر خود کو مضبوط کیا اور آئندہ ضیا علی خان کو مکمل نظر انداز کرنے کا تہیہ کیا۔ اس نے خود سے عہد کر رکھا تھا کہ وہ ماں کے دامن پر لگے چھینٹے نہ صرف اپنی محنت اور کردار سے مٹائے گی...... بلکہ خود کو بھی ثابت کرے گی۔

☆☆☆

گاؤں پر اترنے والی صبح بے حد چمکدار تھی۔ سنہری کرنوں نے ہر چیز کو عجیب سنہری رنگ بخشا تھا۔ ہر چیز جھلملا اٹھی تھی۔ سردیوں میں ایسی دھوپ انگ، انگ میں عجیب ہی سرشاری بھر دیتی ہے۔

ڈیرے کے وسیع احاطے میں دھوپ میں ہی چارپائی پر بیٹھے سہراب علی خان لوگوں کے مسائل بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ جو نیچے زمین پر بچھی چوڑی چٹائی پر دائرے کی صورت بیٹھے تھے۔ تبھی ڈیرے کی ننھی سی چار دیواری کے پار کچی سڑک پہ دھول اڑاتی پولیس کی گاڑی پر ان کی نظر پڑی۔ گھنی مونچھوں تلے دبے ہونٹ دھیمے سے مسکرا دیے تھے۔

''خان، پولیس۔'' ایک آدمی تیزی سے اطلاع دینے لگا۔ خان نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا حکم دیا تھا۔ گاڑی ڈیرے کے چوبدار دروازے کے باہر ہی رک گئی۔ ایس ایچ او، دو سپاہیوں کے ساتھ ان کی طرف آیا۔

''السلام علیکم خان جی......'' آگے کو نکلی ہوئی توند سے پھسلتے بیلٹ کو بار، بار جھٹکے سے اونچا کرتا ایس ایچ او ادب سے مخاطب ہوا۔

''کیسے ہیں ایس ایچ او صاحب؟'' سہراب خان نے سلام کا جواب دیتے ہوئے ان کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''دعا ہے آپ کی خان۔'' وہ مسکرایا۔

''خیریت تو تھی، آج اتنی صبح......'' سہراب خان نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے پوچھا۔

''وہ خان......'' وہ ذرا آگے کی طرف جھکا۔

''خبر تو آپ تک پہنچ ہی گئی ہوگی۔'' سرگوشی کی۔

''کون سی خبر ایس ایچ او صاحب، کھل کر بات کریں، اپنا ڈیرا ہے۔'' وہ ویسے ہی پُراعتماد لہجے میں بولے تو...... وہ کھسیانہ سا سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

''خان...... شہباز خان کے کھیتوں میں رات

آگ بھڑک اٹھی تھی۔" اب کی بار اس کی آواز بھی دم دار تھی۔ سہراب خان سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"نقصان تو نہیں ہوا ناں......؟" وہ فکرمند تھے۔

"کافی نقصان ہو گیا ہے، کھڑی فصل تباہ ہو گئی ہے۔" وہ بغور سہراب علی خان کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہمیں ہمدردی ہے اُن سے...... جاؤں گا شام تک افسوس کرنے...... اور جو بھی مدد ہو سکی کروں گا۔" ان کے چہرے پر یہ سادہ سا تاثر تھا۔

"خان...... لیکن میں آپ کو یہ بتانے نہیں آیا؟" وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔

"صاف بات کرو ایس ایچ او......" وہ اب چڑنے لگے تھے۔

"گاؤں کے کچھ لوگوں نے آپ کے آدمی شاہ سوار کو دیکھا تھا موقع پر...... ان کو آپ کے آدمیوں پر شک ہے خان۔" پہلی بار سہراب خان کے ابرو تن گئے تھے لیکن چہرے پر سکون سا تھا۔

"میرے آدمی اس قدر ذلیل کام کیوں کرنے لگے جبکہ ہمارے ان سے اچھے خاصے تعلقات ہیں، رہی بات شاہ سوار کی تو وہ کسی کام سے شہر گیا ہوا ہے۔ اس کے اس کام میں ملوث ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ان کی آواز میں یقین تھا، ایس ایچ او اور الجھنے لگا تھا۔

"جو بھی ہے خان، ہمیں تفتیش تو کرنی پڑے گی، شاہ سوار اور آپ کے دوسرے آدمیوں سے بات، پوچھ گچھ......" وہ جیسے اجازت لے رہا تھا۔

"لاکھ بسم اللہ...... ہماری طرف سے آپ کو مکمل اجازت ہے۔" سہراب خان نے مونچھوں کو تاؤ دیتے جیسے انہیں خدا حافظ کہا تھا۔ وہ سر ہلاتا مڑ گیا۔ سہراب خان کی پیشانی پہ سلوٹیں نمودار ہوئی تھیں۔

☆☆☆

"مے آئی کم ان میم؟" بھاری مردانہ آواز پر سبھی کی نظریں دروازے کی سمت اٹھیں۔ آنکھوں میں ایک دم سے ہی ستائش سی ابھری تھی۔ بلیو جینز پہ بلیک شرٹ پہنے، آستینیں فولڈ کیے ضیا علی خان دروازے میں اِستادہ تھا۔

"ضیا بچے......" میڈم تبسم کے لب اسے دیکھ کر خود بخود مسکرا اٹھے تھے۔ صبح جب ان کی گاڑی راستے میں خراب ہو گئی تھی۔ تب اتفاقاً ضیا سے ان کی ملاقات ہوئی تھی اور اس کی گاڑی میں بیٹھ کر صرف بیس منٹ کی ڈرائیو میں وہ اس کی خوش مزاجی سے کافی امپریس ہو چکی تھیں۔

"آ جاؤ۔" انہوں نے اجازت دی۔ ایک ہاتھ میں ایک دو کتابیں تھامے وہ ایک شان سے چلتا اندر آیا تھا۔

"شہزادہ لگتا ہے قسمے......" نمرہ نے کتاب میں گم بیٹھی لالہ کو کہنی مار کے متوجہ کیا...... وہ چونک کر سامنے دیکھنے لگی۔ ٹھیک اسی وقت ضیا کی نگاہ بھی اس کی طرف اٹھی تھی۔ اور وہ رک گیا تھا۔

"یہ ہیں آپ کے نئے ساتھی، ضیا علی خان......" میڈم تبسم تعارف دینے لگیں۔

"کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر انہوں نے ہمیں لیٹ جوائن کیا ہے لیکن خیر دیر آید درست آید......" ان کے کہنے پر سبھی مسکرا دیے تھے۔ ضیا البتہ ابھی تک اسے ہی دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی سرمگی سی لو دیتی آنکھوں میں نہ جانے کیا سحر تھا۔ وہ زیادہ دیر اس کی طرف نہ دیکھ پائی تھی۔ نظریں جھکا گئی تھی۔

"have a seat Zia" میڈم نے اسے اجازت دی۔ لالہ نے جھکی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ سیاہ بوٹوں میں مقید قدم دھیرے سے آگے بڑھے۔ دانستہ یا نادانستہ جب وہ بالکل اس کے قریب سے گزرنے لگا تھا اس کا پین لالہ کے قدموں میں گر پڑا تھا، وہ رک گیا تھا۔ لالہ کا دل تیز، تیز دھڑکنے لگا۔ وہ جھکا، مہکتی خوشبو نے لالہ کو اپنے حصار میں لیا تھا۔ اس نے جھٹکے سے پاؤں پیچھے کیے تھے۔ ضیا نے پین اٹھایا اور پھر آگے بڑھ گیا...... لالہ البتہ دیر تک دل کو نہ سنبھال پائی تھی۔

☆☆☆

"ہاری......" وہ آفس میں لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔ جب خوشی سے چہکتی وہ اس کمرے میں داخل ہوئی۔ ہاری متوجہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنے کام میں بری طرح محو تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے انگلی سے ٹیبل بجائی۔ وہ چونکا اور سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

"کچھ لائی ہوں تمہارے لیے؟" اس نے دو پیکٹ اٹھا کر ٹیبل پر رکھے۔

"میرے لیے......؟" وہ حیران ہوا۔

"ہاں......" وہ مسکراتے ہوئے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"جانتے ہو ناں...... پاپا کچھ دنوں تک تمہاری پروموشن ڈکلیئر کرنے والے ہیں۔" دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر ان پر ٹھوڑی ٹکاتے وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"تو......؟" وہ ذرا سا پیچھے ہو کے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

"تو سمپل، اب ہر وقت تم اس سادہ سے لباس میں نظر نہیں آؤ گے۔"

"کیوں...... اس لباس میں کیا برائی ہے؟" اس نے مزید حیران ہوتے ہوئے اپنی سفید کاٹن کی شرٹ کے کالر چھوتے ہوئے پوچھا۔ وہ کھل کر مسکرا دی۔

"منیجر بن جاؤ گے اب تم...... مطلب سبھی کچھ اب تم ہیڈ کرو گے...... اور میں چاہتی ہوں کہ تم دور سے ہی پہچانے جاؤ...... وہ دیکھو سکندر انٹرپرائزز والا ہاریال ولی خان جا رہا ہے۔" اس کی آنکھوں میں عجیب سی لو جھلکنے لگی تھی۔

اس دفعہ مسکرانے کی باری ہاریال کی تھی۔

"میڈم، انسان لباس سے نہیں، اپنی قابلیت سے پہچانا جاتا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اپنی قابلیت سے میں ضرور ایک دن پہچانا جاؤں گا۔" اس کی آواز میں یقین تھا۔

"کچھ بھی ہو ہاری۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کل سے تم انہی کپڑوں میں آفس آؤ گے۔ کوئی بہانہ نہیں۔" وہ بائیں ہاتھ کی انگلی ہونٹوں پر سجائے گم سا بیٹھا رہا۔ وہ جاتے، جاتے مڑی۔

"میری بات مانو گے؟" ہمیشہ کی طرح حکم دے

کر وہ ایک مرتبہ پھر ملتجی انداز میں اس سے پوچھ رہی تھی۔ جیسے اسے یقین نہ تھا ہاریال اس کی بات مانے گا۔ ہاریال کھلکھلا دیا تھا۔

"شیور میم......" اس کے مؤدب انداز پر وہ پُرسکون سی ہو کر ہاتھ ہلاتی باہر چلی گئی۔ اور وہ پریشان سا اس کے دیے گئے گفٹس چیک کرنے لگا۔

☆☆☆

"امی......" آفس کے لیے نکلتے وقت اسے کچھ خیال آیا تو واپس کچن کی کھڑکی میں آ کر پکارا...... برتن دھوتی زرینہ کے ہاتھ ایک دم رکے تھے۔

"نانو کی طبیعت خراب تھی، میں جلدی آ جاؤں گا، آپ تیار رہیے گا پھر چلیں گے۔" حمزہ کی بات پر ان کا منہ بن گیا تھا۔ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی وہ باہر آئیں۔

"تمہیں بڑی خبر ہوتی ہے نانو کے گھر والوں کی۔" انہوں نے گھر والوں پہ زور دیتے ہوئے کہا۔ شک بھری نگاہ حمزہ کو گھور رہی تھی۔

"شاویز کا فون آیا تھا رات کو...... امی نے بتایا۔" بہ مشکل خود پر ضبط کرتے ہوئے اس نے نرمی سے جواب دیا تھا۔

"اور ہاں امی...... پلیز اُدھر کوئی ایسی بات مت کیجیے گا جس سے نانو خفا ہو جائیں۔" اس نے ہمیشہ کی طرح ماں کو ہدایت دی۔ وہ تو بھڑک ہی اٹھیں۔

"نانو خفا ہو جائیں یا تمہاری رانی......" تلخی سے کہا گیا۔

"پلیز امی......!" وہ انہیں روکتا بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

"اولاد ہو تم میری، ہر ایک رنگ سے واقف ہوں تمہارے۔" وہ تیزی سے کہتی اس کے پیچھے آئیں۔

"اور کسی غلط فہمی میں مت رہنا کہ وہ لالہ بی بی تم پر تھوکے گی بھی۔" حمزہ کے بڑھتے قدم ایک دم رکے تھے۔

"ارے کوئی اوباش امیر زادہ نہ پھنسا لیا ناں تو میرا نام بدل دینا۔" وہ ایک، ایک لفظ چباتے ہوئے بولیں۔ حمزہ بائیک کھڑی کر کے ان کے قریب آ کھڑا ہوا۔

"کسی کی بیٹی کے بارے میں بات کرتے ہوئے

آپ کو ذرا بھی خوف نہیں آتا کہ آپ کی بھی ایک بیٹی ہے۔'' وہ ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا تھا۔

''یہی تو فرق ہے۔'' انہوں نے لب کاٹتے ہوئے کہا۔

''وہ میری بیٹی ہے، سیمیں کی طرح کسی آوارہ عورت کی نہیں۔'' حمزہ کے لیے وہاں مزید رکنا دشوار تھا، مٹھیاں بھینچتا صحن میں پڑی پلاسٹک کی بالٹی کو زور دار لات رسید کرتا وہ بائیک کے پاس آیا تھا۔

''میرا انتظار مت کیجیے گا، میں کھانا باہر ہی کھالوں گا۔ مجھے دیر ہوجائے گی۔'' وہ بائیک لیے غصے سے کہتا باہر کی طرف بڑھا۔

''ہاں، ہاں ان منحوسوں کے بارے میں کچھ کہو تو غصہ تو تمہیں آئے گا ناں...... کالا جادو جو کیا ہے اس کلموہی نے۔'' وہ اس کے پیچھے، پیچھے آتے ہوئے بولیں۔ وہ بنا پلٹے تیزی سے گھر سے نکل گیا تھا۔

''رات کا کھانا بھی باہر ہی کھا کے آنا......'' دروازے کی اوٹ سے انہوں نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔ ''بلکہ ان چہیتوں کے گھر ہی کھانا۔'' ایک اور طنز میں بجھا تیر...... اس نے غصے سے مکا بائیک کو جڑ دیا تھا۔

☆☆☆

کلاس ختم ہوتے ہی وہ نمرہ کے ساتھ کینٹین جانے کے بجائے ڈیپارٹمنٹ کے پچھلے لان کی طرف آگئی تھی۔ ایگزامز سر پر تھے اور وہ جلد از جلد اپنے نوٹس مکمل کرنا لینا چاہتی تھی۔ اس طرف بہت کم لوگ آتے تھے سو فارغ وقت میں وہ کافی سارا کام نمٹا سکتی تھی۔ سنبل کے پیڑ کے نیچے سب سے بے خبر بیٹھی وہ کتابوں میں غرق تھی۔ اور نمرہ ائرفون لگائے گالوں پر سرد ھنتی چیونگم چباتی ارد گرد کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ وہ اس طرف پہلی بار آئی تھی اور وہ دل ہی دل میں اس بات پر افسوس کر رہی تھی۔ زیادہ لوگ نہ ہونے کی وجہ سے اس طرف نہ صرف سکون تھا بلکہ سبزہ بھی کافی تروتازہ تھا۔ یہاں اگلے لان کی نسبت پھلدار درختوں کی تعداد بھی کافی زیادہ تھی۔ اور سب پودے خزاں کی آمد پر بے حد حسین منظر پیش کر رہے تھے۔

''لالہ......'' اسے اچانک ہی خیال آیا۔ میوزک آف کرتے ہوئے اس نے کتاب میں گم لالہ کو مخاطب کیا جو ساتھ، ساتھ تیزی سے صاف اوراق کو رنگین بھی کیے جا رہی تھی۔

''ہم......'' اس نے ویسے ہی مصروف انداز میں جواب دیا۔ بنا اس کی طرف دیکھے۔

''تم نے ایک بات نوٹ کی۔'' ائرفون گھاس پر اچھالتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''نہیں......'' ویسے ہی مصروف انداز میں صاف جواب آیا۔

''لیکن میں نے نوٹ کی ہے ناں......'' وہ چڑ کر کہتے ہوئے اس کا شانہ ہلا گئی۔

''کیا ہے نمرہ......؟'' لالہ ناراض ہوئی۔ ''لکھنے دو جلدی...... ورنہ اہم پوائنٹس دماغ سے مس ہو جائیں گے۔'' اس کا ہاتھ اسی قدر تیزی سے چلتا رہا۔

''لالہ......'' اس نے پین لالہ کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ وہ بے بس نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ نمرہ کے چہرے پر ناراضی تھی لالہ مسکرائی۔

''اچھا بتاؤ۔'' وہ کتابیں سائڈ پر رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا نوٹ کرلیا تم نے؟'' بند مٹھی پر ٹھوڑی جمائے وہ اس سے پوچھنے لگی۔

''مجھے لگتا ہے ضیا علی خان تمہیں پسند کرنے لگا ہے۔'' اس نے اپنا قیاس بتایا اور لالہ کا تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''تمہیں بھی لگتا ہے ناں......؟'' کمال اعتماد سے پوچھا گیا۔

''اس بے ہودہ بات کے لیے تم نے میرے کتنے اہم پوائنٹس مس کر دیے۔'' لالہ اس کی بات کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے تاسف سے بولی۔

''یہ بے ہودہ بات نہیں ہے۔'' وہ کھوئے، کھوئے لہجے میں بولی۔

''نمرہ......'' شہادت کی انگلی دکھاتی لالہ تلملائی۔

''میں نے اکثر دیکھا ہے لالہ...... تم جہاں ہوتی ہو وہ وہیں پہنچ جاتا ہے۔ کلاس کے دوران بھی میں نے

دیکھا ہے اکثر وہ تمہیں دیکھتا رہتا ہے۔''

''اس کا مطلب تم اس کی طرف دیکھتی رہتی ہو۔'' لالہ نے دائیں آنکھ دباتے ہوئے اسے چڑھایا تھا۔ واقعی یا صرف بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔ نمرہ بھی نہ سمجھ سکی تھی۔

''شاید...... مگر میں نے ہمیشہ نہ جانے کیوں اسے تمہیں ہی کھوجتا ہوا محسوس کیا ہے۔'' نمرہ نے اس کی بات آرام سے ہوا میں اڑا دی تھی۔ اس بار لالہ خاموش رہی تھی کیونکہ واقعی یہ سچ تھا۔ وہ بالکل نہیں جانتی تھی کہ ضیا علی خان کون تھا...... لیکن وہ اتنا سمجھ سکتی تھی کہ وہ واقعی اس کی طرف متوجہ رہتا تھا۔

دانستہ یا نادانستہ کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کر جاتا کہ خود لالہ کو اپنا کردار مشکوک لگنے لگتا۔ وہ ہمیشہ اس سے کتراتی تھی۔ پہلو بچا کے نکل جاتی...... اسے یقین تھا اس طرح سوائے اس کے ضیا کی اس پیش رفت کا اندازہ اور کسی کو نہیں ہوگا۔ لیکن آج نمرہ کے منہ سے سن کر اسے حقیقی معنوں میں پریشانی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا یہ صرف اس کا اپنا وہم نہیں تھا۔ ضیا کو باقی لوگ بھی نوٹ کرنے لگے تھے۔

''ویسے سچ کہوں تو مجھے کافی اچھا لگتا ہے۔ تم دونوں کی جوڑی لگے گی شاندار......'' نمرہ کے شرارتی قہقہے پہ وہ چونکی تھی۔

''شٹ اپ نمرہ......'' غصے سے کہتی وہ کتابیں اٹھانے لگی۔

''اس میں شٹ اپ والی کیا بات ہے؟'' وہ منہ بنا گئی۔

''اگر آئندہ تم نے ایسی کوئی بھی بات کی جس میں، میں اور ضیا ایک ساتھ شامل ہوں تو ہماری دوستی ختم سمجھنا نمرہ......'' وہ بیگ اٹھاتی کھڑی ہوئی۔

''پاگل ہو تم......'' حیران سی نمرہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اتنی چھوٹی سی بات پہ دوستی ختم کرو گی؟'' اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

''چھوٹی سی بات تمہارے لیے ہے...... میں نہیں چاہتی میرے حوالے سے اس طرح کی باتیں پوری یونیورسٹی کی زبان پر آجائیں۔ ایک پل لگتا ہے ایسی باتوں کو پھیلنے میں نمرہ...... اور میرے خواب بہت اونچے ہیں اور ان خوابوں کے راستے میں کوئی ضیا علی خان نہیں آئے گا، نہ میں آنے دوں گی۔'' سخت لہجے میں کہتی وہ آگے بڑھی۔

''اچھا سوری......'' نمرہ نے فوراً معذرت کی تھی۔ اور اگلے ہی پل خود سے آگے جاتی لالہ سے ٹکرا کر رک گئی تھی۔ لالہ اچانک رکی تھی۔ تبھی وہ اس سے ٹکرا گئی تھی۔ اس نے حیرت سے سر اٹھایا تھا اور اگلے ہی پل لالہ کی طرح اس کے قدم بھی ساکت ہوئے تھے۔ بلیک کلر کی شلوار قمیص میں ملبوس وہ بلاشبہ ضیا علی خان ہی تھا۔ وہ بلاشبہ ساحر شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی آنکھوں میں جس قدر غرور تھا عنابی لبوں پر اسی قدر دوستانہ مسکراہٹ رقص کرتی رہتی تھی۔ تنے کالر کی بلیک قمیص شلوار میں ملبوس، آستین فولڈ کیے، سنہری روؤں والی کلائی پہ ڈارک براؤن کلر کے دھاگے میں محفوظ تعویذ باندھے بڑی شان سے اس نے وہی بایاں ہاتھ اسے دیکھ کر ہلایا

صبحِ امید

تنگ دستی میں دل شکستہ نہ ہوں......
آبِ حیات اندھیروں میں پوشیدہ ہوتا ہے

از: فرح طاہر، ملتان

کیسا سوال

ہمارے روٹھ جانے سے ہمارے ٹوٹ جانے تک
بتاؤ ساتھ دو گے کیا، تمہیں گر ہم پکاریں تو

از: حرا قریشی، ملتان

بھروسا

جب انسان اپنے رب پر اس قدر بھروسا کر لیتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی بھی اس کی ضرورت پوری کرنے والا نہیں تو اللہ بھی اپنے بندے کو مایوس نہیں لوٹاتا۔ اس کی دعا ضرور قبول کرتا ہے۔

از: ممتاز خانم، کراچی

تھا۔ جیسے وہ اس کا پرانا شناسا تھا۔

''میں نے کہا تھا ناں......'' نمرہ نے لالہ کے مزید قریب ہوتے ہوئے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ لالہ تیز قدموں سے آگے بڑھی۔ وہ سیڑھیوں کے قریب آئی۔

''لالہ......'' بالکل اچانک سامنے آکر پکارا گیا تھا۔ لالہ نے نظریں اٹھائیں۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اسی وقت شاہد اور ابراہیم بھی وہاں آگئے تھے۔

''اس بدتمیزی کا مطلب......؟'' لالہ نے غصے سے پوچھا۔

''میرے ساتھ چل کر ایک کپ کافی پیو گی۔''

اتنی دلیرانہ آفر پر لالہ کا چہرہ جہاں لال ہوگیا، نمرہ کا نہ جانے کیوں پورا منہ کھل گیا۔

''جہنم میں جاؤ تم......'' وہ سائڈ سے نکلتے ہوئے بھڑکتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تمہیں وہاں کافی پینی ہے تو جہنم ہی سہی...... ضرور چلوں گا۔'' اس کے ویسے ہی سادہ لہجے پہ شاہد اور ابراہیم کو ہنسی آگئی۔ نمرہ نے بہ مشکل اپنے قہقہے کا گلا دبا دیا تھا۔ لالہ نے البتہ اس دفعہ مڑ کر بھی نہ دیکھا تھا۔

''پاگل ہے ناں......؟'' لالہ کے ہم قدم ہوتے ہوئے اس نے جیسے تائید چاہی تھی۔

''بالکل بھی نہیں۔'' لالہ کے جواب پر اسے حیرت ہوئی۔

''بگڑے ماں، باپ کی بگڑی ہوئی اولاد ہے۔'' لالہ کے اگلے الفاظ پہ اس نے تائید میں سر ضرور ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

شاہ سوار ان کا سب سے قابل آدمی تھا...... اس نے سہراب علی خان کے لیے بڑے، بڑے کام کیے تھے۔ لیکن کبھی کسی کی نگاہوں میں نہیں آیا تھا۔ لیکن اس بار بازی بالکل الٹ گئی تھی۔ گاؤں کے کئی لوگوں نے اسے وہاں دیکھا تھا جہاں آگ لگی تھی۔ اپنے قبیلے کے لوگوں کو سنبھالنا زیادہ مشکل نہ تھا۔ لیکن مخالف قبیلے کا نقصان ہوا۔ اور ان کے لوگوں کو خریدنا ان کے بس میں بھی نہ تھا۔ تبھی انہوں نے فی الفور شاہ سوار کو شہر کے قریب ایک قدرے سنسان علاقے میں رہنے کی ہدایت کی تھی۔ اور ٹھیک دو دن بعد آج وہ خود بھی اس کچے پرانے کھنڈر نما مکان میں موجود تھے۔ شاہ سوار سر جھکائے شرمندہ سا کھڑا تھا۔

''اس واقعے سے میں کیا سمجھوں شاہ سوار؟'' مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے انہوں دائیں ہاتھ میں پکڑی چھڑی گھمائی۔ ''یہی کہ تم ناکارہ ہوگئے ہو۔'' ان کا لہجہ تلخ ہوا۔

''نہ خان......'' وہ ان کے قدموں پر گر پڑا۔

''ساری عمر آپ کی خدمت کی۔ آئندہ بھی کرتا رہوں گا۔ آپ حکم کریں خان، آپ کو میری ضرورت نہیں رہی۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لوں گا۔'' بھاری قد و قامت والا بھرپور مرد بچوں کی طرح ہاتھ باندھے رو رہا تھا۔ وہ ان کا وفادار آدمی تھا۔ انہیں کوئی شک نہیں تھا۔ وہ اگر اسے کہہ دیتے تو واقعی وہ اپنی جان بھی لے لیتا۔

''تمہارا گناہ اتنا بھی بڑا نہیں کہ اس کی سزا میں، میں اپنا اتنا قیمتی آدمی کھودوں۔ لیکن تم جانتے ہو، الیکشن قریب ہیں۔ ذرا سی بات سے کس قدر نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''اپنی غلطی مانتا ہوں خان...... شرمندہ ہوں میں۔'' وہ ہاتھ باندھے جھکا رہا۔

''یہ تو شکر ہے ایس ایچ او بکاؤ نکلا...... ورنہ اس بار واقعی مجھے تمہیں کھونا پڑتا۔'' ان کی آواز میں تاسف سا ابھرا۔ سرد سی لہر شاہ سوار کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا گئی۔ سہراب علی خان اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آئندہ خیال رکھوں گا خان۔'' وہ مزید جھکا۔

''خیال ہی رکھو تو اچھا ہے شاہ سوار...... آئندہ ایسی غلطی ہوتو میرے سامنے آنے کی غلطی نہ کرنا۔'' انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔

''حکم خان......'' وہ ہاتھ باندھے بولا۔ سہراب علی خان باہر کی طرف مڑے تھے۔ شاہ سوار کی اٹکی سانسیں پھر سے جیسے بحال ہوئی تھیں۔

(باقی آئندہ)



رواج

شمع تنویر

آج فریدہ بیگم کو اپنے شوہر جمال احمد بہت یاد آرہے تھے جنہیں راہیِ عدم ہوئے سال گزر گیا تھا۔ صبح سے شام ہوگئی تھی مگر فریدہ بیگم کی آنکھیں بار، بار نم ہوئی جاتی تھیں۔ موقع ہی کچھ ایسا تھا کہ جمال احمد کی کمی اتنی شدت سے محسوس ہونا ایک فطری بات تھی۔

کل ان کے بیٹے کی رسم مہندی اور پرسوں بارات تھی۔ کتنی بڑی خوشی تھی کہ ان کا لاڈلا خوبرو بیٹا دولہا بننے والا تھا، اس کے سہرے کے پھول کھل رہے

تھے بس ایک دن بیچ میں تھا کہ پھر ان کی بہو کے آجانے سے ان کے گھر میں رونق آجانی تھی اور پھر کچھ اور وقت گزرنے کے بعد پوتا، پوتی کی ننھی منی آوازوں اور چہکاروں سے ان کا گھر بج جائے گا، مکمل ہو جائے گا......بس یہیں تک سوچ کر بے حد خوشی کے ساتھ، ساتھ دل میں ہوک سی اٹھی۔

''آہ جمال احمد، آپ کو کتنا ارمان تھا اپنے پوتا پوتی کے ساتھ کھیلنے کا، سمیع کی نوکری لگتے ہی آپ اس کی شادی اور پوتا پوتی کی باتیں کر کر کے کتنے خوش ہوتے تھے......اور یوں اچانک چلے گئے۔''

دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونک کر اپنے ماضی سے باہر آئیں۔ جلدی، جلدی دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کیے اور بظاہر مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا۔ جانتی تھیں کہ سمیع آفس سے آیا ہوگا اور اس کے سامنے وہ اس خوشی کے موقع پر بالکل نہیں رونا چاہتی تھیں مگر سمیع ماں کا چہرہ دیکھ کر ایک لمحے میں ہی سمجھ گیا کہ وہ دن بھر روتی رہی ہیں، اپنے لیے باپ کے ارمانوں سے تو وہ خود بھی واقف تھا سو ماں کو ساتھ لگا کر تسلی دیتے خود اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

''ایک خلش اور بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔'' فریدہ بیگم بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

''وہ کیا......؟'' سمیع نے نرمی اور محبت سے پوچھا۔

''بیٹا ہم تمہارے ابو کا صحیح طرح علاج نہ کروا سکے۔'' وہ پُرملال لہجے میں بولیں۔

''امی! ایسا کچھ نہیں ہے، ہم نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر کوشش کی ابو کی صحت یابی کے لیے......بس وہ اتنی ہی عمر لکھوا کر لائے تھے۔'' سمیع ماں کو سمجھاتے ہوئے بولا۔

''بیٹا دعاؤں سے تو تقدیر بھی بدل جاتی ہے مگر ساتھ تدبیر کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور تم تو جانتے ہو اس وقت کے حالات......'' فریدہ بیگم اتنا کہہ کر خاموش ہو گئیں تو وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

''میں تو ہوں ناں آپ کے پاس آپ کا خزانہ۔'' اس نے قصداً موضوع بدلا۔

''ہاں میرے بچے میرا خزانہ، سونا چاندی ہیرا موتی میری خوشی، میرا سکون تم ہی تو ہو۔'' وہ محبت سے بولیں۔

''اور میری خوشی اور سکون آپ ہیں امی......پلیز آپ رویا مت کریں۔'' سمیع نے ماں کو عقیدت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا یہ بتاؤ کل کے انتظامات تو پورے ہو گئے ناں......'' فریدہ بیگم اس غمزدہ کیفیت سے باہر آ گئیں تو سمیع کے دل کو بھی سکون محسوس ہوا اور وہ فریدہ بیگم کو تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

☆☆☆

رات بڑے خوشگوار ماحول میں دونوں ماں، بیٹا کھانا کھا رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

سمیع نے جا کر دروازہ کھولا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، اس کے چچا، تایا اور دونوں پھوپیاں مع سارے کزنز دروازے پر موجود تھے۔

''السلام علیکم۔'' اس نے پُرجوش انداز میں سلام کیا تو کورس میں جواب بھی ملا اور ساتھ ہی ڈھیروں دعائیں بھی...... وہ ان سب کو لیے اندر چلا آیا جہاں فریدہ بیگم کھانے کے برتن سمیٹ رہی تھیں۔ ان سب کو اس طرح اچانک دیکھ کر فریدہ بیگم خوشی سے کھل اٹھیں۔

''دل خوش ہو گیا......میرے تو گھر کی رونق... دوبالا ہو گئی آپ لوگوں کے آنے سے۔ فریدہ بیگم بڑھ کر جیٹھانی دیورانی اور نندوں سے گلے ملیں۔ جیٹھ کو سلام کیا، دیور کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا، کچھ دیر یونہی باتیں ہوتی رہیں پھر وہ کھانا کھانے کے لیے اصرار کرنے لگیں تو سب نے کھانے سے تو معذرت کر لی کہ کھا کے آئے ہیں تاہم چائے، ناشتے اور کولڈ ڈرنک سے سب کی تواضع ضرور کر دی گئی۔

جب فریدہ بیگم فرحت سے ان کے پاس آکر بیٹھیں تو ان سب کی آمد کا اصل مقصد کھلا۔

''بس ہم نے سوچا کہ کل تو مہندی ہے اور بھی بہت لوگ ہوں گے اپنے فریضے سے ہم آج ہی نمٹ

جائیں۔'' بڑی نند بولیں۔

''کیسا فریضہ آپا......؟'' فریدہ بیگم ناسمجھی سے بولیں۔

''ارے بھئی اپنے شہزادے پر کچھ حق ہم بھی تو رکھتے ہیں یا نہیں؟'' فریدہ بیگم کے جیٹھ کمال احمد بھتیجے کو خود سے لپٹاتے ہوئے بولے۔

''کیوں نہیں بھائی صاحب......آپ کا ہی تو حق ہے۔'' فریدہ بیگم جلدی سے بولیں۔

''بس تو پھر اس کے ولیمے کا کھانا میں کروں گا۔'' انہوں نے استحقاق بھرے انداز میں کہا۔

''اور یہ پچیس، پچیس ہزار ہماری طرف سے۔'' نندوں نے شادی مبارک کے گلابی، گلابی لفافے ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''اور بھابی......میرے پیارے بھتیجے کے لیے یہ چھوٹا سا تحفہ میری طرف سے۔'' نوٹوں سے پھولا ہوا ایک لفافہ ان کے دیور نہال احمد نے ان کے حوالے کیا۔

''اور یہ منہال نے بھجوایا ہے وہ کل آئے گا۔'' مزید ایک لفافہ ان کے سپرد کیا گیا......مگر وہ لفافے لینے میں پس وپیش سے کام لے رہی تھیں۔

''بھئی کیش تحفے ہم اس لیے دے رہے ہیں کہ آپ کے کام آجائے سو اخراجات ہوتے ہیں شادی کے......کوئی آسان تھوڑی ہے آج کل کے دور میں شادی کرنا۔'' دیورانی ان کی جھجک دیکھ کر بولیں۔

''مگر یہ سب بہت زیادہ ہے......میں نے تو کمیٹی ڈالی ہوئی تھی سمیع کی شادی کے لیے، وہ بروقت مل گئی ہے......کوئی پریشانی والی بات نہیں ہے۔ آپ لوگ اتنا مت کریں۔'' فریدہ بیگم ہچکچا کر بولیں ہرچند کہ جانتی تھیں سسرال والے صاحبِ حیثیت ہیں۔

''اس کا مطلب ہے کہ جمال احمد کے بعد ہمارا کوئی حق نہیں اپنے بھتیجے پر۔'' کمال احمد ناراضی سے بولے۔

''ایک منٹ بھائی صاحب......'' فریدہ بیگم کی چھوٹی نند صالحہ جو بڑی دیر سے خاموش بیٹھی تھی، اس نے اپنی خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ مرحوم جمال احمد تمام بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ نزدیک اپنی اسی بہن سے تھے۔ اور صالحہ کو بھی اپنے اس بھائی سے سب سے زیادہ پیار تھا۔

''بھابی آپ مجھے ایک بات بتائیں......میری بیٹی کی شادی پر جمال بھائی نے کیا دیا تھا۔'' صالحہ نے پوچھا۔

''فرنیچر۔'' فریدہ بیگم آہستگی سے بولیں۔

''جی ہاں! اسی طرح آپا کے داماد کو سلامی میں موٹر بائیک اور بھائی صاحب کی زارا کی شادی پر فریج اور نہال کے بیٹے کی مہندی کا کھانا کیا تھا۔'' صالحہ

نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا تو فریدہ بیگم کو وہ وقت یاد آیا...... جب کتنی دقتوں سے کمیٹیاں ڈال، ڈال کر ان میاں بیوی نے اپنی عزت کا بھرم رکھا تھا۔

''واقعی جمال نے ہمیشہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر کیا۔'' کمال احمد نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا تو بڑی نند بھی چھوٹے بھائی کی یاد میں پھپک کر رو دیں۔

نہال احمد بڑھ کر بڑی بہن کو تسلی دینے لگے مگر فریدہ بیگم جو صبح سے آنسو بہا رہی تھیں...... اس وقت...... اس سوگوار ماحول میں، خشک آنکھوں کے ساتھ نہ جانے کس گہری سوچ میں گم تھیں چہرے پر غم و درد کے آثار نمایاں تھے۔

☆☆☆

رات کے گیارہ بجے یہ لوگ رخصت ہوئے ہی تھے کہ فریدہ بیگم کے اپنے بہن، بھائی اپنی، اپنی گاڑیوں میں آگئے...... اپنی گاڑی والوں کے لیے رات کیا، دن کیا......

اپنے بھائی بہنوں کو دیکھ کر فریدہ بیگم خوش تو بہت ہوئیں مگر وہ جو دل میں ایک گوشۂ غم تھا وہ یونہی دکھتا رہا۔ کولڈ ڈرنک سے تواضع کے بعد سمیع سب کے لیے میٹھے پان لے آیا تھا۔ بھانجے، بھانجیوں اور بھتیجے، بھتیجیوں نے مل کر ڈھولک بھی بجایا گانے بھی گائے خوب رونق میلا لگا...... لیکن جب جانے لگے تو ان کے آنے کا اصل مقصد بھی عیاں ہو گیا۔

سب نے اپنے، اپنے لفافے فریدہ بیگم کو دیے...... لاکھ فریدہ بیگم منع کرتی رہیں مگر سب کی اپنی، اپنی بولیاں......

''پاگل ہوئی ہو فریدہ یہی تو موقع ہوتا ہے اور یہی رواج بھی ہے۔'' بڑی بہن ڈپٹ کر بولیں۔

''اور پھر کبھی جمال احمد اور تم نے کمی کی دینے دلانے میں؟'' بڑے بھائی نے بھی یاد دلایا۔

''ارے بھئی یہ تو قرض حسنہ ہوتا ہے۔'' چھوٹی بہن نے کہا۔

''اور باجی یہ دستورِ زمانہ ہے ہم کون سا انوکھا کام کر رہے ہیں۔'' چھوٹی بھاوج بھی بولیں۔

''اور اس موقع پر اپنے ساتھ نہیں دیں گے تو کون دے گا۔'' بڑی بھاوج ملائمت سے بولیں۔

ان سب کے جملے فریدہ بیگم کے دل کے اس گوشۂ غم کو تسکین پہنچانے کے بجائے مزید دکھی کرتے گئے وہ چپ کی چپ بیٹھی رہیں سمیع ماں کی اس کیفیت کو ناسمجھی سے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

سب چلے گئے تھے مگر فریدہ بیگم کی چپ نہ ٹوٹی۔ وہ کاغذ کے ان نوٹوں کو دیکھ رہی تھیں جو سمیع نے گن کر ایک ساتھ کر کے ان کے حوالے کیے تھے۔

سسرال اور میکے سے تحفتاً آگئی ہوئی یہ رقم مجموعی طور پر دو لاکھ کے لگ بھگ تھی یہ حقیقت تھی کہ جمال احمد نے اپنی سفید پوشی کے باوجود بھی خاندان میں دینے دلانے میں کمی نہیں کی تھی۔ قرض ادھار بھی نہ کیا بس اپنی ضرورتوں کو محدود رکھ کر چلے، اکلوتا ایک بیٹا تھا اس کی تعلیم و تربیت بھی فریدہ بیگم کے سلیقے اور جمال کی سمجھ بوجھ سے بہت اچھی ہو رہی تھی وہ خود ایک سرکاری دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ دن میں دفتر اور شام کو واپسی کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اپنی چھوٹی سی پرچون کی دکان کھول کر بیٹھ جاتے، جو گھر کے باہر ہی تھی۔ اللہ نے اسی میں برکت دے رکھی تھی...... پھر اللہ جانے کیسی ہوا چلی کہ جمال احمد کو فالج اور سینے کے انفیکشن نے ایک ساتھ گھیر لیا۔

''آہ......'' فریدہ بیگم نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''امی کیا ہوا ہے آپ کو...... ! جب تایا لوگ آئے تھے جب بھی آپ تھوڑی ہی دیر بعد ایک دم اداس ہو گئی تھیں اور پھر جب خالہ، ماموں وغیرہ آئے تو آپ اور زیادہ خاموش ہو گئیں... کیوں؟'' سمیع ماں کی یہ کیفیت دیکھ کر پریشان تھا۔

''بیٹا یہ پیسے دیکھ رہے ہو؟'' فریدہ بیگم نے سوال کیا۔

''جی...... تو کیا ہوا اگر ان لوگوں نے پیسے دیے بھی ہیں تو رواج ہے امی۔ میرے ابو بھی سب جگہ دے کر آتے تھے۔''

''بیٹا یہ سارے لوگ ہمارے اپنے تھے جو رواج کے مطابق پیسے دے کر چلے گئے ہیں۔'' فریدہ بیگم عجیب سے انداز میں بولیں۔

''جی امی یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ انہوں نے کوئی احسان تھوڑی کیا ہے ہم پر۔'' سمیع انہیں سمجھانے والے انداز میں بولا۔

''کاش بیٹا وہ ہم پر احسان ہی کر دیتے اس وقت...... جب ہمیں اس احسان کی شدید ضرورت تھی۔'' فریدہ بیگم نے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔

''تمہیں یاد ہے بیٹا تمہارے ابو گیارہ دن اس پرائیویٹ اسپتال میں ایڈمٹ رہے اس دوران کون سا ٹیسٹ تھا ان کا جو ڈاکٹروں نے نہیں کیا...... کتنی مہنگی، مہنگی دوائیاں اور انجکشن تھے جو اُن کے لیے بے حد ضروری تھے۔ ادھر اسپتال کے چارجز الگ......'' فریدہ بیگم اتنا کہہ کر خاموش ہو گئیں جیسے مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں رہی ہو۔

''جی امی...... ! ابو کو کوئی معمولی فالج نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹرز یہی تو کہہ رہے تھے انہیں بہت میرلیس فالج کا اٹیک ہوا تھا جس سے ان کا دماغ بھی متاثر ہوا تھا لیکن صرف پہچاننے کی حد تک...... اور وہ بھی صحیح ہو جاتا اگر آفس والوں کی طرف سے پینل کی سہولت ہمیں بروقت مل جاتی۔'' سمیع پر تاسف انداز میں بولا۔

''بیٹا شادی کے لیے انسان پہلے سے پلاننگ کرتا ہے انتظام کرتا ہے مگر بیماری ایک ناگہانی آفت کی طرح آتی ہے، اس کے لیے پہلے سے کچھ انتظام نہیں ہوتا۔ پندرہ دن پہلے ہی ہم نے آپا کے داماد کو سلامی میں بائیک دی تھی۔ ہم اس وقت بالکل خالی ہاتھ تھے جب تمہارے ابو کو بیماری نے آن گھیرا، میرا زیور بیچ کر اسپتال کا بل ادا کیا گیا...... اور ہم ڈاکٹرز کی مرضی کے خلاف تمہارے ابو کو گھر لے آئے کیونکہ اسپتال کا مزید بل ادا کرنے کی ہماری سکت نہیں تھی اور گورنمنٹ اسپتال میں تو کسی ڈاکٹر نے سیدھے منہ ہم سے بات ہی نہیں کی تھی۔'' فریدہ بیگم کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔

''جی امی انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ بیڈ خالی نہیں ہے۔'' سمیع کو آج بھی اس ڈاکٹر کا سفاک انداز تکلیف پہنچاتا تھا۔

''بیٹا، ہم تمہارے ابو کو گھر کیوں لائے؟ سب ہماری مجبوری جانتے تھے، سب رشتے داروں کو علم تھا کہ ہم پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے مجبور ہیں مگر ہمارے اس اقدام پر سب کے سب خاموش رہے جو بولتا اسی کو دینا پڑتا...... یا وہ اس انتظار میں تھے ہم خود اُن کے سامنے ہاتھ پھیلاتے۔ تمہاری شادی کے لیے تو میں نے کمیٹیاں ڈالی ہوئی تھیں، سب انتظام ہو گیا۔ مگر بیٹا بیماری کا تو کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا...... اس کے لیے پہلے سے کچھ تیاری نہیں کی جاتی جو پیسہ تھا وہ اس وقت رشتے داروں کی شادی میں لگ گیا تھا۔ ہمیں ان پیسوں کی ضرورت تو اس وقت تھی میرے بچے...... رواج یہ کیوں ہے کہ شادی پر ہی لفافے دیے جائیں...... رواج یہ کیوں نہیں ہے کہ کسی کے اچانک اتنے شدید بیمار ہو جانے پر لفافے دیے جائیں۔'' اتنا کہہ کر وہ بھی پھوٹ، پھوٹ کر رو دیں۔ سمیع آزردہ سا بیٹھا تھا...... وہ ماں کی کہی ہر بات سے سو فیصد متفق تھا۔

''واقعی ہم لوگ جب کسی کی شادی یا خوشی میں جاتے ہیں تو پیسوں کا ایک لفافہ اپنے ہمراہ ضرور لے کر جاتے ہیں لیکن جب ہمارا کوئی عزیز، رشتے دار یا پڑوسی اسپتال میں زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے اور ہم عیادت کے لیے تو ضرور ہی جاتے ہیں پر زیادہ سے زیادہ جوس کے پیکٹ یا پھل، بسکٹ وغیرہ جو وہ اس وقت فوری کھا پی بھی نہیں سکتا...... اس وقت ہم لفافے کو ضروری نہیں سمجھتے...... جبکہ اس وقت مریض کے گھر والوں کو پیسوں کی از حد ضرورت ہوتی ہے۔'' سمیع اپنی ہی سوچ پر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا تھا۔



امرت

شیریں حیدر

قسط 13

تخلیقِ کائنات سے لے کر اب تک . . . کئی ادوار بدلے مگر عورت کی کہانی ہر دور میں لگ بھگ وہی رہی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رشتوں کی ڈور میں باندھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو اور بھی خوب صورت بنائیں مگر اس کے پیدا کردہ دل میں جذبے بھی اسی کے پیدا کردہ تھے۔ محبت ،نفرت، رشک، حسد، رنج، غصہ اور خوشی . . . اب ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم کس جذبے کو خود پر حاوی کرلیتے ہیں، یہ ہماری خصلت بن جاتا ہے اور ہماری کل شخصیت کا خلاصہ . . . یہی ہمارے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور ہم اسی کا تاثر دوسروں پر عمر بھر کے لیے چھوڑتے ہیں - ہماری عادات صرف ہم پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ کسی کی زندگی کا سفر کس طرح سہل یا کٹھن ہوتا ہے اس کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اُن کی زندگی کے اہم کردار ہوتے ہیں اور جن کا ہونا یا نہ ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ پیدائش سے لے کر اپنی موت تک رشتوں کی ڈور سے بندھے ہوئے کردار زندگی کو ہنس کر گزارتے ہیں یا رو کر، مشقت سے سانس لیتے ہیں یا خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے ہوئے اس کا سارا دارومدار ان سے وابستہ رشتوں پر ہوتا ہے ۔ وقت بدل جاتے ہیں مگر کہانی وہی رہتی ہے اور اپنی باری سے اس میں مختلف کردار شامل ہوتے رہتے ہیں۔

زندگی کے انہی پیچ و خم اور نشیب و فراز سے نبرد آزما ہوتی ایک چشم کشا تحریر ......



چپ رہنے والو، چپ کب تک!

"میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں امرت!" وہ میرے پلنگ کے پاس زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا، اس کی آنکھیں شدتِ ضبط سے یا کسی اور وجہ سے لال ہو رہی تھیں۔

"کس بات کی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھ سے غلطی ہوگئی، میں نے تم پر ہاتھ اٹھایا!"

"تو؟" میں نے سوال کیا۔

"میں معافی مانگتا ہوں اپنے کیے کی۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"معافی کا کوئی مطلب ہوتا ہے زین اور اس سے مشروط کچھ وعدے....." میں کافی دنوں سے اس خاموش جنگ سے اکتا گئی تھی اور اتنا کافی تھا کہ وہ مجھ سے معافی مانگ رہا تھا۔

"میں سمجھا نہیں؟"

"معافی مانگنے والا جب اپنی غلطی تسلیم کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کردو اور اگر مجھے معاف کردو تو یہ غلطی میں نہیں دُہراؤں گا۔" میں چاہے نیند سے جاگی تھی مگر میرے حواس پوری طرح بیدار تھے اور میں نے جو کچھ اتنے دنوں سے سوچا تھا کہ کسی اچھے موڈ میں یا مناسب وقت دیکھ کر میں اس سے بات کروں گی، اس کا موقع مجھے مل گیا تھا۔

"ہاں میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔" اس نے فوراً کہا۔ "بہت بڑی بے وقوفی ہوگئی، میں برا انسان نہیں ہوں، بس اپنے حواس میں نہیں تھا ورنہ میں عورت پر ہاتھ اٹھانے کو تو مرد کی سب سے بڑی کمزوری سمجھتا ہوں.....اور غصے میں جانے کیا، کیا بکواس بھی کردی میں نے، مجھے معاف کردو امرت!"

"بس؟" میں نے اپنے گھٹنے پر رکھا ہوا اس کا ہاتھ اٹھایا اور اٹھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

"بس نہیں تو اور کیا؟ کیا میں ناک زمین پر رگڑوں؟" وہ بپھرا، کتنی دیر اپنے اصل چولے کے بغیر رہ سکتا تھا۔

"بس تم اس چیز کی معافی مانگ رہے ہو کہ تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا، مجھے بدکردار اور بدچلن کہا؟" میں نے پوچھا۔

"اور کیا، کیا ہے میں نے تمہارے ساتھ؟" اس نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

"تم شراب پیتے ہو اور تمہارے گھر سے باہر نا.....غلط تعلقات اور دوستیاں ہیں۔" میں ناجائز کہتے، کہتے رک گئی۔

"تو اس میں تمہارے ساتھ کیا برا کیا ہے؟ یہ تو میرے ذاتی فعل ہیں۔" اس نے دھڑلے سے کہا۔

"یہ سب گناہ ہے زین، میرے ساتھ ہی تو برا ہے کہ میرا شوہر اچھے کردار کا حامل نہیں ہے، میں کسی کو یہ نہیں کہہ سکتی کہ میرا شوہر ایک شریف آدمی ہے۔" میں نے رسان سے کہا۔

"تم لگے لپٹے الفاظ میں مجھے گناہ گار، بدکردار اور بدمعاش کہہ رہی ہو؟" اس نے فوراً سارے الفاظ کے متضاد ڈھونڈ لیے تھے۔

"میں نے صاف الفاظ میں کہا ہے جو بھی کہنا تھا....." میں نے اپنا غصہ ضبط کر کے جواب دیا۔

"تم چاہتی کیا ہو؟" میرے کندھے پر اس کی گرفت ہرگز نرمی لیے ہوئے نہ تھی۔

"میں چاہتی ہوں کہ تم اس وقت مجھے تنہا چھوڑ دو..... میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں، مجھے مزید اذیت نہ دو۔" میں سسکی۔

"تم ناخوش ہو میرے ساتھ.....اذیت میں ہو.....میرا بچہ پیدا نہیں کرنا چاہتیں.....اس روز تم نے کہا کہ کاش تم نے اس شادی سے انکار کردیا ہوتا.....تمہارا اصل مسئلہ کیا ہے؟ کیوں تم مجھے اس حد تک زچ کررہی ہو کہ میں تنگ آ کر تمہیں چھوڑ دوں؟ مجھے علم تو ہو کہ کون ہے جس کی خاطر تم مجھے چھوڑنا چاہتی ہو؟" اس نے میرے اندر باہر سے دکھتے ہوئے وجود کو جھنجوڑا۔

"میرا بازو چھوڑو زین ورنہ میں چاچو کو بلا رہی ہوں۔" میں نے کسی بچی کی طرح اسے دھمکی دی۔

"بلاؤ اپنے چاچو کو..... جیسے میں ان سے ڈرتا ہوں ناں.....سانپ ہی تو ہیں جو ہمارے خزانے پر کنڈلی مار کر بیٹھے ہوئے ہیں.....مما کہتی ہیں کہ ان کے بیٹھے ہوئے ہمیں کچھ نہیں ملنے والا.....تو جس سانپ کے بیٹھے ہوئے کچھ نہ ملے، اس کی تو گردن مروڑ دینی چاہیے۔" وہ بن پیے ہوئے بھی بہکا ہوا تھا۔

"مجھے چھوڑو زین!" میں نے اپنے لہجے میں ذرا نرمی پیدا کی۔

"تمہیں چھوڑنا ہی تو نہیں ہے.....تم تو وہ طوطا ہو جس میں جن کی جان ہے۔" وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنسا۔

"تم معاف کردیتیں تو بہتر ہوتا.....مما نے بتایا تھا کہ اب تمہارے بچنے کے چانسز بھی کم ہیں..." اس نے چچ چچ کر کے کہا اور میری آنکھوں میں جھانکا۔ "تم خوفزدہ ہو مرنے سے؟" اس نے سوال کیا۔

"میں تو ہر روز مرتی ہوں زین!" میں نے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا۔

"پتا ہے کیا.....میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ اللہ تمہاری طرف ہے، تمہارے دل کی ہر خواہش پوری ہوتی رہی ہے، تم نے سرمد سے شادی سے انکار کیا، تمہاری مان لی گئی۔ تم نے مجھے ملنے کے بعد دل میں دعا کی ہوگی کہ میں تمہیں مل جاؤں، تمہاری یہ خواہش بھی پوری ہوئی.....میں نہیں چاہتا تھا کہ اس سمجھوتے کی شادی کے نتیجے میں کوئی بچہ پیدا ہو مگر تم شاید چاہتی تھیں تو ساری احتیاط کے باوجود بھی یہ بچہ پیدا ہونے جارہا ہے بلکہ مما نے بتایا ہے کہ شاید وقت سے پہلے ہی....."

"ہاں مجھے فخر ہے کہ میرا اللہ میری طرف ہے مگر تم بہت سی خوش گمانیوں میں مبتلا ہو....."

"مجھے سب سے زیادہ مشکل لگتا تھا اس صورتِ حال کا سامنا کرنا کہ جب میں دوسری شادی کی بات کرتا تو پاپا کا کیا ردِعمل ہوگا مگر اب میں کچھ انتظار کرلوں گا تو خود ہی ایسی صورتِ حال بن جائے گی۔" اسے پوری امید تھی کہ میں مرنے والی تھی، یقیناً کینسر کا نام ہی ایسا ہے کہ سننے والا اس کی زندگی سے مایوس ہوجاتا ہے۔ "اب لگتا ہے کہ اللہ میری طرف ہے۔"

"ہاں تم سارے کام جو اللہ کو خوش کرنے والے کرتے ہو۔"

"ویسے تم نے بھی تو دعائیں کی ہوں گی کہ تمہاری جان مجھ سے چھوٹ جائے تو دیکھ لو کیا ہوا۔" وہ کہتا ہوا غسل خانے میں چلا گیا۔ میرا دل چاہا کہ دھاڑیں مار، مار کر روؤں، زین کی بے حسی اور اس کی گھٹیا سوچ، اس بچے کی ممکنہ معذوری یا موت.....اتنا بڑا دکھ تھا کہ سہانہ جارہا تھا۔ میں زندگی میں بہت کچھ ایسا کھو کر بھی زندہ رہی تھی جس کے بغیر جینا ممکن نہیں لگتا تھا مگر اب ان حالات میں لگتا تھا کہ سانس ابھی سے رکنے لگی۔ اس بے حس انسان کے ساتھ رہتے ہوئے تو مجھے چار آنسو بہانے کو کندھا بھی میسر نہ تھا۔ شکر ہے کہ تمنا آگئی تھی اور اس نے ہی امو جان کو فون کر کے صورتِ حال بتائی تھی کہ میرے بچے کی قبل از وقت پیدائش متوقع تھی، میری بیماری کے بارے میں اس نے رسولی کا لفظ استعمال کیا تھا، کینسر کا کہتی تو وہ سفر کر کے یہاں تک پہنچ بھی نہ پاتیں۔

تمنا کے بتانے پر ہی امو جان، کبیر بھائی، فاطمہ اور کمیل سب آرہے تھے، ماما نے ان کے لیے خصوصی کھانوں کا مینیو مقبول چاچا کو دے دیا تھا اور ساجدہ سے کہہ کر مہمان خانے کے سب کمرے تیار کروا دیے تھے۔ تمنا کو تو حسنہ نے

اپنے کمرے میں ہی ٹھہرانا تھا۔ لاہور سے میثاق بھی گاڑی پر روانہ ہو گیا تھا اور اسی روز شام کو پہنچ رہا تھا۔ مجھے سب کا یوں آنا حوصلہ دینے کے بجائے خوفزدہ کر رہا تھا۔ ہمیشہ سے ہی میں ایسی ہوں کہ چاہے جتنی بھی بیمار ہوتی، خود کو مضبوط رکھتی اور حوصلے سے بیماری کا مقابلہ کر رہی ہوتی تھی تاوقتیکہ کوئی مجھ سے پوچھے کہ کیا میں بہت تکلیف میں ہوں۔ اس وقت ضبط اور برداشت کے سارے بند ٹوٹ جاتے اور ساری بہادری ہوا ہو جاتی۔ اب بھی یہی ہو رہا تھا کہ جوں جوں اپنے سارے پیارے جمع ہوتے جا رہے تھے، میں کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ اس پر آخری ضرب شامیر کی کال نے لگائی۔ کال کی کوالٹی اچھی نہ تھی، ٹوٹی پھوٹی سی سمجھ آ رہی تھی۔

''پریشان نہیں ہونا میری پیاری اور بہادر بہن...... ہمیں دیکھو، ہم ہر وقت موت سے مقابلہ کر رہے ہوتے ہیں، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بیٹھے ہوتے ہیں، جانتے ہیں کہ کوئی پل ہماری سانس کی رواں تار کو توڑ دے گا مگر ہم مضبوط ہیں، تم نے بھی بہادری سے اس جنگ کو لڑنا ہے۔ تم تنہا نہیں ہو، سب تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو اپنے پیاروں سے کتنا دور بیٹھے ہوتے ہیں۔ موت کو محبوبہ بنا کر رکھتے ہیں تو محبوبہ کی طرح نخرے کرتی اور وہ ہم سے دور بھاگتی رہتی ہے مگر کب تک، ایک نہ ایک دن تو اسے ہمارے پاس آنا ہی ہوتا ہے ناں!'' اس کا کہنا تھا کہ میں بلک، بلک کر رونے لگی۔ سب لوگ پریشان ہو گئے کہ جانے شامیر نے کیا کہہ دیا تھا۔

مجھے اپنی بیماری، زندگی، موت اور بچے سے بڑھ کر اس وقت اپنے بھائی کی زندگی کا خیال آیا اور میں خود پر قابو نہ رکھ سکی تھی۔ سب لوگ مجھے چپ کروا رہے تھے، دلاسے دے رہے تھے اور اپنے طریقے سے مجھے بہادر بننے کو کہہ رہے تھے۔ زین کو اس وقت بھی مجھ سے زیادہ اہم کوئی مصروفیت تھی۔ مگر مجھے اب اس کی اتنی پروا نہیں تھی، اس کے دل میں کوئی اور بس رہی تھی اور اس نے مجھ سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ وہ صرف چاچو کا......... خدانخواستہ، میں اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی کہ چاچو ہی اس گھر میں میرے لیے مضبوط سہارا تھے۔ میں اپنے باپ کی خواہش کا مان کیسے رکھتی جو چاچو نہ ہوتے اور یوں بھی زین کا یوں واضح کر دینا اس بات کا صاف اعلان تھا کہ ان کے بعد میری اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ وہ دل کے مریض تھے اور ان کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ حالانکہ کسی بیماری میں مبتلا ہونا کوئی ایسی وجہ ہے بھی نہیں۔ ابو جان کون سا کسی بیماری میں مبتلا تھے، ان کی زندگی بھی تو ایک حادثے کا شکار ہو کر چلی گئی۔ 'اللہ میرے باپ جیسے چاچو کو سلامت رکھے!' میں نے ان کے لیے دل سے دعا کی تھی۔

☆☆☆

''چاچو......'' میں نے انہیں اس وقت کال کی جب وہ دن کے وقت اپنے کمرے میں تنہا تھے۔ چھٹی کا دن تھا، باقی سب لوگ لاؤنج میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ''مجھے آپ سے ایک بات کہنا تھی.. بلکہ ایک درخواست کرنا تھی۔''

''کہو بیٹا...... کچھ پیسوں کی ضرورت ہے؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''نہیں چاچو......'' میں نے فوراً کہا۔

جب میں ان سے کوئی بھی بات کرنا چاہتی تھی تو ان کے ذہن میں پہلا خیال یہی آتا تھا بلکہ میں نے نوٹ کیا تھا کہ جب بھی چاچو سے کوئی یوں کہتا کہ اسے چاچو سے کوئی اہم بات کرنی ہے تو چاچو کا پہلا سوال یہ ہوتا تھا کہ اسے رقم کی ضرورت تو نہیں۔ آہستہ، آہستہ مجھے احساس ہونے لگا کہ واقعی ان کے اور ان کے بچوں کے مابین رشتے میں پیسہ بہت اہم تھا۔ ان کے ہاں ہر جھگڑے اور بحث کی بنیاد پیسہ ہوتا تھا۔ شاید اس لیے کہ انہیں خاندانی اقدار کو چھوڑ کر پیسے کی کشش نے متاثر کیا تھا اور پھر وہ اس گرداب میں ایسے پھنسے تھے کہ ان کے خونی رشتوں میں بھی فاصلہ آ گیا۔ ان کے بچوں نے پیسے کی ریل پیل میں آنکھ کھولی اور جہاں انہیں پیسے کی کمی محسوس ہوتی، ان کے مفادات پر گویا ضرب پڑتی اور

وہ ماں باپ کے سامنے تن کر کھڑے ہو جاتے۔

انہیں اپنے بہن بھائیوں میں امتیازی سلوک ماں باپ کی محبت کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس بات پر ہوتا تھا کہ کس بچے پر ماں باپ نے کتنا پیسہ خرچ کیا ہے۔ زین باہر پڑھنے گیا اور اس پر لاکھوں خرچ ہوئے، اس پر باقی سب نالاں کہ کسی اور پر چاچو نے اتنی رقم خرچ نہیں کی اور جس پر کی وہ اس بات پر ناراض کہ اسے اتنی کم عمر میں دیس نکالا دے دیا گیا تھا۔

''تو پھر اور کیا بات ہے بیٹا؟'' انہوں نے شفقت سے کہا۔ مجھے احساس ہوا کہ واقعی چاچو اتنی شفقت سے اپنے کسی بچے سے بات نہیں کرتے تھے۔

''چاچو مجھے آپ سے یوسف کے بارے میں کچھ کہنا تھا۔'' میں نے جھجکتے ہوئے تمہید باندھی۔

''کہو بیٹا...... ویسے مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے کہ تم کیا بات کہنا چاہتی ہو۔''

''بتائیں بھلا چاچو؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''نہیں تم ہی بتاؤ بیٹا......'' انہوں نے کہا۔ ''میں جاننا چاہوں گا کہ اس نے تمہیں کس طرح اپنا نقطۂ نظر مجھ تک پہنچانے کو کہا ہے۔'' تو اس کا مطلب ہے کہ چاچو سے وہ اس بارے میں پہلے ہی بات کر چکا ہے۔

''وہ چاچو...... وہ تبلیغ کے لیے ساؤتھ افریقہ جانا چاہتا ہے اپنے گروپ کے ساتھ، آپ اگر اسے اجازت دے دیں تو!'' میں نے بہ مشکل اپنا جملہ پورا کیا۔

''میں جانتا تھا کہ میرے انکار...... پھر ماں کی سفارش پر انکار کے بعد وہ تمہیں ہی استعمال کرے گا۔'' چاچو نے کہا۔

''تو کیا وہ جا سکتا ہے؟'' میں نے جوش سے پوچھا۔

''تم نے اس سے اس سارے تبلیغی دورے کی تفصیلات پوچھی ہیں کیا؟''

''نہیں تو چاچو......''

''تم نے اس سے یہ پوچھا کہ اس میں اچانک یہ تبدیلی کیوں آ گئی ہے؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''نہیں چاچو......'' میں نے دبے سے لہجے میں کہا۔ ''میں نے سوچا کہ اس کی شخصیت میں ایک مثبت تبدیلی آ گئی ہے تو میں بجائے اسے سراہنے کے اس سے یہ تو نہ پوچھوں کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔''

''پہلے تو یہ فکر ہونی چاہیے کہ کسی بھی انسان کی شخصیت ایک سو ساٹھ ڈگری تبدیل ہوتی ہے تو اس کے پیچھے بہت اہم اسباب ہوتے ہیں۔ پھر جو شخص خود تبدیل ہوتا ہے وہ سب سے پہلے اپنے اردگرد اس تبدیلی کے اثرات کو دیکھنا چاہتا ہے اور اپنے ساتھ رہنے والوں کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔'' چاچو نے وضاحت کی۔ ''کیا ایسا ممکن ہے کہ میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ اس کے سامنے کہوں، تم اس کا نقطۂ نظر بھی سنوں اور تم بھی......''

''ایسا تو شاید ممکن نہ ہو چاچو...... کل یا پرسوں تو مجھے اسپتال جانا ہے۔'' میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''چلو بعد میں اس پر بات کر لیں گے...... جب تم واپس آ جاؤ گی۔''

''مگر اسے تو شاید جلد ہی جانا ہے۔'' میں نے اصرار کیا۔

''میں اس کے جانے پر قائل نہیں ہوں...... یوں بھی گھر میں ان دنوں جو پریشانی ہے، اس طرح کے حالات میں اسے اس بات پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔'' چاچو نے حتمی انداز میں کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں دیر تک فون اسی طرح کان سے لگائے بیٹھی رہی، چاچو نے جس پریشانی کا ذکر کیا تھا وہ میری ہی وجہ سے تھی اور میں نے گھر بھر بلکہ خاندان بھر کو پریشان کر رکھا تھا۔

☆☆☆

"بچہ اگر آگ سے کھیلنا چاہے تو میں تو کیا، کوئی برے سے برا باپ بھی اسے اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

چاچو نے بات شروع کی۔ باقی سب لوگ رات کے کھانے کے لیے باہر گئے تھے۔ چاچو دوا لے کر جلد سو جاتے تھے، یوسف اب اس طرح کی مصروفیات سے خود کو الگ رکھتا تھا اور میں ان کے لاکھ اصرار کے باوجود نہیں گئی کہ مجھے شاید اگلے روز اسپتال جانا تھا۔ زین اپنے دوستوں کے ساتھ حسبِ معمول پارٹی پر تھا اور ماما نے اسے کال کر کے خوب لعن طعن کی تھی۔ اس کے جواب میں اس نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ مجھے کیا مسئلہ ہے میں نے اس کی ماں کو کیوں اس کے خلاف بھڑکا رکھا ہے۔ مجھے نہ ایسا کرنے کی ضرورت تھی نہ اس کے اس احمقانہ سوال کا جواب دینے کی۔ اپنے کمرے میں سورۂ مریم کا ورد کرتے ہوئے یکایک مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے یوسف کے کمرے کے باہر کھڑے ہو کر اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے دروازہ کھول کر حیرت سے مجھے دیکھا، میں نے اس سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چاچو کے پاس چلے، مجھے چاچو سے اس کے سامنے کچھ بات کرنی ہے۔ وہ تذبذب میں تھا مگر ساتھ چل دیا، چاچو جاگ رہے تھے اور کوئی کتاب لیے بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں یوسف کے سلسلے میں ہی ان سے بات کرنے آئی ہوں۔

"مذہب کی طرف مائل ہونے کو آپ آگ سے کھیلنا کہتے ہیں پاپا؟" اس نے دیدہ دلیری سے چاچو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور سوال کیا۔

"تم تبلیغ کے لیے اتنی دور، دوسرے براعظم جانا چاہتے ہو...... ہوں!" چاچو نے اس کی نظر اور لہجہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تم کافی ماہ سے اس طرح تبدیل ہو رہے ہو، پہلے تم نے تبلیغ کا عمل گھر سے کیوں نہیں شروع کیا، پانچ ہزار میل کی دوری سے اس کا آغاز کرنے کے پیچھے کیا منطق ہے؟"

"کیونکہ وہ جگہ ایسے ممالک میں سے ہے جہاں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے، ہمارے مشن ایسے ممالک میں تبلیغ کرتے ہیں جہاں ان کی بہت زیادہ ضرورت ہے...... رہی بات اپنے گھر کی پاپا تو ہمارے گھر میں اس کا اسکوپ بہت کم ہے۔"

"کیوں گھر میں کیوں اسکوپ کم ہے؟"

"کیونکہ یہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے...... اس گھر میں نماز نہ پڑھنا تو ایک برائی ہے ہی، اس کے علاوہ بھی اتنا سب کچھ ناقابلِ برداشت اور ناقابلِ تبدیلی ہے کہ یہاں میرا دم گھٹتا ہے۔"

"جس گھر میں تم پیدا ہوئے، جہاں ہر کسی سے تمہارا خونی رشتہ ہے وہاں تم اپنی بات نہیں سمجھا سکتے اور گھر سے باہر سب لوگ تمہاری بات ماننے کو تیار ہو جائیں گے؟" چاچو کا لہجہ گرم ہو گیا۔

"گھر سے باہر کے لوگوں میں پھر بھی کوئی لحاظ مروت ہوتا ہے پاپا!" اس نے اپنی آواز کو دھیما کر لیا۔

"یوسف بیٹا......" چاچو نے آہستگی سے کہا۔ "تم ابھی دنیا اور اس کے چکروں کو جاننے کے لیے بہت چھوٹے ہو، میں اس روز سے تمہیں دیکھ رہا ہوں جس روز سے تم نے پڑھائی چھوڑ کر گھر سے ٹیوشن سینٹر کے بجائے دوسری جگہ شروع کیا تھا اور پھر آہستہ، آہستہ تم کس طرح تبدیل ہوئے ہو۔"

"تو گویا اس سے پہلے آپ نے مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا؟" اس نے طنز سے سوال کیا۔

"دیکھ تو میں تمہیں اس دن سے رہا ہوں جب تم صرف چھ پاؤنڈ کے پیدا ہوئے تھے...... اپنے ہاتھوں سے تمہیں کھلاتا بھی تھا، نہلاتا بھی تھا اور تمہارے ناتواں وجود کو مالش بھی کرتا تھا...... اب تم چھ فٹ کے ہو گئے ہو اور یہ سمجھنا شروع ہو گئے ہو کہ تم مجھ سے بڑے اور عقل مند ہو۔"

"میں نے ایسا کبھی نہیں کہا پاپا!"

"لیکن میرے سمجھانے پر نہ سمجھنا اور اپنی ضد پر مصر رہنا...... اسی بات کی علامات ہیں ناں۔"

"عقل کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا پاپا...... میں آپ سے زیادہ خود کو نہ بڑا سمجھتا ہوں نہ عقل مند!"

"چاچو ایسی بات نہیں ہے......" میں نے اس کی تائید میں دلیل دی۔

"جن باتوں کو میں سمجھتا ہوں وہ تم لوگ نہیں جانتے بیٹا!" چاچو نے کہا۔ "وہ جو ان کا پیر بنا پھرتا ہے ناں...... کسی زمانے میں سیٹھ (فلاں انہوں نے کوئی بھلا سا نام لیا) ہوتا تھا، ہیروں کا اسمگلر! اب وہ داڑھی اور چوغے کا سہارا لے کر......"

"پاپا پلیز...... کسی کا ماضی کریدنا اور کسی پر یوں شک کرنا ٹھیک نہیں...... میں بھی تو اس سے پہلے ایک بے پروا اور بے فکرا انسان تھا، میرا حلیہ، عادات اور اطوار سب کچھ بدل گیا ہے۔ اگر کوئی شخص خود کو عملی طور پر بدل کر دکھائے، برائی سے تائب ہو کر نیکی کا راستہ اختیار کرے اور دوسروں کو بھی نیک راہ دکھائے تو اس کو داد دینی چاہیے اور اس کی وجہ سے راہ ہدایت پر چلنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔"

"جو میں جانتا ہوں یوسف میرے بیٹے، وہ تم نہیں جانتے۔"

"پاپا مجھے ایک دفعہ جانے دیں، میں انہیں اپنی رضامندی دے چکا ہوں اور اللہ کے راستے پر چل رہا ہوں، میری راہ کھوٹی نہ کریں...... ایک بار اجازت دے دیں۔" وہ گھگھیایا۔

"تمہیں میری اجازت نہیں، مجھ سے خرچے کے لیے پیسے چاہئیں...... جتنے چاہے پیسے لے لو مگر اپنی پڑھائی پر دھیان دو، پڑھ لکھ کر بھی کسی نہ کسی طرح مذہب کی خدمت کر سکتے ہو۔"

"مجھے آپ کی طرف سے ایک پیسے کی ضرورت نہیں ہے پاپا...... سب کچھ وہی لوگ کر رہے ہیں۔" اس نے فوراً کہا۔

"کیا مطلب؟" چاچو نے حیرت سے سوال کیا۔

"مطلب یہ کہ ہمارے آنے، جانے، رہائش اور کھانے کا تمام خرچہ وہی ادا کریں گے۔" اس نے کہا۔

"وہی کون...... وہ سیٹھ......؟" چاچو نے تمسخر سے پوچھا۔

"وہ صاحب پاپا......" اس نے تصحیح کی۔ "ہمارا پورا گروپ ہے وہی سب خرچہ برداشت کر رہا ہے۔"

"اور ان کے پاس یوں لٹانے کے لیے اتنا پیسہ کہاں سے آتا ہے؟"

"لٹانے کے لیے نہیں پاپا، تبلیغ دین کے لیے۔" وہ مسلسل ان کی طرفداری کر رہا تھا۔ اس کی اور چاچو کی گفتگو سے میرے ذہن میں بھی بہت سے سوالات اٹھ رہے تھے مگر میں خاموش رہی تاکہ وہ اس کو اجازت دے دیں، ایسا نہ ہو کہ کل کو وہ بھی زین کی طرح کہے کہ پاپا نے اس کے لیے کچھ نہیں کیا۔

"اگر تمہیں مجھ سے پیسے بھی نہیں چاہئیں تو پھر کیا چاہیے؟" انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔

"آپ کی اجازت...... میرا مطلب ہے تحریری اجازت۔ شیخ صاحب کہتے ہیں کہ جو بچہ والدین کے زیرِ کفالت ہو وہ کسی قسم کا فیصلہ ماں باپ کی رضامندی کے بغیر نہیں کر سکتا، اس لیے آپ کو تحریری اجازت دینا ہوگی۔"

"دل میں بہت سے اندیشے ہیں بیٹا مگر پھر بھی میں تمہیں یہ تجربہ کرنے کی اجازت دے دوں گا۔" چاچو نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ "مگر پھر بھی میرا کریڈٹ کارڈ لے جانا بیٹا، ایسا نہ ہو کہ کہیں کسی مشکل میں اس کی ضرورت پڑ جائے۔"

"کریڈٹ کارڈ کا استعمال حرام ہے پاپا......" اس نے فوراً کہا۔ "ویسے بھی مجھے یقین ہے کہ مجھے اتنے زیادہ پیسوں کی ضرورت نہیں پڑے گی، میری اپنی کچھ بچت ہے میرے جیب خرچ سے، وہ کافی ہوگی۔"

"میں تمہیں ایک ہزار ڈالر دے دوں گا، تم یہ رقم ساتھ ضرور رکھ لینا۔" چاچو نے اصرار کیا۔

"نہیں پاپا، ہمیں اپنے ساتھ اتنی بڑی رقم رکھنے کی اجازت نہیں ہوگی۔" اس نے جواباً کہا۔ "آپ فکر نہ کریں،

کوئی بھی مشکل پڑے تو میرے لیے میرا اللہ کافی ہوگا۔'' اس نے پورے یقین سے کہا۔

''ایک اور اہم بات بیٹا......'' چاچو نے ہمیں مخاطب کیا۔ ''سمجھنا کہ یہ ساری گفتگو ہوئی ہی نہیں اور نہ ہی میں نے تمہیں اجازت دی ہے......''

''یہ کیا بات ہوئی پاپا!'' وہ ٹھٹکا، میں اور وہ تو یہی سمجھے تھے کہ چاچو اجازت دینے کو تیار ہیں۔

''تم چند دن میں اپنی ماں کے سامنے دوبارہ میرے سامنے اپنا مقدمہ پیش کرنا اور اس سے پہلے کہہ دینا کہ مجھ سے تمہاری سفارش کرے...... میں تھوڑی ردوکد کے بعد مان کر تمہیں تحریری اجازت دے دوں گا۔'' چاچو کا نکتہ ہم دونوں کو سمجھ میں آ گیا تھا۔ گھر میں کسی سے یہ بات چھپی نہ تھی کہ چاچو کی مجھ پر خاص شفقت تھی اور جو بات چاچو ماما کے کہنے پر نہ مانتے تھے وہ اب میرے کہنے پر مان تو گئے تھے مگر ماما کو یہ احساس نہیں دلانا چاہتے تھے کہ میری سفارش ان کی سفارش سے تگڑی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں آ کر بھی میں سوچ رہی تھی کہ میرے لیے گھر میں سب کی ایسی سوچ کیوں تھی۔ یوسف کس قدر تبدیل ہو گیا تھا، اس کی تبدیلی کے بارے میں میرے ذہن میں بھی شکوک اٹھ رہے تھے...... بارہ لوگوں کے گروپ کے تمام اخراجات، پاسپورٹ بنوانے سے لے کر ہر طرح کے سفر اور قیام اور طعام کے اخراجات .... ان کے پاس کتنے فنڈ تھے اور اپنے ملک سے ہزاروں میل دور ان کم عمر اور نوجوان لڑکوں کو بھجوانا۔ سوچتے سوچتے، میں نیند میں چلی گئی، زین ابھی تک نہ لوٹا تھا۔ ہلکے سے کھٹکے سے آنکھ کھلی، فون اٹھا کر وقت دیکھنے کے لیے مندی، مندی آنکھوں سے اسکرین آن کی تو اس پر سارہ کی طرف سے پیغام تھا، اسے کھولا نہیں کہ اس وقت چیک کرتی تو جواب بھی دینا پڑتا۔ زین کے دروازہ کھولنے کی آواز آئی، وہ فون کان سے لگائے ہوئے تھا۔

''سو رہی ہو؟'' اس نے فون کان سے لگائے، لگائے مجھ سے پوچھا۔

''ابھی جاگی ہوں دروازے کی آواز سے!'' میں نے پہلے سوچا کہ اسے جواب نہ دوں مگر پھر اس روز کا انجام یاد کر کے بول پڑی۔ اسے میری ہر بات بری لگنے لگی تھی، میں پھر بھی چاہ رہی تھی کہ مصالحت کر لوں، زندگی یوں تو بسر ہونے والی نہیں۔ یوں بھی جلد ہی میں ماں بننے والی تھی، جانے بچہ زندہ بچتا کہ نہیں مگر یہ خوش فہمی تو بہرحال تھی کہ یہ بچہ ہم دونوں کے مابین تعلقات کو بہتر کر دے گا۔ باپ بن کر شاید زین اپنی ذمے داری کا احساس کرے۔ چاچو نے ہمارے لیے جو فلیٹ خریدا تھا اس میں مجھے اسپتال سے واپسی پر چلے جانا تھا، باقی سب کچھ چاچو نے وہاں سیٹ کروا رکھا تھا۔ میرا اپنا دل بھی نہیں چاہ رہا تھا کہ اس بھرے پُرے گھر کو چھوڑ کر یوں تنہا فلیٹ میں رہنے لگوں، جانے زین کی روش تبدیل ہوگی یا نہیں اور میں اسی طرح تنہا اس کے لوٹنے کا انتظار کرتی رہوں گی۔

''کوئی کام تھا تم سے......'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''کچھ چاہیے...... کوئی کھانا وغیرہ؟'' میں نے لیٹے، لیٹے پوچھا اور اٹھنے کی کوشش کی۔

''نہیں لیٹی رہو......'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''ہیلو...... تم لائن پر ہو؟'' فون پر جو کوئی بھی تھا، اس سے اس نے پوچھا۔ ''آواز صاف آ رہی ہے ناں؟'' میں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے زین، سب ٹھیک تو ہے ناں؟'' میں نے سوال کیا۔

''امرت کی آواز بھی تمہیں صاف سنائی دے رہی ہے کیا؟''

''کون ہے زین، کس سے بات کر رہے ہو تم؟''

''زارا ہے...... اسے یقین نہیں آ رہا کہ مجھے اس سے اب بھی محبت ہے اور میں اس سے شادی کروں گا، اسے اتنی

دیر سے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں مگر وہ سمجھ ہی نہیں رہی، اس کا ایک ہی مطالبہ ہے کہ میں تمہیں طلاق دے دوں فوراً، ابھی، اسی وقت!'' اس نے بات اس طرح کی کہ فون پر دوسری طرف بھی صاف سنی جا رہی ہوگی مگر لائن کے اس پار والی نے نہیں دیکھا ہوگا کہ زین نے مجھے ایک آنکھ میچ کر کوئی اشارہ بھی کیا تھا۔

☆☆☆

''تم شاور لے لو، بھرپور شاور لینا، پانی سے انسان کے اندر کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور بالکل پریشان نہیں ہونا...... اللہ تعالیٰ ہے ناں تمہارے ساتھ، ہم سب ہیں، ہم سب کی دعائیں ہیں۔'' سامان بیگ میں رکھتے ہوئے تمنا ساتھ، ساتھ اپنے نصیحت بھرے لیکچر کو جاری رکھے ہوئے تھی، میں اپنے فون سے کچھ پیغامات ڈیلیٹ کر رہی تھی، سارہ کا پیغام کھولا، اس نے سلام لکھا تھا اور خیریت پوچھی تھی اور ایک تصویر بھیجی تھی، وہ غالباً اس کی شادی کے وقت کی تصویر تھی۔ گلابی دوپٹے کے ہالے میں اس کی مسکراتی آنکھوں والا شاداب چہرہ، دوپٹے کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے تھامے ہوئے جن پر مہندی کا لال رنگ تھا۔ ممکن ہے کہ اس کی شادی کی سالگرہ کا دن ہو۔ سوچا کہ ابھی اسے کوئی جواب لکھتی ہوں مگر......

''اور کچھ میری بہنا؟'' میں نے ہنس کر اس سے سوال کیا۔

''بس تم نے کوئی بات کہنا ہو آخری بات کے طور پر تو؟'' اس نے ہنس کر کہا۔

''بہت سی آخری باتیں ہیں تمنا...... مگر اچانک موت بھی آ جائے تو انسان ساری باتیں ادھوری چھوڑ کر چلا جاتا ہے ناں'' میں نے قنوطیت کو خود پر طاری ہونے سے روکا۔

''اللہ کے کاموں کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے امرت، ہم انسان تو جانے کیا، کیا سوچتے ہیں اور کیا، کیا پلان کرتے ہیں!'' تمنا نے گہری سانس لے کر کہا۔ اس کا اشارہ غالباً اپنی حالت کی طرف تھا جس سے وہ لاعلم تھی اور اس روز اسپتال میں دورہ سا پڑنے پر ڈاکٹر یاسمین نے چیک کر کے انکشاف کیا تھا۔

''ہاں...... انسان کچھ سوچتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور ہوتے ہیں لیکن یقین کرنا کہ وہ فیصلے بہترین ہوتے ہیں۔'' میں نے یقین سے کہا۔

''میری دعا ہے امرت کہ تم بامراد لوٹو...... اللہ تعالیٰ تمہیں میری عمر بھی دے دے...... اور اگر اسے بچہ واپس لینا ہی ہے تو میرا لے لے، میں تو ابھی چاہتی بھی نہیں تھی اور میری تو اس سے اتنی وابستگی بھی نہیں ہوئی۔''

''اللہ نہ کرے تمنا......'' میں نے فوراً کہا۔ ''ایسی بات بالکل نہ کرنا۔''

''میں بہت پریشان ہوں تمہاری وجہ سے امرت...... مجھے بتانا بھی نہیں آ رہا ہے کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے اور میں نے کبھی زندگی کو تمہارے بغیر تصور بھی نہیں کیا، میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ تمہیں کچھ ہو جائے......'' وہ سسک رہی تھی اور میں اندر ہی اندر پگھل رہی تھی۔ ''میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکوں گی کہ تمہیں بچے کی طرف سے کوئی صدمہ برداشت کرنا پڑے!'' وہ مجھ سے لپٹ گئی، میرے لیے بھی آنسو بہانا آسان ہو گیا۔

''میں بھی تم سے بہت پیار کرتی ہوں تمنا...... اللہ تمہیں ہمیشہ خوش و خرم اور آباد رکھے۔'' میں نے اس کی کمر کو تھپکا۔

''اللہ زین بھائی کو ہدایت دے اور وہ تمہاری قدر کریں، میری ہیروں جیسی بہن کی۔''

''تمہیں میں ہیروں جیسی لگتی ہوں تمنا...... ہیرا تو پتھر ہوتا ہے!'' میں نے اس کی بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔

''امرت...... میری جان!'' وہ مجھ سے اور بھی شدت سے لپٹ گئی۔ ''اللہ تمہارا حامی و مددگار ہو!''

''آمین!'' میں نے اسے پیار سے چوما۔

''حوصلے میں ہو ناں؟'' اس نے مزاحیہ انداز میں سوال کیا۔

میرا شوق و جذبہ

سب سے پہلے تو اس بات کو جان لیں کہ پیشن ہے کیا؟ پیشن ہمارا شوق ہے، جذبہ ہے وہ کام جسے کرنے میں ہم اپنے دل کی پوری رضامندی اور خوشنودی سے راضی ہوں۔

چالیس بلکہ پچاس سال یا کبھی پوری زندگی گزر جاتی ہے اور لوگوں کو سمجھ نہیں آتا ان کا پیشن کیا ہے؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ وہ صرف پیسے کمانے کے لیے لگی بندھی نوکری کر رہے ہوتے ہیں اور پھر گھر آ کر وہی روز کا وتیرہ...... ہر حیوان وہی کام کر رہا ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے دماغ میں فیڈ کر دیا ہے، پیٹ بھرنے، اپنے سے طاقتور جانور سے بچنے کے لیے پناہ کی تلاش اور افزائش نسل ...... صرف ایک انسان ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عقل دی ہے۔ جبھی اسے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا اور کائنات اسے مسخر کرنے کے لیے کہا یعنی اپنی عقل استعمال کرو اور جمادات، نباتات اور حیوانات سے فیض پاؤ۔ ہم اپنے شعبے کا کام تو کرتے ہیں مگر اپنی صلاحیتوں کو پہچانتے نہیں اور روتے رہتے ہیں کہ میری جاب سخت ہے، میں مجبور ہوں، گھر چلانا ہے، ایسے میں اپنا پیشن اور اپنی شخصیت کو کیسے جان سکتی ہوں۔ ہمیں کتنی نعمتیں عطا کی ہیں اس کا ادراک ہم نہیں کرتے۔ بڑے، بڑے کامیاب و مشہور لوگوں نے مشکل حالات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اپنے اصل پیشن کو پایا۔ ایڈیسن نے ہزار بار کوشش کی تو بلب ایجاد کر پایا۔ رائٹ برادران نے اپنی جمع پونجی اپنے پیشن کو پانے میں لگا دی تو جہاز بنا لیا۔

ہمارے تمام مسلمان مشاہیر جیسے بوعلی سینا، الرازی، ابن الہیثم، جابر بن حیان، خوارزمی وغیرہ، ان سب سائنس و فلسفے، طب اور ریاضی کے جو اصول دیے وہی آج تک بنیادی طور پر مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے تو نہیں سوچا کہ اب تو 60 سال کا ہو گیا ہوں تو اب تو مرنے والا ہوں، اب کیا فائدہ کسی غور و خوض کا ہمارے ہاں تو پچاس لگتے ہی لوگ اٹھتے بیٹھتے کہنے لگتے ہیں کہ اب تو جانے کا وقت آ گیا ہے چاہے وہ جانے کا وقت نوے سال میں آئے، آگے کے چالیس سال گھر بیٹھ کر مکھیاں مارتے گزارتے ہیں۔ اور خواتین (معاف کیجیے گا) صرف باتوں میں وقت گزار دیتی ہیں بجائے اس کے کہ اپنے سے چھوٹوں کی تربیت کریں یا کوئی ہنر یا علم سکھائیں۔ جبکہ زندگی جب تک کی ہو انسان کو چاہیے کام کرے، کام نہیں کر سکتا تو کتابوں سے دوستی کرے اپنے علم میں اضافہ کرے۔ اسلامی تعلیمات کی طرف راغب ہو اور اپنے گھر والوں کو بھی بتائے۔ یہ بھی نہیں کر سکتا تو اچھے اور قابل لوگوں کی صحبت اختیار کرے۔ بس خالی نہ بیٹھیں جب تک جان ہے تب تک جہان ہے۔ مرنے کے لیے تو آئے ہی ہیں مر کے جانا تو ہے لیکن مرنے سے پہلے ہم کیوں مر جاتے ہیں۔ کیوں اپنی صلاحیتوں کو خود ہی زنگ لگا لیتے ہیں۔ اپنے آپ کو تلاش کریں، اللہ نے کسی نہ کسی مقصد کے لیے تو ضرور بھیجا ہے اسے تلاش کریں۔

آج میں اپنی بہنوں کو اپنا پیشن جاننے کی چند ٹپس بتاتی ہوں۔ اپنی پسند کے پانچ، دس، پندرہ مشغلے کام جو ہوں ان کی لسٹ بنا لیں۔ اہمیت کے اعتبار سے درجہ بندی کریں۔ ایک دو تین وغیرہ۔ اب انہیں کرنا شروع کر دیں لگاتار ایک ہفتہ اگر تو آپ کا پیشن نہیں ہوگا آپ رک جائیں گی۔ آپ کو گھبراہٹ ہوگی، پریشانی ہوگی، آپ کا دل نہیں لگے گا۔ اندر سے یہ آواز بھی آئے گی کہ یہ کس کام میں پڑے ہو یہ تمہارا کام نہیں۔ چلیں آپ وہ کام کرنا چھوڑ دیں۔ دوسرا شروع کریں۔ تیسرا، چوتھا، اسی طرح جس کام میں آپ کا دل لگے، خوشی ملے، دلچسپی محسوس ہو آپ کا پیشن ہوگا۔ بس اپنا مقصد پانے کے لیے جان توڑ محنت لگا دیں۔ خیال رہے کہ کام مثبت طرز فکر اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچانے کی غرض سے ہوں۔ آپ کوئی بھی ایسا کام چن سکتے ہیں جو آپ کو باعزت معاش بھی مہیا کر سکے۔ بڑی، بڑی ایجادات سے پہلے چھوٹے، چھوٹے امور میں اپنی صلاحیتیں اور ہنر آزمائیں۔ ان شاء اللہ کامیابی ملتی ہی چلی جائے گی۔ محنت اور خلوص نیت شرط ہے۔

تحریر: نورین شہزاد، کراچی

''ان شاء اللہ!'' میں نے مسکرا کر اس کی بات کا جواب دیا۔

☆☆☆

امو جان میرا سامنا کرنے سے کترا رہی تھیں۔ ناشتے کی میز پر اس روز خلاف معمول سب لوگ مہمانوں سمیت موجود تھے اور امو جان سر درد کا کہہ کر اپنے کمرے میں تھیں۔ میں نے تمنا سے کہا کہ وہ جا کر امو جان کو بلا لائے ورنہ میں خود ادھر جاؤں گی۔ وہ اٹھ کر گئی اور واپس آ کر بتایا کہ وہ ہاتھ منہ دھو کر آتی ہیں۔ میز پر موجود ہر شخص اندر سے گھبرایا ہوا تھا مگر بظاہر سب نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عارب اور میثاق باتیں کر رہے تھے، باقی خاموش...... میثاق باتوں میں ہر تھوڑی دیر کے بعد کوئی نہ کوئی چٹکلا چھوڑ دیتا تھا جس سے سب کے چہروں پر تھکی سی مسکراہٹ بکھر جاتی۔ چاچو کے چہرے پر تفکر تھا، ابو جان جیسے لگ رہے تھے وہ۔

زین بھی صورتِ حال کے پیش نظر اس صبح گھر پر ہی تھا۔ اسی شام کو ماما نے اس کی خوب کلاس لی تھی، خاص طور پر اسے کہا تھا کہ اسے ایسی صورت میں گھر پر رہنا چاہیے جبکہ اس کے سسرال والے بھی آئے ہوئے ہیں۔ شاید اسی کا نتیجہ تھا جو وہ رات الٹی سیدھی ہانک رہا تھا۔ نشے میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔

حسنہ تو تمنا کے ساتھ خوب گپ شپ کر رہی تھی اور امو جان کا بھی بہت خیال رکھ رہی تھی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میرے میکے والے آئے تھے اور انہیں اتنا خصوصی پروٹوکول مل رہا تھا۔ یوسف ہر ایسی صورتِ حال سے کنی کترا جاتا جہاں سب مل کر بیٹھے ہوتے تھے۔ ایک روز پہلے میں نے اسے پیغام بھیجا تھا کہ سب بیٹھے ہیں تو وہ بھی وہیں لاؤنج میں آ جائے۔ اس کے جواب میں اس نے لکھا کہ یوں نامحرموں کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ لگانا شرعاً ممنوع ہے اس لیے اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھ کر اپنی تسبیحات کرتا رہے۔ اس کے بدلے ہوئے اطوار کو سب نے محسوس کیا تھا مگر چونکہ یہ تبدیلی مثبت تھی تو کسی نے کھل کر اس پر بات نہ کی تھی۔ ماسوائے تمنا کے ایک دو بار مذاق میں بات کرنے کے مگر میں نے اسے بھی منع کر دیا کہ وہ اس پر کوئی تبصرہ نہ کرے۔

اس روز میں اندر سے بہت خوفزدہ تھی مگر بظاہر حوصلہ کیے ہوئے تھی، کچھ عجیب سی الجھن بھی تھی جس نے میرا احاطہ کر رکھا تھا۔ امو جان نے چاچو سے کہہ کر گھر پر بکرے منگوا کر ان کا صدقہ دیا اور میرے ہاتھوں سے یتیم خانے کے لیے ایک بڑی رقم بھی صدقے کے طور پر بھجوا دی تھی۔ اسپتال جاتے وقت ہر کوئی میرے ساتھ جانے کو تیار تھا مگر مجھے اس پر خفت ہو رہی تھی۔

''پلیز کوئی ایک آدھا بندہ چلے میرے ساتھ امو جان! یوں میلا تو نہ لگائیں۔''

''میں تو ساتھ ضرور جاؤں گی، باقی تم تمنا اور زیبا سے خود بات کر لو۔'' امو جان نے حتمی انداز میں کہا تھا۔

''میں ان سے کس طرح کہوں امو جان، آپ سے تو شاید پھر بھی کہہ سکتی ہوں......''

''زین بھی تو جا رہا ہوگا، تھوڑی دیر کے بعد کوئی نہ کوئی واپس آ جائے گا، یوں کسی کو کہیں کہ وہ نہ جائے تو وہ برا محسوس کریں گے۔'' امو جان نے مجھے سمجھایا۔

''کم از کم چاچو کو تو کہیں کہ وہ گھر پر ہی رکیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں جمال کو میں سہولت سے منع کر سکتی ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

میں دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کر رہی تھی، بیگ میں نے اپنے ہی سامان کا تیار کیا تھا، بچے کی چیزوں کو گھر پر ہی رہنے دیا تھا۔ جانے کیا ہونے والا تھا اور میں اس سامان کو دیکھ، دیکھ کر کنفیوز ہو رہی تھی۔

''زین سے بھی کہہ دیں کہ وہ نہ جائے امو جان!'' میرے منہ سے وہ عجیب سی بات پھسل گئی جس پر مجھے امو جان

کی وہ خوفناک گھوری ملی جس سے بچپن میں جان جاتی تھی۔

”شوہر ہے وہ تمہارا..... کوئی اور جائے یا نہ جائے، اس کا جانا بنتا ہے۔ عام حالات میں صرف بچے کی پیدائش ہو رہی ہوتی تو میں کبھی نہ کہتی کہ وہ ساتھ جائے، بے شک کام پر چلا جائے مگر جب بیوی یوں کسی تکلیف اور بیماری میں مبتلا ہو تو اللہ او پر اور زمین پر سب سے بڑا آسرا ہی شوہر کا ہوتا ہے۔“ انہوں نے مجھے سمجھایا۔

”ٹھیک کہتی ہیں امو جان!“ میں نے حلق میں پھنسنے والے گولے کو نگلا۔ انہیں تو کیا، کسی کو بھی علم ہی نہ تھا کہ میرے اور اس کے بیچ کیا رشتہ تھا اور اس کی اصلیت کیا تھی۔ میں کیا، کیا برداشت کر رہی تھی، صرف میرا اللہ جانتا تھا۔

☆☆☆

”حوصلے میں ہوناں پیاری؟“ ڈاکٹر یاسمین نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میں کمزور محسوس کرنے لگی۔

”جی!“ بہ مشکل میں نے ایک لفظ کا جواب ادا کیا۔

”تمہارا ہاتھ کانپ رہا ہے..... کچھ کھایا پیا ہے تم نے؟“

”میں نے دودھ پیا تھا صرف!“

”آج تو پیٹ بھر کر ناشتا کرنا تھا، رات کے بعد کچھ کھانے کو نہیں ملے گا کیونکہ کل آپریشن ہوگا انشاءاللہ!“

”میں تھوڑی دیر میں کچھ کھا لوں گی۔“

”ڈاکٹر یاسمین، کوئی اور ضرورت، کوئی دوا، خون وغیرہ!“ ماما نے سوال کیا۔

”دوائیں اور باقی چیزیں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے..... اس کے گروپ کے خون کا بھی ہم انتظام کر رہے ہیں، کافی نایاب گروپ ہے اس لیے بہت مشکل سے ملتا ہے۔ اس کی ادائیگی آپ کو کرنا ہوگی!“

”خون آپ ہم میں سے کسی سے لے لیتے!“ امو جان نے کہا۔

”ہم چیک کروا لیں گے اگر اسی گروپ کا خون ہوا تو آپ لوگوں میں سے کوئی اس خون کے بدلے خون دے سکتا ہے ورنہ آپ کو ادائیگی ہی کرنا پڑے گی۔“

”ہاں ایک ہی خاندان ہے، کسی نہ کسی کا خون تو میچ ہوگا۔“ ماما نے کہا۔

”لازمی نہیں ہے کہ کسی کا خون میچ ہو اور اگر ہو تو وہ اتنا صحت مند یا کافی بھی ہو۔“ ڈاکٹر یاسمین نے وضاحت کی۔ ”جس بلڈ بینک سے ہم خون خریدتے ہیں وہ صحت مند اور تمام بیماریوں سے پاک خون ہی قبول کرتے ہیں اور اسی معیار کا خون وہ ہمارے اسپتال کے لیے دیتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ایک بیماری کا علاج کرنے کے لیے کسی اور بیماری کے مریض کا خون لگا کر مرض کی شدت اور بڑھا لیں۔“

”اگر کسی کی زندگی کو خون زیادہ بہہ جانے کے باعث خطرہ ہو تو آپ اسے فوری طور پر خون لگائیں گے ناں... اس وقت یہ اہم نہیں ہوتا کہ خون صحت مند ہے یا نہیں؟“ تمنا سے رہا نہ گیا۔

”بعض جان لیوا صورتوں میں ایسا کرنا پڑ جاتا ہے لیکن اگر بلڈ بینک کی سہولت موجود ہو تو وہاں ہمیشہ عطیہ کیے گئے خون کو purify کر لیا جاتا ہے اور اس میں جو کمیاں کجیاں ہوں انہیں درست کر کے ہی خون رکھا جاتا ہے۔“

”کل کس وقت آپریشن کرنا ہوگا؟“ زین نے بھی سوال کیا۔

”آپریشن کا وقت باقی آپریشن کی لسٹ کے مطابق، مریضوں کی صورت حال کے مطابق متعین ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہم انہیں پہلے نمبر پر بھی رکھ لیں تو معلوم ہو کہ صبح کوئی اور ایمرجنسی آ گئی ہے اور اسے پہلے کرنا پڑ جائے۔“

”پھر بھی کوئی وقت اندازاً بتا سکیں گی آپ؟“ زین نے روکھے سے انداز میں پوچھا۔

”آپ یہیں ہوں گے..... سو جونہی ان کا وقت آئے گا سب سے پہلے آپ کو ہی علم ہوگا!“ ڈاکٹر یاسمین نے کہا۔

”میں..... میں یہاں کیا کروں گا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تو اور اس کے پاس کون رات کور کرے گا؟“ ڈاکٹر یاسمین نے چتون چڑھا کر پوچھا۔

”کوئی بھی..... میرا مطلب ہے ماما یا اس کی امو جان!“ اس نے آپشن بتائیں۔

”ہمارے اسپتال کا اصول ہے کہ جب کوئی سیریس مریضہ داخل ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے شوہر کو ہی قیام کرنا ہوتا ہے!“ ڈاکٹر کا انداز حتمی تھا۔

”مگر.....“ وہ ہکلایا۔ ”مجھے تو ایسی عادت نہیں ہے۔“

”یہ آپ کی بیوی ہے اور آپ کا بچہ..... زین صاحب! اور اس کی تمام ذمے داری آپ پر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ صبح ہونے سے پہلے ہی ہمیں رات کو کسی پہر آپریشن کرنا پڑ جائے..... میرا مطلب ہے کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”تو میں نے آپریشن میں کیا کرنا ہے؟“ اس نے چڑ کر پوچھا۔

”آپ کی بیوی کا آپریشن، آپ کی رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتا!“ ڈاکٹر یاسمین بہت برداشت کر رہی تھیں ورنہ وہ یوں بات کرنے والے کی خوب ”عزت افزائی“ کرتی تھیں۔

”تو میں ابھی اجازت دے دیتا ہوں۔“ اس نے دریا دلی کا مظاہرہ کیا۔

”آپریشن کا اجازت نامہ، آپریشن سے پہلے ہی سائن ہوگا!“ ان کا لہجہ غصے سے بھرپور تھا۔ ”البتہ آپ کی اگر کوئی ایسی مصروفیت ہے جو آپ کی بیوی اور بچے سے اہم ہے..... یا آپ کو اپنی نیند اور آرام بہت پیارا ہے تو آپ جائیں۔“ انہوں نے سب کے سامنے غصے سے کہا تھا۔ ”حیرت ہے مجھے..... اس طرح کے شوہروں کے لیے بچے کس طرح پیدا کر لیتی ہیں بیویاں!“ وہ بڑبڑائی تھیں۔

”ڈاکٹر یاسمین..... کیا میں رک سکتی ہوں رات کو؟“ تمنا نے فوراً سوال کیا۔

”تمہارے ساتھ تو جو کچھ اس دن ہوا تھا پیاری لڑکی، اس کے بعد میں تو نہیں سمجھتی کہ تمہیں اس کے پاس رات رکنا چاہیے..... لیکن اگر تم بہادر بنو تو رک سکتی ہو!“ امو جان حیرت سے تمنا کو دیکھ رہی تھیں کیونکہ انہیں کچھ علم نہ تھا۔ ممانے انہیں تھام کر چلنے کا اشارہ کیا۔

”کیا ہوا تھا تمہیں تمنا.....؟“ امو جان کی آواز لرز رہی تھی۔

”ارے کچھ نہیں بھابی!“ ماما نے فوراً کہا۔ ”خوش خبری ہے اس کے ہاں بھی!“ تمنا زین کی موجودگی کے باعث شرما گئی۔

”تو پھر تم جاؤ.....“ امو جان نے کہا۔ ”امرت کے پاس میں رکوں گی۔“

”ارے عائشہ بھابی چلیں..... آج چلیں، ابھی تو جانے کتنے دن امرت اسپتال میں رہے گی، آج کی رات آسان ہے، آج تمنا کو رکنے دیں۔ آپریشن کے بعد آپ رک لیجیے گا!“ ماما نے امو جان سے کہا تو وہ بے دلی سے ان کے ساتھ چل دیں۔

باقی سب لوگ واپس چلے گئے۔ جانے سے پہلے ماما ایک تگڑی رقم تمنا کے بیگ میں رکھوا کر گئی تھیں، اسپتال میں یوں تو اتنی رقم کا اپنے پاس رکھنے کا کوئی جواز نہ تھا، کون سا ہمیں راتوں رات اس کی ادائیگی کرنا تھی، الٹا اس کی حفاظت کی فکر پڑی رہتی۔ ممانے بتایا کہ اس اسپتال کے ان خصوصی کمروں میں مریضوں کا قیمتی سامان رکھنے کے لیے لاکرز بھی تھے۔ اسپتال کا وہ کمرا تو دیکھنے میں ویسے بھی اسپتال نہیں بلکہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا کمرا ہی لگ رہا تھا۔ میں نے اس سے پہلے ایک ہی بار کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا کمرا دیکھا تھا، جہاں ہم نے اپنے ہنی مون کے دوران قیام کیا تھا۔ وہ ہنی مون بھی اپنی نوعیت کا انوکھا ہی ہنی مون تھا۔

ماما نے بے حد اصرار کیا تو زین جانے کو تیار ہوا، اس کے خیال میں اس کی زندگی میں تفریح کا تصور اس کے جگری دوستوں کے بغیر نامکمل تھا۔ وہ دوست جو اس نے اپنی طرف سے بڑے مخلص سمجھ رکھے تھے...... کچھ اس جیسے اور کچھ اس سے بہتر ان دوستوں کا گروپ اس میں، میں خود کو مس فٹ محسوس کرتی۔ اسی لیے جب بھی وہ دوستوں کی طرف جانے کا سوچتا اور ماما اصرار کرتیں کہ اگر جانا ہے تو بیوی کو ساتھ لے کر جاؤ تو میں ساتھ جانے سے انکار کر دیتی تھی۔ مجھے اس کے ان دوستوں سے گھن آتی تھی...... کوئی اور وجہ نہیں بلکہ میری اپنی آنکھوں دیکھے ان کے اطوار تھے۔

ہنی مون پر جب ہم بھوربن کے اس فائیو اسٹار ہوٹل میں پہنچے تو سب سے پہلے زین نے وہاں پہنچ کر استقبالیہ سے یہ چیک کیا کہ اس کے دوستوں میں سے کون، کون وہاں پہنچ چکا تھا اور یہ کہ ان سب کے کمرے اس کے کمرے کے ساتھ، ساتھ تھے کہ نہیں۔ نئی، نئی شادی ہوئی تھی، زین کو اتنا جانتی بھی نہ تھی، یہی سوچا کہ باقی دوستوں کی بھی انہی دنوں میں شادیاں ہوئی ہوں گی اور سب نے مل کر اپنا، اپنا ہنی مون پلان کیا ہوگا۔ کمرے میں پہنچ کر بھی وہ فون پر مسلسل ان سے رابطہ کر کے پوچھے جا رہا تھا کہ وہ لیٹ کیوں ہیں۔ دوستوں کے ساتھ گفتگو کے دوران وہ ہنی...... ڈارلنگ، ڈیئر اور سوئٹ ہارٹ کے القاب استعمال کر رہا تھا اور میں سن، سن کر حیران ہو رہی تھی کہ لڑکے آپس میں کیا اس طرح کے القاب سے بات کرتے ہیں۔

جلد ہی مجھ پر اس کے ہنی، سوئٹ ہارٹ اور ڈارلنگ کے بھید کھل گئے...... آتے ہی وہ سب آپس میں تپاک سے گلے ملے، گالوں پر بوسے دیے گئے، کمر میں بازو حمائل ہوئے...... ایک لڑکی تو زین سے دیر تک چپکی رہی، یہ جان کر بھی کہ وہاں زین کی بیوی بھی موجود تھی۔ آنے والے دوستوں میں چار لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں...... وہ سب دو کاروں میں اکٹھے آئے تھے۔ ہمارے کمرے کے علاوہ تین اور کمرے بک کروائے گئے تھے۔ لڑکیوں نے اپنا سامان ہمارے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں رکھا اور سب لوگ ہمارے ہی کمرے میں آ کر صوفوں اور بیڈ پر پھیل گئے، دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ میں بہ مشکل یہ سب برداشت کر رہی تھی، کھانا کھانے کے لیے سب اکٹھے اٹھے اور واپسی پر اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میں نے کہا کہ میں آرام کرنا چاہتی تھی۔

''نو پرابلم...... ہم چلتے ہیں اپنے کمرے میں، چل کر تاش کی بازی لگاتے ہیں!'' کسی ایک نے کہا۔ ''تم لوگ آرام کرو یار...... ہنی مون ہے تمہارا، انجوائے کرو!'' کہہ کر وہ لڑکیوں والے کمرے کی طرف چل دیے۔

''ان میں سے کوئی اور شادی شدہ نہیں ہے؟'' میں نے زین سے کمرے میں آ کر پوچھا۔

''نہیں یار...... سب لوگ اپنی، اپنی زندگی کو دیکھو تو کس طرح بھرپور انجوائے کر رہے ہیں۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''ایک مجھے ہی پاپا نے پھنسا دیا!''

''عمر میں تو سارے تم سے بڑے لگتے ہیں؟'' میں نے چتون چڑھائے۔

''عمر سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شادی کوئی زندگی کا the most essential کام نہیں ہے، ہو جاتی ہے سب کی۔ شادی کی پابندی میں پڑنے سے پہلے آزادی کی زندگی کا اپنا ایک مزہ ہے!'' اس نے ہوا میں گہری سانس چھوڑی۔

''تو نہ پڑتے تم اس پابندی میں، انجوائے کرتے ابھی کچھ سال۔''

''اچھا میں ان کے ساتھ جا کر ایک سگریٹ پی آؤں! تم آرام کرو، میں آ جاتا ہوں واپس......'' کہہ کر اس نے ڈریسر کا رخ کیا، اپنے شب خوابی کے لباس میں وہ باہر نکلا اور سگریٹ کا پیکٹ لے کر میرے گال کو تھپتھپایا۔ ''تم چلنا چاہو ساتھ تو چلو!''

''میں کیا کروں گی وہاں...... تم لوگ سگریٹ پیو گے، وہ لوگ تاش کھیل رہے ہیں۔''

''وہی تو......'' اس نے فوراً کہا۔ ''مگر میں نے سوچا کہ تم یہ نہ سوچو کہ میں تمہیں نظر انداز کر رہا ہوں۔ تم تو میری بیوی ہو ہی جانم، سمجھتی ہو کہ تمہارے لیے تو سارا وقت ہے مگر دوستوں سے کبھی کبھار ہی تو ملنا ہوتا ہے۔''

''میں سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' میں نے ہولے سے کہا تھا اور وہ چلا گیا۔ اپنے ہنی مون پر اپنی چند دن کی بیاہتا بیوی کو کمرے میں تنہا چھوڑ کر۔ میں کچھ دیر تو لیٹ کر کروٹیں بدلتی رہی اور کوشش کی کہ سو جاؤں مگر نیند کہاں آتی۔ فطری طور پر مجھے اپنے شوہر کے واپس آنے کا انتظار تھا۔ کافی دیر گزر گئی، نہ نیند آ رہی تھی نہ چین، سو اٹھی اور اپنے لباس کی شکنیں درست کر کے باہر نکلی۔ دوسرے کمرے کے دروازے پر پہنچ کر ٹھٹکی کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں، تاہم دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے ''یس'' کی آواز سن کر دروازہ وا کیا۔

وہ سب لوگ قالین پر ہی بیٹھے ہوئے تھے...... زارا نام کی وہ لڑکی زین کے اتنا ساتھ جڑ کر بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا آدھا وجود زین کی گود میں تھا، وہ سب سگریٹ پی رہے تھے اور ساتھ چار لوگ تاش کی بازی لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرا دھوئیں سے بھرا ہوا تھا، میں نے بہ مشکل اپنی سانس روک کر اس دھوئیں کو اپنے حلق میں اترنے سے روکا۔

''آؤ، آؤ جانم!'' زین نے ہاتھ سے تھپتھپا کر قالین پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سگریٹ کا ایک کش لگا کر اس کا دھواں زارا کے بالوں میں چھوڑا۔

''میں ٹھیک ہوں......'' میں فاصلے پر ایک صوفے پر ٹک گئی۔ زین اور زارا کو بے تکلفی کی انتہا پر دیکھ کر میرے اندر کچھ بھڑکا۔ مجھے تو وہ بے حیائی کا ایک بھرپور مظاہرہ لگا مگر وہاں سب ویسا ہی چل رہا تھا، باقی لڑکیاں بھی لڑکوں کے عین بیچ میں اور ایک، ایک لڑکے کی ''توجہ'' کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔

''تمہیں سگریٹ پینا برا لگتا ہے؟'' زارا نے مجھ سے پوچھا۔

''مجھے سگریٹ ہی برا لگتا ہے......'' میں نے غصے سے جواب دیا۔

''ایک بار پی کر تو دیکھو جانِ زین!'' اس کے لہجے میں طنز تھا جس نے مجھے بتایا کہ اگر مجھے اس کا زین سے اختلاط نہ بھایا تھا تو اسے بھی زین کا مجھے جانم کہنا برا لگا تھا۔

''زین کافی ہو گیا اب چلو کمرے میں، مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''جاؤ زین......'' ایک اور لڑکی نے کہا۔ ''بھابی کو لوری سنا کر سلانا ہوگا ناں تمہیں!'' اس پر ان کا بھونڈا اور معنی خیز قہقہہ مجھے اندر تک مزید غصے سے جلا گیا۔

''بس یہ سگریٹ ختم ہوتی ہے جانم تو چلتے ہیں!'' زین نے گویا کوئی قہقہہ سنا ہی نہ تھا یا اس کے لیے یہ اتنی بڑی بات نہ تھی۔

''یہ لو جانی...... تمہاری آخری سگریٹ...... اس کے بعد مسالا ختم ہو گیا ہے!'' میرے سامنے اس لڑکے نے کوئی سیاہ سی چیز ایک سگریٹ کو کھول کر اس کے تمباکو میں ملا کر اسے آدھا آدھا دو خالی سگریٹوں میں بھرا اور ایک، ایک زین اور زارا کو پکڑایا۔

''بہت کنجوس ہو گئے ہو یار تم لوگ!'' زارا نے کہہ کر اپنی جینز کی جیب سے ایک سنہری سا پیکٹ نکالا اور اس لڑکے کی طرف بڑھایا۔ ''یہ لو زارا کی جان کے ٹکڑے اور اب یہ نہ کہنا کہ یہ آخری سگریٹ ہے۔''

''میں کہاں سے ہو گیا تمہاری جان کا ٹکڑا...... جب تک یہ زین ہے!''

''زین اب میرا کہاں رہا پیارے!'' اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''زین ہمیشہ تمہارا تھا اور رہے گا!'' زین نے اس کے بالوں پر بوسہ دے کر کہا تھا۔

''ہم جا رہے ہیں ذرا کام سے......'' دوسری طرف بیٹھ کر تاش کھیلنے والوں کو دیکھنے والا وہ جوڑا جو کافی دیر سے

اٹکھیلیاں کر رہا تھا، ان میں سے لڑکے نے کہا، دونوں پر اس سگریٹ کے نشے کا اور ایک دوسرے کے وجود کا کافی خمار چڑھا ہوا تھا۔ سو وہ چلتے بنے۔

''چلو امرت......'' زین نے اپنی آدھی سگریٹ زارا کو دے دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے میں دھوئیں اور بُو سے بیٹھنا ناقابلِ برداشت تھا۔ میں خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''واپس آؤ گے جانی؟'' زارا نے سوال کیا۔

''نہیں اب سوؤں گا!'' زین نے پلٹ کر، جھک کر اسے الوداعی بوسہ دیا۔

''تم مجھے نظر انداز کر رہے ہو زین؟'' اس نے منہ بسورا۔

''کیسے کر سکتا ہوں، سویٹ ہارٹ!'' اس کا ہاتھ تھام کر اسے عہد دیا۔ ''امرت کے لیے یہ سب نیا ہے ناں۔''

''تو واپس آ جانا نا جب یہ سو جائے تو، پلیز!'' اس نے التجا کی۔

''ہاں یار...... بھابی سو جائیں تو آ جانا!'' ایک اور نے تائید کی۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ سب یہ ساری گفتگو کھلے عام کر رہے تھے، انہیں کسی بات کا ڈر نہ تھا، یوں لگ رہا تھا کہ اس سارے منظر میں، میں کہیں نہ تھی۔ میں تھی تو کیا انہیں نظر نہ آ رہی تھی یا میرا وجود اتنی سی اہمیت بھی نہ رکھتا تھا کہ وہ اس کے وہاں ہونے کا کچھ لحاظ کرتے۔

''چلو ڈارلنگ......'' زین کا یوں سب کے سامنے مجھے اس انداز سے مخاطب کرنا بھی مجھے ناگوار گزر رہا تھا۔ میں اس کی ہمراہی میں باہر نکلی، کمرے سے باہر نکلتے ہی میں قدرے فاصلے پر ہو گئی، اس کے وجود سے کئی قسم کی ناگوار بوئیں میری طبیعت پر گراں گزر رہی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' اس نے میرے گریز کو محسوس کیا۔

''تم نے کس، کس طرح کے سگریٹ پیے ہیں زین...... مجھ سے اس کی بُو برداشت نہیں ہو رہی؟''

''کچھ ایسا خاص بُو والا سگریٹ نہیں پیا...... جیسے سارے سگریٹ ہوتے ہیں، ویسا ہی ہے۔''

''تم لوگ سگریٹوں میں کچھ اور بھر کر پی رہے تھے۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

''وہ ذرا...... اس سے تھکاوٹ اتر جاتی ہے، ہلکی سی دوا ہے اور کچھ نہیں۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ وہ کوئی ٹھیک چیز نہیں ہے......'' میں نے اپنے ہاتھ میں دبے اس ریپر کو محسوس کیا جو میں نے خاص طور پر سنبھال لیا تھا۔

''یونہی وہم نہ کیا کرو......'' زین نے کمرے میں پہنچ کر میرے قریب ہونے کی کوشش کی اور میں نے خود کو اس کی گرفت سے نکالا۔

''اس سے بہتر تھا کہ میں وہیں بیٹھا رہتا...... اگر تم نے کمرے میں آ کر یہی ادائیں دکھانا تھیں۔''

''زین تم بھول رہے ہو کہ یہ میرا اور تمہارا ہنی مون ہے...... تم اس کمرے میں ایک غیر لڑکی کے ساتھ قابلِ اعتراض حالت میں بیٹھے تھے، جسے دنیا کی کوئی بیوی برداشت نہیں کر سکتی۔''

''میں کیا کروں...... کہاں جاؤں...... وہ کہتی ہے وہ تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتی اور تم کہتی ہو کہ تم اسے میرے ساتھ برداشت نہیں کر سکتیں......'' اس کی آواز میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔

''تم نے شراب پی رکھی ہے زین؟'' میں نے اس سے دور ہٹتے ہوئے کہا، وہ بیڈ کے کنارے پر بیٹھا ہوا تھا۔

''کم آن امرت...... اتنی فرسودہ باتیں نہ کرو......'' اس کی ڈھٹائی قائم تھی۔ ''یہاں آؤ میرے پاس!''

''میں آتی ہوں دس منٹ میں!'' کہہ کر میں غسل خانے میں چلی گئی۔

ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریپر کو کھول کر پڑھا اور اسے تہہ کر کے اپنے میک اپ والے تھیلے میں، سامان کے نیچے رکھ دیا۔ فلش کی سیٹ کو بند کر کے میں اس پر بیٹھ گئی اور گہری، گہری سانسیں لینے لگی، یہاں نسبتاً ہلکی سی خوشگوار خوشبو تھی جو کسی اچھے برانڈ کے ائر فریشنر کی مرہونِ منت تھی۔ میں وقت گزار رہی تھی کہ وہ سو جائے، پورے دس منٹ گزار کر میں نے خواہ مخواہ فلش کیا، اپنے دانت صاف کیے اور منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مارے...... وہ جاگ رہا تھا اور اسی پوزیشن میں بیٹھا ہوا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو میری جان؟'' اس نے سوال کیا۔ ''اتنی دیر لگا دی!''

''ہاں وہ میرا پیٹ کچھ گڑبڑ کر رہا ہے!'' میں نے جھوٹ بولا...... جانے کیوں۔

''اچھا پھر سو جاؤ تم......'' وہ بیڈ سے اٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا۔

میں بیڈ پر بیٹھ گئی، کہیں وہ میرے میک اپ والے تھیلے کی تلاشی نہ لے لے، میں نے سوچا۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ بعد میں وہ پیکٹ اپنے بیگ میں رکھ لوں گی اور چاچو کو جا کر دکھاؤں گی، وہ پیکٹ جس کے اندر سے وہ کچھ سیاہ سا مواد نکال کر سگریٹ میں تمباکو کے ساتھ دوبارہ بھر کر پی رہے تھے اور اس کے بعد سب کی آنکھیں چڑھی، چڑھی اور گفتگو بے ربط تھی۔ یونہی سوچوں میں مجھے نیند آ گئی تھی، معلوم ہی نہ ہوا کہ کب وہ غسل خانے سے نکلا اور اس کے بعد کہاں گیا۔ مگر صبح جاگی تو وہ صوفے پر بیٹھے، بیٹھے سویا ہوا تھا۔ میرے اٹھنے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

''اب تم ٹھیک ہو ناں بالکل؟''

''ہاں...... کیا ہوا مجھے؟'' مجھے بھول گیا کہ میں نے پیٹ خراب ہونے کا بہانہ کیا تھا۔

''دوبارہ گئیں تم باتھ روم؟'' اس نے سوال کیا۔ ''ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت ہے؟'' اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ واقعی مجھے سلا کر واپس اپنی دوست کا پہلو گرمانے چلا گیا تھا اور شاید صبح ہی واپس آیا ہوگا۔

☆☆☆

''کہاں چلی گئی تھیں تم؟'' میں سوچوں میں جانے کتنی دیر گم رہی تھی کہ تمنا کو باہر سے آتے دیکھ کر چونکی تھی۔

''وہ فون تھا کسی کا اور یہاں سروس نہیں تھی تو میں باہر بالکونی میں چلی گئی...... کال ختم ہو گئی تو میں یونہی باہر گھومتی ہوئی اسپتال دیکھ رہی تھی...... میرا تو خواہ مخواہ بیمار ہونے کا دل چاہ رہا تھا۔''

''شرم کرو......'' میں نے اسے تنبیہ کی۔

''قسم سے امرت...... میں نے اس سے پہلے ایسا خوب صورت اسپتال نہیں دیکھا!'' اس نے اسپتال کی تعریف کی۔ ''ایسی خوب صورت اور بااخلاق نرسیں ہیں۔''

''اچھا ہی ہوا کہ زین نہیں ٹھہرا ورنہ......'' میں نے ہنس کر کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی، تمہاری محبت میں گوڈے، گوڈے ڈوب کر انہوں نے تم سے شادی کی تھی، وہ کیوں کسی اور کو دیکھ کر متاثر ہوں گے؟'' تمنا نے پُریقین لہجے میں کہا۔

''مرد کا کیا بھروسا پیاری......'' میں نے مذاق کے لہجے میں کہا۔ ''ایک جیب میں، ایک ہاتھ میں رکھتے ہیں اور دو چار کو پیچھے بھی لگائے رکھتے ہیں۔''

''ان کا کیفے ٹیریا بڑا زبردست ہے...... چلیں کوئی سوپ شوپ پیتے ہیں؟'' تمنا نے منہ میں اس سوپ کے ذائقے کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''میں تو شاید اب کچھ کھا نہیں سکتی۔'' میں نے اسے کہا۔ ''نرس ابھی بلڈ پریشر چیک کرنے آئے گی تو اس سے پوچھوں گی۔''

"میں جا کر اس سے پوچھ نہ آؤں؟" وہ باہر گئی اور چند منٹوں میں واپس آ گئی۔ "وہ کہہ رہی ہیں کہ ابھی تم کھا سکتی ہو اور سوپ تو یوں بھی ہلکا کھانا ہے، مزید تین گھنٹے کے بعد بھی پی سکو گی تم۔"

"ہاتھ پر یوں کینولا لگا ہوا......" میں جھجکی۔

"کوئی بات نہیں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے!" اس نے مجھے اٹھایا اور میں نے اپنا ہاتھ اپنی بڑی سی چادر کے اندر چھپالیا۔ "ایسے لگ رہا ہے جیسے ہم اپنی یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں بیٹھے ہوئے ہیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"اتنا اچھا کیفے ٹیریا تو نہیں تھا وہ......" میں نے بھی ہنس کر کہا۔

"مجھے تو یونیورسٹی کا وقت بہت یاد آتا ہے...... کبھی کبھی میثاق کو ساتھ لے کر جاتی ہوں اور اس سڑک پر ہم لمبی ڈرائیو کرتے ہیں۔"

"اسے وہاں جانے میں بھلا کیا کشش محسوس ہوتی ہوگی؟"

"میری خوشی کی خاطر جاتا ہے وہ صرف۔"

"ہوں......" میں نے سوپ کا پہلا گھونٹ لیا۔

"یونیورسٹی کا سوچ، سوچ کر کیا کچھ یاد آتا ہے ناں!" اس نے بات شاید کسی مقصد سے بڑھائی تھی۔

"زندگی کے پیچھے رہ جانے والے ہر دور کے ساتھ بہت کچھ یاد آتا ہے تمنا...... مگر ہم سب یادوں کی گٹھڑی کا بوجھ اٹھا کر تو نہیں چل سکتے ہر وقت۔"

"سب کچھ نہیں...... کچھ چیزیں تو بہت خاص ہوتی ہیں!"

"سوپ اچھا ہے......" میں نے موضوع بدلا۔

"کچھ اور لو گی پیاری؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، میرے لیے یہ کافی ہے۔ تم کچھ کھانا چاہو تو لے لو، میری وجہ سے تکلف میں نہ رہنا، میں تو کچھ ہلکا ہی کھانا چاہتی تھی، دودھ کے ساتھ ایک دو بسکٹ لے لوں گی تو گزارہ ہو جائے گا۔" میں نے اسے کہا۔

"میں پہلے کچھ آرڈر کر کے ذرا واش روم سے ہو کر آتی ہوں......" کہہ کر وہ کاؤنٹر کی طرف گئی، کچھ آرڈر کیا اور پھر غسل خانے کی طرف چلی گئی۔ سامنے میز پر رکھا اس کا فون بج رہا تھا...... ایک بار، دو بار بج کر بند ہوا اور پھر مسلسل بیل ہونے لگی۔ میں نے فون کو سیدھا کر کے دیکھا، یہ سوچ کر کہ میثاق یا امو جان کال نہ کر رہے ہوں۔ کوئی انجان نمبر تھا، نمبر آ رہا تھا، نام نہیں۔

"السلام علیکم......" بار، بار بجتے رہنے کی وجہ سے میں نے فون اٹھالیا، کوئی ضروری کام سے ہی کال کر رہا ہوگا۔

"تمنا؟" اس نے میری آواز نہیں پہچانی تھی مگر میں اس آواز کو اب بھی پہچان گئی تھی۔

"نہیں......" میں نے مختصراً کہا۔ سوچا کہ فون بند کر دوں مگر مجھے یہ بد اخلاقی لگی۔ ایک تو تمنا کا فون اٹھالیا، اوپر سے اس کی آواز سن کر فون بند کر دیتی، کہیں وہ اسے تمنا کی بد اخلاقی نہ سمجھ بیٹھے۔ تمنا کا تو اس سے رابطہ ہوگا، سارے سلسلے تو میرے اور اس کے بیچ کے منقطع ہوئے تھے۔

"جانتا ہوں...... صرف کنفرم کر رہا تھا......" اس نے تھکے سے لہجے میں کہا۔ "کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں...... تمنا ذرا واش روم تک گئی ہے...... ابھی آتی ہوگی!"

"مجھے آپ سے بات کرنا تھی...... تمنا سے کہا تھا کہ ایک بار آپ سے بات کروا دے۔" ہمارے بیچ کیا کچھ حائل ہو گیا تھا کہ تم سے آپ تک کا سفر انجانے میں ہی طے ہوا تھا۔ "فون بند نہ کیجیے گا پلیز!"

"مجھ سے آپ کو کیا بات کرنی ہے؟" میرے لیے اسے تم کہنا ممکن نہ رہا تھا۔

"آپ کے بارے میں سن کر میں بہت تکلیف میں تھا...... ایک بار آپ کی آواز سننا چاہتا تھا۔"

"ہونہہ......" میں نے ہنکارا ابھرا۔ "شاید آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شاید میں زندہ نہ بچوں اس لیے آپ میری آواز آخری بار سننا چاہتے تھے......"

"امرت......" وہ سسکا۔ "یوں نہ کہیں پلیز!"

"آپ میرے کزن ہیں، اس حوالے سے آپ نے مجھے کال کر کے میری خیریت پوچھ لی، آپ کا شکریہ کال مگر براہِ کرم...... اور کچھ مت کہیے گا، کوئی ایسی بات جو مجھے احساسِ جرم میں مبتلا کر دے کہ میں ایک داغدار ماضی کی حامل عورت ہوں، پورے خلوص سے اپنے شوہر کے ساتھ رہنے کے باوصف میرے ماضی کی وہ کیچڑ اب بھی میرے ضمیر کو کچوکے لگاتی ہے۔"

"امرت!"

"آپ خیریت سے ہیں، پاکستان آئے ہوئے ہیں؟" میں نے بالکل نارمل لہجے میں بات کرنے کی کوشش کی مگر میرا چہرہ ضبط کے باعث سخت ہو رہا تھا۔

"میں امریکا سے ہی کال کر رہا ہوں۔"

"اوہ اچھا...... مگر اسکرین پر نمبر تو پاکستان کا آ رہا ہے؟"

"کالنگ کارڈ سے کال کریں تو ایسا ہی ہوتا ہے!"

"اوکے، فون بند کرتی ہوں۔"

"ایک منٹ...... ایک منٹ امرت!" وہ فوراً بولا۔ "پلیز ایک بات سنو!" پہلے چند فقروں کے بعد اس نے آپ جناب کا تکلف ختم کر دیا تھا۔

"جی کہیں؟"

"میں بہت دعا کر رہا ہوں تمہارے لیے!"

"بہت شکریہ کال!" کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔ بصد کوشش بھی میں کال بھائی نہ کہہ سکی تھی۔

ابھی چند لمحے پہلے ہی تو جب تمنا نے یونیورسٹی کا ذکر کیا تھا تو میرے دل کے چور خانے میں اس کی یاد کا دیا جلا تھا، جسے میں نے جلنے بھی نہ دیا تھا اور چند لمحوں کے بعد اس کی کال آ گئی تھی۔ گویا ساری پلاننگ تمنا کی تھی، تھوڑی دیر پہلے ہی اس نے یونیورسٹی کا ذکر بھی دانستہ کیا تھا، شاید وہ مجھے کال سے بات کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہ رہی تھی۔ فون بند کر کے میں سوچ رہی تھی کہ وہ واپس آئے تو اس کی کلاس لوں...... دل میں کئی درد جاگ اٹھے تھے، جو باب میں اپنی زندگی کی کتاب میں سے بند کر چکی تھی انہیں جب واقعات کی آندھی الٹ کر کھول دیتی تو ان کی کسک جاگ جاتی۔ پچھتاوے تھے ان سے وابستہ جو مجھے کچوکے لگاتے تھے۔

تمنا ابھی تک نہ لوٹی تھی، میں نے اس کا فون اٹھایا اور اس پر سے وہ کال ڈیلیٹ کر دی...... جانے کیوں! شاید میں اس سے اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"سوری بہنا...... ذرا دیر ہو گئی۔" وہ اپنے ہاتھوں پر لوشن لگاتی ہوئی وارد ہوئی۔

"کوئی بات نہیں......" "تمہارا پیٹ تو ٹھیک ہے ناں؟" میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں! کیوں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"دیر جو لگا دی تم نے!"

"نہیں، میں ٹھیک ہوں بالکل......" اس نے ٹھنڈے ہو جانے والے سوپ کو ایک طرف کر دیا۔ "تم سینڈوچ لو گی؟"

"میرا پیٹ بھر گیا ہے بالکل!" میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا، میں نے اس سے کہا۔ "تم بل کیوں دو گی بھلا!"

"تم دو یا میں دوں..... ایک ہی بات ہے۔" اس نے اپنا بیگ کھولا۔

"کمرے سے میرا بیگ لے آتیں تم!" میں نے اس سے مروتاً کہا۔ ورنہ میرا بیگ میرے پاس ہوتا بھی تو اس میں سے کیا نکلتا، جو رقم ماما نے اخراجات کے لیے دی تھی وہ تمنا نے لاکر میں رکھ دی تھی۔

"اور سب ٹھیک ہے؟" دو دفعہ خواہ مخواہ تمنا نے فون پلٹ کر اسے آن کر کے دیکھا تھا، کال کا ریکارڈ بھی غالباً چیک کیا تھا مگر اسے کیا ملتا، اس کی آنکھوں میں کھوج تھی اور وہ میرے چہرے پر کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

"ہاں میں تو ٹھیک ہوں..... تم کچھ ٹھیک نہیں لگ رہیں۔" میں نے انتہائی پُرسکون لہجے میں کہا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں، چلو کمرے میں چلتے ہیں۔"

☆☆☆

بارہ بائی بارہ فٹ کا کمرا ہوگا جس میں، میں بیڈ پر اور وہ صوفہ کم بیڈ پر تھی، ہم دونوں کے درمیان خاموشی کمرے میں تیسرے فرد کی طرح براجمان تھی۔ میں چھت کی طرف دیکھ رہی تھی، جانے کیا، کیا سوچ رہی تھی ایک ہی رات پہلے زین کے ساتھ گزری ہوئی رات کی تلخ یاد نے میرے سینے کی گہرائی سے درد کی ایک لہر کو اٹھایا اور میرے سر تک پہنچا دیا۔

"نیند نہیں آ رہی ہے تمہیں؟" تمنا نے سر اٹھایا۔

"اونہوں!" میں نے سچ بولا۔

"پُرسکون رہو....." اس نے وہیں سے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا، میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کوشش کر رہی ہوں۔" میں نے اس کے ہاتھ کو سہلایا۔

"تم سے ایک بات کہنا تھی۔" اس نے ڈرتے سے لہجے میں کہا۔

"مجھے بھی تم سے ایک بات کہنا تھی!" میں نے ہلکی سی روشنی میں اس سے نظر چرائی۔

"کیا؟"

"پہلے تم کہو!"

"کوئی تم سے بات کرنا چاہتا ہے!" اس نے ہولے سے کہا۔

"مجھ سے..... کون؟ ایسا کون ہے جسے مجھ سے بات کرنے کے لیے تمہارے ذریعے اجازت لینے کی ضرورت ہے؟"

"ہے ایک!" اس نے مسکرا کر کہا۔ "اگر میں تم سے پوچھوں گی تو تم منع کر دو گی۔"

"اچھا..... وہ کون ہے؟" میں نے بھی جواباً مسکرا کر پوچھا۔

"کامل بھائی....." اس نے سوچ کر منہ سے تیر چھوڑا تھا، اس کا اثر میرے چہرے پر تلاشتی اس کی نظروں کو کچھ نہ ملا۔

"تو؟" میں نے اس کی بات پر کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا، ایسا کہ جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔

"وہ بہت پریشان ہوئے تھے تمہاری بیماری کا سن کر، تم سے ایک بار بات کرنا چاہتے تھے، تمہاری خیریت جاننا چاہتے تھے!"

"میری خیریت تو وہ تم سے بھی پوچھ سکتے تھے..... اور رہی بات مجھ سے بات کرنے کی تو وہ میرے کسی بھی پھوپی زاد کی طرح میری خیریت دریافت کر سکتے ہیں، اس کے لیے اتنے مشکل راستے اختیار کرنے اور اتنے ڈرامے پلان کر کے سین تیار کرنے کی تو کوئی ضرورت نہیں!"

"کیا!" وہ چیخی۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم نے ان سے بات کر لی ہے؟" اس نے قیافہ لگایا، ہم ایسی ہی تھیں، ایک دوسرے کی آدھی ادھوری باتوں کو بھی سمجھ جاتیں۔ "لیکن تم نے ان سے کیسے بات کی، میرے فون پر تو کوئی کال ان کے نمبر سے نہیں آئی؟"

"ہوں، تمہارے ڈرامے کے پلاٹ میں کچھ کمزوریاں تھیں، تم نے جان بوجھ کر مجھے کینٹے ٹیریا جانے کا کہا کیونکہ کمرے میں فون کی سروس نہیں تھی۔ پھر تم جو ہمیشہ گرما گرم سوپ پینے کی عادی تھیں، اپنا سوپ پیے بغیر، اپنے فون سے کسی کو پیغام کرنے کے بہانہ کر کے اٹھیں اور تمہارا فون وہیں رہ گیا، وہ فون جو تم غسل خانے جاتے ہوئے بھی ساتھ لے کر جاتی ہو....." میں رکی۔ "تم بھی جانتی ہو اور وہ بھی کہ اگر وہ کسی ایسے نمبر سے کال کرتا جس کے ساتھ فون کی اسکرین پر اس کا نام آ رہا ہوتا تو میں شاید وہ کال نہ اٹھاتی۔ ایک ہی نمبر سے بار، بار مسلسل آنے والی کال میں نے اس لیے اٹھائی کہ وہ لوکل نمبر تھا اور میں بھی کہ کہیں کوئی ایمرجنسی نہ ہو!"

"کیسی چالاک ہو تم!" وہ ہنسی۔

"اگر تم مجھ سے سیدھے سبھاؤ کہہ دیتیں تمنا کہ کامل آخری دفعہ میری آواز سننا چاہتا ہے تو شاید میں تمہارے کہنے سے ہی اس سے بات کر لیتی، اتنا مشکل سین کرنے کی ضرورت نہ پڑتی!"

"ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟" وہ روتی ہوئی اٹھ کر میرے بیڈ پر آ کر مجھ سے لپٹ گئی۔

"میں..... میں ہر صورتِ حال کے لیے تیار ہوں پیاری، بری ترین کے لیے بھی!" میں نے اسے سہلاتے ہوئے کہا۔ "موت آنا ہوگی تو میں اسے بھی نہیں روک سکوں گی، شاید اس وقت میری جو زندگی ہے اس سے نجات کی بہتر راہ یہی ہے!"

"ایسی باتیں نہ کرو امرت!" وہ سسکی۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا!"

"کچھ بھی ٹھیک ہونے والا نہیں ہے، ٹھیک ہو ہی نہیں سکتا!" دروازے پر دستک کی آواز نے ہم دونوں کو چونکا دیا، ہم نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کون ہے؟" تمنا نے بند دروازے کے پاس کھڑے ہو کر پوچھا۔

"تم یقیناً تمنا ہو..... شکر ہے کہ تم ہو یہاں!" باہر سے آواز آئی۔ "میں سارہ ہوں!" میں نے تمنا کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔

"میری جان امرت!" وہ آ کر پہلے تمنا کو سلام کر کے پھر میری طرف لپکی اور آ کر مجھ سے لپٹ گئی، میں تب تک اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔

"ارے یہ تم اتنی پیاری اور مختلف کیسے لگ رہی ہو؟" تمنا نے کمرے کی بتی آن کر دی تھی۔ "کسی کی شادی اٹینڈ کر کے آ رہی ہو کیا؟" اس کے ہاتھوں پر پیارے سے ڈیزائن کی مہندی لگی ہوئی تھی۔

"بس یہی سمجھو!" وہ ہنسی، اس کی ہنسی بھی مختلف تھی۔

"کس کی شادی تھی؟" میں نے سوال کیا۔ "کل جو تم نے تصویر بھیجی تھی وہ بھی اسی شادی کی تھی، میں سمجھی کہ تم نے اپنی شادی کے وقت کی کسی البم سے کھینچ کر بھیجی تھی۔"

"ہاں وہ میری تصویر..... میری ہی شادی کی تصویروں میں سے ایک تھی۔" اس نے کہا۔ "چار دن پرانی!"

"کیا؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"میں نے شادی کر لی ہے امرت!" اس نے ہولے سے کسی مجرم کی طرح سر جھکا کر کہا۔ "میری کلاس کی ایک بچی کا والد ہے، وہ کافی عرصے سے مجھ سے رابطے میں تھا اور چاہتا تھا کہ میں اس کی محبت کے جواب میں اس کی حوصلہ افزائی کروں!"

''ہوں...... کتنے بچے ہیں اس کے؟'' میں نے سوال کیا۔

''تین...... تینوں بیٹیاں ہیں!'' اس نے کہا۔

''اچھا......'' میں نے بے دھیانی سے کہا۔ دل میں سوچا کہ تین اس کی اور دو سارہ کی، پانچ بیٹیاں ہوگئیں، اب ظاہر ہے کہ اسے بیٹا بھی چاہیے ہوگا۔

''تم خوش نہیں ہوئیں؟'' اس نے یاس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... خوش ہوں، ناخوش ہونے کی کوئی وجہ تو نہیں۔'' میں نے محسوس کیا کہ میں نے اس کی اتنی بڑی خوشی پر کسی جوش کا اظہار نہیں کیا۔ ''اصل میں، میں اپنے ہی مسئلے میں اتنی الجھی ہوئی تھی سارہ!'' میں نے اس کا مہندی والا ہاتھ تھاما۔ ''سوری میری جان!''

''کوئی بات نہیں امرت...... میں جانتی ہوں کہ تمہاری کیا پچویشن ہے اور میں یہی بات اس روز بھی تم سے کہنا چاہتی تھی اور بعد میں بھی کال کر کے تم سے مشورہ کرنا چاہا تھا مگر ایسا ہو نہ سکا۔''

''کوئی بات نہیں!'' میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔ ''بیٹیاں کہاں ہیں تمہاری؟''

''گھر پر!'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''تمہارے نئے گھر پر؟'' میں نے سوال کیا۔

''نہیں امرت...... وہ اپنے گھر پر ہی ہیں، میں خود بھی اپنے گھر پر ہی ہوں۔ ابھی حالات موافق ہوں گے تو اندازہ ہوگا کہ مستقبل میں کیا ہوگا، فی الحال ہم اپنے، اپنے گھروں میں ہی ہیں!''

''بچیوں کا کیا ردِعمل ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ابھی انہیں حقیقت کی خبر نہیں...... وہ سمجھتی ہیں کہ میرا کوئی کزن ہے جو بڑے عرصے کے بعد آیا ہے اور اکثر ہمارے ہاں آ جاتا ہے، مجھے کسی عجیب صورتِ حال کا سامنا ہونے کا بھی ڈر ہے مگر اس کے گھر کے حالات بھی ابھی ایسے ہی ہیں کہ وہ آہستہ، آہستہ اس بات کو اپنے گھر پر بھی منکشف کرے گا۔''

''ظاہر ہے کہ اس کی بچیوں کو بھی تیار کرنے کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کی بیٹیاں تمہاری بیٹیوں سے بڑی ہوں گی؟''

''ہاں...... وہ تینوں بڑی ہیں میری بیٹیوں سے!'' وہ رکی۔ ''بڑی بیٹی تو اب بارہ سال کی ہوگئی ہے!''

''چلو اچھا کیا...... ظاہر ہے کہ اس کی بیٹیاں بھی اب عمر کے ایسے حصے میں ہیں کہ انہیں ماں کی ضرورت باپ سے زیادہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر بہتر ہوتا کہ تم دونوں پہلے اپنے، اپنے بچوں سے بات کرتے۔ وہ بھی اپنی بیٹیوں سے بات کرتا کہ عمر کے جس مقام پر وہ ہیں وہاں یہ شادی محبت سے مجبور ہو کر نہیں بلکہ نظریۂ ضرورت کے تحت کر رہا ہے، وہ بڑی ہیں، سمجھ جاتیں، انہیں ماں بھی مل رہی تھی اور......''

''اس نے یہ شادی محبت ہی کے ہاتھوں مجبور ہو کر کی ہے امرت!'' سارہ نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں لرزش تھی۔ ''مجھے بھی شاید اس سے محبت ہوگئی تھی۔ ان بچیوں کی اپنی ماں زندہ ہے، انہیں کسی اور ماں کی ضرورت نہیں تھی۔'' میں اس کا منہ تک رہی تھی۔ حیران تھی کہ میں جو سوچتی تھی کہ وہ کون سی عورتیں ہیں جو شادی شدہ مردوں سے بغیر کسی جواز کے شادی کر لیتی ہیں، وہ کیسی ہوتی ہیں؟ ان میں سے ایک عورت میرے سامنے بیٹھی تھی جس نے ایک اور عورت کے آشیاں پر نقب لگائی تھی، اس کے ہنستے بستے آنگن میں شراکت کا پودا لگا دیا تھا۔ جانے یہ شادی کس کروٹ بیٹھتی اور محبت کا یہ خمار اترتا تو سارہ کا کیا انجام ہوتا۔

☆☆☆

''لگتا ہے کہ تم اپنی دوست کی شادی سے بہت پریشان ہوگئی ہو، اس نے کچھ ایسا برا نہیں کیا، ہر عورت کو معاشرے میں اپنے لیے تحفظ تلاش کرنے کا حق حاصل ہے۔'' تمنا، سارہ کے جانے کے بعد مجھے خیالوں میں گم دیکھ کر بولی۔

''اس کی طرف سے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے...... بس دکھ ہوا ہے، میں بھی چاہتی تھی کہ وہ اپنے لیے کچھ بہتر سوچے، ساری زندگی اس طرح گزارنا آسان بھی نہیں ہوتا مگر اس کے ذہن میں کبھی میری بات بیٹھی ہی نہیں۔ اب جانے یہ اچانک محبت کہاں سے جاگی اور اتنی جلدی سر چڑھ کر بولنے لگی، مجھے صرف یہ ڈر ہے کہ جتنی جلدی یہ بخار چڑھا ہے اتنی جلدی اتر نہ جائے۔''

''تم اس کی وجہ سے خود کو پریشان تو نہ کرو اس وقت۔''

''سارہ نے بہت برے، برے وقتوں میں میرا ساتھ دیا ہے، یقین کرو اگر میری زندگی میں سارہ نہ ہوتی تو میرا دم گھٹ جاتا۔ میں شاید خود کو کچھ کر لیتی، اس نے مجھے کبھی کسی طرح کے حالات میں تنہا نہیں چھوڑا...... کاش میں بھی اس کے لیے کچھ کر سکتی۔''

''تم اپنا دل چھوٹا نہ کرو...... اس کے لیے دعا کرو، جو بھی ہوا ہے وہ اسی طرح ہونا لکھا تھا۔''

''سو تو ہے......'' میں نے کہا اور کروٹ بدل لی تاکہ وہ میری آنکھوں میں امڈ کر آنے والے آنسوؤں کو نہ دیکھ سکے۔ ''سو جاؤ اب، مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔''

''شب بخیر!'' اس نے لیمپ بند کر دیا۔ میں سارہ کی طرف سے انجانے سے اندیشوں کا شکار تھی، اسی کو سوچ رہی تھی۔

''شب بخیر......'' میں نے اسی رخ پر لیٹے ہوئے کہا۔

''ارے یاد آیا امرت!'' اس نے پھر لیمپ جلا لیا، میں نے کروٹ نہ بدلی۔ ''تم نے کہا تھا کہ تم نے مجھ سے کوئی بات کہنا تھی؟''

''ہوں......'' میں نے کچھ سوچنے کی اداکاری کی۔ ''یاد نہیں آ رہا کہ کیا بات کہنا تھی، اس وقت تو ذہن میں ہوگی مگر سارہ کے آ جانے سے سب بھول گئی!'' کروٹ دوسری طرف ہونے کی وجہ سے بات بن گئی ورنہ میرے چہرے سے وہ جان جاتی کہ میں بات بھولی نہیں تھی بلکہ بات اسے بتانا نہیں چاہتی تھی اب۔ میں زین اور زارا کی دوستی کے بارے میں ہی تمنا کو بتانا چاہ رہی تھی اور گزشتہ رات کا زارا کا مطالبہ اور زین کی حرکت پر سوچ کر رہ گئی۔

''میں تم سے کامل بھائی کے بارے میں بات کر رہی تھی اور تم نے کہا تھا کہ تمہیں بھی کچھ کہنا تھا!'' اس نے مجھے یاد دلانے کے لیے اشارے دیے مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا۔ کچھ بھولا ہوتا تو کچھ یاد آتا ناں!

☆☆☆

مجھے سمجھ میں نہ آیا تھا کہ زین نے مجھے ایک آنکھ دبا کر کیا اشارہ کرنا چاہا تھا، میں نے کچھ نہ سمجھنے کا اشارہ کیا، زین نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا مگر مجھے پھر بھی سمجھ میں نہ آیا تھا۔

''اچھا بابا...... سن رہی ہو ناں تم فون پر اور تمہیں ہماری طرف کی آوازیں آ رہی ہیں ناں؟'' زین نے فون پر کہا تھا۔

''ہاں، مجھے تمہاری آواز صاف سنائی دے رہی ہے...... امرت ہے تمہارے پاس ابھی؟'' میں اس آواز کو فون پر نہ پہچان سکی تھی، سوالیہ نظروں سے زین کو دیکھا۔

''زارا ہے......'' اس نے میری کشمکش کو دور کیا۔ ''مجھ سے ناراض ہے کسی بات پر، غصے میں ہے، سمجھتی ہے کہ میں اسے ٹال مٹول کرتا ہوں اور اس سے کبھی شادی نہیں کروں گا۔ اسے بتایا بھی ہے کہ تمہیں کینسر ہو گیا ہے اور یہ کہ تمہارے بچنے کے امکانات بھی کم ہی ہیں مگر یہ بھی اپنی ضد کی ایک ہی ہے!''

''یہ کس طرح کی باتیں کر رہے ہو تم زین؟ تم اتنے بے رحم کیسے ہو سکتے ہو، میں تمہاری بیوی ہوں، اس طرح کہتے

ہوئے تمہارے دل کو کچھ نہیں ہوتا، بجائے اس کے کہ تم مجھے حوصلہ دو، تم نے اپنے دل میں پکا یقین کرلیا ہے کہ میں بچ نہیں پاؤں گی!'' میں نہ چاہتے ہوئے بھی رو پڑی۔

''سن لیا تم نے!'' زین نے فون میں کہا تھا۔ ''یہی کہہ رہی ہے ناں وہ کہ میں اس کا خیال نہیں رکھتا اور اس سے محبت نہیں کرتا، اس کے ہونے یا نہ ہونے سے مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔''

''تم مجھے باتوں میں الجھا رہے ہو زین۔'' دوسری طرف وہ چیخی تھی۔ ''میں تمہیں خالی دھمکی نہیں دے رہی، جو کہہ رہی ہوں وہ کرکے دکھاؤں گی تمہیں اگر تم نے میرا مطالبہ پورا نہ کیا۔ میں اپنی کلائی کی رگ کاٹ سکتی ہوں تو میرے لیے نیند کی بیس گولیاں کھالینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔''

''دیکھو...... تم بہت بے وقوفانہ مطالبہ کررہی ہو...... تمہیں بتایا ہے کہ اس کے بچنے کی امید بہت کم ہے، تم تھوڑا عرصہ انتظار کرلو، اگر اسے کچھ نہ ہوا تو میں تمہارا مطالبہ مان لوں گا۔'' زین گھگیا یا تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ ایسی واہیات حرکتیں اور گفتگو کرنے والی لڑکی میں کیا تھا کہ زین مجھ سے شادی کرنے کے بعد بھی اس سے شادی کا متمنی تھا۔

''زین...... تم میری بات مان رہے ہو یا کہ نہیں؟'' اس نے یوں کہا جیسے آخری وارننگ دے رہی ہو۔ ''میں مزید ایک منٹ تک انتظار کررہی ہوں، ٹیلی فون پر اب اور کوئی آواز نہیں سننا ہے مجھے اس کے سوا۔''

''وہ تم سے کہہ کیا رہی ہے زین، کیا چاہتی ہے، کیا مطالبہ ہے اس کا؟'' میں نے غصے سے دانت پیس کر پوچھا۔

''وہ چاہتی ہے امرت کہ میں تمہیں طلاق دے دوں۔'' اس نے میرے سر پر بم پھوڑا۔ ''میں اسے بہت چاہتا ہوں امرت، اس کے بغیر جینے کا تصور بھی محال ہے......'' اس کے لہجے میں منت تھی۔ ''میں تمہیں کبھی طلاق نہ دیتا امرت مگر...... میں بہت مجبور ہوں، اگر میں ایسا نہیں کروں گا تو وہ خود کو ختم کرلے گی، میرے جینے کا مقصد ختم ہوجائے گا۔'' میں گونگی ہوگئی تھی، دیدے پھٹ کر حلقوں سے باہر کو نکل رہے تھے......

''تم میری بات مان رہے ہو کہ نہیں؟'' وہ چیخی۔

''کررہا ہوں یار...... کررہا ہوں، ایک منٹ صبر کرو!'' اس نے تھوک نگلا۔ ''امرت...... میں زین جمال!''

☆☆☆

''تم کہیں رو تو نہیں رہیں امرت؟'' وہ بتی جلا کر میرے سرہانے کھڑی تھی۔

''نہیں!'' میری آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

''ارے پاگل...... اس نے کچھ اچھا سوچ کر ہی ایسا کیا ہوگا ناں، اس کے لیے تم خواہ مخواہ خود کو ہلکان کررہی ہو۔''

''کس کے لیے؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''وہ جو ہے تمہاری دوست سارہ!'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''نہیں...... اس کے لیے نہیں، یونہی کچھ اور یاد آگیا تھا۔''

''کچھ اور یا کوئی اور؟'' اس نے مذاق سے کہا۔

''لائٹ بند کردو تمنا...... مجھے آنسو بہانے سے نہ روکو پیاری، میرے دل پر بہت بوجھ ہے، اسے میری آنکھوں سے نکلنے دو، نہ بات کرو مجھ سے نہ کوئی سوال، تسلی دو نہ دلاسا...... بس مجھے میرے ساتھ تنہا چھوڑ دو!''

''میں تمہاری بہن ہوں امرت...... کسی حال میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑنے والی۔'' وہ آکر مجھ سے لپٹ گئی۔

''مجھے اپنا غم خود ہی منانے دو تمنا پلیز...... میری بہن، مجھے ایک بار ٹوٹنے دو، بکھرنے دو، میں خود ہی اٹھوں گی، خود ہی سنبھلوں گی اور پہلے سے مضبوط ہوجاؤں گی۔'' اب میں ہچکیوں سے رو رہی تھی اور وہ بلک رہی تھی۔

(جاری ہے)



قدر

بشریٰ ماہا

''مبشرہ......! تمہیں گھر میں سب سے زیادہ پیار کون کرتا ہے؟'' بات کرتے، کرتے اچانک سے رومیل نے یہ سوال کیا تھا۔

''میری دادو......'' اس نے بنا اِک لمحے سوچے جھٹ سے جواب دیا۔

''اور تم سب سے زیادہ کس سے پیار کرتی ہو؟'' دوسرا سوال فوراً تیار تھا۔

''ماما جان سے۔'' مبشرہ نے جھٹ سے جواب دیا۔

''اس کے بعد......'' جواب ملتے ہی پھر سے سوال حاضر تھا۔

''پاپا سے......'' اس نے اس بار بھی جواب سوچے بنا جھٹ سے دیا تھا۔

''یار یہ تو غلط بات ہے۔ جب دادو تمہیں سب سے زیادہ پیار کرتی ہیں تو ان کا بھی حق ہے کہ انہیں سب سے زیادہ پیار ملے تو پھر تم کیوں نہیں کرتیں ان سے سب سے زیادہ پیار......؟'' رومیل نے ایک نقطہ اٹھایا۔

’’تم اتنے عجیب سوال کیوں کر رہے ہو آج......؟‘‘ اس سے جواب نہ بن سکا تو چڑ کر بولی۔

’’نہیں، سوال عجیب نہیں ہے۔ بس تمہارے پاس جواب نہیں ہے اس لیے تمہیں ایسا لگا۔‘‘ وہ جو اسے اس سے بھی زیادہ جانتا تھا وہ بھلا اس بات سے کیسے انجان رہتا۔

’’جب تمہیں پتا ہے تو کیوں تنگ کر رہے ہو مجھے رومیل......‘‘ وہ ہتھیار ڈالتے ہوئے بولی۔

’’ایک بات کہوں تم سے......؟‘‘ وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پھر سے بولا۔ انداز البتہ پہلے سے سنجیدہ تھا۔

’’پلیز کوئی لیکچر نہیں اب......‘‘ وہ جھنجلا کر بولی۔

’’مبشرہ یہ جو ہمارے دادا، دادی، نانا، نانی ہوتے ہیں ناں یہ لوگ بوڑھے شجر کے مانند ہوتے ہیں......جن کی ٹھنڈی چھاؤں میں کھیل کود کر ہم بڑے ہوئے ہیں، جن کی شاخوں پر لگنے والے میٹھے رسیلے پھلوں سے ملنے والی طاقت ہمارے لہو میں دوڑتی ہے......اور جب یہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ہم سے کچھ نہیں مانگتے سوائے ذرا سی، توجہ، محبت اور وقت کے......مجھے لگتا ہے ساری زندگی ہمارے لیے قربان کرنے والے وہ اس سب کے حقدار تو ہوتے ہیں۔‘‘ وہ سنجیدگی سے بولتا گیا اور جو سمجھانا چاہ رہا تھا وہ سمجھ چکی تھی اور وہ اسے صرف سمجھا ہی تو سکتا تھا۔ عمل کرنے پر مجبور تو نہیں کر سکتا تھا ناں......

☆☆☆

’’مبشر بیٹا! تمہاری دادو کی طبیعت کل سے ٹھیک نہیں ہے، اوپر سے وہ کئی بار تمہارا پوچھ چکی ہیں، کتنی بری بات ہے ناں تم ان کے پاس کل سے نہیں گئی ہو۔‘‘ مما اسے پیار سے سمجھا رہی تھیں۔

’’اُف مما......! ابھی تو میرا بالکل موڈ نہیں ہو رہا ان کے پاس جانے کا۔‘‘ اس نے ناول پڑھتے ہوئے بیزاری سے جواب دیا۔

’’شٹ اپ......وہ تم سے یہ نہیں کہتی ہیں کہ تم ان کی خدمت کرو......بس ذرا سا وقت ہی تو مانگتی ہیں تمہارا......تمہیں ہنستا ہوا دیکھ کر ہی وہ تو خوش ہو جاتی ہیں، یہ رشتے بہت قیمتی ہوتے ہیں بیٹا......اور قسمت والوں کو ہی میسر ہوتے ہیں، یہ رشتے ساری زندگی کے لیے تمہارے پاس نہیں رہتے بیٹا۔ یہ ناولز، موبائل......یہ سب تو پھر تم کبھی دیکھ سکتی ہو......لیکن تمہاری دادو کی چھاؤں جیسی ہستی ہمیشہ تمہارے انتظار میں نہیں رہے گی بیٹا!‘‘ مبشرہ پہ ان باتوں کا اثر ہوا کہ نہیں پر اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ ناول رکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ماما جان نے اسے اپنی بات مانتے ہوئے دیکھ کر پیشانی پر محبت سے پیار کیا تھا۔

☆☆☆

اسے صبح سے ہی ہلکا، ہلکا سا بخار محسوس ہو رہا تھا۔ کالج سے بھی اس نے آج چھٹی کر لی تھی۔ دادو نے جب سے سنا کہ ان کی لاڈلی کی طبیعت ٹھیک نہیں تب سے وہ اس کے کمرے میں بیٹھی کبھی اس کا سر دبا تیں، کبھی دعائیں اور آیات پڑھ کر پھونکتیں......ان دعاؤں ہی کا اثر تھا کہ وہ شام تک بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔

رومیل بھی صبح سے دو بار کال کر کے پوچھ چکا تھا اس کی خیریت......رومیل اور اس کی منگنی کو دو سال ہو چکے تھے......پڑھائی مکمل ہوتے ہی دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔ رومیل کے دادا، دادی تو اس کے بچپن میں ہی فوت ہو چکے تھے، وہ ان رشتوں کو بہت مس کرتا تھا اور مبشرہ کو بھی اکثر ان کی قدر کرنے کی نصیحت کرتا رہتا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ مبشرہ اپنی دادو سے پیار نہیں کرتی تھی......بس......بات صرف یہ تھی کہ آج کل کے دور میں جہاں دلچسپی کی اتنی چیزیں موجود تھیں، وہاں بوڑھی دادی کے لیے اس کے پاس وقت کہاں تھا۔ ان کے گھر کا ماحول بھی بہت اچھا تھا۔ دادو نے جتنی محبت اور مان بابا کو دیا تھا، آج اس مان اور محبت کے سبب ماما ان کی سگی بیٹیوں سے بڑھ کر خیال رکھتی تھیں۔

’’مبشرہ......مبشرہ......سنو بیٹا۔‘‘ دادی پچھلے پندرہ منٹ سے وقفے، وقفے سے اسے آوازیں دے رہی تھیں لیکن وہ ان کی طرف بنا توجہ کیے موبائل گیم کھیلنے میں معروف تھی......subway surfers میں اس نے چھ ہزار سکے جمع کر لیے تھے۔ اور اب اس کا ہائی اسکور دو کروڑ سے بھی اوپر جا رہا تھا۔ گیم میں جتنی دلچسپی تھی......بھلا بوڑھی دادو کی باتوں میں کہاں مل سکتی تھی۔

’’اوہ نو......‘‘ ذرا سا دھیان چوکا اور وہ آؤٹ ہو گئی تھی۔ اس کا موڈ سخت آف ہو چکا تھا۔

’’کیا ہے دادو......؟ آپ کی وجہ سے میرا گیم خراب ہو گیا۔‘‘ وہ منہ بسورتی ہوئی ان کے پاس آئی تھی۔

’’میری وجہ سے......؟‘‘ وہ حیران ہوئیں۔

’’جی ہاں......آپ آواز نہیں دیتیں تو اور بھی اچھا ہائی اسکور بناتا ناں۔‘‘

’’ارے میری چاندنی......! میں تو اس لیے آواز دے رہی تھی کہ تمہاری طبیعت معلوم کر سکوں۔‘‘ انہیں یاد آیا تو وہ بولیں۔

’’میری طبیعت......مجھے کیا ہوا ہے؟‘‘ وہ حیرانی سے منہ کھول کر بولی۔

’’رات کو تمہیں سر درد تھا ناں میری بچی......‘‘ وہ فکرمندی سے بولیں۔

’’وہ......وہ تو ٹھیک ہو گیا تھا رات کو ہی......اب دوبارہ سے ہلکا، ہلکا سا محسوس ہو رہا ہے۔‘‘ وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔

’’ارے میرے پاس بیٹھو......لاؤ میں، داب دیتی ہوں تمہارا سر۔‘‘ وہ فوراً پریشان ہو گئی تھیں۔ جبکہ مبشرہ جھٹ سے ان کے برابر بیڈ پر لیٹ گئی۔ دادو اب اپنے کمزور ہاتھوں سے اس کا سر آہستہ، آہستہ دبا رہی تھیں......یوں تو ان سے کھانا بھی خود سے نہیں کھایا جاتا تھا۔ لیکن ذرا مبشرہ کو کچھ ہوا نہیں اور وہ اس کی......تیمارداری میں لگ جاتیں......مبشرہ کو آہستہ، آہستہ سکون آنے لگا تھا۔ وہ وہیں ان کے برابر میں لیٹے، لیٹے سو چکی تھی۔

☆☆☆

درویشی

پرندوں کی دنیا کا درویش ہے یہ
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

انتخاب: رابعہ شیر، راول پنڈی

اردو ادب کے شیدائی

ٹیچر نے 9th کلاس کے لڑکوں کو ایک مضمون لکھنے کے لیے دیا مضمون کا عنوان تھا۔ ’’کرن‘‘ ایک ہونہار طالب علم نے کچھ یوں لکھا کہ......’’کرنیں کئی طرح کی ہوتی ہیں مثلاً روشنی کی کرن، امید کی کرن، سورج کی کرن ارے ہاں یاد آیا پرانے زمانے میں دلہنوں کے دوپٹے میں لگنے والی کرن لیکن ان تمام کرنوں میں سب سے زیادہ پیاری ہے ہمارے پڑوسی انکل بٹ کی بیٹی کرن......‘‘

تحریر: صائمہ سید، کراچی

’’ماما! پلیز مجھے جانے دیں نا ٹور پر بس تین دن ہی کی تو بات ہے۔‘‘ وہ ملتجی لہجے میں بولی تھی۔

’’مبشرہ......تمہاری دادو کی طبیعت کتنی خراب ہے، ایسے میں تم ان کو اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہو؟‘‘ وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

’’مما پلیز......وہ اکیلی کہاں ہیں......آپ ہیں، بابا ہیں، سب تو ہیں۔‘‘ وہ غصے میں منہ بنا کر بولی۔

’’لیکن ہم تمہاری کمی تو پوری نہیں کر سکتے ناں......تم جانتی ہو وہ تم سے کتنی محبت کرتی ہیں۔‘‘

’’ایسی محبت کا کیا فائدہ......جو آپ کی خوشیوں میں رکاوٹ بنے۔‘‘ وہ غصے سے بولتی واک آؤٹ کر گئی۔

’’دادو......دادو پلیز، مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔‘‘ مبشرہ نے ان کا کندھا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

’’ہاں بولو میری بچی......‘‘ انہوں نے محبت سے اس کے چہرے کے گرد ہاتھ پھیرا۔ بیماری نے انہیں اس بار پہلے سے زیادہ کمزور کر دیا تھا آواز بھی بہت

مشکل سے نکل رہی تھی۔

''دادو میری ساری فرینڈز ٹور پر جارہی ہیں...... میں بھی جانا چاہتی ہوں...... لیکن ماما، پاپا اجازت نہیں دے رہے...... کہتے ہیں تمہاری دادو کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ چہرے پر دنیا جہان کی معصومیت سجائی ہوئی تھی۔

''اچھا...... میں بات کرتی ہوں، تم اداس نہ ہو۔'' وہ اتنا ہی کہہ سکیں۔ مبشرہ نے انہیں جھٹ گلے سے لگالیا تھا۔

''آئی لو یو دادو......'' وہ خوشی سے چور آواز میں بولتی ان کے گلے لگ گئی۔

☆☆☆

وہ دن اس کی زندگی کے سب سے حسین دن تھے، ان تین دنوں میں اسے جتنی بار دادو کا احساس ہوا تھا، اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے ماما، پاپا اور دادو کے لیے ڈھیر سارے گفٹس لیے تھے۔ اس کی زندگی میں جو خوشی کے پل آئے تھے ان کا کریڈٹ دادو کو جاتا تھا۔

وہ بہت خوشی، خوشی گھر میں داخل ہوئی تھی مگر گھر میں بپا غیر معمولی چہل پہل نے اسے کسی انہونی کا احساس دلایا تھا۔ ماما، پاپا سامنے ہی بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

''ماما، پاپا، دادو...... کہاں ہیں؟'' وہ سب کچھ وہیں پھینکتی ان کے پاس گئی تھی۔ وہ خاموش بیٹھے تھے۔

''ہم سب نے تمہیں انفارم کرنے کی کوشش کی لیکن تم کال ہی ریسیو نہیں کر رہی تھیں۔'' اب پاپا بول رہے تھے، وہ اٹھ کر آئے اور اسے سینے سے لگالیا۔ سب جانتے تھے دادو سب سے زیادہ اسے ہی پیار کرتی تھیں۔

اسے یاد آیا کہ وہ جان بوجھ کر اپنا موبائل سائلنٹ کر کے...گھر پر چھوڑ گئی تھی تاکہ کوئی اسے کالز کر کے تنگ نہ کرے...... یک دم اسے زور کا چکر آیا اور وہ پاپا کے بازوؤں میں ہی بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

اس کی جب آنکھ کھلی تو اسے پتا چلا اس سے سب سے زیادہ محبت کرنے والی ہستی اس دنیا میں نہیں رہی تھیں جو اس کی سب سے زیادہ فکر کرتی تھیں جن کے لیے اس کا ان کے پاس ہونا ہی سب کچھ تھا۔ اسے ہی وہ آخری لمحوں میں دیکھ نہ سکیں۔

وہ جانتی تھی، دادو نے اسے کتنا یاد کیا ہوگا، کتنا انتظار کیا ہوگا...... آنسو لڑیوں کی صورت اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے...... یک دم کوئی چپکے سے اس کے برابر والے صوفے پر آ کے بیٹھ گیا۔ اس نے چہرہ گھما کے دیکھا...... وہ رومیل تھا۔

''رومیل میری دادو......'' اسے اور شدت سے رونا آنے لگا۔

''اب نہیں رو مبشرہ...... اب اس کا کوئی فائدہ نہیں، یہ آنسو بیکار ہیں اب۔'' وہ سر جھکائے سرد مہری سے بول رہا تھا۔

''وہ جب تمہارا انتظار کرتی رہیں، تمہیں پکارتی رہیں، تب تم زندگی سے مٹی جیسی خوشیاں کشید کرنے میں مصروف تھیں، اب جب وہ نہیں ہیں تو آنسو کیوں بہار رہی ہو...... تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ اب تمہیں کوئی ڈسٹرب کرنے والا نہیں ہوگا۔'' وہ سفاکی سے بول رہا تھا۔

''ہمیشہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب ہمیں محبت وافر مقدار میں ملتی رہے تو ہمیں قدر نہیں ہوتی اور جب وہ چھن جائے تب ہی ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔'' وہ اب اداسی سے بول رہا تھا۔

''تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو رومیل......؟'' مبشرہ کے رونے میں اب اور شدت در آئی تھی۔

''کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم موبائل فون بھول کر نہیں بلکہ جان بوجھ کر گھر چھوڑ گئی تھیں۔'' وہ اتنا کہہ کر اٹھ کر چلا گیا تھا۔

اور مبشرہ اپنی جگہ ہششدر رہ گئی تھی۔ وہ کیوں بھول بیٹھی تھی کہ کوئی تھا جو اسے اس سے بھی زیادہ بہتر جانتا تھا۔

ابتدا نئے سال کی

عائشہ تنویر



صارم بے چینی و اضطراب کے عالم میں کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ ثمن نے اس سے شادی کے لیے منع کر دیا ہے۔ وہ ثمن کو پسند کرتا تھا بلکہ اس سے محبت کرتا تھا...یہ اور بات کہ اس کا اظہار وہ اپنے آپ سے کرتے بھی جھجکتا تھا۔ محبت کا اظہار نہ سہی لیکن ان کی دوستی اور تعلق نظر انداز کرنے کے قابل تو نہ تھا۔ زندگی نے اب تک اسے سب کچھ بن مانگے دیا تھا۔ اسے لگتا تھا ثمن بھی یونہی خود بخود اس کی ہو جائے گی۔

دھچکا اسے تب لگا جب امی نے اسے سمن کے لیے آنے والے رشتے کی جانچ پڑتال کرنے کا کہا۔ کتنی ہی دیر وہ چپ سادھے گیا۔ امی سمجھیں کہ شاید وہ یہ کام کرنا نہیں چاہتا تو حسب عادت پیار سے سمجھانے لگیں۔

''بیٹا تمہاری خالہ کی بیٹی ہے۔ بہنوں جیسی ہے تمہارے لیے۔ اب ہمارے سوا اس کا کون ہے۔ چھان پھٹک تو تمہیں ہی کرنی پڑے گی۔''

''بہنوں جیسی ہے، بہن تو نہیں ہے ناں۔ اتنی محنت کرنے کے بجائے میں خود شادی کر لیتا ہوں اس سے۔'' اس نے حواس بحال کیے اور تمام جذبات چھپاتا بظاہر سرسری انداز میں بولا۔

امی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بے پروا سا سیل فون کی اسکرین پر انگلی چلا رہا تھا۔

''میں نے بھی یہی سوچا تھا لیکن سمن نے منع کر دیا۔ کہہ رہی تھی خالہ میں آپ کی بہو نہیں بیٹی رہنا چاہتی ہوں۔ تمہاری دلچسپی کا بھی معلوم نہیں تھا سو میں نے اصرار نہیں کیا۔ اب پھر پوچھوں گی اس سے۔''

ان کی بیان کردہ تفصیل اس کی انا کے اڑیل گھوڑے پر چابک کی طرح لگی۔ وہ فوراً بدک گیا۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو پھر بات کرنے کی، میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میں آپ کو کچھ دن میں چھان بین کر کے بتا دوں گا۔ پھر آپ اس کا رشتہ فائنل کر دیجیے گا۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' اس نے قطعی لہجے میں کہا تو امی مایوسی سے کہتی اٹھ گئیں۔

ان کے جاتے ہی اس کی ساری بے نیازی اڑنچھو ہو گئی۔ سیل فون ایک طرف رکھ دیا۔ تکیہ اٹھا کر نیچے پھینک دیا پھر کچھ اور سمجھ نہ آیا تو کمرے میں ادھر سے اُدھر پھرنے لگا۔ وہ خود کو ٹھنڈے دماغ کا حلیم الطبع، خوش مزاج انسان سمجھتا تھا۔ اس وقت اس کی ساری خوش مزاجی غائب تھی۔ وہ طیش میں سوچ رہا تھا۔

''ہنہ، میں کون سا مرا جا رہا ہوں اس عام سی لڑکی کے لیے۔ مجھ جیسے خوش شکل، خوش اطوار، اچھی جاب والے لڑکوں کے پیچھے لڑکیاں تو کیا، ان کے والدین بھی مرتے ہیں۔ بس اسی کے اندر کا احساسِ کمتری ہے۔''

تھک گیا تو ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

''وہ جتنی بھی معمولی ہو لیکن میرے لیے خاص ہے۔ اسے جیون ساتھی بنانا میری اولین خواہش ہے۔''

کچھ دیر بعد ہی وہ خود سے اعتراف کر رہا تھا۔

اب اس کا دماغ کام کر رہا تھا۔ دل میں پلتے پسندیدگی کے جذبات نے انا کو کچل دیا تھا۔

دل اور دماغ ہم آواز ہو کر اس ہی ستم گر کی داستان سنا رہے تھے۔ وہ بیڈ پر چت لیٹا اسے ہی سوچ رہا تھا۔ اس عام سی لڑکی کو۔ جو دنوں میں اس کے دل میں گھر کر گئی تھی۔

☆☆☆

سمن ابراہیم اپنے والد کے انتقال کے بعد بوڑھی دادی اور سلائی کر کے زندگی کی گاڑی دھکیلتی غریب ماں کی اکلوتی متاع تھی۔ صرف مال و دولت ہی نہیں، وہ رشتوں کے معاملے میں بھی قلاش تھی۔ ایک خالہ جو خود اپنی سخت گیر ساس کے سبب دوسرے شہر میں رہتی تھیں اپنی بہن کو سہارا نہ دے پائیں۔

امی ہمیشہ صارم کے سامنے اپنی سگی بہن کی یاد میں آنسو بہاتیں۔ اپنی بہن کی کسمپرسی کا سوچ کر انہیں اپنے پاس موجود آسائشات بار لگنے لگتیں۔ وہ اکثر اس کے ذریعے دادی سے چھپ کر خالہ کو منی آرڈر کرواتیں۔ کبھی کبھار ملنے بھی چلی جاتیں۔ اسے کافی حیرت ہوتی کہ رشتے بدلنے سے رویے بھی بدل جاتے ہیں۔ اس کی شفیق دادی، امی کے معاملے میں کیسے ایک تنگ نظر ساس بن جاتی ہیں۔ ان کا اصل آخر کیا ہے۔ انہیں شاید یہ خدشہ تھا کہ سمن کی والدہ اپنی بوڑھی ساس کو تنہا نہیں چھوڑیں گی اور ان کے بیٹے پر تین افراد کی ذمے داری آ جائے گی۔ جانے انسان اس پالنے والے رب کو بھول کر خود کو رازق کیوں سمجھ لیتا ہے۔

وہ خود کبھی حیدر آباد نہیں گیا تھا۔ لیکن عمر بڑھنے کے ساتھ اس نے دادی کے سامنے امی کی حمایت شروع کر دی تھی۔ خالہ والے معاملے میں دادی کے سامنے اسے آواز بلند کرنے کی نوبت نہ آئی اور ان کا انتقال ہو گیا۔

دادی کے انتقال کے بعد امی نے کافی کوشش کی کہ اپنی بہن اور بھانجی کو حیدر آباد سے کراچی اپنے پاس لے آئیں کیونکہ خالہ کی ساس کا بھی انتقال ہو گیا تھا لیکن وہ بنا سہارے کے جینے کی عادی ہو چکی تھیں۔ سو سمن کی تعلیم کا بہانہ کر کے خوش اسلوبی سے معذرت کر لی۔

اب اچانک خالہ کے انتقال کے بعد امی سمن کو اپنے پاس لے ہی آئیں۔

پہلی بار اس نے سمن کو خالہ کے انتقال پر دیکھا تھا۔ حیدر آباد میں اس گرم ترین دن میں جب سب گرمی سے بے حال ہو رہے تھے۔ وہ ایک کونے میں مستقل بہتے پسینے اور چہرے پر چپکی بالوں کی لٹوں سے بے نیاز آنسو بہانے میں مصروف تھی۔ اس کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔ کلمہ پڑھتے، آنسو بہاتے وہ اپنے اردگرد سے بے نیاز اتنی دکھی نظر آ رہی تھی کہ اس کی بیچارگی اور تنہائی محسوس کر کے صارم کا دل تاسف سے بھر گیا۔

پھر وہ ان کے گھر آ گئی۔ امی سمن کے آگے پیچھے پھرتیں، اس کے تمام دکھوں کا مداوا کرنا چاہتی تھیں۔ رسمی سلام دعا سے زیادہ صارم کی اس سے بات چیت بالکل نہیں ہوتی تھی پھر بھی وہ سمن کا اجنبی رویہ بھانپ گیا تھا۔ وہ مہمانوں کی طرح تکلف سے رہتی۔ اگر ٹی وی دیکھ رہی ہوتی اور کوئی آ جاتا تو فوراً ریموٹ میز پر رکھ دیتی یا خود پیش کر دیتی۔ امی گرمی میں چائے کی عادی نہ تھیں۔ اس کا سر درد بھی کر رہا ہوتا تو بہت تکلف سے پوچھتی کہ ''خالہ میں ایک کپ چائے بنا لوں۔''

اپنی ہمدرد طبیعت سے مجبور ہو کر صارم نے خود اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ وہ اسے اس کے خول سے نکالنا چاہتا تھا۔ سو اکثر اس سے باتیں کرنے لگا۔ ان میں کافی دوستی ہو گئی تھی۔

''تمہاری سالگرہ کب آتی ہے سمن؟'' ایک دن صارم نے اچانک یاد آنے پر پوچھا تھا۔

''یکم جنوری۔'' سمن نے دھیمے سے جواب دیا تھا۔ وہ زیادہ شوخ نہیں تھی۔ شاید اس کے حالات نے اسے اپنی عمر سے زیادہ سنجیدگی عطا کر دی تھی۔ گزرتے ماہ و سال عمر میں شاید اتنا اضافہ نہیں کرتے بلکہ یہ غم اور مشکلات ہوتے ہیں جو انسان کو بوڑھا کر دیتے ہیں۔ تب ہی کچھ بچے بچپن میں ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں اور کچھ لوگوں کا بچپنا تا زندگی قائم رہتا ہے۔

''واہ، یکم جنوری...... پھر تو تم نئے سال اور سالگرہ کی مبارک باد ایک ساتھ وصول کرتی ہو گی۔'' صارم نے خوشدلی سے کہا تھا۔

''میں نہ سالگرہ مناتی ہوں، نہ نیا سال۔ ویسے بھی ہمارا نیا سال تو محرم سے شروع ہوتا ہے۔'' سمن نے لب دانت تلے دبا کر آخر میں دانستہ اسے شرمندہ کرنا چاہا۔

''یہ کیا بات ہوئی، سورج، چاند سب ہمارے اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں۔ ہم سورج کے حساب سے نماز پڑھتے ہیں تو چاند کے حساب سے روزے رکھتے ہیں۔ ہجری، عیسوی سال میں تفریق کر کے اللہ کے بنائے اجسام کے ساتھ زیادتی مت کرو لڑکی۔ یہ تو چھوٹی، چھوٹی خوشیاں ہیں۔'' صارم نے شرارت سے اسے لاجواب کیا۔ وہ ہنس پڑی۔

''میں ہجری، عیسوی کسی طرح سے سالگرہ نہیں مناتی۔ وقت کا زیاں ہے۔ کچھ کرنا ہی ہے تو کسی نیک کام سے نئے سال کا آغاز کرو۔''

''چلو ٹھیک ہے، اب نئے سال کے آغاز میں تم اچھا سا کھانا بنا کر ہمیں کھلانا۔ کھانا کھلانے کا بہت ثواب ہے بھئی۔'' صارم نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔ وہ خود بھی ان چیزوں کا اتنا شوقین نہیں تھا۔ بس وہ تو یہ چاہتا تھا کہ وہ اس گھر میں اپنا حق سمجھ کر رہے۔

ہمدردی کب محبت میں بدلی اسے پتا بھی نہیں چلا۔ بس وہ جاننے لگ گیا، اسے پتا چل گیا کہ سمن کو کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ چائے اور آئس کریم کے لیے وہ کبھی منع نہیں کرتی۔ سیاہ و سفید اس کے پسندیدہ رنگ ہے۔ سردیوں میں چھت پر بیٹھ کر مونگ پھلی کھانا اس کا دل پسند مشغلہ ہے۔ جب کسی بات پر وہ شرارت سے لب کا کونہ دانتوں تلے دباتی ہے تو اس کی آنکھیں بھی مسکرانے لگتی ہیں۔ صارم نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سردی

کے موسم میں فریج میں آئس کریم بھر دی۔ روز رات کو وہ ڈھیروں مونگ پھلی خرید لاتا۔ اس سب کے باوجود وہ اپنی حدود سے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اس کی بے جا بے تکلفی سمن کو ناگوار گزر سکتی تھی۔

اس کی کوششوں سے سمن ان کے گھر کا حصہ بن گئی تھی۔ وہ اسے بھائی نہیں کہتی تھی، نام لے کر پکارتی تھی۔ ابتدا میں بہت تکلف سے جب اس نے اسے آپ، آپ کہہ کر مخاطب کیا تو وہی سلسلہ آگے چل پڑا۔ اس کی زبان سے اپنا نام صارم کو بہت پیارا لگتا۔ وہ امی کو تو خالہ ہی کہتی لیکن ابو نے اسے بیٹی بنالیا تھا۔ گو انہوں نے امی کو کبھی خالہ کی مالی امداد سے نہیں روکا تھا۔ لیکن اب اس کی باتیں سن کر انہیں اس بات پر شرمندگی ہوتی کہ ان کے ہوتے ہوئے وہ تحفظ سے محروم تھی۔ وہ بھی باپ کی محبت کی ترسی ہوئی تھی سو بہت پیار سے انہیں ابو کہتی۔ رات کے کھانے کے بعد ابو اور سمن دونوں لاؤنج میں بیٹھ کر مزے سے چائے پیتے تھے۔ ایک اتوار کو صارم کی پسند پر بریانی بنتی تو اگلے اتوار ابو کے کہنے پر سمن پلاؤ بنالیتی۔ اس کے منہ بنانے پر وہ صاف جواب دیتی۔

”پچھلے اتوار خالہ کی اور آپ کی پسند کا مینیو تھا۔ اب ہماری باری ہے۔“

اس کے پسندیدہ ڈرامے کے اوقات میں ابو خبریں سننے بیٹھ جاتے تو وہ بعد میں آرام سے صارم کے لیپ ٹاپ پر ڈراما دیکھ لیتی۔ چند مہینوں میں ہی وہ گھر کا فرد بن گئی تھی۔ ایسی ہنستی مسکراتی زندگی گزارتے صارم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ سمن اس گھر سے کہیں جائے گی۔

محلے کی ایک قرآن خوانی میں وہ امی کے ساتھ گئی تو کسی خاتون کو اپنے بھائی کے لیے وہ بھا گئی۔ انہوں نے سمن کے سامنے ہی اپنی خواہش کا اظہار کر دیا تھا۔ بعد میں جب امی نے اسے بہو بنانے کا کہا تو اس نے نرمی سے منع کر دیا۔ امی بھی یہ سوچ کر خاموش ہو گئیں کہ اس کی صارم سے دوستی ہے۔ کوئی وجہ ہوگی جو اس نے انکار کیا۔ رشتہ بہت اچھا تھا۔ اس لیے امی خوش، خوش صارم کو رشتے کی تفصیلات بتانے آگئیں۔

بیتے خوب صورت پل فلم کی طرح صارم کے دماغ میں گھومے اور آخر میں امی کی بات یاد آتے ہی مسکراتے لب بھنچ گئے۔ تصور میں سجا کانچ کا محل ٹوٹ گیا تھا۔ دسمبر چل رہا تھا۔ وہ تو سمن کی سالگرہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا لیکن قسمت نے اسے ہی شاک کر دیا تھا۔

”سمن نے میرے لیے کیوں منع کیا؟“ یہ سوال اسے چین نہیں لینے دے رہا تھا۔

پوری رات عجیب ادھیڑ بن میں گزری۔ صبح وہ اٹھا تو سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو کر اپنی شکایت بیان کر رہی تھیں۔ اس نے آئینے میں خود کو دیکھا تو یوں لگا کہ دماغی خلفشار چہرے پر لکھا ہے۔ ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مار کر ساری سوچیں اتارنے کی سعی کی۔ آنکھیں بھی حتی الوسع بہتر ہو گئیں۔ پھر بھی جب وہ تیار ہو کر کمرے سے نکلا تو بہت پژمردہ تھا۔

”یہ دیکھیں، آج میں نے کیا بنایا۔“ سمن بہت خوشی سے اپنی بنائی کوئی ڈش میز پر رکھ رہی تھی۔

”میں جا رہا ہوں، آج جلدی جانا ہے۔“ اس نے میز کے پاس کھڑے ہو کر اعلان کیا اور باہر کی طرف مڑا۔

”آپ نے ناشتا تو کیا ہی نہیں۔ ایک منٹ رک جائیں صارم، میں پیک کر دیتی ہوں۔“ سمن بوکھلا کر کہتی اس کے پیچھے آئی تھی۔

ابو نے اخبار میں سر دیے اس کی بات پر سر ہلا دیا تھا۔ امی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ باقاعدگی سے ناشتا کرنے کا عادی تھا۔

”کھالوں گا آفس میں کچھ بھی۔ تم یہ نئی، نئی عادتیں مت ڈالو مجھے، بعد میں مسئلہ ہوگا۔“ اس نے خود کو نارمل ظاہر کرتے مذاق کرنے کی کوشش کی لیکن لہجہ خود بخود روکھا ہو گیا۔ امی اور سمن کو متعجب چھوڑ کر وہ باہر نکل آیا تھا۔

☆☆☆

سارا دن آفس میں بھی وہ عجیب بے دلی کی کیفیت کا شکار رہا۔ سمن کے ساتھ گزرے خوشگوار پل یاد آتے تو بے اختیار دل میں ایک کوشش کرنے کی خواہش جاگتی۔

امی کا جملہ یاد آتا کہ سمن راضی نہیں تو ہونٹ بھنچ جاتے، ساری خوشگواری بھاپ بن کر اڑ جاتی۔ اسی کشمکش میں وہ جلدی گھر آ گیا تھا۔ آتے ساتھ ہی وہ حسبِ معمول لاؤنج میں بیٹھنے کے بجائے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ لاؤنج میں بیٹھتا تو پھر سمن کو دیکھ، دیکھ کر کڑھتا۔ امی سمن کو چائے کا کہتی اس کے پیچھے ہی کمرے میں چلی آئیں۔

”کیا ہوا صارم...... جلدی آ گئے آج؟“ وہ لیٹا ہوا تھا، امی نے پاس بیٹھ کر ہاتھ سر پر رکھ کر حرارت محسوس کرتے بہت تشویش سے پوچھا۔

”جی، سر درد کر رہا ہے رات سے۔“ اس نے سر امی کی گود میں رکھ دیا۔ کرب کے ان لمحوں میں ماں کا پیار اسے جذباتی کر گیا۔ اندرونی طور پر جس توڑ پھوڑ کا وہ شکار تھا۔ اس وقت اسے ایسا ہی سہارا درکار تھا۔

”کل سے تم اپ سیٹ ہو؟ تم سمن سے شادی کرنا چاہتے ہو تو بولتے کیوں نہیں۔“ امی کچھ ڈپٹ کر پوچھ رہی تھیں۔

”میں اس پر کوئی زبردستی نہیں کر سکتا، اگر وہ نہیں راضی تو مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اپنا چہرہ اس نے امی کی گود میں چھپا لیا تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔

اپنے دھیان میں دروازہ کھول کر اندر آتے سمن نے ان کی باتیں سنیں تو خجل ہو گئی۔

”مجھے اس سے پوچھنے تو دو ایک بار۔“

امی سمن کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ چائے کی ٹرے رکھتے سمن کے ہاتھ کانپے تھے۔ برتن کھنکنے کی آواز پر صارم نے سر اٹھایا تو سامنے انگلیاں مروڑتی سمن کھڑی تھی۔

وہ تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر کھڑے ہو کر الماری کھول لی۔ وہ اس بکھری حالت میں اس کا سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ عجیب سی صورتِ حال بن گئی تھی۔ صرف امی بالکل مطمئن بیٹھی تھیں۔

”سمن بیٹا، تمہیں پتا ہے کہ تمہارے لیے محلے سے بھی رشتہ آیا ہے۔ دوسرا رشتہ صارم کی صورت موجود ہے۔ تمہاری شادی کا سن کر دیکھو کیا شکل نکل آئی اس

چُست لباس، صحت خراب

بعض لباس دیکھنے میں بہت حسین لگتے ہیں لیکن پہننے والے کو اس قدر بے آرام کرتے ہیں کہ اکثر وہ بیمار بھی پڑ جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں خواتین کی ایک بڑی تعداد تنگ لباس کو ترجیح دیتی ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کا پیٹ دبا اور پچکا رہے اور وہ دبلی نظر آئیں۔ لیکن دبلا لگنے کی خواہش میں مسلسل تنگ لباس کا استعمال انہیں ایک ایسی بیماری میں بھی مبتلا کر سکتا ہے جسے معالجین (Designer Dyspepsia) کہنے لگے ہیں۔

برطانیہ میں اندازاً چھتر فی صد لوگوں کو پیٹ کے درد اور اپھارے کی شکایت رہتی ہے۔ سوئے ہضم کی یہ کیفیت یوں تو عورتوں اور مردوں دونوں کو متاثر کرتی ہے لیکن تحقیق کے مطابق اس کی زیادہ شکایت انہیں ہوتی ہے جو زیادہ تر تنگ لباس پہنتے ہیں۔ اور اب تو ہمارے ہاں بھی یہی رواج چل پڑا ہے۔

ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ تنگ لباس کی وجہ سے معدے کو پھیلنے کی جگہ نہیں ملتی لہٰذا اندرونِ معدہ دباؤ بڑھنے لگتا ہے اور ریح (ہوا) بھر جاتی ہے۔ اس حالت میں کھانا کھایا جائے تو غذا نیچے نہیں اترنے پاتی اور معدے میں بھری ہوئی ریح اسے اوپر کی طرف اچھالتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سینے میں جلن ہونے لگتی ہے۔

یہ خیال بھی ضرور... رکھنا چاہیے کہ اگر زیر جامہ، پتلون اور قمیص وغیرہ بہت تنگ ہوں تو ورمِ مثانہ کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ مصنوعی ریشے کا ریشمی لباس ہوا کے گزر کو روکتا ہے جس کی وجہ سے جراثیم پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ سوتی زیر جامہ پہننا چاہیے تاکہ جلد تک ہوا پہنچتی رہے۔

ماہرینِ امراضِ چھاتی کے مطابق خواتین میں تنگ زیر جامہ نہایت نقصان دہ ہے جو کبھی بریسٹ کینسر کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔

از: ڈاکٹر نفیسہ نہال، لاہور

کی۔ تم فیصلہ کرنے میں آزاد ہو۔ ہم ہر صورت تمہارے ساتھ ہیں۔ بس تم مجھے وجہ بتا دو کہ تم نے منع کیوں کیا۔ ہماری محبت میں کوئی کمی ہے؟'' امی نے شگفتگی سے پورا مسئلہ بیان کرتے سمن کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ صارم کی ماں تھیں سو سمن سے بے انتہا محبت کے باوجود وہ غیر جانبدار نہیں رہ سکی تھیں۔

''نہیں خالہ ایسی بات بالکل نہیں۔'' سمن تڑپ کر ان کے قدموں میں زمین پر بیٹھ گئی۔

''آپ لوگوں کے سوا میرا کون ہے اس دنیا میں۔'' وہ امی کے ہاتھ تھامے نم لہجے میں کہہ رہی تھی۔ امی نے پیار سے ہاتھ اس کے سر پر پھیرتے اسے بازو سے تھام کر اسے اوپر اٹھایا۔

''اوپر بیٹھو یہاں میرا بچہ، آرام سے کھل کر بات کرو۔''

وہ دونوں صارم کو نظر انداز کیے مکمل فلمی سین کرنے میں مصروف تھیں۔ جبکہ وہ سب کچھ بھلائے دل و جان سے متوجہ تھا مگر بظاہر الساری میں سر دیے تھا۔ یہ خیال تو پن کی طرح چبھ رہا تھا کہ آخر اسے منع کرنے کی وجہ کیا تھی۔ لڑکا محلے کا ہوتا تو وہ سمن کی ذاتی پسند یا محبت وغیرہ کا چکر سمجھ لیتا لیکن اس کے علاوہ کسی سے بھی شادی کرنے میں سمن کو کوئی اعتراض نہیں تھا تو اس پر کیوں تھا۔

سمن نے برابر بیٹھ کر سر امی کے کندھے پر رکھ لیا تھا۔

''خالہ، آپ کا اور امی کا کوئی مضبوط میکا نہیں تھا۔ اسی لیے صارم کی دادی آپ پر سختی کرتی رہیں اور ہمیں بھی ابو کے جانے کے بعد کوئی سپورٹ کرنے والے رشتے دار نہ تھے۔ میں تو بس اپنا میکا ختم نہیں کرنا چاہتی۔ آپ لوگ میرے پیچھے ہوں گے تو مجھے ہمت ملے گی۔ واپسی کا راستہ ہونا چاہیے۔ آپ لوگوں کی محبت ہی تو میری طاقت ہے۔'' اس نے دھیمے سے اپنی خواہش بیان کی تھی۔ امی کے کچھ کہنے سے پہلے اتنی دیر سے خاموش تماشائی بنا صارم غصے سے اس کے سامنے آیا۔

''استغفر اللہ لڑکی، کیسی باتیں کرتی ہو؟ خدانخواستہ تم پر کوئی مصیبت آنے والی ہے جو واپسی کے راستے ڈھونڈ رہی ہو۔ یہ بات یاد رکھو سہارا اللہ کا ہی ہوتا ہے۔ کوئی رشتے دار کسی کا کچھ نہیں کرتا۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم شادی کر لو گی تو میں شادی نہیں کروں گا اور مجنوں بن جاؤں گا؟ آج کل کی لڑکیوں سے سگی بہنیں برداشت نہیں ہوتیں تو میری بیوی میری کسی کزن کو کیسے برداشت کرے گی۔ حد ہو گئی انتہا درجے کی جاہلانہ منطق کی۔''

کل رات سے اب تک سمی ساری کڑھن یوں تلخ حقائق کی صورت صارم کے منہ سے نکلی کہ امی بھی حیرت سے منہ کھولے دیکھتی رہ گئیں۔ سمن کی آنکھیں ایسا لہجہ سن کر آنسوؤں سے بھر گئیں۔

تحیر سے صارم کی شعلہ بیانی سنتے امی کی نظر سمن کے بہتے آنسوؤں پر گئی تو خفگی سے صارم کو گھورا۔

''میں بات کر رہی تھی، تمہیں کیا ضرورت تھی بیچ میں بولنے کی۔''

''پرانی فلموں کے سلو موشن میں چلتے جذباتی سین ہی ختم نہیں ہو رہے تھے، بات کیا خاک ہو رہی تھی آپ لوگوں کے مابین۔'' وہ ان سے زیادہ خفا تھا۔

''چپ، تم اسی قابل ہو کہ تمہیں منع کر دیا جائے۔''

امی بڑبڑائیں اور پھر سمن کی طرف گھومیں۔

''بیٹا، تمہارا دل مطمئن ہے ناں۔ میں صارم کے ابو سے بات کرتی ہوں، انشاءاللہ خوب دھوم دھام سے شادی کریں گے۔'' وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیے پیار سے پوچھ رہی تھیں۔ بہتے آنسوؤں کے ساتھ، شرم کے رنگوں سے سجی خوب صورت مسکان نے سمن کا چہرہ گلابی کر دیا تھا۔ لیکن امی کو جواب سمن کے بجائے سامنے سے آیا۔

''شادی جب ہو گی سو ہو گی۔ مجھے تو ابھی یکم جنوری کو نکاح کرنا ہے امی۔ مجھے کسی نے کہا ہے کہ نئے سال کا آغاز بابرکت ہونا چاہیے۔ نکاح جیسی سنت سے میں اپنا نیا سال شروع کروں گا۔''

ساری ٹینشن بھلائے وہ شوخی سے چہک رہا تھا۔

سمن نے اس کی بات پر لب کا کونہ دانتوں تلے دبا کر.... بے ساختہ امڈتی ہنسی روکی تھی۔ ان کے خوش باش چہرے دیکھ کر امی بھی بے اختیار مسکرا دیں۔

امیدِ صبح

سلمیٰ غزل



آج موسم بے حد خوشگوار تھا شاید اس کے اندر کے موسم کی وجہ سے جس نے اس کی روح تک کو سرشار کر دیا تھا۔ وہ ایک درخت کے نیچے کھڑی مسلسل اوپر کی سمت بنے تایا کے گھر کو تک رہی تھی۔ گھیر والی شلوار، پھولدار قمیص، بڑی سی چادر میں اس کا روپ بے حد سندر لگ رہا تھا، گورے رنگ میں گلابیاں سی گھل گئی تھیں۔ آسمان پر سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا جس کی سنہری کرنیں پتوں میں سے جھانک، جھانک کر

ماحول کو اور بھی تابناک بنا رہی تھیں دیودار کے اونچے اونچے درخت کے بیچ چھوٹے، چھوٹے کھیت دور سے بڑے خوب صورت لگ رہے تھے۔

"آج میکائیل کو آنا ہے......" بدخشاں کے ہونٹوں پر ایک شرمیلی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میکائیل اس کا تایازاد ہی نہیں بچپن کا منگیتر بھی تھا اس کے پیدا ہونے پر تایا نے اپنے پانچ سالہ بیٹے میکائیل کے لیے ایک ننھی سی انگوٹھی بدخشاں کی انگلی میں ڈال کر اسے اپنی بہو بنانے کا اعلان کردیا تھا جس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ دونوں ساتھ کھیلتے کودتے بڑے ہوئے تھے۔ بابا نے اسے میٹرک تک تعلیم دلوائی تھی کیونکہ اس سے آگے لڑکیوں کے لیے گاؤں میں کوئی کالج وغیرہ نہیں تھا۔ بدخشاں کے دو بھائی حنان اور منان تھے حنان نے جب آگے پڑھنے سے انکار کردیا تو بابا نے اسے اپنے ساتھ زمینوں پر لگالیا لیکن منان کو میکائیل کی طرح پڑھنے کا بے حد شوق تھا تو بابا نے بخوشی اسے شہر جا کر پڑھنے کی اجازت دے دی۔ میکائیل اور منان نے ایک ساتھ ہی کمیشن کا امتحان پاس کیا تھا۔ منان نے بحیثیت لیکچرار کالج جوائن کرلیا اور میکائیل کو بڑی اچھی سرکاری ملازمت مل گئی۔

کافی عرصے بعد میکائیل گاؤں آرہا تھا۔ اس لیے سب بے حد خوش تھے۔ ایک سال پہلے بابا نے حنان کی اپنے دوست کی بیٹی سے شادی کردی تھی۔ ہانیہ، بدخشاں کی بھابی ہی نہیں بہترین دوست بھی تھی اور اپنے شوہر کی خواہش پر لاہور میں پرائیویٹ پڑھ بھی رہی تھی۔

میکائیل کے گاؤں آنے کی خوشی میں تایا نے پورے گھر میں رنگ و روغن کرایا تھا تو بابا نے بھی ہونے والے داماد کے شایانِ شان گھر پر انتظام کیا تھا۔ شام کو میکائیل نے آنا تھا اور بابا اور اماں دوپہر ہی سے تایا کے گھر چلے گئے تھے۔ بدخشاں کو ان کی واپسی کا شدت سے انتظار تھا مگر وہ واپس آئے تو چپ، چپ اور اداس سے تھے اور مارے شرم کے بدخشاں ان سے کچھ پوچھ نہیں سکی۔ رات کو میکائیل ان کے گھر بھی آیا لیکن اس کا انداز بڑا لیا دیا اور بیگانہ سا تھا۔ اس کی باتوں میں عجیب طرح کی بے نیازی اور نخوت تھی، لگتا تھا کہ گردن میں "سریا" فٹ ہوگیا ہو اس کے رویے میں غرور کا عنصر شامل تھا اور بدخشاں کی طرف تو اس نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا جو بطورِ خاص اس کے لیے تیار ہوئی تھی۔ دوسرے دن اس نے خود کو نک سک سے سنوارا اور مکان کے کونے پر آ کھڑی ہوئی اسے معلوم تھا کہ اسی راستے سے گزر کر میکائیل کو اپنے دوستوں سے ملنے جانا تھا۔ کافی دیر بعد میکائیل اوپر سے آتا نظر آیا۔ براؤن دھاری والی شرٹ اور جینز میں اس کا قد اور بھی نمایاں لگ رہا تھا نفاست اور سلیقے سے سنورے بال اس کے چہرے پر بھلے لگ رہے تھے۔ وہ وارفتگی سے اسے تکنے لگی آخر وہ اس کا اپنا ہی تو تھا وہ جونہی قریب آیا اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ چہرے پر قوسِ قزح کے رنگ بکھر گئے، گھنی پلکیں شرم سے لرزنے لگیں۔ مگر میکائیل نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ اس پر ڈالی اور بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔

بدخشاں کے دل پر قیامت گزر گئی۔ غصے اور رنج نے سینے میں آگ سی بھڑکا دی رات بھر وہ غصے اور صدمے کی آگ میں جلتی رہی۔ اتنی توہین، اتنی بیگانگی...... اُدھر اماں...... بابا چپ تھے تو تائی، تایا جن کی صبح بدخشاں کو دیکھے بغیر نہیں ہوتی تھی اب کنی کترا رہے تھے۔

☆☆☆

اور پھر بے رخی کی وجہ بھی کھل کر سامنے آگئی...... میکائیل نے شادی سے انکار کردیا تھا، تایا تائی جھکے ہوئے سر اور شرمندہ، شرمندہ نگاہوں سے سامنے آئے تو بابا کے گلے لگ کر رو پڑے۔

"مجھے میکائیل سے اس نافرمانی کی ہرگز توقع نہیں تھی، یہ تمہاری ہی نہیں میری بھی بے عزتی ہے، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اعلیٰ تعلیم دلا کر میں نے اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی ماری ہے، میں اسے بھی معاف

نہیں کروں گا۔ میں اسے عاق کردوں گا جائداد سے۔" تایا سخت غصے میں تھے۔

"نہیں بھائی! آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔" بابا دکھ سے بولے۔ "غلطی ہماری ہے بچپن کے رشتے ضروری نہیں کہ پائدار بھی ہوں پھر ہماری نادانی کی سزا میکائیل کو کیوں ملے، وہ پڑھا لکھا اعلیٰ عہدے پر فائز...... اسے یقیناً ایسی ہی لڑکی کی ضرورت ہوگی جو اس کے ساتھ سوسائٹی میں اٹھ بیٹھ سکے، اُس کے کندھے سے کندھا ملا کر چل سکے جدید طرزِ زندگی سے آشنا۔ میری بیٹی سیدھی سادی کہاں اس کے معیار پر پوری اترے گی، بے وقوفی تو ہم سے ہوئی کہ بغیر سوچے سمجھے منگنی کا پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا یہ ضروری تو نہیں کہ بڑے ہو کر وہ اسے غلامی کا طوق نہ سمجھے......" بابا رنجیدگی سے بولے۔

"میرے بھائی اسے نئی تہذیب اور لالچ نے اندھا کردیا ہے وہ اپنی کمپنی کے مالک کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ جس کے باپ کو اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے شوہر نہیں نوکر چاہیے اور وہ یہ بات سمجھ نہیں رہا، نقلی ہیرے کی ظاہری چمک سے متاثر ہو رہا ہے......" تایا رو پڑے تھے۔

"لیکن ہم اسے مجبور نہیں کرسکتے، دکھ یہ ہے کہ اس کا سب سے برا اثر بدخشاں پر پڑا ہے۔ سچ ہے بچوں کے بچپن میں کیے گئے بزرگوں کے غلط فیصلے کی بھینٹ ہمیشہ معصوم لڑکی ہی چڑھتی ہے۔" بابا کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بچپن کے کیے گئے فیصلے پر شرمندہ اور پشیمان ہیں مگر لکیر پیٹنے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا وقت کا پنچھی ہاتھ سے نکل چکا تھا جو رشتہ انہوں نے بڑے ارمانوں سے بنایا تھا اپنے ہی خون نے ایک جھٹکے سے توڑ دیا تھا حنان نے سنا تو بیوی اور بیٹے کے ساتھ فوراً گاؤں آگیا۔

"بابا آپ پریشان نہ ہوں بلکہ شکر ادا کریں کہ انکار اُدھر سے ہوا ورنہ لاہور میں میکائیل کے لچھن ڈھکے چھپے نہیں تھے، خاندانی رکھ رکھاؤ اور تایا جی کے لحاظ میں، میں خاموش تھا ورنہ میں تو خود اس رشتے پر معترض تھا، اچھا ہوا انکار کر کے انہوں نے ہمیں شرمندگی سے بچالیا، ہماری بہن ہم پر بھاری نہیں، انشاء اللہ اسے میکائیل سے اچھا رشتہ مل جائے گا۔"

☆☆☆

رات کی پلکیں بھیگ چکی تھیں۔ پہاڑوں پر اندھیرے سائے جھک آئے تھے، ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ چیڑ، دیودار اور چنار کے درختوں سے جھلکتی تاریکیوں کا زرد چاند ایسے جھانک رہا تھا جیسے کسی کے غم میں اداس ہو۔ اماں، بابا سرگوشیوں میں اپنے کمرے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ ان کے غلط فیصلے کی وجہ سے ان کی معصوم بیٹی کو ناکردہ گناہ کی سزا ملی ہے۔ غلطی ان کی تھی سزا بیٹی کو ملی دونوں بھائی اور اس کی بھابی مومنہ بھی اس کی اداس شکل دیکھ کر دکھی ہو رہے تھے۔

خاص طور پر آج اس کے ارمانوں پر بجلی سی گر گئی تھی خوابوں کے جزیرے میں آگ لگ گئی تھی لگتا تھا جیسے سینے میں کوئی خنجر کی انی چبھو رہا ہو، وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہی تھی۔

"ابا جی میں آپ کے کسی فیصلے کا پابند نہیں ہوں، یہ میری زندگی ہے جس طرح چاہے جیوں شادی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے۔ میری پوری زندگی کا سوال ہے جس کے ساتھ پوری زندگی گزارنی ہو جب وہ ہی من چاہی نہ ہو تو ایسے کاغذی بندھن کا فائدہ؟ ہم دونوں کے رہن سہن، سوچنے کا انداز، زندگی گزارنے کے طور طریقے اور پھر تعلیم کہیں بھی تو مماثلت نہیں...... وہ پینڈو، اجڈ، جاہل...... میرے ساتھ کہاں چل سکتی ہے۔ یہ تضاد اور فاصلے زندگی بھر ختم نہیں ہوں گے۔ چچا کی بیٹی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اس پھٹے ہوئے ڈھول کو میں ساری زندگی اس لیے بجاتا رہوں کہ آپ نے زبان دی تھی۔ میں نے بڑی محنت اور کوشش سے معاشرے میں ایک مقام بنایا ہے میری عزت ہے ساکھ ہے، میں اس گنوار لڑکی کی خاطر اپنی خوشی کو داؤ پر

نہیں لگا سکتا۔'' یہ وہ الفاظ تھے جو مومنہ نے خود سنے تھے اور تایا کے گھر سن کر باہر ہی سے واپس پلٹ آئی تھی، منان نے تو منع کیا تھا کہ بدخشاں کو کچھ مت بتانا مگر مومنہ اس کو اس خول سے نکالنا چاہتی تھی جس میں اس نے خود کو بند کرلیا تھا...... یہ وہ الفاظ تھے جنہیں مومنہ سے سن کر بدخشاں ذلت اور شرمندگی کے احساس سے بلبلا اٹھی۔ نسوانیت کی توہین ہوئی تو آنسو خود بخود خشک ہوگئے دل پر چھریاں چل رہی تھیں۔ خوابوں کے نازک آبگینے کرچی، کرچی ہوکر گہرائیوں تک جا کر سینے میں آگ دہکا رہے تھے۔ اس وقت اس کو صدمے سے زیادہ احساسِ ذلت بے چین کررہا تھا۔ صبح اس کی سوجی ہوئی آنکھیں اور سوگوار چہرہ دیکھ کر مومنہ بول اٹھی۔

''بابا ہم بدخشاں کو اپنے ساتھ لاہور لے جانا چاہتے ہیں۔''

''ضرور لے جاؤ بیٹا بس بدخشاں سے پوچھ لو۔'' وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح بدخشاں بہل جائے جب منان نے اس سے پوچھا تو وہ ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ بابا کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''بابا میں بھائی کے ساتھ ایک شرط پر جانے کو تیار ہوں۔''

''شرط کیا ہے بیٹا......؟'' بابا نے تحمل سے پوچھا۔

''میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔''

''ارے واہ، یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔'' مومنہ خوش ہوکر بولی۔ ''تمہاری بورڈ میں چوتھی پوزیشن تھی آسانی سے کسی بھی اچھے کالج میں داخلہ مل جائے گا...... میں تو آرٹس پڑھ رہی ہوں لیکن تمہارے پاس تو سائنس ہے۔''

''بیٹا مجھے کوئی اعتراض نہیں، میں تو خود لڑکیوں کی تعلیم کے حق میں ہوں مگر یہاں میٹرک کے بعد کالج ہے ہی نہیں اور ہاسٹل میں چھوڑنا ہمیں گوارا نہ تھا اب بھائی بھاوج کے پاس رہے گی تو ہمیں بھی اطمینان رہے گا؟''

بابا بڑے کھلے دل کے تھے حالانکہ گاؤں میں اب بھی زیادہ تر لوگ تعلیم نسواں کے خلاف تھے اور اس سے لڑکیوں کے لیے بے غیرتی اور بے حیائی سمجھتے تھے مگر بابا ایسے نہیں تھے وہ بیٹی کو خوش اور سکھی دیکھنا چاہتے تھے۔

☆☆☆

بدخشاں کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوگیا تھا لاہور کے سب سے اچھے کالج میں داخلہ مل گیا، گاؤں کی سیدھی سادی اور خاموش فضاؤں میں پلی بدخشاں اب لاہور جیسے خوب صورت، تاریخی عمارتوں سے مزین اور جدید خطوط پر استوار شہر میں آگئی تھی۔ وہ پوری لگن اور دلجمعی سے پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ یوں لگتا تھا لکھنا پڑھنا ہی اس کی زندگی کا مقصد اور اوڑھنا بچھونا ہے، صفائی پسند اور نفیس طبیعت کی مالک تو وہ پہلے ہی سے تھی اب اس نے اپنے لباس کی رنگت، کانٹ چھانٹ اور خوب صورت انتخاب پر بھی توجہ دینا شروع کردی تھی جس میں اس کی بھابی کا بھرپور تعاون حاصل تھا۔

خوب صورت تو وہ پہلے بھی تھی مگر اب ذرا سی توجہ اور گرومنگ نے اس کے حسن میں چار چاند لگادیے تھے۔ بقول اس کی دوست ہانیہ کے ''یار تمہارے ساتھ چلنے میں تو احساسِ کمتری ہونے لگتا ہے' تم تو کسی شاعر کی غزل یا سنگ تراش کا خوب صورتی سے تراشا ہوا مجسمہ لگتی ہو اس پر تمہاری یہ معصومیت اور بھولا پن......اُف......'' وہ ٹھنڈی آہ بھرتی اور مصنوعی غم زدہ بن جاتی تو بدخشاں کو ہنسی آجاتی۔ وہ کبھی کبھار کالج کے کسی فنکشن میں اپنے لمبے سیاہ بالوں کو پشت پر کھلا چھوڑ دیتی تو سیاہ گھٹاؤں کا گماں ہوتا اور لڑکیاں چھو، چھو کر رشک بھری نظروں سے تعریف کرتیں، اس کی محنت رنگ لائی اور انٹر سائنس میں نمایاں پوزیشن لینے پر اسے آسانی سے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا' ہانیہ بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔

☆☆☆

وقت کب کسی کے لیے رکا ہے، وقت کا پنچھی اپنی رفتار سے اڑتا رہا اور بدخشاں مشکل مرحلے عبور کرتے ہوئے میڈیکل کے فورتھ ائیر میں آگئی۔

چھٹیوں میں وہ جب بھی گاؤں آتی تو اس کا حلیہ وہی پرانا ہوتا یعنی ڈھیلے، ڈھالے کپڑے، تیل میں چپڑے بال، آنکھوں میں ڈھیروں کاجل اور بڑی سی چادر......اس نے گھر میں سب کو سختی سے منع کردیا تھا کہ اس کی تعلیم کے بارے میں کسی کو کچھ بھی نہ بتایا جائے' کبھی کبھار وہ گاؤں آتی اور میکائیل بھی آیا ہوا ہوتا تو وہ خود کو گھر میں بند کرلیتی تاکہ اس کا سامنا نہ ہو، وہ اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی۔ اماں بابا اسے خوش دیکھ کر بہت خوش اور مطمئن تھے۔

کبھی، کبھی کمبائنڈ اسٹڈی کے لیے وہ ہانیہ کے گھر بھی چلی جاتی جو اس کی ہم مزاج اور ہم خیال تھی بھائی اور بھابی کو بھی اس کی یہ مخلص دوست بہت پسند تھی مگر وہاں جاکر وہ اکثر بے چین ہوجاتی تھی کیونکہ ہانیہ کے بھائی کی گہری نظریں وہ سہہ نہ پاتی......لگتا تھا کچھ کہہ رہی ہوں۔ کئی ان کہی کہانیاں، بے تابیوں کی داستان سناتیں نگاہیں اسے بے بس کردیتیں۔ ہانیہ کا گھرانہ بہت پڑھا لکھا تھا اس کے ابو ایک بڑی پوسٹ پر تھے خود امی کالج میں پڑھاتی تھیں اور ہانیہ کا بھائی شہیر بی اے کرکے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کررہا تھا یوں تو بے حد شریف اور مہذب تھا مگر بدخشاں کو دیکھتے ہی اس کی نگاہوں کی چمک بڑھ جاتی۔ مگر اس کی نگاہوں میں خباثت نہیں احترام ہوتا عزت ہوتی مگر یہ پاکیزہ اور پُرخلوص نگاہیں اسے ڈسٹرب کرنے لگتی تھیں اور کچھ عرصے کے لیے وہ ہانیہ کے گھر جانا چھوڑ دیتی تھی مگر اس کے اصرار پر جانا ہی پڑتا تھا۔ رات کو جب وہ کمرے میں تنہا ہوتی تو آنکھیں ایک پیکر سامنے لاکر اس کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کردیتیں اور وہ دونوں پیکروں کا موازنہ کرنے لگتی۔

سفید رنگت، شربتی آنکھیں، پیشانی پر جھولتے ہوئے گھنے سیاہ بال......دراز قد لیکن ہر انداز

میں نخوت، تیکھا پن، بناوٹ اور تکبر جبکہ دوسری طرف معمولی شکل صورت، گندمی رنگ، درمیانہ قد لیکن...... آنکھوں میں خلوص و محبت کی چمک، انکساری اور عاجزی، گفتگو میں دھیما پن اور شرافت...... گویا...... ایک تو آندھی کا زبردست تھپیڑا...... جو ہستی کو تہ و بالا کردے...... اور دوسرا نسیم سحر کا لطیف جھونکا...... جو سر سے پاؤں تک تازگی اور سرور بخش دے۔ دونوں پیکروں کا مقابلہ سوچ میں جاری رہتا تھا جبھی ضمیر کی آواز بلند ہوتی۔

''بے وقوف لڑکی ہیرے کا پتھر سے کیا مقابلہ میکائیل جس نے تمہاری نسوانیت کو مجروح کیا، تمہارے وقار کی دھجیاں اڑادیں، تمہیں اپنے راستے کا پتھر سمجھ کر ٹھوکر ماردی۔ تمہارے خلوص کا مذاق اڑایا، پورے خاندان میں رسوا کیا، کیا وہ اس شخص سے مقابلے کے قابل ہے کہ جس کی نگاہوں میں احترام و عزت ہے، خلوص ہے جو انکساری و عاجزی اور ملنساری کا پیکر ہے۔''

دوسرے دن ہانیہ کالج نہ آئی تو بدخشاں اس کے گھر پہنچ گئی۔ سامنے ہی شہیر لان میں بیٹھا کسی کتاب کا مطالعہ کررہا تھا۔

''زہے نصیب، آپ نے ہمارے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا۔'' وہ شوخی سے بولا۔

''آپ اتنی ثقیل اردو نہ بولیں صرف یہ بتائیں آج ہانیہ کالج کیوں نہیں آئی، آج تو اسے ضروری آنا تھا سیمینار اٹینڈ کرنے......'' بدخشاں نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''اسے بہت تیز بخار ہے اور وہ اندر اپنے کمرے میں لیٹی ہے؟'' جونہی بدخشاں نے اندر کی جانب قدم بڑھائے پیچھے سے شہیر کی آواز آئی۔

''مس بدخشاں...... وہ شاید سورہی ہے آپ کچھ دیر میرے پاس بیٹھ سکتی ہیں، میں ایک شریف انسان ہوں آپ کو کچھ نہیں کہوں گا......'' بدخشاں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اس کی آنکھوں سے عیاں تھا وہ سرد لہجے میں گویا ہوئی۔

''آپ کی شرافت میں کوئی کلام نہیں مگر آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مجھ سے کچھ کہنے والا آج تک پیدا نہیں ہوا، میں نے کبھی کسی کو یہ موقع ہی نہیں دیا کہ وہ کچھ کہنے کی جرأت کرسکے......'' شہیر شاید کچھ اور کہتا مگر آوازیں سن کر ہانیہ خود ہی باہر آگئی تھی اور پھر بدخشاں کو اپنے ساتھ اندر لے گئی۔

☆☆☆

رات جب وہ بستر پر لیٹی تو ایک لمحے کے لیے بھی سو نہ سکی دل میں ایک پھانس سی چبھ گئی تھی جو کسی کروٹ چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ شہیر کی نگاہوں نے اس کا سکون غارت کردیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میکائیل کی تصویر دھندلانے لگی تھی۔ تصور میں بار، بار شہیر کا عکس ابھرتا اور پھر وہ محبت لٹاتی آنکھیں...... اس کے ذہن پر چھا جاتیں...... جن آنکھوں میں محبت کی چمک اور لہجے میں اور خلوص کی چاشنی تھی، پیار کا اجالا اور وفا کا تقدس تھا۔ یہ دو آنکھیں غیر محسوس طریقے سے اس کے دل میں اترتی جارہی تھیں۔ روح میں سمارہی تھیں شہیر نے کئی بار اس سے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر ہر بار اس نے اس کی یہ کوشش ناکام بنادی۔ وہ اس کے دل کی آگ سے بے خبر نہیں تھی مگر جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی شاید حیا یا پھر مصلحت کا تقاضا...... اکثر شہیر کا خوابیدہ لہجہ اور مخمور نگاہیں اس کے جذبات میں ہلچل مچادیتیں۔ سوئے ہوئے جذبات جاگ اٹھتے اور دل میں ارتعاش سا پیدا ہوجاتا مگر وہ اپنے جذبات اور احساسات پر قابو رکھنا جانتی تھی۔

☆☆☆

آج کل اس کی اور ہانیہ کی نائٹ ڈیوٹیز لگ رہی تھیں دونوں کافی مصروف ہوگئی تھیں۔ اس دن میکائیل اپنے دوست کی عیادت کے لیے اسپتال آیا تو ٹھٹک کر رک گیا جنرل وارڈ میں بدخشاں نرس سے کسی مریض کی کیس ہسٹری لے رہی تھی۔ چمپئی رنگت،

پرکشش چہرہ، لمبے سیاہ بال ہیئر بینڈ میں قید اس کی کمر پر ہلکورے لے رہے تھے...... سفید گاؤن میں اس کا روپ بے حد مقدس اور پاکیزہ لگ رہا تھا۔

''کیا یہ وہ بدخشاں ہے جسے اجڈ، گنوار کہہ کر میں نے ٹھکرادیا تھا......؟ نہیں یہ بدخشاں ہو ہی نہیں سکتی مشابہت ہوسکتی ہے۔'' وہ بڑبڑایا کیونکہ اس کے تصور میں تو وہی چادر میں لپٹی بدخشاں تھی جسے انگلش تو کیا اردو... بھی ٹھیک سے بولنا نہیں آتی تھی...... اسی لمحے ایک سینئر ڈاکٹر کمرے میں داخل ہوا اور اسے مخاطب کیا۔

''ڈاکٹر بدخشاں پلیز کم ٹو مائی آفس......''

بدخشاں نے اسی دوران مریض کے بارے میں سینئر ڈاکٹر کو کچھ بتایا اور پھر بے نیازی سے اس کے برابر سے نکلتی چلی گئی۔ میکائیل پر تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ کتنا تضاد تھا پرانی اور نئی بدخشاں میں۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا پھر یہ اس کا معمول بن گیا وہ گاہے بگاہے دوست کو دیکھنے کے بہانے اسپتال کے چکر لگانے لگا۔ اس دن تو حد ہی ہوگئی وہ دروازے میں کھڑا تھا جب بدخشاں آتی نظر آئی۔

''دروازے سے ہٹ کر کھڑے ہوا کریں لوگوں کو گزرنا بھی ہوتا ہے نفرت آمیز طنزیہ لہجہ...... نگاہوں میں حقارت...... اسے لگا جیسے کانوں میں کسی نے جلتی ہوئی سلاخیں اتار دی ہوں...... یہ وہی الفاظ تھے جو اس نے ایک دن بدخشاں کے راستے میں کھڑے ہونے پر بڑی حقارت سے کہے تھے۔ آج وہی اس نے میکائیل کے منہ پر ماردیے تھے اور وہ مرغزاروں میں چلتے، چلتے ایک ہی ٹھوکر سے لق و دق صحرا میں نکل آیا تھا۔ ہر طرف ویرانی اور سناٹا، ایک کمزور اور دیہاتی لڑکی اتنی پرعزم، باحوصلہ اور باہمت ہوگی ایسا تو اس نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ سوچا تھا۔ وہ اتنی بلندی پر پہنچ گئی تھی کہ میکائیل کو اپنا وجود تنکے سے بھی ہلکا اور بت کے جیسا حقیر لگ رہا تھا۔ وہ بری طرح پچھتاوے کی آگ میں جلنے لگا۔ جس وجہ سے اس نے بدخشاں جیسے ہیرے کو ٹھکرایا تھا۔ وہ تو خود ہی اسے ٹھوکر مار کر اپنا راستہ بدل چکی تھی۔

شمع نے روز اول ہی اس پر واضح کردیا تھا کہ وہ اسے صرف اس شرط پر اپنانے کو تیار ہے کہ اسے خود کو بدلنا ہوگا، وہ گاؤں جائے گا مگر وہ ہرگز نہ جائے گی۔ نہ میکائیل کے ماں، باپ اس کے گھر میں قدم رکھیں گے۔ اور میکائیل نے یہ سوچ کر ہامی بھرلی تھی کہ اتنی بڑی جائداد کی تنہا وارث کے عوض یہ سودا برا نہیں...... لیکن اسی دوران شمع کا کزن بے انتہا ماڈرن اور ہینڈسم امریکا سے آیا تو شمع کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ جتنا بھی پیتل پر سونے کی پالش کرلیتی اصل تو وہی رہتا ناں...... اس نے نہ صرف میکائیل کو دھتکار دیا بلکہ اسے اس کی اوقات بھی یاد دلادی اور اسے خود اسی کی نظروں میں ذلیل کردیا...... تب اسے بدخشاں یاد آئی اور آج ایک ڈاکٹر کے روپ میں دیکھ کر تو اس کے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوگئیں۔

☆☆☆

وہ ایک عام سا ہی دن تھا جب ہانیہ اسے اسپتال سے زبردستی اپنے گھر لے گئی۔ بدخشاں کو ہانیہ کے امی، ابو بھی بہت پسند کرتے تھے۔ دونوں چائے پی رہے تھیں جب شہیر بھی آگیا اور ان کے ساتھ چائے میں شریک ہوگیا۔ ہانیہ فون سننے اندر گئی تو شہیر کو بولنے کا موقع مل گیا۔

''بدخشاں......'' جذبات سے مخمور لہجے میں اس نے دھیرے سے پکارا...... بدخشاں جو اپنے خیالات میں گم پرس کی زنجیر سے کھیل رہی تھی چونک اٹھی۔

نگاہیں بڑی چاہت، محبت اور محویت سے اسے تک رہی تھیں۔ وہ بے چین ہوگئی۔

''پلیز میری بات سنے بغیر مت جانا، میں کب سے تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر تمہارے گریز اور کچھ رعب حسن میں لب کشائی نہ کرسکا لیکن آج تمہیں میری بات سننا ہوگی۔ بدخشاں میں تمہارے ساتھ زندگی کی

شروعات کرنا چاہتا ہوں میں کوئی گلی محلے کا عام سطحی عاشق نہیں، تم سچ مچ میری آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز ہو، میرا ارمان ہو، میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ میرے بارے میں بھلا کیا جانتے ہیں؟'' بدخشاں نے متانت سے پوچھا۔

''مجھے جاننا بھی نہیں ہے، میرے سارے گھر والے تمہیں پسند کرتے ہیں اور میں تمہارے سامنے ہوں، میں صرف تمہاری مرضی جاننا چاہتا ہوں۔''

''آپ جانتے ہیں میرے آباؤ اجداد کا تعلق گاؤں سے ہے، خاندان کی میں پہلی لڑکی ہوں جو پڑھنے شہر آئی ہے۔''

''تو یہ تو بڑے فخر کی بات ہے شرمندگی کی نہیں..... سچ پوچھو تو ہمارے ملک کی خوشحالی کی وجہ یہ گاؤں کے لوگ ہی ہیں جو دھرتی کا سینہ چیر کر فصلیں اگاتے ہیں، محنت مشقت کر کے..... اور ہم شہر والے عیش سے کھاتے ہیں اور خود کو توپ چیز سمجھنے لگتے ہیں۔ میرے تو اپنے نانا، دادا کا تعلق گاؤں ہی سے تھا۔'' وہ سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ''مجھے تو تم پر رشک آرہا ہے کہ ان عظیم اور قابلِ تحسین والدین کی بیٹی ہو جنہوں نے علم کی اہمیت کو جانا اور تمہیں گاؤں کی روایات کے خلاف پڑھنے شہر بھیجا..... ان کی عظمت کو سلام کم از کم وہ نام نہاد پڑھے لکھے ہزاروں لوگوں سے بہتر ہیں جن کا ڈگریوں نے بھی کچھ نہیں بگاڑا اور ان کی تعلیم گدھے پر کتابوں کا بوجھ لادنے کے مترادف ہے۔''

شہیر کی پُرخلوص باتوں نے بدخشاں کا دل موم کر دیا اور وہ خود کو روک نہ پائی اور میکائیل سے متعلق ہر بات اسے بتادی۔

''کیا تم اب بھی اپنے کزن کو پسند کرتی ہو.....؟'' شہیر نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

''نہیں..... بلکہ میں تو اس کی مشکور ہوں کہ آج اس کی وجہ سے میں اس مقام پر ہوں..... جہاں تک پسند کا تعلق ہے، بچپن سے منگنی تھی آپ محبت نہیں بس لگاؤ کہہ سکتے ہیں لیکن اب اسے پسند کرنا تو دور کی بات..... میں تو اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی.....'' بدخشاں کے لہجے میں نفرت اور حقارت تھی۔

''تو پھر میرے بارے میں کیا خیال ہے؟'' شہیر کے الفت بھرے لہجے اور مان نے جیسے دل میں طوفان برپا کر دیا رگ، رگ میں شرارے سے دوڑنے لگے لانبی پلکیں بوجھل ہو کر اس کے تمتماتے ہوئے رخساروں پر لرزنے لگیں۔

''میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ اس کا اختیار میرے والدین اور بھائیوں کو ہے۔''

☆☆☆

میکائیل بدخشاں کے رویّے سے سخت پریشان تھا اسپتال میں اسے دیکھتے ہی اس کی تیوریوں پر بل پڑ جاتے۔ اور وہ خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف کر لیتی۔ وہ اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی آخر تنگ آکر میکائیل گاؤں جا کر ماں، باپ کے پیچھے پڑ گیا اور اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ بیٹے کو برا بھلا کہنے کے باوجود ان کی اپنی دلی خواہش بھی یہی تھی میکائیل کے انکار نے انہیں بڑا دکھ پہنچایا تھا اور بھائی کے آگے شرمندہ بھی کیا تھا مگر بیٹے کے اصرار پر وہ ایک مرتبہ پھر بھائی کے آگے دامن پھیلانے پر مجبور ہو گئے تھے لیکن چھوٹے بھائی کا ایک ہی جواب تھا۔

''اب یہ فیصلہ بدخشاں خود کرے گی، ہم نے اپنی مرضی چلا کر اور ایک غلط فیصلہ کر کے اسے کافی دکھ پہنچایا ہے اب یہ اس کی صوابدید پر ہے اقرار یا انکار..... ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

درخشاں نے سنا تو وہ غصے سے آگ بگولا ہو گئی۔

''اس کی ہمت کیسے ہوئی میرا نام اپنے لبوں پر لانے کی، وہ جاہل، اجڈ، گنوار بدخشاں آج اس کے قابل کہاں ہو گئی۔ اگر وہ میرے لیے دنیا کا آخری مرد بھی ہوا ناں تو میں مر جاؤں گی مگر اس گھٹیا کم ظرف انسان سے شادی نہیں کروں گی۔'' میکائیل نے یہ سب سنا مگر اسے حیرت نہیں ہوئی۔ وہ ذہنی طور پر یہ

سننے کے لیے تیار تھا لیکن ہار ماننے کے لیے نہیں اسے ہر صورت بدخشاں کو منانا تھا۔

☆☆☆

وہ لاہور میں بدخشاں کے بھائی کے گھر پہنچ گیا جو اس وقت گھر پر نہیں تھے تو بھابی سے اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ اسے ڈرائنگ روم میں بلا کر خود باہر چلی گئیں تاکہ وہ اچھی طرح بات کر لیں۔

''کیوں آئے ہیں آپ، مجھ سے کوئی کام ہے؟'' اس نے بے رخی سے پوچھا۔

''تم نے رشتے سے انکار کیوں کر دیا؟''

''آپ کون ہوتے ہیں مجھ سے یہ پوچھنے والے، آپ کو یہ حق کس نے دیا ہے؟'' وہ تلخی سے بولی۔

''بدخشاں میں جانتا ہوں، مجھے معلوم ہے تم مجھ سے ناراض ہو اور تمہاری ناراضی بجا ہے مگر میں اپنے کیے پر بے حد پریشان ہوں، شرمندہ ہوں، اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں، میں مانتا ہوں، میں تمہارا گنہگار ہوں اور انسان کے لیے یہ احساسِ گناہ ہی کافی ہوتا ہے کہ تم مجھے معاف کر دو مجھے ایک موقع دے دو، اپنی غلطی سدھارنے کا۔'' وہ عاجزی سے بولا۔

''آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں آپ سے ناراض ہوں یا خفا ہوں؟ میں آپ سے صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر میں وہی گاؤں کی سیدھی سادی، اجڈ گنوار بدخشاں ہوتی تو کیا پھر بھی آپ مجھے اپنانے کو تیار ہو جاتے۔'' اس نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''لیکن اب تو تم پڑھ لکھ گئی ہو خدارا سمجھنے کی کوشش کرو، اسی میں ہماری اور دونوں گھرانوں کی بھلائی ہے۔ پلیز مجھے مت ٹھکراؤ.....'' وہ گڑگڑایا۔

''مگر یہ میرے وقار اور عزت کا سوال ہے، میری نسوانیت مجروح ہوئی ہے۔ آپ سے بات کرتا بھی میں اپنی توہین سمجھتی ہوں میں اجڈ، گنوار، دیہاتن جس کا ساتھ آپ کے لیے شرمندگی کا باعث تھا اچانک اس میں لعل کیسے جڑ گئے؟ آپ کس منہ سے میرا رشتہ مانگ رہے ہیں؟ کل آپ نے میرے والدین کو رسوا کیا اور مجھے ذلیل مگر آج اللہ کا شکر ہے میں اس قابل ہوں کہ سر اٹھا کر جی سکوں.....''

''مگر تم یہ مت بھولو آج تم اس مقام پر میرے ٹھکرانے کی وجہ سے ہی ہو۔'' میکائیل کو اب غصہ آگیا تھا۔

''مگر میں اس کے لیے آپ کی احسان مند نہیں بلکہ اپنے والدین کی ہوں اگر آپ چاہتے تو میں آج کی بدخشاں بن کر آپ کے برابر آسکتی تھی، پڑھ لکھ کر وہ مقام حاصل کر لیتی جس پر میں آج ہوں مگر آپ کو تو غرور اور تکبر نے کہیں کا نہ چھوڑا..... دولت مند باپ کی بیٹی نے جب آپ کو لات مار کر آئینہ دکھایا تو آپ کو بدخشاں یاد آگئی۔'' وہ تلخی سے گویا ہوئی۔

''کان کھول کر سن لیں مسٹر میکائیل آج کی عورت خواہ گاؤں کی ہو یا شہر کی مردوں سے زیادہ خوددار، باوقار اور عزم و حوصلے کا پیکر ہے جو ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ آپ عورت کی قابلیت اور صلاحیت کو انڈر اسٹیمیٹ مت کریں اور اپنی صلاحیتوں کو مجھ پر آزمانے کے بجائے کسی اور مثبت کام میں لگائیں، آپ مجھے بھول جائیں، میں نہ کبھی آپ کی تھی، نہ ہوں اور نہ ہوں گی آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔''

''پلیز بدخشاں.....'' میکائیل کا سر جھکا ہوا اور لہجے میں ندامت تھی۔

''بس اب ایک لفظ بھی اور نہیں، مجھے آپ بدتمیزی پر مجبور نہ کریں۔ پلیز چلے جائیں۔'' اس کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی عود کر آئی۔ میکائیل بے نیل و مرام لوٹ گیا اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اس کے جانے کے بعد جانے کیوں وہ پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی مگر پھر ایک نئے عزم سے کھڑی ہو گئی۔

ایک نئی اور روشن صبح اس کی منتظر تھی، بہاروں نے دستک دے دی تھی اس کے دکھوں کا مداوا ہونے والا تھا۔ شہیر کے والدین آج اپنے بیٹے کے لیے اس کا ہاتھ مانگنے آرہے تھے جس کی سچائی، بے لوث محبت اور خلوص پر بدخشاں کو کوئی شک نہیں تھا۔



ع عورت الف امانت

ایک عام تاثر یہی ہے کہ عورت ایک کمزور اور کم تر ہستی ہے... مگر یہی کمزور اور کم تر ہستی صنفِ مخالف پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتی ہے اور وقت پڑنے پر چٹان جیسی مضبوطی بھی دکھاتی ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے عورت کہانی میں ہماری معروف قلم کار فرحین اظفر نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔

جداگانہ موضوعات لیے کہانیوں کا نیا سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر

وہ آبگینۂ حیات تھی۔ کانچ کے آبگینوں کے مانند نازک اور نفیس، شہد آگیں اور شفاف...... جیسے بلوریں جام میں چھلکتا ہوا پانی...... خود اس کو اپنے حسن کا کہیں نہ کہیں ادراک تھا جبھی جوانی کی حدود میں قدم رکھتے ہی اسے مزید نکھارنے کی جدوجہد میں لگ گئی تھی۔

جس کسی نے بھی اس کا نام رکھا تھا، اس کی شخصیت کے دریا کو گویا کوزے میں مقید کردیا تھا۔ جوانی کی منہ زور لہریں امڈ امڈ کے اس کا سراپا دوچند کرتیں۔

''آبی۔''

گھر میں اس کا نام سماعتوں کو تراوٹ بخشتے مائع کی طرح گونجتا رہتا اور اس کی ہنسی کانوں میں جذب ہوتی جسم و جاں کو تر و تازہ رکھتی۔

وہ بہار کے مہکتے ہوئے جھونکے کی طرح بے اختیار تھی۔ وہ سرما کی سرد رات میں چمکتا چاند تھی۔ وہ گرمیوں کی مہکتی شام تھی۔ خزاں کا اس کی زندگی میں کوئی گزر نہ تھا۔ اداسی کا اس کی شخصیت میں کوئی رنگ نہ تھا...

ناامیدی حرام تھی، مایوسی کفر تھی لیکن......

صرف اس روز تک، جس روز تک اس پہ اس کی حقیقت واضح نہ ہوئی تھی۔ وہ خوش رہتی تھی اور خوش ہی رہتی اگر اسے اس گھر کے واحد مکین سے اس کے رشتے کا پتا نہ چل جاتا۔

☆☆☆

ایک روشن صبح، جب تیز ہوائیں بدلتے موسم کی باس جھولیاں بھر، بھر لا کر کرۂ ارض کے مکینوں پر لٹا رہی تھیں۔ سبز ڈالیوں پہ کھلے ننھے شگوفے ہوا کی خرمستیوں پر کھلکھلا رہے تھے۔ سورج کی سنہری شعاعیں دلوں کو امید کی نئی روشنی دے رہی تھیں۔ اس روز گھر کی بلبل صبح سے اٹھ کے گھر ہی میں چہچہا رہی تھی۔

''انابی! زبردست قسم کا ناشتا بنائیں میرے لیے آج میں باقاعدہ ناشتا کرنے کے موڈ میں ہوں۔''

''تو آپ روز کیا بے قاعدہ ناشتا کر کے جاتی ہیں۔'' اخبار سمیٹ کر رکھتے ہوئے شہریار تھوڑا سا ہنس دیے۔

''نہیں......'' اس نے بناوٹی انداز میں منہ لٹکایا۔ ''لیکن روز تو یونی کے چکر میں ڈھنگ سے کچھ بھی کھایا نہیں جاتا۔'' بھوک اس کی کمزوری تھی۔

''تو آج......؟''



''آج یونی آف ہے۔پبلک ہالی ڈے یو نو......''
اس نے مزے سے کندھے اچکائے۔

شہریار نرم نگاہوں سے اسے دیکھتے رہے پھر تاسف سے سر ہلایا۔

''یہ پاکستانی قوم...... کب چھٹیوں پہ خوش ہونا چھوڑے گی۔''

''جب تک آپ جیسے قائد کے مقولے کام کام اور صرف کام پہ عمل کرنے والے عظیم لوگ یہاں موجود ہیں، کم از کم تب تک تو بالکل نہیں۔'' وہ ایک بار پھر ہنس دیے۔

''یعنی یو تھ چاہتی ہے کہ جو تھوڑے بہت کام کے لوگ بچے ہیں، وہ بھی ان ہی کی طرح ہو جائیں۔''

''جی ہاں اپ ٹو ڈیٹ، ویل مینرڈ اور ڈسپلنڈ...... اور سب سے بڑھ کے کول......''

صاف ظاہر تھا کہ دونوں نے ایک دوسرے کو چھیڑا تھا مگر آبی جیت چکی تھی یا پھر شہریار جان بوجھ کے ہمیشہ کی طرح اس سے ہار گئے تھے۔

انابی ناشتا لے آئیں اور شہریار انہیں خدا حافظ کہہ کے چلے گئے تب انابی سے باتیں کرتے، کرتے اسے کچھ یاد آیا۔

''انابی۔'' اس نے ایک فلک شگاف چیخ ماری اور تیزی سے اٹھ کے باہر بھاگی۔انابی نے اس کی تیز رفتاری پہ دل کر دل پکڑ لیا۔

''خدا ہدایت دے اس کو کسی دن میری جان نکالے گی۔'' وہ لٹکا ہوا منہ لے کے واپس آئی تو اس وقت تک انابی کے دل کی دھڑکن قابو میں نہیں آئی تھی۔

''آپ کو کیا ہوا؟'' اس نے انہیں دیکھ کے پوچھا۔

جواب میں انہوں نے اسے جن نظروں سے گھورا، وہ پہلے تو سٹپٹا گئی۔پھر ہنسنا شروع ہوئی تو پہاڑی جھرنے کا سا شور چاروں اور گونج اٹھا۔

''کیا آفت آ گئی تھی جو یوں گھوڑیوں کی طرح دوڑیں لگا دیں۔'' انابی زیادہ ہی تپ گئی تھیں۔اسے یاد آیا تو پھر سے منہ لٹک گیا۔

''میرے ڈاکومنٹس تھے ناں ان کے پاس وہ لینے تھے۔اب پھر رات تک کا ویٹ کروں۔''

''تو جا کے لے، لے کمرے میں ہوں گے۔''

''کمرے میں نہیں...... ان کی الماری کی لاکڈ ڈرار میں۔''

انابی سر ہلاتی اٹھ گئیں۔

کبھی، کبھی شہریار لنچ پہ گھر آ جاتے تھے۔اس نے فون کیا تو پتا چلا آج نہیں آ رہے ہیں۔لیکن آبی کے ڈاکومنٹس کے لیے انہوں نے یہ کہہ کے مسئلہ حل کر دیا کہ چابی ان کی سائیڈ ٹیبل پر ہے۔

وہ آج پہلی بار ان کی پرسنل چیزوں کو ہاتھ لگانے جا رہی تھی۔ایکسائٹمنٹ کی کوئی حد نہ تھی۔اور شہریار کے لاکھ تاکید کرنے کے باوجود کہ وہ کسی دوسری چیز کو نہیں چھوئے گی۔اس کا ان کی ہدایت پہ عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

☆☆☆

''واؤ۔'' کام کی چیز اسے مل چکی تھی، اب وہ سیاہ جلد والی ایک خوب صورت سی ڈائری دیکھ رہی تھی۔

''پتا نہیں میری اخلاقی تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی، جو میں نے یہ غلط حرکت کرنے کا سوچا بھی۔'' خود کو شرمندہ کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے ڈائری کھولی مگر اندر کے صفحے خالی تھے۔

'' اوں ہوں......'' وہ سخت بدمزہ ہوئی۔

اس نے منہ اندر ڈال کر کوئی اور چیز دیکھنی چاہی مگر وہاں صرف موٹی، موٹی چند ایک فائلوں کے سوا کوئی چیز نہ تھی۔وہ جس خاندانی البم گم شدہ رشتے اور بچھڑی محبت ٹائپ کے انکشاف کی تلاش میں تھی۔وہاں ایسا کچھ بھی نہ تھا۔

گہری سانس بھر کے اس نے ڈائری واپس رکھنی چاہی تو اس میں سے جھانکتے ایک بوسیدہ لفافے نے اس کی توجہ کھینچ لی......

''یہ کیا ہے؟'' تجسس کے ہاتھوں حال سے بے حال آبگینے نے جلدی سے لفافہ کھولا۔

دولہا کا نام ولدیت مع سکونت و رہائش......

سرپرست کا نام......

جوں، جوں وہ پڑھتی گئی...تجسس تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا۔وہ محض ایک کاغذ نہیں، کوئی بم کا گولہ تھا جو اس کی بصارتیں پھوڑ گیا۔

نظریں بھٹکتی گئیں، سر نفی میں ہلتا گیا اور چند لمحوں میں ایک کاغذ کے ٹکڑے نے اس کی حیات پھونک ڈالی۔

اسے بہت شوق چڑھا تھا اپنے ماضی میں جھانکنے کا۔یہ کیسا دریچہ تھا جس نے اس کے باہر نکلنے کا راستہ ہی ختم کر دیا۔

اسے گم شدہ رشتوں کی تلاش تھی۔اسے بچھڑی محبتیں یاد آ رہی تھیں......اب رشتہ بھی مل چکا تھا اور محبت بھی لیکن اس نے اپنا آپ کہیں کھو دیا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن یونیورسٹی میں دوستوں کے گروپ میں بیٹھی وہ ان کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی جیسے وہاں نہیں تھی۔پژمردگی اور اضمحلال اس کی شکل سے ٹپک رہا تھا۔

''کیا بات ہے کہاں گم ہو؟'' وہ چونکی پھر پھیکی سی مسکراہٹ سے سر ہلایا۔

''کم آن یار، آج اتنی چپ کیوں ہو کچھ تو بولو۔کوئی پرابلم ہے تو ہمیں بتاؤ۔شاید ہم کوئی ہیلپ کر سکیں۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے بس آج موڈ نہیں ہے۔''

''ہاں، میں صبح سے نوٹ کر رہی ہوں تم پریشان ہو۔'' یہ صدف تھی......اس کی بیسٹ فرینڈ۔صدف سے اس کی کوئی بات چھپی ہوئی نہیں تھی۔ہم عمر ہونے کے باوجود وہ اس سے زیادہ سمجھدار اور معاملہ فہم تھی۔آبی اپنی ہر پرابلم اسے بتا کے ہلکی ہو جاتی تھی لیکن آج......

''میں گھر جا رہی ہوں صدف۔'' اس کا لہجہ بے حد مایوس کن تھا۔اسے لگا صدف تو کیا، دنیا کا کوئی انسان اس کا مسئلہ حل نہیں کر سکتا۔

واپسی کا سارا سفر چپکے، چپکے آنسو پونچھتے ہوئے گزرا۔گھر جانے کے خیال نے ایک عجیب سی دہشت طاری کر دی تھی۔

اسے اپنی ذہنی ابتری سے خوف آنے لگا تھا اور کوئی راہِ نجات دکھائی نہیں دیتی تھی۔اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ......

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی حالت بہ زبانِ خود چیخ، چیخ کے پکارنے لگی کہ کہیں بہت غلط کچھ ہو چکا ہے۔انابی کافی دیر پوچھنے کی کوشش کرتی رہیں مگر اس نے لب کھول کے نہ دیے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس بات کو آخر وہ کون سے ایسے شخص کے سامنے بیان کرے جو اس کی الجھن بھی سلجھا دے اور اس کا کرب بھی سمجھ جائے۔زندگی میں پہلی بار اسے اپنا آپ اس بھری دنیا میں اکیلا اور بے یار و مددگار لگ رہا تھا۔

آج سے پہلے تو سب باتیں سب مسئلے انابی اور خود شہریار اس خوب صورتی سے حل کرتے آئے تھے کہ اسے کسی چیز کے لیے پریشان ہونا ہی نہیں پڑا۔تو، تو کیا یہ ایک آخری بچا ہوا رشتہ بھی وہ ہی نبھائیں گے۔

''نہیں......'' اس کی بند آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

☆☆☆

دو دن سے وہ شدید بخار میں پڑی تھی۔ڈاکٹر، دوا اور دعا...اسے ان ہی تین چیزوں کی ضرورت تھی، جو پابندی اور پوری توجہ سے اسے دی جا رہی تھیں لیکن طبیعت سنبھلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ذرا دیر کے لیے غنودگی چھٹتی تو وہ، کبھی انابی اور کبھی شہریار کو اپنے نزدیک پاتی۔اسے بدحالی میں بھی ان کی پریشانی کا خیال تھا مگر......خود پر سے اختیار ختم ہو چکا تھا۔وہ جانتی تھی ان کی پریشانی اس کی الجھن، اس کی پریشانی اور دکھ سے بہت چھوٹی تھی۔وہ لوگ اس کا مداوا نہیں کر سکتے تھے۔

''آہ......'' دکھتے جسم اور جلتی آنکھوں سے اس نے جسم کو ہلانا چاہا مگر صرف آہ بھر کے رہ گئی۔

جانے کتنا وقت بیتا تھا۔ذہنی اور جسمانی شکست و ریخت نے اسے توڑ کے رکھ دیا تھا۔

سرہانے بیٹھے شہریار نے اس کی جلتی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو جیسے انگاروں کو چھو لیا۔وہ مہربان لمس کی ٹھنڈک سے سکون پا رہی تھی۔اور ان کا اپنا سکون و قرار لٹتا

جارہا تھا۔

انہوں نے اپنے لاکڈ سیف میں بے ترتیبی دیکھ لی تھی۔

وہ آپی کی اس کیفیت کا سبب جانتے تھے۔ اور خود کو کسی حد تک اس سب کا ذمّے دار بھی سمجھ رہے تھے۔

بچپن سے آج تک بن کہے اس کی ہر بات، جذبات اور ضرورت کو جان لینے والے آج مخمصے میں پڑے تھے۔ خود سے بات کرنا نہیں چاہتے تھے اور وہ بات کر نہیں رہی تھی۔

زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ لاکھ چاہنے کے باوجود وہ اندازہ لگانے سے قاصر تھے کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا تھا۔

وہ ایک بار پھر کراہی۔

اپنی سوچوں سے نکل کر انہوں نے دیکھا وہ آنکھیں کھولے ان ہی کو دیکھ رہی تھی۔ ماتھے پر ان کے ہاتھ کا لمس زندہ تھا۔

''آپی...... کیسی طبیعت ہے اب...... کچھ چاہیے؟''

وہ فوراً ہی متوجہ ہوئے۔

آپی کو ان کی آواز بہت دور سے سنائی دی۔ ماتھے پر ان کے ہاتھ کا ٹھنڈا لمس یک لخت ہی جلنے لگا۔ اس نے ان کا ہاتھ ہٹا دیا اور منہ پھیر لیا۔

انہوں نے خود کو بھی ایک ان دیکھی آگ میں جلتا محسوس کیا۔

☆☆☆

یونیورسٹی سے اس کی دوست صدف کا فون آیا تھا۔ وہ اس کی مسلسل غیر حاضری سے پریشان تھی۔

انہوں نے تسلی دے کر فون بند کیا اور اس کے کمرے میں آگئے۔

آج چار دن بعد اس کی طبیعت ذرا بہتر ہوئی تھی۔ انا بی اپنے ہاتھ سے اسے ناشتا کرا رہی تھیں۔

ان کو آتے دیکھ کے اس نے انا بی کا ہاتھ ہٹا دیا۔

''بس انا بی اور نہیں......''

شہریار نے اس کے انداز سے جھلکتی بیزاری نوٹ کرلی تھی۔ ان کا پہلے سے بوجھل دل کچھ اور بوجھل ہو گیا۔

وہ قریب آکے بیٹھے، انا بی ناشتے کی ٹرے اٹھا کے چلی گئیں تب اس سے مخاطب ہوئے۔

''آپی...... میں جانتا ہوں یہ موسمی بخار نہیں ہے۔ اس کی وجہ کچھ اور ہے......''

''کچھ اور نہیں اس کی وجہ آپ خود ہیں۔'' اس کے اندر طاقت نہیں تھی ورنہ چیخ پڑتی۔

''تم سمجھتی ہو تو ایسا ہی ہوگا۔''

اس کے انداز نے ان سے بات کرنے کی ہمت چھین لی۔

چند لمحے خاموش لیکن اعصاب پر بری طرح گراں گزرے۔ پھر بالآخر وہ بول پڑی......

''کیوں...... کیوں کیا یہ سب میرے ساتھ...... ایسا کیوں۔'' اس کا لہجہ تلخ اور آنکھیں نم ہوگئیں۔

انہوں نے گہری سانس لے کر خود کو جواب دینے کے لیے تیار کرلیا۔ پتا تو تھا کہ یہ وقت آنا ہی ہے۔

''تمہارے بابا نے اپنے ڈوبتے کاروبار کو بچانے کے لیے... تمہیں اپنے دوست کے حوالے کرنا چاہا تھا۔ تم اس وقت صرف آٹھ سال کی تھیں۔ خالہ جان کو تمہارے بابا کے اس فیصلے سے سخت اختلاف تھا لیکن گاؤں کے گھٹن زدہ ماحول میں ان کی بات سننے والا کوئی نہ تھا۔ اتفاق سے میں ایک رات گاؤں پہنچ گیا۔ امی اور پاپا کے انتقال کے بعد میں جب بھی تنہائی محسوس کرتا تو ممتا کی خوشبو پانے کے لیے خالہ کے پاس چلا جاتا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا اس روز میں اکیلا جا تو رہا تھا لیکن میری واپسی اکیلے نہیں ہونی تھی۔ شوہر کے فیصلے سے بددل اور ان کے رویّے سے مایوس ہوکر انہوں نے تمہیں میرے ساتھ بھیج دیا...... میں نا سمجھ تو نہ تھا، اٹھائیس، تیس کا جوان تھا۔''

''تو اس کے لیے اس نام نہاد رشتے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا آپ ویسے ہی میرا خیال نہیں رکھ سکتے تھے۔'' وہ تڑخ گئی۔

''میں نے بھی یہی کہا تھا مگر خالہ...... خالو کی ہر امید ختم کر دینا چاہتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کوئی تمہیں ڈھونڈنے تمہارے پیچھے نہ جائے۔''

انہوں نے گہری سانس لے کر بات جاری رکھی۔

''اور ہوا بھی یہی...... ساتھ والے گاؤں میں رہنے والی خالہ کی سہیلی نے ان کا ساتھ دیا اور تم...... تم ان ہوس کے پجاریوں سے محفوظ ہوگئیں۔''

بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی بہت کچھ کہنا سننا باقی تھا پھر بھی دونوں کے درمیان ایسی خاموشی چھا گئی جیسے اب کہنے کو کچھ باقی رہا نہ سننے کو۔

''آپ نے مجھے بے خبر کیوں رکھا۔ آپ نہیں جانتے اس بات نے مجھے کتنا دکھ پہنچایا ہے۔'' اس کا دکھ اس کی آواز سے عیاں تھا۔

''اس وقت تمہیں میری ہر بات بے بنیاد اور ہر جواز بودا محسوس ہوگا لیکن سچ یہ ہے کہ میں تمہیں اختیار دینا چاہتا تھا۔ اپنی زندگی میں اپنے پسند کا ساتھی ڈھونڈنے کا مکمل اختیار...... اور یہ اسی صورت ممکن تھا جب، تم ہمارے درمیان ہر قسم کے رشتے سے بے نیاز ہو کے فیصلہ کرتیں...... میں نہیں چاہتا تھا کہ نا سمجھی کی عمر میں جو فیصلہ تمہارے لیے کیا گیا تھا، وہ بعدازاں تمہیں اپنے پیروں کی زنجیر لگنے لگتا...... میں صرف تمہیں آزاد رہنے دینا چاہتا تھا۔ ہر طرح کے فیصلے کے لیے مکمل آزاد......''

ان کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی مگر وہ پھر بھی تھک کے خاموش ہوگئے۔

کمرے میں ایک چبھن زدہ خاموشی در آئی۔

''میں زندگی بھر دو انتہائی رشتوں کے درمیان تنی رسی پہ بہت پھونک، پھونک کے چلا ہوں۔''

انہوں نے پھر بولنا شروع کیا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سننے گئی۔

''نہ میں تم سے ایسا برتاؤ رکھنا چاہتا تھا کہ تم مجھے باپ یا بھائی کے روپ میں دیکھنے لگو۔ نہ میں تمہارے اتنا قریب جانا چاہتا تھا کہ جذبات بہک جائیں۔ میں بس یہ چاہتا تھا کہ جب تم اپنے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے لگو تو دل و دماغ کی پوری رضامندی کے ساتھ کرو۔ نہ تمہارے دل پہ کوئی بوجھ ہو نہ احسان مندی کے جذبات۔ دو انتہائی رشتوں کے درمیان دوستی کے رشتے کو کسی اور سمت میں بھٹکنے سے بچانے کے لیے میں نے خود پہ بھی جبر کیا ہے آپی...... نہ جانے کب اور کتنی بار......''

وہ چونک گئی۔

''سچ تو یہ ہے کہ ہمارے درمیان ایک انتہائی نازک رشتے کی موجودگی کے باوجود میں نے ہمیشہ تمہیں صرف اور صرف ایک امانت سمجھا اور ایک امانت ہی کی طرح تمہاری حفاظت کی۔''

آپی نے اپنی آنکھیں زور سے بند کرلیں۔ شہریار کے منہ سے کسی نئے رشتے کا اعتراف سننا بھی اس کے لیے بہت مشکل تھا۔

''اب آگے تم پوری طرح آزاد ہو۔ جس طرح چاہے فیصلہ کرلو۔ کیا تم...... تم نے کسی سے کوئی وعدہ لیا ہے؟''

آپی نے خود کو شرمندگی کے گڑھے میں گرتا محسوس کیا۔ کیونکہ وعدے کے نام پہ اسے کوئی یاد آگیا تھا۔

''تم کمیٹڈ ہو؟''

''کسی کو پسند کرتی ہو؟''

''تمہارا کوئی یونی فرینڈ......؟''

وہ دل پہ پتھر رکھ کے بہت رسانیت سے سوال کر رہے تھے۔ جانتے تھے کہ کسی بھی قسم کی کوئی جذباتیت بھی آپی کو مزید توڑ پھوڑ سے دوچار کرسکتی ہے۔

''یقین کرو میں نہیں سمجھتا اس میں کوئی برائی ہے۔ اگر ایسا ہے تو تم......''

ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ آپی ایک دم پھوٹ، پھوٹ کے رو پڑی۔ وہ تاسف سے اسے دیکھتے رہے۔ اس وقت وہ اسے دلاسا دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ وہ روتی رہی اور روتے روتے ایک جانب لڑھک گئی۔

☆☆☆

گاڑی جانے پہچانے راستوں پہ تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ بالکل اس کی ذہنی رو کی طرح جو کبھی ایک سمت میں دوڑنے لگتی تو کبھی دوسری میں......

کبھی اس کے تصور میں شہریار کا چہرہ منڈلاتا اور کبھی جواد عرف جوڈی کا......

جوڈی ان کے فرینڈز سرکل کا سب سے ہینڈسم لڑکا تھا۔ جو بقول خود اس کے آبی کی اداؤں پہ بری طرح مرمٹا تھا۔ ابتدا میں تو آبی نے اسے اور اس کی حرکتوں کو نظر انداز کیا لیکن کب تک...... بالآخر وہ بھی اس کی سحر انگیز شخصیت کے سحر میں ڈوبتی چلی گئی۔

جوڈی اس سے ایک سال ہی سینئر تھا اور فائنل میں آنے کے بعد ہی اس نے آبی کو پرپوز کر دیا تھا۔ آبی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اس میں قابلِ اعتراض کوئی بات تھی بھی نہیں سوائے اس کے کہ اس کی کمپنی میں لڑکیوں کی ایک کثیر تعداد شامل تھی۔ صدف نے اس کا جھکاؤ دیکھ کے اسے اس معاملے میں خبردار کیا تھا۔

''جوڈی کوئی بہت قابلِ بھروسا لڑکا نہیں ہے آبی...... ایسا نہ ہو کہ تم اپنے جذبے کسی ناقدرے کی نذر کر دو۔''

''کم آن صدف ایسا نہیں ہوگا...... اور میں کون سا اس کے عشق میں مری جا رہی ہوں۔ اس نے پرپوز کیا مجھے کوئی خرابی نہیں لگی۔ ایک سال تک ہم ایک دوسرے کو جان لیتے ہیں اگر اسے میں ٹھیک نہیں لگی تو وہ بااختیار ہے اور اگر مجھے اس میں کچھ ایسا ویسا دکھا تو میں کک آف کر دوں گی۔''

اس وقت اس نے کتنے آرام سے یہ بات کی تھی اسے پتا نہ تھا بعد میں جوڈی اس کے گرد اپنی توجہ اور خوب صورت لفظوں کا ایسا جال بچھا دے گا کہ وہ اس میں پھنس کے رہ جائے گی۔ وہ صرف ایک شکاری تھا یا کھلاڑی...... جس نے آبی کی معصومیت اور نادانی سے فائدہ اٹھانے کا جو پلان بنا رکھا تھا اس، میں صرف آبی کی احتیاط پسندی کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو پایا تھا۔

اور آج آبی تمام باتوں سے بے خبر اپنے دل کی بات اس سے کرنے جا رہی تھی۔

☆☆☆

صبح کی دھوپ سنہری رنگ اوڑھ کے اس کی آنکھوں کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ سفید ٹین ٹاپ میں اس کا نازک سراپا کئی دن کے بخار کے باعث کمزور لگ رہا تھا۔ بڑے سارے کالر پہ لگا فرأڑ اُڑ کے اس کے زردی مائل رخساروں سے ٹکرا رہا تھا۔ لبوں پہ لگی ہلکی گلابی لپ اسٹک بھی اسے تروتازہ دکھانے سے قاصر تھی۔

جوڈی اسی کے انتظار میں تھا۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ بھی اسے دیکھ کے حیران ہوا۔ پھر اس کی بات سننے کے بعد تو شاکڈ رہ گیا۔

''تم نے تو مجھے حیران کر دیا ہے آبی؟''

''صرف حیران؟...... میں تو سخت پریشان بھی ہوں جوڈی۔''

وہ بنا کچھ بولے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''سچ تو یہ ہے کہ میرے اندر تمہارا سامنا کرنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔''

''کہتی تو تم ٹھیک ہو مگر میں اور لوگوں جیسا تو نہیں ہوں ناں کہ اس بات کا صرف تم ہی کو قصوروار ٹھہراؤں۔''

''لیکن...... اور لوگوں جیسے تو شہری بھی نہیں ہیں۔''

وہ بے خیالی میں بڑبڑائی۔

''اوکم آن بے بی! اب تم مجھے اس بڑے میاں سے مت ملانا۔'' آبی کو اس کا انداز ناگوار گزرا مگر چپ رہی۔ وہ خیر اتنے بزرگ بھی نہ تھے۔

''ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی، جب ان کو فیصلہ تم پہ ہی چھوڑنا تھا تو اتنے سال تمہیں نکاح میں کیوں رکھا۔''

آبی ایک دم سے چونک گئی۔ یہ سوال تو اس کے ذہن میں کبھی نہیں آیا تھا۔

''ضرور اپنا چانس بنانے کے چکر میں ہوگا۔ آخر پوری زندگی پالا پوسا ہے کچھ تو صلہ چاہیے ہوگا ناں۔''

آبی کو اس کی بات سے اتفاق نہیں تھا۔ مگر مخالفت کے لیے دلیل کہاں سے لاتی۔

''ایک بات بتاؤ مجھے سچ، سچ...... کبھی اس نے تنہائی میں...... میرا مطلب ہے...... اپنے رشتے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش تو نہیں کی۔''

جوڈی کو خود بھی پتا نہیں چلا کب اس کے لہجے میں

شک کے زہریلے ناگ سرسرانے لگے۔ لیکن آبی کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔

وہ بے ساختہ ان لمحوں کو یاد کرنے لگی جب وہ اور شہریار اکیلے اور ایک دوسرے کے قریب ہوتے تھے۔ انہوں نے تو اسے کبھی اس بات کا احساس نہیں دلایا کہ ان کے درمیان اس طرح کا بھی کوئی رشتہ ہو سکتا ہے۔

''ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔'' اس نے قطعیت سے نفی میں سر ہلایا۔

''تم کہاں کھو گئیں...... مانو یا نہ مانو...... وہ ادھیڑ عمر آدمی تمہیں اتنی آسانی سے نہیں چھوڑے گا۔''

''وہ مجھے چھوڑنا چاہیں گے ہی کیوں؟'' جوڈی کی باتوں نے اسے سوچ کی نئی سمتوں میں دھکیل دیا تھا۔ اب وہ اس سے زیادہ خود سے بات کر رہی تھی۔

''ایگزیکٹلی...... یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ ہمیں خود ہی اس سے جان چھڑانے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔''

اس کی جانچتی ہوئی نظریں آبی کے شفاف جسم کے طول و عرض ناپنے لگیں۔

''کیوں نہ ہم کچھ ایسا کریں کہ......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے بے حد قریب آبیٹھا۔

جب شکار خود چل کے آگیا تھا تو وار خالی جانے دینا بے وقوفی ہوتی۔

''ان کے پاس تمہیں چھوڑ دینے کے سوا کوئی راستہ نہ بچے......'' اس نے اپنی انگلیاں اس کے نرم رخسار پر پھیریں اور آبی جیسے ہوش میں آگئی۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو، ہوش میں تو ہو......'' آبی نے فوراً اٹھ کر اس سے دور ہونا چاہا مگر اس نے اس کا بایاں ہاتھ تھام لیا۔

''کیا غلط کہا ہے میں نے۔'' آبی نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ اب بھی حریصانہ نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

''یو آر رائٹ مسٹر جواد...... تم نے جو کہا ٹھیک کہا...... ان فیکٹ مجھے تو تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے...... وہ ایک الجھن جو کئی دن سے سلجھ نہیں رہی تھی۔ آج تم نے سلجھا دی۔''

''شہری نے مجھے اپنے ساتھ باندھ کے رکھا یقیناً تم جیسے بھوکے ہوس خوروں سے بچانے کے لیے۔''

''اگر اب بھی میں انہیں غلط سمجھتی رہی تو اُن کی امانت میں خیانت کر بیٹھوں گی۔'' اس نے ہاتھ چھڑایا۔

''امانت...... خیانت...... یہ کیا بکواس کر رہی ہو ڈارلنگ۔''

شکار کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کے اسے وقتی طور پہ سنبھلنا پڑا۔

''یہ بکواس نہیں حقیقت ہے۔ جس شخص نے اتنے برسوں حق حاصل ہوتے ہوئے مجھے امانت سمجھ کر رکھا، وہی امانت کا اصل حقدار ہے نہ کہ تم...... ایک تنہا لڑکی کے پاس آتے ہی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کسی کی بیوی ہے، منہ سے رال ٹپکنے لگی۔''

''مائنڈ یور لینگویج آبگینے! تنہائی میں مجھ سے ملنے تم خود آئی ہو...... میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ یہاں آؤ۔ ہم روز ملتے ہی ہیں۔''

''ہاں میں ملی تو بہت عرصہ ہوں تم سے مگر پہچانا آج...... افسوس کہ شہری کے سکھائے گئے بہت سے سبق بدگمانی کی دھند نے بھلا دیے تھے...... مگر اب یاد آگئے ہیں، بہت اچھی طرح......''

☆☆☆

واپسی کا سفر بہت رُلانے والا تھا۔ وہ ایک طرح سے جوڈی کی شکر گزار تھی کہ اس نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔

یہ بات واقعی قابلِ غور تھی کہ شہری اب تک اس کا انتظار کیوں کرتے رہے۔ وہ اس کی ہاں کے منتظر تھے جبھی ناں...... انہوں نے اسے اپنے اور اس کے رشتے کی سچائی کیوں نہ بتائی۔ وہ اس پر مسلط نہیں ہونا چاہتے تھے جبھی ناں......

اور وہ خود کیسی کم فہم اور نادان نکلی کہ ایک جسم کی بھوک کے ہاتھوں بے بس شخص کو اپنے پوتر جذبے سونپنے چلی تھی۔

''میری محبت اتنی ارزاں تو نہیں کہ کسی ایسے ویسے کے

ہاتھوں رل جائے۔ اسے تو کسی قیمتی بلکہ نایاب دل کا مکین ہونا چاہیے۔ اور وہ دل شہریار کے سوا کس کا ہو سکتا ہے۔''

اس نے گھر کی طرف گاڑی موڑتے ہوئے اپنے رخساروں کو بھیگتا اور لبوں کو مسکراتا محسوس کیا۔

☆☆☆

خزاں کی زرد روشاموں میں ٹنڈ منڈ درختوں کے چھدرے سائے میں بیٹھ کر ان کی خاموشی سے، زندگی کے حقیقی معنی کشید کرنا ان کا دل پسند مشغلہ رہا تھا۔

کبھی موسم بہار کی دل نوازیاں انہیں بھی بھاتی تھیں، دسمبر کا شاعری سے دل برماتے تھے۔ مگر گزرتے ہوئے چند برسوں میں انہیں اور ان کی گہری نیند جیسی زندگی کو کسمساتی ہوئی کروٹیں ایسے عطا کی تھیں کہ اب انہیں زرد کے سوا کوئی رنگ بھاتا ہی نہ تھا۔ پرخوش رنگ تتلیوں جیسے ایک وجود نے ان کے سانس لیتے جسم میں زندگی ڈال رکھی تھی۔ وہ جیتے اسی کے لیے تھے اور اب مر بھی اسی کی وجہ سے رہے تھے۔

آبگینے حیات واقعی ان کی حیات تھی اپنے پورے مفہوم کے ساتھ دل اور دماغ میں روشن......

اس نے ہمیشہ ان کا نام لیا پر کبھی ان کا اور اپنا رشتہ پہچاننے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے لیے دنیا میں ایک ہی شخص سے اس کا رشتہ تھا اور اس کے لیے کافی تھا وہ رشتہ اور اس کی حقیقت کیا تھی اسے جاننے سمجھنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

انہوں نے بہت چاہا کہ کبھی کسی کمزور لمحے میں اپنی چاہت کا اقرار کرلیں اور اظہار کردیں...... لیکن اس کے بچپنے اور نوعمری نے انہیں بے تکلفی کی ایک خاص حد پہ روکے رکھا۔

وہ دل کے لاکھ چاہنے پر بھی اپنی طرف چکراتی اس کی معصوم محبت پر ادراک کے در وا نہیں کرسکے۔ وہ سامنے منزل کے ہوتے ہوئے بھی سماج اور مجبوریوں کے پتھریلے راستے پر سفر کرنے پہ مجبور تھے۔ شاید یہی ان کا نصیب تھا اور ابھی اور کتنا سفر باقی تھا وہ قطعی انجان تھے۔

معاً بیرونی دروازہ کھلا اور آپی کی گاڑی اندر داخل ہوئی۔ وہ ارد گرد سے اتنے بے خبر تھے کہ اندازہ ہی نہیں ہوا کب وہ ان کے برابر میں آکر بیٹھ گئی۔

''کیسے سوچ رہے ہیں؟''

آواز سن کر چونکے، آنکھیں کھول کر اسے دیکھا پھر بے ارادہ بول اٹھے۔

''تمہیں۔''

''کیا؟''

''یہی کہ شاید تم سے رشتہ جوڑ کر اور پھر تمہیں...... بے خبر رکھ کے میں نے زیادتی کردی تمہارے ساتھ۔'' آج ان کے انداز میں کوئی جھجک نہیں تھی۔ ایک مشکل لمحہ آکے گزر چکا تھا۔ اب بات کرنا نسبتاً آسان تھا۔

''شاید تمہیں شفاف اور خالص بنانے کے چکر میں، میں وہ کر گیا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''آپ نے جو کیا ٹھیک کیا۔ میرے ساتھ، میرے لیے۔ مجھے...... میری محبت اور جذبوں کو شفاف رکھنے کے لیے۔ آپ اپنے دل میں اپنی خالص محبت چھپائے پھرتے رہے۔ اپنے پاکیزہ جذبے بے وقعت نہیں ہونے دیے۔ آپ نے کہا تھا ناں کہ آپ نے مجھے امانت سمجھا۔''

اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا تو انہیں لگا جیسے...... بے تحاشا روشنیاں ان آنکھوں میں اتر آئی ہوں۔

''آپ نے امانت کی حفاظت کرکے اپنا فرض ادا کردیا اور ایسے فرض شناس کا حق ہے کہ اس کی امانت اسی کو لوٹائی جائے۔ مجھے کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میرے جذبے بھی ایک امانت ہیں اور اپنے امین کے پاس لوٹ آئے ہیں۔ ایسی خالص اور کھری محبت کے لیے ایک سچے دل سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں۔''

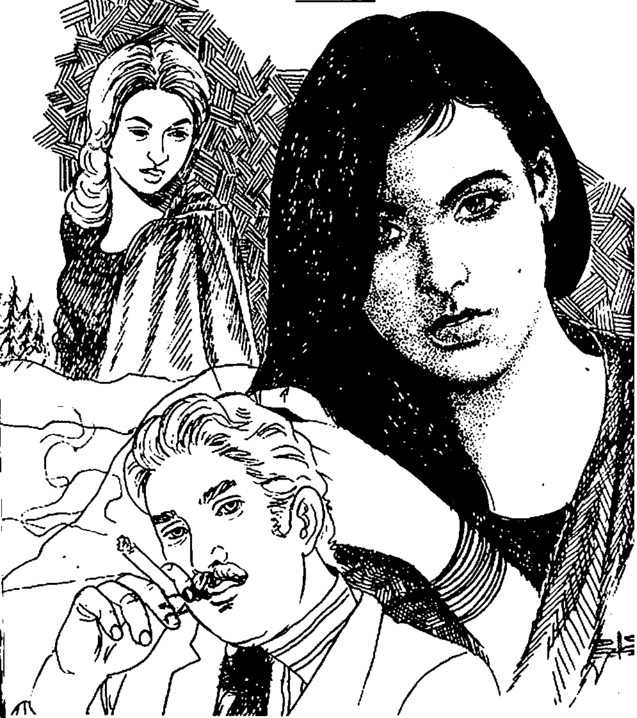
سینے میں عرصہ دراز سے رکی ہوئی سانس خارج ہو کر روح تک کو ہلکا کر گئی۔

انہوں نے طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔ آپی کے ہاتھ کا لمس ان کے ہاتھ پہ جاگ رہا تھا۔ آج انہیں اپنا ہاتھ ہٹانے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں خود کو کہیں رکھ کر بھول بیٹھی ہوں
کہاں؟
کچھ یاد نہیں شاید
تکیوں کے غلافوں میں یا شاید
الماری کی درازوں میں یا پھر
پرچھتی کے گلاسوں میں یا پھر
شیلف پر رکھی کتابوں میں...... یا...... یا
ڈائری کے اوراق میں

میں خود کو کہیں رکھ کر بھول بیٹھی ہوں

رخ چوہدری



کہاں رکھا تھا میں نے خود کو کچھ یاد نہیں مجھ کو
کہاں کھو دیا میں نے خود کو
کہاں انگلی چھوٹ گئی خود سے
کچھ یاد نہیں
یا شاید بچپن کی گلیوں میں بھولی ہوں خود کو
یا
لڑکپن کی شوخیوں میں کھو دیا خود کو
یا
پھر جوانی کے خوابوں میں
کہاں رکھا تھا میں نے خود کو کہاں ڈھونڈوں میں خود کو
باپ کی محبت میں، ماں کی ممتا میں
یا
پھر ساجن کی آنکھوں میں......
کہاں، کہاں ہوں میں......
کہاں رکھ کر بھولی ہوں میں خود کو
کچھ یاد نہیں مجھ کو

وہ ایسی ہی تھی عام سی لڑکی نام کی ہالہ آنکھوں میں بے شمار خواب سجائے وہ تعبیر کے پنکھ لگائے تکمیل کے آسمان پر پرواز کرنا چاہتی تھی، اپنے ارادوں کی چوٹیوں کو سر کرنا چاہتی تھی۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے صبر کی چاکلیٹ تھما دی جائے اور کہا جائے تمہیں ایسے نہیں ویسا کرنا ہے' یہ نہ کرو، وہ کرو جو ہم نے کہا ہے وہ کرو مگر وہ تو وہ کرنا چاہتی تھی جو وہ کرنا چاہتی تھی جو اس کا دل کرنا چاہتا تھا۔

لیکن ہوا کیا، زندگی کی شاہراہ پر گزرنے والا ہر پل اس سے اس کا اپنا پن چھینتا چلا گیا۔ اور وہ اپنی ہی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی...... اور اسی تلاش میں وہ جانے کب بچپن کی گلیوں میں جا نکلی۔

اس کے ابا حسام الدین کوئی رئیس آدمی نہیں تھے مگر پرکھوں کی طرف سے ورثے میں ملنے والا گھر بہت اچھا اور بڑا تھا۔ بڑے سے آنگن میں آم اور جامن کے بڑے، بڑے درخت تھے اور نیم کا بڑا سا درخت جس کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے دادی کا تخت بچھا تھا۔ جس پر بیٹھ کر وہ اپنی بہوؤں پر کڑی نگاہ رکھنے کے بعد کڑی تنقید بھی کیا کرتیں اور خالی بے جا تنقید ہوتی۔ کم از کم ہالہ کو تو ایسا ہی لگتا تھا ایک دن اس نے پوچھ بھی لیا۔

''دادی جان! آپ ہر وقت اماں اور چاچی کو ڈانٹتی کیوں رہتی ہیں جب وہ اچھا کام کریں تب بھی۔''

تب دادی جان نے اپنی نظر کے موٹے، موٹے شیشوں والی عینک کو کھسکا کر ناک کی نوک تک گھسیٹا اور پان کو کتھے، چونے سے سجاتے ہوئے یوں کہا گویا اس کا سوال بھی اتنا ہی غیر اہم ہو جتنا وہ اپنی بہوؤں کو سمجھتی ہیں۔

''یہ ڈانٹ پھٹکار، یہ روک ٹوک عورت کا مقدر ہوتی ہے تب ہی تو نسل در نسل عورت کو ورثے میں ملتی ہے۔ مجھے میری بزرگ عورتوں نے یہ سب ورثے میں دیا میں اب تمہاری ماں، چاچی کو اور یہ تم لوگوں کو ورثے میں دیں گی یہ سب اور پھر تم...... بیٹا یہ سلسلہ تو چلتا ہی رہے گا تا حیات......''

کتھے، چونے اور چھالیا سے بھرا پان دادی جان نے دائیں طرف گال میں دبا دیا کیونکہ گزرتے ہوئے ماہ و سال نے اسی طرف چند دانت چھوڑے تھے۔ یہ تو دادی جان کے منہ کے اندر کا احوال تھا جس سے آٹھ نو سالہ ہالہ کو کچھ خاص سروکار بھی نہیں تھا۔ اسی لیے دادی جان کی طرف سے ملنے والے چھالیا کے چند دانے منہ میں ڈال لیے مضبوط دانتوں کی زد میں آکر پسنے والی چھالیا کی آہ و بکا دادی جان کو بھی سنائی دے رہی تھی مگر ہالہ کا دماغ وہیں اٹکا ہوا تھا۔ آخر کار دادی جان بھی عورت تھیں مگر وہ اماں اور چاچی کی شکایات ان کے شوہر حضرات کے سامنے لگانے کو اپنا سرکاری منصب سمجھتی تھیں اور یہ ہی بات ہالہ کو کبھی ہضم نہیں ہوئی تھی۔

''کیوں! دادی جان آخر کیوں؟'' ہالہ کو اللہ تعالیٰ نے حساس دل اور نازک سوچ دی تھی شعور میں قدم رکھتے ہی اسے غلط کیا ہے، صحیح کیا ہے محسوس ہونے لگا۔ وہ رشتوں اور رویوں کو سمجھنے لگی تھی ابا اور چاچا کا اپنی، اپنی بیوی سے غلط بات بھی منوالینا اور ان کا اپنی چاہت اور مرضی کے نہ ہوتے ہوئے بھی خوش دلی سے وہ کام کر لینا شاید یہ بھی ان کا عورت پن تھا۔ یا شاید اس قربانی کے پیچھے یہ مقصد تھا کہ زندگی کی یہ ریل جو رشتوں سے بھری ہے بغیر کسی خرابی یا رکاوٹ کے چلتی رہے۔ اور شاید یہ ہی وجہ تھی کہ گھر میں ابا اور چاچا کی سخت گیری کا راج تھا مگر اماں اور چاچی کے صبر اور ضبط کی وجہ سے کوئی فساد کھڑا نہیں ہوتا تھا۔ گھر میں امن اور سکون کی فاختہ دانہ چگتی نظر آتی تھی۔ ویسے تو سب ٹھیک تھا کسی کو کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ سب کی طرح ہالہ کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ ہالہ تو 'اختلاف' 'اعتراض' کیا چیز ہیں وہ تو ان سے ناواقف تھی...... مگر جب سے ہالہ کے دماغ میں سوچ نامی چیز نے جنم لیا تھا وہ بھی اختلاف پر تن کر کھڑی ہو جاتی۔ اور اب بھی یہ ہی ہوا تھا کہ ہالہ کیوں کا سوال نہیں کرنا چاہتی تھی مگر 'ہالہ بی' نے ''کیوں آخر کیوں'' کہہ کر دادی جان کے لیکچر کو آواز دے دی تھی۔

''وہ اس لیے بٹی کہ عورت کو ایک نسل پیدا کرنی ہوتی ہے، بنانی سنوارنی ہوتی ہے تاکہ وہ معاشرے میں ایک اچھا شہری دے سکے اور اس کا بیٹا یا بیٹی عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں۔ اور اسے ایسا کرنے کے لیے سب سے پہلے ''اپنے پن'' کی قربانی دینے پڑتی ہے۔ اپنی مرضی' اپنی پسند ناپسند اپنی، خوشی، اپنا آرام سکون سب قربان کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ اس کا گھر آباد رہے اس سے وابستہ تمام رشتے خوش اور پُرسکون رہیں...... یوں سمجھ لو بیٹا عورت قربانی کا دوسرا نام ہے جو ہر عورت دیتی ہے اور دینی بھی چاہیے۔''

''اُف...... دادی جان کی اتنی بڑی باتیں میری چھوٹی سی عقل میں نہیں آتیں۔ چلو ہالہ اٹھو۔''

ہالہ کے اندر کی باغی ''ہالہ بی'' نے اکتا کر کہا لیکن تھی تو ایک عورت ہی ناں سو اندر کی آواز کو دبا کر عقیدت مندی سے دادی جان کی باتیں سنتی رہی اور سمجھنے کی کوشش بھی کرتی رہی۔ اس نے دادی جان کا دور تو نہیں دیکھا تھا مگر اماں اور چچی کو تو وہ دیکھ ہی رہی تھی۔

اس دن خاندان میں کسی کے ہاں شادی پر جانا تھا۔ چچی چونکہ خوب گوری چٹی تھیں تو گہرے، گہرے رنگ پہنتی تھیں اس روز... سیاہ رنگ کی تاروں بھری ساڑی اور سلور زیور زیب تن کر کے بڑے ارمانوں سے وہ تیار ہوئیں تو بہت حسین لگ رہی تھیں اور تو اور خود دادی جان نے ان کی بلائیں لے لی تھیں مگر کیا ہوا چچا جان نے جو دیکھا تو غصے سے سب کے سامنے چچی جان کو ڈانٹ دیا اور جب دادی جان نے چچی جان کی حمایت میں چند الفاظ کہہ دیے تو چچا جان نے ماں کو بھی سختی سے جواب دے کر چپ کروا دیا تھا۔

''اماں جان! آپ نے اپنی ساری زندگی ابا جان کی پسند کے مطابق گزاری جبکہ ہم جانتے ہیں بہت سی باتیں آپ کو سخت ناپسند ہوتی تھیں مگر ابا کی خاطر آپ سب کچھ کرتیں...... اب ہاجرہ جانتی ہیں کہ مجھے یہ سب پسند نہیں تو کیوں انہوں نے ایسی ساڑی پہنی اور اتنا میک اپ کیا۔''

''آپ! ناراض نہ ہوں جی...... میں ابھی تبدیل کر لیتی ہوں۔'' چچی منمنائیں۔

''کیوں! کیوں......'' اس روز ہالہ کے اندر کی ''ہالہ بی' خوب چیخی چلائی تھی کہ چچی جان کتنی اچھی لگ رہی تھیں اور بجائے تعریف کے چچا نے سب کے سامنے ان کی تذلیل کر دی صرف اس لیے کہ ان کو یہ سب پسند نہیں تھا اب چچی کو ساڑی، میک اپ بے حد پسند ہے تو ہوا کرے چچا کو تو اپنی پسند دیکھنی تھی ناں۔ اسی طرح کے غیر متوازن رویے ہالہ بی کو کوفت کا شکار کر دیتے تو وہ ہالہ سے الجھ پڑتی تو۔ وہ اسے مسکرا کر یہ سب برداشت کرنے کا مشورہ دیتی کہ یہ بھی رسم وفا ہے نبھاؤ گی تو جی پاؤ گی مگر ہالہ بی تن کر اپنے عزائم ایسے بتاتی کہ وہ محکوم زندگی نہیں جیے گی اپنی پسند اور اپنی مرضی کی زندگی جیے گی ہالہ تب بھی مسکرا دیتی شاید اس کے بھولپن پر یا اپنی بے بسی پر......

ہالہ بی بہت خود سر تھی وہ اپنی مرضی، اپنی پسند کے تحت چلنا چاہتی تھی، وہ مخالف کو باور کرانا چاہتی تھی کہ

اس کی بھی حیثیت ہے......اس کا بھی وجود ہے......وہ بھی اپنی خوشی اور پسند کی سلطنت پر راج کرسکتی ہے اور یہیں ہالہ کا ہالہ بی سے اختلاف رائے ہوجاتا۔

''اماں! ابھی نہیں آسکتی ''ان'' کو چھٹی نہیں مل رہی۔'' اس روز دادی جان کی طبیعت سخت خراب تھی اور انہیں بیٹی کی یاد ستا رہی تھی مگر بیٹی نے صاف چٹ انکار کردیا تھا۔

پورا کنبہ جانتا تھا کہ اس گھر کے اکلوتے داماد کتنے اکڑفوں والے ہیں......شادی کو پندرہ سال ہوگئے تھے مگر مجال ہے جو سلطانہ پھپو نے کہا ہو کہ انہوں نے کوئی کام اپنی مرضی......یا اپنی خوشی سے کیا ہو۔

''عابد کو یہ پسند ہے، عابد کو وہ پسند ہے......عابد......عابد اور بس عابد......''

''اُف! ہالہ بی بند بھی کرو یہ عابد نامہ ہم کوئی اور بات بھی تو کرسکتے ہیں ناں......'' اس نے پھر اپنے اندر کی آواز دبائی۔ وہ شعور کی اولین سیڑھی پر چڑھتے ہی شاید کچھ زیادہ ہی سمجھدار ہوگئی تھی اگرچہ اس کے اندر بیٹھی ایک ''ہالہ بی'' اسے کچوکتی رہتی مگر وہ ان آوازوں کو ہر ممکن دبانے کی کوشش کرتی۔

اب وہ میٹرک کے امتحانات سے فارغ تھی اور بس چند ہی مہینے تھے کہ وہ بھی کالج جاتی اور سہیلیوں کے ساتھ کالج لائف انجوائے کرتی۔ وہ حد درجہ خوش بھی تھی مگر انجانے اندیشوں کا شکار بھی معلوم نہیں ابا اسے اجازت دیتے بھی یا نہیں اس لیے کہ......اماں نے تو صاف، صاف کہہ دیا تھا۔

''نہ بی بی نہ کالج میں داخلے کی اجازت دینا میرے دائرۂ اختیار سے باہر ہے اپنے ابا کی عدالت میں جاؤ اجازت دے دیں......تو تمہاری خوش بختی نہ دیں تو تمہارا مقدر......''

ہالہ کو سو فیصد یقین تھا کہ ابا داخلے کی اجازت نہیں دیں گے اور ہوا بھی وہی، کالج میں داخلے کا معاملہ جب ابا کی عدالت میں پیش کیا گیا تو عین حسب توقع جواب ملا تھا۔

''کوئی ! ضرورت نہیں مزید تعلیم کی، میرے نزدیک لڑکیوں کے لیے میٹرک تک تعلیم مناسب ہے اردو پڑھنا، لکھنا آگئی، قرآن پاک ترجمے اور تفسیر کے ساتھ پڑھ سکتی ہے اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے۔

اب بات تو ابا کی بھی بڑی وزن دار تھی، ایک عام گھریلو لڑکی......جس کے نوکری کرنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ نہ ہی ملکی حالات سنبھالنے کی ذمے داری کی فکر کرنا تھی' نہ ہی سائنس دان بن کر کچھ نئی چیز دریافت یا ایجاد کرنا تھی جب ان تمام باتوں میں سے کچھ نہیں کرنا تھا تو میٹرک تک کی تعلیم ہی کافی تھی......اب اماں چونکہ ابا کی بے دام کی غلام تھیں ساری زندگی ''جی حضوری'' میں گزار کر بھی پریشان ہوتی پھرتیں کہ کہیں حکم عدولی تو نہیں ہوگئی اس لیے ابا کے فیصلے سے انہیں کوئی اختلاف تو......نہیں تھا مگر وہ بیٹی کی شدید خواہش بھی جانتی تھیں۔ ڈرتے ڈرتے ابا کے جلالی چہرے پر نظر ڈالی جہاں سکون تھا اپنے فیصلے کے درست ہونے کا یقین تھا۔ قطعیت اتنی کہ گویا اختلاف کی گنجائش کا امکان بالکل نہیں تھا۔

''اماں! جان میں جانتی ہوں ابا کا جو فیصلہ ہوگا مگر......مگر اماں جان آپ ابا جان کے یہ ضرور گوش گزار یے گا کہ کالج جا کر تعلیم حاصل کرنا میری شدید ترین خواہش ہے۔'' ہالہ کی خواہش کی بازگشت نے ممتا کے حوصلے کو بلند کیا تو وہ آہستہ سے گویا ہوئیں۔

''جی! آپ کی بات سو فیصد درست اور مناسب ہے مگر......مگر ہالہ کی بہت خواہش ہے کہ وہ کالج میں داخلہ لے......ڈھیر سارا پڑھے اور......'' اماں نے اپنی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ابا کے چہرے کی سختی میں اضافہ دیکھ لیا تھا، وہ وہیں چپ ہوگئیں، الفاظ نے خود منہ سے نکل کر بے مایہ ہونے سے انکار کردیا تھا۔

''اچھا! تو اب ہمارے فیصلے اور حکم پر بیٹی کی خواہش کو معتبر سمجھا جائے گا۔'' ابا کے چہرے کے طیش اضافہ ہوا تو تپش اماں نے اپنے دل پر محسوس کی۔

''نہیں جی نہیں! ایسا نہیں ہے، فیصلے تو آپ ہی

کے معتبر اور مقدم رہیں گے......بس یوں ہی کہہ دیا تھا کہ کالج میں داخلے کا ہالہ کا بچپن کا شوق ہے۔ اب جب آپ کو پسند نہیں......تو حکم عدولی کی اس کو بھلا مجال کہاں......''

اب اماں چونکہ ماں تھیں، بیٹی کی شدید خواہش کے پوری نہ ہونے پر اِک کسک تو دل میں اترتی انہوں نے بھی محسوس کی تھی مگر دوسری طرف وہ ابا سے بھی متفق تھیں کہ میٹرک تک تعلیم بہت ہے گھریلو لڑکی کے لیے......عورت کو صرف بحالتِ مجبوری گھر سے باہر نکلنا چاہیے جب کوئی مجبوری نہیں ہے تو بلاوجہ کیوں.. نامحرموں کی دنیا میں نکلے۔ اب چونکہ ابا اور اماں کی بات درست تھی اس لیے ہالہ نے بچپن کے اس خواب کو اس خواہش کو دل کے قبرستان میں جہاں اور بھی..... بے شمار......چھوٹی بڑی خواہشات کی قبریں تھیں اسے بھی وہیں دبا کر دل میں اٹھنے والی ٹیسوں کو نمکین پانی میں بدلنے سے پہلے صبر کی موٹی سی چادر میں جذب کیا.... سمجھوتے کی بکل ماری اور فرمانبرداری کا جھومر ماتھے پر سجائے خاموش ہوگئی مگر ہالہ بی نے خوب واویلا مچایا خوب روئی چلائی۔

''کتنا! شوق تھا مجھے کالج جانے پھر یونیورسٹی جانے، ڈھیر ساری ڈگریاں لینے کا، ڈھیر سارا علم حاصل کرنے کا......مگر......مگر تم نے چپ چاپ ابا کا یہ فیصلہ بھی مان لیا......تم، تم احتجاج کیوں نہیں کرتی ہو ہالہ...... آخر کالج میں داخلے پر ابا کو اعتراض کیوں ہے۔''

''ہالہ بی! ابا کو اعتراض کیوں ہے......یہ مجھے معلوم نہیں......میں صرف یہ جانتی ہوں کہ ابا کو لڑکیوں کا کالج، یونیورسٹی جانا پسند نہیں، رہی بات چیخنے چلانے یا احتجاج کی تو......اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں کیونکہ میں جانتی ہوں ایک طرف تو میں گستاخ قرار دی جاؤں گی دوسری طرف اماں جان کی تربیت اور پرورش پر حرف آئے گا......اسی لیے سمجھوتے ہی میں عافیت سمجھتی ہوں اپنی بھی اور اماں کی بھی......''

''کیوں! ہالہ کیوں، سارے کالج، یونیورسٹیاں لڑکیوں سے بھرے ہوئے ہیں......مگر ایک ہمارے ابا ہی کو علم سے دشمنی ہے۔ تم......تم ابا سے بات کرو داخلے کی۔'' ہالہ بی کسی طور مطمئن نہیں ہو رہی تھی ہالہ بھی اس نہج تک آگئی کہ ہاں ابا سے اگر بات کی جائے تو......لیکن نہیں، دنیا چاہے اِدھر کی اُدھر ہوجائے ابا اپنی بات سے نہیں ٹلیں گے دادی جان کہا کرتی تھیں۔

''میرا! حسام تو بادشاہی مزاج رکھتا ہے اپنی بات منوانے پر یقین رکھتا ہے، اس کے ابا ایسے ہی تھے ساری عمر ہر بات اپنی ہی منوائی۔''

''کیوں! آخر کیوں ہالہ......کیوں۔''

ہالہ اِک گہری سانس لے کر سراپا احتجاج ''ہالہ بی'' کو دیکھتی اپنی خواہشات کی طرح ادھوری سی مسکراہٹ کے ساتھ چپ رہتی کیونکہ احتجاج کرکے وہ اپنی خواہشات کو بے مول کرنا نہیں چاہتی تھی......اور سمجھوتے کا یہ فلسفہ ہالہ بی کو سمجھ نہیں آتا تھا۔ اسی لیے تو بے چین روح کی طرح بھٹکتی رہتی یہاں وہاں...... بہت دن تک خاموش رہتی...... ہالہ سے اس لیے ناراض رہتی کہ وہ بولتی نہیں تھی' احتجاج کرکے اپنی بات منواتی نہیں تھی......اور ہالہ اپنی بات گنوانے سے ڈرتی تھی۔ ہر چند کہ ہالہ کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ وہ بھی ریگولر اسٹوڈنٹ کی طرح کالج، یونیورسٹی جا کر......مگر اسے یہ حق تو نہیں دیا گیا لیکن اس نے پرائیویٹ انٹر کرلیا پھر بی اے کی تیاری کرنے لگی۔

''اب! تو خوش ہوناں ''ہالہ بی'' میں نے انٹر اتنے اچھے نمبروں سے پاس کرلیا ہے اور اب بی اے بھی کرلوں گی، انشاء اللہ......'' اس نے آئینہ دیکھتے ہوئے خود کلامی کی مگر ہالہ بی اس کے ایسے ہی کئی سمجھوتوں پر مسکرا کر رہ جاتی۔

''تم! مانو......یا نہ مانو ہالہ بی...... سمجھوتا تو عورت کا مقدر ہے......وہ سلیم بھیا یاد ہیں ناں...... وہی چھوٹی خالہ کے دیور کے بیٹے جو گئے تو خیر سے اعلیٰ تعلیم کے لیے تھے لندن......ڈاکٹری کی ڈگری کے ساتھ، ساتھ وہ ایک عدد فرنگن کو بھی دلہن بنا کر لے

آئے تھے۔ کتنی حسین تھیں...... ''چینی بھابی......'' مگر ہمارے ہاں کے لوگوں نے ان کی زندگی عذاب بنا دی۔ وہ محبت میں سب کے رویے برداشت کرتی چلی گئیں، اسلام قبول کیا، مشرقی رنگ میں رنگ گئیں سسرال کے تابع ہوگئیں۔ کیا...... کیا کچھ نہیں ہوا ان کے ساتھ...... مگر وہ شوہر اور بچوں کے لیے سب کچھ برداشت کرتی چلی گئیں...... اور سلیم بھیا کی وفاداری دیکھو...... ''چینی بھابی'' کی قربانیوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھ گئے...... دوسری شادی کرلی۔ اور اب وہ اپنی پاکستانی بیوی کے ساتھ لندن میں رہتے ہیں اور ان کی لندن والی انگریز بیوی تین بچوں کے ساتھ یہاں رہتی ہے...... مان لو ہالہ بی کہ عورت مشرق کی ہو یا مغرب کی سمجھوتا اسی کو کرنا پڑتا ہے۔ بس انداز سب کے اپنے، اپنے معاشرے کے حساب سے ہوتے ہیں۔'' آج ہالہ بی کو اس نے قائل کر ہی لیا تھا۔ سمجھوتا نہ کرتی تو کیا کرتی۔ اندر کی ہالہ بی کی باتوں سے کبھی، کبھی دل چاہتا کہ وہ بغاوت کر جائے لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس نے ایسا کچھ کیا تو اماں کی تربیت پر حرف آئے گا اور وہ یہ ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ ہر چند کہ ''ہالہ بی'' پابندیوں کی اس جیل سے ہر وقت فرار چاہتی تھی...... مگر ہالہ نے اس کی بغاوت کو اپنی مٹھی میں قید کر رکھا تھا اور وہ یہ مٹھی کبھی ڈھیلی نہیں چھوڑتی تھی، اب یہ الگ بات تھی کہ وہ بھی وہی چاہتی تھی جو ہالہ بی چاہتی تھی۔

''ارے! خالدہ بی یہ کیا کر دیا تم نے...... ہالہ کی قمیص کی آستین ہاف کیوں سی ڈالی، باپ بھائیوں نے دیکھ لیا تو اسے بعد میں مجھے پہلے باتیں سنائیں گے ...... ہائے، ہائے اتنی اچھی......''

اماں، خالدہ بی جو کہ خیر سے درزن تھیں پر برس پڑیں کیونکہ آستین ہاف سل گئی تھی جو دیکھ کر ہالہ اور ہالہ بی تو کھل اٹھی، ایک عرصے سے خواہش تھی کہ ہاف آستین والی شرٹ پہنے مگر ابا اور بھائیوں کے ڈر سے وہ کہہ نہ پاتی اور نہ اماں کو خیال آتا کہ اس کا کپڑا سلواتے وقت اس سے اس کی پسند ناپسند پوچھ لیں۔ اب درزن نے جو اماں کو جلال میں دیکھا تو جھٹ کڑ کڑ چھالیا دانتوں میں دباتے ہوئے انگلی پر لگا کتھا چاٹا اور اپنی غلطی کو بہو کے کھاتے میں ڈال دیا۔

''اری نوج بیگم آپ تو بلاوجہ آپے سے باہر ہو رہی ہیں ایک تو یہ کہ کپڑا کم تھا...... پوری آستین بن کے نہیں دے رہی تھی اور دوسری بات یہ کہ میری موئی نظر اب بہت کمزور ہوگئی ہے کام اب بہو کرتی ہے اور تم جانو...... لڑکیاں، بالیاں آج کے دور کی ہیں اور نئے فیشن کے بھی کپڑے سیتی ہیں۔''

''ارے بھاڑ میں گیا فیشن خالدہ بی...... کپڑا کم تھا تو تم واپس لے آتیں، نہ سیتیں اور ویسے سچ بات یہ ہے کہ کپڑا پورا تھا۔ ہاں بہت زیادہ نہیں تھا مگر کم بھی نہیں تھا کہ آستین ہی نہیں بن پاتی۔''

اماں تو خوب برس رہی تھیں بی درزن پر، وہ بھی ڈھٹائی سے سن رہی تھی۔

''ہالہ! اس سے پہلے کہ اماں شرٹ بوا کو دے دیں اچک لو......'' ہالہ بی نے عین من پسند بات کی تو ہالہ نے بھی بلا تاخیر اماں کے ہاتھ سے چھین لینے والے انداز میں اچک لی۔

''جانے دیں ناں اماں جان، اتنا قیمتی کپڑا ہے مانا کہ آستین چھوٹی ہے مگر اب پیسے برباد تو نہیں کرنے ناں...... اب نوٹ درختوں پر تو لگتے نہیں کہ توڑ، توڑ کر برباد کیے جائیں...... اب سل گئی ہے تو میں پہن لوں گی......'' ہالہ ہاف آستین والی سرخ اور فیروزی پھولدار شرٹ پہننے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ اس کی معمول کے ڈھیلے ڈھالے ناپ سے قدرے تنگ ہاف آستین والی شرٹ کتنی اچھی لگ رہی تھی، ہالہ مچل، مچل گئی اسے زیب تن کرنے کے لیے۔ چشم تصور میں اس نے شرٹ پہن کر بھی دیکھ لی تھی کتنی حسن اور اسمارٹ لگ رہی تھی وہ اس شرٹ میں...... مگر وہ جلد ہی تصور سے کھینچ لی گئی۔

''دماغ! خراب ہوگیا ہے ہالہ تمہارا، اتنی چھوٹی

آستین والی شرٹ پہن کر گھومو گی تو تمہارا ابا وا تو مجھے گھر ہی سے نکال دے گا۔ لو...... خالدہ بی یہ قمیص اپنی بہو ہی کو دے دو، وہ ہی نئے فیشن کے آستین پہن لے...... میری ہالہ آج تک سات پردوں میں رہی ہے آئندہ بھی رہے گی۔'' چلو جی چھٹی ہوئی اماں نے وہ شرٹ جو درزن کی غلطی سے ہالہ کی پسند کے سانچے میں ڈھل کر سل گئی تھی۔ چھوٹی آستین کی وجہ سے درزن کو ہی تھما دی...... اور ہالہ کی ایک اور خواہش اپنی موت آپ مرگئی تو ہالہ بی نے رو، رو کر آسمان پر سر پر اٹھالیا۔

''اُف...... ہالہ بی چپ بھی کر جاؤ...... تمہاری مسلسل ریں، ریں سے میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔''

''اور! جو حسرتِ ناتمام کو دفناتے ہوئے میرا دل جو شدت ضبط اور شدتِ درد سے پھٹا جا رہا ہے...... اس کا کیا؟ کیوں آخر کیوں...... ہالہ تمہاری ہر خوشی ہر خواہش کا گلا کیوں دبا دیا جاتا ہے...... کتنا شوق تھا، ارمان تھا مجھے ہاف آستین والی شرٹ پہننے کا...... لحاظ و ادب کے مارے کہہ نہ پائی اب جبکہ غلطی سے سل گئی تو...... تو اماں نے تنہائی میں بھی پہن کر شوق پورا نہیں کرنے دیا...... کوئی حد ہوتی ہے کسی بات کی 'یہ کیسا قانون ہے کیسا...... انصاف ہے کہ انسان اپنی پسند سے ایک سانس بھی نہ لے سکے...... مجھے کالا رنگ پسند ہے مجال ہے جو آج تک مجھے یہ رنگ پہننے کی اجازت دی ہو کہ جی یہ نحوست کی علامت ہے، کالا رنگ ابا کو پسند نہیں...... فیشن کی دنیا میں کتنے ہی فیشن آتے ہیں جاتے ہیں...... مگر یہ سب ہمارے لیے نہیں، ہم تو ہیں پابند سلاسل...... ہمیں تو سانس بھی آہستہ اور احتیاط سے لینی ہے...... اور...... اور...... ہالہ تم دیکھنا۔'' یہ تو ہر وقت کا رونا تھا ہالہ...... کی فرمانبرداری اور ہالہ بی کی من مانی ہر وقت ہی گتھم گتھا رہتی۔

''تمہاری! یہ فرمانبرداری ایک دن ختم کر دے گی تمہیں بھی اور مجھے بھی۔''

''اچھا ہے ناں ہر وقت کی کل، کل ہی ختم ہو جائے گی۔''

ہمیشہ کی طرح اس نے جل کر سوچا اور منہ لپیٹ کر سوگئی۔

☆☆☆

کسی کے حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں وقت کا پرندہ اپنی پرواز جاری رکھتا ہے، ہالہ نے پرائیویٹ بی اے کرلیا تھا ساتھ، ساتھ اماں بیگم نے امور خانہ داری سلائی، کڑھائی میں بھی اسے ماہر کر دیا تھا۔ ابھی معذلت نہیں آیا تھا ہاں البتہ سلطانہ پھپو کی بڑی بیٹی آسیہ کی شادی خانہ آبادی کا جو بلاوا آیا تو جیسے...... خاندان بھر میں ہلچل مچ گئی۔ ہر کوئی اسی شادی کے تذکرے اور تیاری میں معروف نظر آتا...... ہالہ اور اس کی چچازاد بہنیں ہر وقت کپڑوں کی تیاری میں الجھی رہتیں...... خاندان کی پہلی شادی تھی ہر کوئی خوب سے خوب تر نظر آنا چاہتا تھا خاص کر لڑکیاں......

''بھئی...... لڑکیوں تم لوگوں کو رسموں کے جوڑوں کے لیے پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں، بھائی صاحب نے ہر لڑکی کے لیے ہر رسم کے جوڑے کر تیار کروا لیے ہیں۔ آؤ دیکھ لو......'' چچی جان نے ایک، ایک کر کے جوڑے دکھانے شروع کیے...... تو لڑکیاں دم سادھے دیکھتی رہیں۔

''یہ! حیدر آبادی ہرے رنگ کے جوڑے، مہندی ...کی رسم کے وقت، یہ پیلے کرتے اور چوڑی دار کے ساتھ مایوں کے جوڑے...... یہ جامنی رنگ کے جوڑے شادی والے روز اور یہ ہلکے فیروزی جوڑے ولیمے کے روز کے ہیں، کیوں لڑکیوں خوش ہو؟''

سب نے کورس کے انداز میں جواب دیا۔

''جی!'' اور پھر سوائے ابا کے سارا خاندان آسیہ کی شادی میں شرکت کے لیے حیدر آباد پہنچ گیا...... پھپو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بھابیوں اور بچوں کے لیے خود کو قربان کر دیں...... البتہ سسرال والوں کا رویہ واجبی سا تھا یا کسی حد تک ناگوار بھی سلطانہ پھپو نے بے دام کی کنیز بن کر سسرال کی خدمت کی تھی جب ان کے میکے والے آئے تو سب کے منہ بن گئے۔

''میرا! دل تو چاہ رہا ہے کہ یہ جو پھپھو پا صاحب ہیں ناں ان

کوکھری، کھری سنادوں......'' حسبِ معمول ہالہ بی کو اپنی پھپھو کی ناقدری کا دکھ ہو رہا تھا۔

''ہاں، سناؤ...... سناؤ تا کہ پھپھو کی عمر بھر ریاضت پر پانی پھر جائے۔ تم بالکل پُرسکون رہو گی...... اور مجھے بھی سکون سے رہنے دو گی۔''

''تو امی تمہیں کیا کہتی ہوں ہالہ اپنی رائے کا اظہار ہی تو کرتی ہوں۔ وہ بھی دل ہی دل میں۔'' اور پھر مہندی کا ہنگامہ شروع ہو گیا پھوپا چونکہ ابا کی طرح تھے اپنی من مانی کرنے والے مجال ہے جو لڑکے، لڑکیوں کو مل کر کچھ کرنے کی اجازت دی ہو۔ لڑکے الگ رنگ جماتے رہے اور لڑکیاں بن سنور کر ستائشی نگاہوں کے انتظار میں ڈھولک الگ پیٹتی رہیں...... لڈی بھی ڈالی گئی، بڑی بوڑھیوں نے اپنے، اپنے کنوارے لڑکوں کے لیے لڑکیوں کو بھی خوب تاڑا۔

''اے ابی مجھے تو سلطانہ کی بھتیجی ہالہ بہت پسند آئی ہے اپنے انور کے لیے......'' انور کی اماں کی نگاہوں میں ہالہ سما گئی تھی اور اس سے پہلے کہ انور کی اماں کچھ ضروری سوالات لے کر ہالہ کے پاس جاتیں اسی وقت سلطانہ اپنی چاند جیسی بھتیجی کو وہاں سے اٹھا کر لے گئیں۔

''جی، پھپھو......'' باہر آ کر ہالہ نے پھپھو کو دیکھا۔

''ماشاء اللہ! میری بھتیجی کو کسی کی نظر نہ لگے اسی لیے وہاں سے لے آئی ہوں...... تمہیں تو میں اپنی......'' ہالہ کی روشن پیشانی چوم کر سلطانہ اسے بہو بنانے کی مہر ثبت کرنے ہی والی تھیں کہ اسی وقت ان کی دیورانی ہاتھ میں مہندی کا تھال لیے آ گئیں اور تھال جس میں مہندی کے ساتھ جلتی ہوئی موم بتیاں رکھی گئی تھیں ہالہ کی طرف بڑھایا۔

''ارے! بھئی یہ لڑکیوں بالیوں کے کام ہیں جو ہمیں کرنے پڑ رہے ہیں' ہالہ لو چندا یہ تھال ذرا اوپر دے آؤ، مجھ سے تو سیڑھیاں چڑھی نہیں جاتیں۔''

''جی، جی میں لے جاتی ہوں لائیے......'' ہالہ نے فرمانبرداری سے تھال پکڑا سیڑھیوں کی طرف بڑھی ابھی درمیان میں پہنچی تھی کہ سینڈل کی ایڑی سیڑھی میں اٹکی قریب تھا کہ وہ تھال سمیت گرتی کسی کی مضبوط گرفت نے اسے تھام لیا۔

''سنبھل کے...... سنبھل کے...... ارے ہالہ یہ تم ہو......'' سنبھالنے والے نے اس کا چہرہ اوپر اٹھتے ہی پہچان لیا۔ اب چونکہ وہ سنبھل چکی تھی تنک کر سامنے کھڑے خوبرو سے نوجوان کو دیکھا جو بہت خوشی سے اسے دیکھ رہا تھا مجال ہے جو وہ اس کو پہچان پائی ہو۔

''جی......! میں تو ہالہ ہی ہوں...... مگر آپ کون؟'' نگاہوں کی اجنبیت نے بتا دیا تھا کہ وہ اسے نہیں پہچان پائی اسی لیے وہ سینے پر ہاتھ باندھے ہونٹوں پر شرارت لیے سامنے کھڑا ہو کر بولا۔

''پہچان پر ہے ناز تو پہچان جایئے۔''

''آپ سے کس نے کہا کہ ہمیں اپنی پہچان پر ناز ہے، آپ خود ہی بتا دیجیے کون ہیں آپ...... ہمیں آپ کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر دعائیں دینی ہیں یا...... سر جھکا کر آپ کو آداب کہنا ہے۔''

ہالہ کی بات پر پھر ایک قہقہہ لگایا گیا اور قدرے جھک کر اس نے شرارت سے دیکھا۔

''اُف! وہی ستراطی بقراطی پن، لڑکی میں بلال ہوں تمہاری پھپھو کا بیٹا۔''

''اُف اللہ! یہ، یہ لمبا چوڑا گھنی مونچھوں والا خوبرو سا بلال تھا جو بچپن میں آتا تو وہ اس کی انگلی پکڑ کر باہر ضرور جاتی۔'' وہ ایک ٹک اسے دیکھتی رہ گئی۔ چونکہ پھپھو کو میکے آنے کی اجازت بہت کم ملتی تھی اس لیے ڈھیر سارے سالوں کے بعد ملاقات ہوئی اور اب گزرے سالوں نے تو اسے پیکرِ ضیا بار کر دیا۔ وہاں بلال کو بھی وجاہت کا تاج پہنا دیا تھا اور پھر جانے کب کیسے ہالہ بی نے درِ دل وا کر دیا اور بلال میاں بڑے استحقاق سے اس لطیف جذبوں والے تخت پر براجمان ہو گئے حرفِ عام میں جسے لوگ محبت کہتے ہیں۔ وہ بلال کی محبت کے سمندر میں ڈوب گئی اور شاید یہ آگ زیادہ شدت اختیار نہ کرتی اگر بلال کی محبت کی شدت اسے ہوا نہ دیتی۔ ہالہ بی تو بے حد خوش تھی اسے بلال سے

بے حد محبت تھی' ہر وقت اسی کو سوچتی رہتی، اس کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھتی رہتی، ایک ہالہ تھی کہ ایک نامعلوم جذبے کی گرفت میں کبھی.... بے ترتیب دھڑکنوں کو قابو کرنے کی کوشش کرتی تو کبھی دھونکنی کی طرح پھولی سانسوں کو سنبھالنے کی کوشش کرتی اور کبھی چہرے پر رقص کرتے رنگوں کو چھپاتی، زیادہ تر پلکوں کی چلمن گرائے رکھتی، کہیں کوئی اس کی آنکھوں میں بلال کا عکس نہ دیکھ لے۔

''کب تک آخر کب تک تم یہ سب چھپاؤ گی ہالہ...... کب تک کہ تم بلال سے محبت کرتی ہو بزدل لڑکی چیخو، چلاؤ بتاؤ سب کو کہ...... کہ تم بلال کو چاہتی ہو، اسے حاصل کرنا...... چاہتی ہو۔''

''اللہ کے واسطے ہالہ بی آہستہ بولو، کوئی سن لے گا تو پتا ہے ناں کیا ہو گا...... ابا تو ویسے بھی ان لوگوں کو پسند نہیں کرتے...... ہاں...... ہاں میں جانتی ہوں میں بلال کو شدت سے چاہتی ہوں اپنی زندگی اسی کے نام کرنا چاہتی ہوں۔ مگر...... مگر......'' بے شمار خدشات ہالہ کو مزید کچھ کہنے یا سوچنے سے روک دیتے مگر ہالہ بی تو بلال پر سو جان سے فدا تھی اس معاملے میں تو وہ اگر مگر برداشت کر ہی نہیں سکتی تھی فوراً ہالہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''چپ! نہیں چپ کر جاؤ ہالہ میں نے تمہارے ضبط کا بہت دباؤ برداشت کیا ہے اور وہ ایسے معاملات تھے کہ میں برداشت کر گئی لیکن سنو یہ ہے میرے دل کا معاملہ، میری محبت کا معاملہ اس میں، میں تمہیں کسی قسم کے سمجھوتے کی اجازت نہیں دوں گی۔ جان لو کہ یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ ہے...... اگر بلال نہیں تو میں بھی نہیں۔''

ہالہ نے ہالہ بی کو کبھی کسی معاملے میں اتنا کٹر نہیں پایا تھا وہ بے بس ہو گئی۔

اور یوں ہوا کہ ایک دن اچانک ہی سلطانہ پھپھو آ گئیں۔ ہالہ اور بلال کا رشتہ طے کرنے...... گھر میں کون تھا جو اس رشتے پر خوش نہیں تھا۔ اماں کو تو بلال بچپن ہی سے پسند تھا ہالہ بی تو جھٹ سجدے میں جا گری تھی، ہالہ بے قابو ہوتے دل کو تھامے خوف زدہ سی گھوما کرتی کہ جانے کون سی گھڑی اسے زندگی کی نوید سناتی یا موت کا طوق پہناتی ہے۔

''ہرگز نہیں! قطعی نہیں سلطانہ، تم نے ایسا سوچا بھی کیسے کہ جس گھر میں ہماری ایک بیٹی نے زندگی قیدِ بامشقت کے طور پر گزاری ہو ہم وہاں دوسری بیٹی دے دیں گے۔ ناممکن...... ہالہ ہماری ایک ہی بیٹی ہے ہم اسے خوش اور خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں، ہماری طرف سے سو فیصد انکار ہے سوچنے سمجھنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ لہٰذا تم بحیثیت بیٹی جب چاہو آؤ جاؤ مگر بلال کے رشتے کے لیے نہیں۔''

اب ابا نے تو فیصلہ لکھ کر قلم توڑ دیا تھا پورے گھر میں یہ خبر خاصے دکھ کے ساتھ سنی گئی۔ اماں تو روئیں بھی مگر اس کے اندر تو قیامت ہی آ گئی تھی۔ ٹوٹے خوابوں کی کرچیوں نے آنکھیں لہولہان کر ڈالی تھیں شدتِ غم اور شدتِ ضبط سے کلیجا پھٹا جا رہا تھا۔ ہالہ بی نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ وہ کسی قیمت پر بلال سے دست بردار نہیں ہونا چاہ رہی تھی۔

''ہالہ! ہالہ اس بار میں تمہیں چپ نہیں رہنے دوں گی، اب تک میں نے فرمانبرداری کا ثبوت دیا تمہارے سمجھوتوں کے ساتھ سمجھوتا کیا مگر...... مگر اب نہیں...... ہالہ اب تمہیں بولنا ہو گا، چیخنا ہو گا...... چلانا ہو گا...... یہ گستاخی نہیں تمہارا حق ہے ہالہ...... یہ تمہارا شرعی حق ہے۔ ربِ عظیم نے حق دیا ہے عورت کو...... اپنا حق استعمال کرو ہالہ...... اپنا حق استعمال کرو...... ورنہ...... ورنہ میں تو بلال کے بغیر مر جاؤں گی۔''

''ہاں، تو مر جاؤ، پیچھا چھوڑو میرا تم، ہالہ بی میں نہیں بول سکتی...... تم کیا چاہتی ہو زبان کھول کر میں ابا کا شملہ جھکا دوں؟ انہوں نے خاندان بھر کے سامنے کتنے مان سے کہا ہے کہ میری ہالہ میرے حکم کی پابند ہے۔ میں، میں ابا کا مان توڑ دوں ہرگز نہیں میں، میں وہی کروں گی جو، جو ابا کہیں گے۔''

''سوچ لو ہالہ میں...... میں تو باقی تمام ادھوری

خواہشات اور تمناؤں کے ساتھ بلال کی محبت کی قبر میں اتر جاؤں گی مگر تم تنہا رہ جاؤ گی، میں تمہاری خوشی تمہاری خواہش اور تمہارے خواب تھی...... جسے زندہ رکھنے کے لیے تم نے کبھی کچھ نہیں کیا...... مجھے دلاسا دے کر خود سمجھوتوں کے سودے کرتی رہیں...... لیکن اب ،اب حد ہوگئی برداشت کے کنارے ڈوب گئے...... بلال اور اس کی محبت میری آخری خواہش اور امید تھی، اس دیے کو بھی تم نے بجھا دیا تو...... تو میں کس کے لیے زندہ رہوں...... لیکن یاد رکھو میرے بعد تم بہت ویران ہوجاؤ گی، اندر کے سناٹوں کے جھینگر ہر وقت چیخ، چیخ کر تمہارا جینا حرام کردیں گے، میں مر رہی ہوں ہالہ، میرا دم گھٹ رہا ہے، تم، تم جاؤ صبر کی بکل مارو اور سمجھوتے کی قبر میں اتر جاؤ۔“

اور پھر ہالہ بی مر گئی...... ہالہ بی جو ہالہ کی اندر کی زندگی تھی اس کی خواہش اس کی امید تھی ہر خواہش پر اس کا دم نکلنے لگتا تھا۔ وہ چیختی چلاتی شور مچاتی اس سے لڑتی، وہ تکمیل چاہتی تھی۔ اور ہالہ اسے سمجھا نہ پاتی کہ تکمیل کے لیے تو بولنا پڑتا ہے۔ اور بولنے کے لیے الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس کے پاس الفاظ کہاں تھے جو اہا کے سامنے کھڑے ہوکر سینہ تان کر کہتے کہ ”ابا مجھے یہ نہیں وہ کرنا ہے...... مجھے وہ نہیں یہ چاہیے۔“ ہالہ بی نے درست ہی تو کہا تھا...... اس کی ذات کے کھنڈرات میں قبرستان والا سناٹا تھا اس کی اپنی آواز پلٹ کر اس کی سماعتوں سے آ ٹکراتی...... تو اس کی سسکیوں کی سنسناہٹ دور تک جاتی، وہ ہالہ بی کے بغیر واقعی اکیلی ہوگئی تھی۔ بہت کمزور اور کھوکھلی سی......

☆☆☆

عمیر جو آج تک تو نظر نہیں آیا تھا...... چچا احتشام اور چچی ہاجرہ کا بڑا بیٹا ساتھ پل کر کھیل کود کر جوان ہوا...... مگر ہالہ کو نظر نہیں آیا تھا...... نہ ہی عمیر نے اپنے ہونے کا ثبوت دیا تھا...... اس کی زندگی...... ہاں سنا جاتا تھا کہ آج عمیر نے فلاں برا کام کیا...... فلاں کے ساتھ جھگڑا کیا...... میٹرک میں ایک بار پھر فیل ہوگیا...... اور ساتھ نہ پڑھنے کا اعلان بھی کردیا...... کوئی کام کرے گا...... مگر ہر کام میں بوجہ نالائقی ہر کام میں ناکام مگر ان تمام...... ”اضافی خوبیوں“ کے ساتھ بھی ابا کو لگا کہ عمیر اُن کی اکلوتی بیٹی کو خوش رکھے گا سو...... ہالہ سے پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھتے ہوئے انہوں نے اس کی باگ ڈور عمیر کے ہاتھ میں تھما کر خود اللہ کو پیارے ہوگئے...... وقت آگے بڑھتا رہا۔ سب ہی اپنی، اپنی زندگی میں معروف ہوگئے مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ سب تو زندگی جی رہے ہیں مگر وہاں زندگی ہالہ کو جی رہی تھی۔

بے ہنر میٹرک فیل شوہر بد مزاج اتنا کہ ہالہ رونے لگتی کہ اسے کن گناہوں کی سزا کے طور پر شوہر ملا...... ہالہ بی مرچکی تھی۔ اندر سناٹا تھا۔ زندگی بوجھ لگنے لگی تھی۔ لیکن جب آنگن میں پھول کھلنے لگے تو اس نے خود کو ان میں گم کردیا...... جب عمیر سے اس کی شادی ہوئی تھی اسی وقت اس نے جان لیا تھا کہ زندگی کی گاڑی اسے اکیلے ہی گھسیٹنی پڑے گی...... ورثے میں ملی ہوئی جائداد عمیر اپنی عیاشی کی نذر کرچکا تھا...... گھر میں بیروزگاری، تنگ دستی کا راج تھا۔ ستم بالائے ستم ایک ایکسی ڈنٹ میں ایک ٹانگ سے بھی معذور ہوگیا اب تو صحیح معنوں میں قابلِ رحم تھا۔ ہالہ کے سامنے کہ ”بی بی میں تو ہوا بیروزگار...... تم چلاؤ اب ذمے داریوں کی کار......“ کا اعلان کرکے پڑا موبائل اور ٹی وی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

ہالہ چار بچوں کی ماں بن چکی تھی اس نے سر پر کفن باندھا اور کود پڑی میدانِ عمل میں...... اور وہ پرائیویٹ ایم، اے تک کی حاصل کی ہوئی تعلیم اس کی بیساکھی بن گئی۔ قسمت نے ساتھ دیا تو اچھے اسکول میں اللہ نے جاب دلادی۔ اور وہ باقاعدہ مشین بن گئی عمیر کی بد مزاجی سہتی، خدمت کرتی بڑے بچوں کو اسکول لے جاتی...... چھوٹے جوڑواں تھے ڈے کیئر سینٹر میں چھوڑتی پھر واپسی پر بچوں کو لیتی۔ اس کی زندگی گھڑی کی سوئی کی طرح چل رہی تھی...... اسے

بچوں کو اعلیٰ تعلیم دینی تھی وقت اور حالات سے مقابلے کے لیے تیار کرنا تھا۔ وہ خود کو فراموش کرچکی تھی، زندہ تھی متحرک تھی تو صرف بچوں کے لیے...... باپ کے سدا یاں بھی چل بسی تھیں۔ جب سے ہالہ بی کی موت ہوئی تھی اپنی ذات کے حوالے سے نہ کوئی خواہش دل میں دھڑکی نہ ہی کوئی خواب آنکھوں میں اترا اب تو صرف ایک ماں تھی اور ماں اپنے بچوں کو ہر حلقے میں کامیاب دیکھنا چاہتی ہے۔ اور اس چاہت میں وہ تنہا تھی شوہر عمیر خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہتا اسے۔ اللہ کا یہ کرم اب ہالہ پر ہوگیا تھا کہ وہ اب نشتر نہیں چبھوتا۔ بس چپ چاپ دیکھتا رہتا...... کہ ہالہ سمجھوتے کے... پُرخار جنگل سے کس طرح اپنے پیروں کو بچاتی یا زخموں کی رفوگری کرتی ہے۔ گزرے وقت میں اللہ کریم نے بچوں کے حوالے سے بے شمار خوشیاں بھی دیں، اس نے اپنے خوابوں کے سانچے میں اپنے بچوں کو ڈھالا تھا۔ بیٹی ڈاکٹر بن گئی بیٹا انجینئر...... چھوٹے بیٹے نے مقابلے کا امتحان دیا تھا۔ اب نتیجے کا انتظار تھا اس کو...... اتنا سب کچھ بھول جانے پر بھی وہ کبھی، کبھی تنہا ہوجاتی اسے ہالہ بی شدت سے یاد آتی تو بے شمار آنسو کہیں پڑھا ہوا جملہ بن جاتے۔ ”آسان نہیں لڑکی ہونا ہزاروں خواب دل میں دفنانے پڑتے ہیں۔“

لیکن جب عورت سارے خواب دفنا کر خود سمجھوتے کی قبر میں اترتی ہے تو ایسے بھی تنہا ہوجاتی ہے۔ باپ نہ بھائی نہ شوہر ارے کوئی تو کہتا ”تم نے ہماری خاطر بہت قربانیاں دی ہیں...... ہم تم سے خوش ہیں......“

”ہالہ...... ! مبارک ہو تمہارے بیٹے نے مقابلے کے امتحان میں ٹاپ کیا ہے۔“ زندگی میں پہلی بار عمیر اپنی وہیل چیئر گھسیٹتا اس کے پاس آکر خوشخبری سنا رہا تھا۔ زندگی میں کتنے موڑ آئے تھے کتنی خوشیاں اور ناکامیاں ملی تھیں مگر عمیر برف کا تودہ بنا رہا اس کو ذلیل ہی کرتا رہا...... پھر، پھر یہ اچانک برف کیسے پگھلی ہالہ حیرت سے اسے دیکھ رہی۔

”ایسے! کیا دیکھ رہی ہو ہالہ تمہارے بیٹے نے ٹاپ کیا ہے ٹی وی سے لوگ آئے ہیں انٹرویو لینے کے لیے۔“

اور پھر کچھ دیر میں ان کا فیملی انٹرویو ہو رہا تھا۔

”یہ سب میرے رب کا کرم ہے کہ اس نے مجھے ہالہ جیسی بیوی دی جس نے مجھ جیسے ناکارہ آدمی کو ڈاکٹر بھی بنادیا، انجینئر بھی بنادیا...... اور اب...... میں نے مقابلے کا امتحان بھی پاس کرلیا...... میں تو نالائق آدمی تھا، نامعلوم کس نیکی یا رب نے اپنی رحمت کے صدقے میں ہالہ جیسی بیوی عطا کردی جس نے میرے گھر کو جنت بنادیا خود کو فراموش کرکے میرے بچوں کو معاشرے کے لیے بہترین کامیاب انسان بنادیا۔ میری ہالہ نے زندگی میں بے شمار سمجھوتے کیے ہیں بہت قربانیاں دی ہیں میری اور بچوں کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے...... میں بے حد خوش ہوں رب کریم کا شکر ادا نہیں کرسکتا...... میں اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوسکتا ورنہ کھڑا ہوکر اپنی عظیم بیوی کو سلیوٹ کرتا...... اور کہتا کہ میری زندگی کو اتنا خوش اور کامیاب بنانے کا شکریہ......“

عمیر کے چہرے پر بے پناہ خوشی تھی وہ ایک، ایک کرکے میڈیا نمائندوں کو بتا رہا تھا ہالہ نے کس طرح تن تنہا یہ سب کیا تھا اور ساتھ بیٹھی ہالہ، ہالہ بی سے مخاطب تھی۔

”کاش! تم زندہ ہوتیں ہالہ بی تو دیکھتیں کہ میرے سمجھوتے کے درخت پر صبر کے کتنے میٹھے پھل آئے ہیں، میری ذہانت اور قابلیت سے انکاری میرا شوہر مجھے دنیا کی عظیم بیوی اور عظیم ماں قرار دے رہا ہے۔ اس نے میری خدمات کے صلے میں مجھے عظیم عورت قرار دے دیا ہے۔ تو کیا کسی بھی بیوی کے لیے یہ اعزاز کم ہے کہ اس کا شوہر ساری دنیا کے سامنے اسے عظیم کہے...... آج میرے سارے زخم بھر گئے ہیں، ساری تھکن اتر گئی ہے...... سارے گلے شکوے دور ہوگئے ہیں...... اے رب کریم تیرا شکر ہے اتنا کہ جتنا تیرا علم ہے کہ میری تلاش ختم ہوئی میں نے خود کو کھوج لیا کہ میں تو سب رشتوں میں ہی ہوں۔“

تاراج

اسما طاہر

وہ پندرہ سال کی تھی جب اس کی موت واقع ہوگئی تھی......اس کے سامنے ایک البم کھلا ہوا تھا۔ اور وہ حسرت سے اس وقت کی تصویریں دیکھ رہی تھی جب وہ زندہ تھی، خوش تھی۔

یہ البم اسے ممی کے سامان میں سے ملا تھا۔ سال پہلے ممی فوت ہوئی تھیں۔ ڈیڈی کو گزرے پندرہ سال ہوگئے تھے۔ اس نے ان کا گھر بیچ دیا تھا۔ اسے اس گھر کا کوئی لالچ نہیں تھا......ویسے بھی گھروں کی ضرورت ان کو ہوتی ہے جو زندہ ہوں۔ اس کی توجہ پھر سے گود میں رکھے البم کی طرف لوٹ آئی تھی۔ پہلے صفحے پر اس وقت کی تصویر تھی جب وہ ایک سال کی تھی۔ سرخ وسفید، صحت منداپنی عمر سے بڑی لگتی، کتنی خوب صورت تھی وہ......اگلی تصویر میں وہ ممی کی گود میں بیٹھی تھی۔ اس نے نہایت خوب صورت فراک پہن رکھا تھا جو اس کے کندھوں پر باریک دھاگوں سے بندھا ہوا تھا۔ اس نے صفحہ پلٹ دیا۔ اب وہ سوئمنگ کاسٹیوم میں تھی۔ عمر غالباً نو سال تھی پھر اس کے بعد سوئمنگ سوٹ میں اس کی کئی تصویریں تھیں۔ ان تصویروں میں فرق تھا تو صرف اتنا کہ ہر تصویر میں اس کی عمر بڑھ رہی تھی۔ اور وہ سوٹ چھوٹا ہوتا جارہا تھا۔ نہ جانے اسے سوئمنگ کا شوق تھا یا ممی، ڈیڈی کو......وہ طرح، طرح کے تیراکی کے لباس پہنے پول سے نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔ ایسی ہی ایک اور تصویر اس کے سامنے تھی۔ وہ اسے بڑی محویت سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے جسم اور بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اور بہت حسین لگ رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ کبھی اس قدر زندگی سے بھرپور تھی۔

اسی تصویر کے پس منظر میں اس نے دیکھا ان کا گھریلو ملازم پیچھے کھڑا اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔ جب وہ زندہ تھی تو یہ تصویر اس نے کئی بار دیکھی تھی مگر پیچھے کا منظر اسے کبھی نظر نہیں آیا تھا مگر آج تو یوں لگ رہا تھا کہ ملازم کی آنکھیں تصویر سے باہر نکل کر اس کا جسم چیر رہی تھیں۔ اس نے اس وقت سخت بے چینی محسوس کی تھی اور گھبرا کر صفحہ پلٹ دیا تھا۔ اگلی کچھ تصویروں میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کیمپنگ سائٹ پر تھی، ٹائٹس پر ٹاپ پہنے جو کندھوں پر بندھا ہوا تھا۔ وہ بہت خوب صورت اور اپنی عمر سے بڑی لگ رہی تھی۔ پھر کچھ تصویریں اسکول کی پارٹیز اور مختلف تقریبات کی تھیں۔ ہر تصویر میں اس کا لباس سب سے منفرد اور دلکش تھا۔ وہ ہمیشہ ٹائٹس، جینز، سلیولیس ٹاپس یا شرٹس پہنتی تھی۔ بقول ممی کے اس لباس میں وہ بہت اسمارٹ لگتی تھی۔ اسے نہیں یاد اس نے کبھی شلوار قمیص پہنا ہو۔ ممی کا کہنا تھا کہ یہ محض ایک نائٹ ڈریس تھا اور کچھ نہیں......رہ گیا دوپٹا تو ممی بالکل تھوڑی تھیں جو اس کے خوب صورت بال اس کے نیچے چھپا دیتیں۔ وہ اپنے ماں، باپ کی اکلوتی اولاد تھی، ممی، ڈیڈی اس کی ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ اس کا لباس ہمیشہ قیمتی اور ماڈرن ہوتا، اتنی سی عمر میں بھی اسے پتا تھا کہ لوگ مڑ، مڑ کر اسے دیکھتے تھے۔ کچھ نظریں اسے اچھی لگتی تھیں اور کچھ اچھی نہیں لگتی تھیں۔ مگر ایسے لوگوں کی وجہ سے وہ اپنا لباس نہیں چھوڑ سکتی تھی جس میں وہ زیادہ سے زیادہ خوب صورت لگے۔ ایک دفعہ اسے قرآن پڑھانے والے مولوی صاحب نے اس کے ناکافی لباس پر اعتراض کیا تھا مگر ممی نے اس کا لباس بدلنے کے بجائے مولوی صاحب کو بدل دیا تھا۔ وہ ناکافی لباس پر چھوٹا سا اسکارف اوڑھا دیتیں اور یہ سلسلہ چلتا ہی رہا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ ایک بار بھی قرآن ختم نہیں کرسکی تھی۔

”دنیا چاند پہ پہنچ گئی ہے اور یہ ابھی تک لباس ناپتے پھر رہے ہیں۔“ اسے ممی کی بڑبڑاہٹ آج بھی یاد تھی۔

اس رات نو بجے اس کی سہیلی کی سالگرہ تھی۔ ممی نے اس پارٹی کے لیے اس کے لیے بطورِ خاص گلابی رنگ کی ساڑی منتخب کی تھی۔ جس کی ٹاپ حسبِ معمول اس کے کندھوں پر دھاگوں سے بندھی ہوئی تھی۔ اور پلو محض ایک پٹی تھا۔ اس کے لمبے قد پر ساڑی خوب جچ رہی تھی۔ ممی اس کے ساتھ نہیں جارہی تھیں۔ انہیں کسی اور پارٹی میں جانا تھا ویسے بیٹی کو خوداعتماد اور خودمختار بھی تو بنانا تھا۔ اب ہر جگہ تو وہ اس کی انگلی پکڑ کر نہیں لے جاسکتی تھیں، اسے گھر سے نکلے کافی دیر ہوگئی تھی۔ اس کی سہیلی کے میسج بار، بار آرہے تھے مگر اس کا گھر تھا کہ آکے نہیں دے رہا تھا۔ وہ خوفزدہ نہیں تھی مگر الجھ گئی تھی ڈرائیور برسوں سے ان کے گھر ملازمت کررہا تھا کوئی اجنبی نہیں تھا، وہ اس طرف سے تو مطمئن تھی۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں اتنی دیر لگ رہی تھی اور پھر کار ایک جگہ رک گئی۔ اس نے شیشے سے باہر دیکھا دور، دور تک گھپ اندھیرا اور سناٹا تھا۔

☆☆☆

وہ پھر کبھی واپس نہیں لوٹی تھی۔ ہمیشہ کے لیے ان اندھیروں اور سناٹوں میں گم ہوگئی تھی۔ کسی کو کچھ بھی بتانے کا فائدہ نہیں تھا۔ اچھے مستقبل کے لیے خاموشی ضروری تھی۔ اس نے خود پر کھلنے والا ہر دروازہ بند کردیا تھا۔ وہ اپنا آپ چھوڑ کر دور کہیں بہت دور بھاگ گئی تھی۔ اس کی روح مرگئی تھی اور جسم کو صرف



خواہش

یوں تو آتا ہے ہر سال
یہی نیا سال
نئے وعدے نئے جذبے
نئے عہد و پیاں لے کر
لیکن میں سوچتی
اکثر یہ تنہائی میں
کہ کب آئے گا وہ سال
جب یہ سارے پیاں
ہوں گے عمل سے ہم کنار

خواہش مند: صائمہ سید، کراچی

ایک تابوت کی ضرورت تھی۔ ڈیڈی کے لیے یہ بات بہت بڑی تھی اسی لیے وہ جلد ہی دنیا سے چلے گئے اور پھر کچھ سال بعد اس کی شادی ہوگئی تھی اب وہ دو بیٹیوں کی ماں تھی۔ جن کی عمریں چار اور پانچ سال تھیں۔ دنیا کو ہر طرح سے نبھا رہی تھی مگر جانتی تھی وہ زندہ نہیں ہے اس کی زندگی تو بس پندرہ سال تھی۔

البم دیکھ، دیکھ کر وہ بے آواز رو رہی تھی۔ آخر اس کا کیا قصور تھا۔ وہ کیوں نہ بچائی گئی، نہ ماں، باپ نہ، قانون نہ خدا کوئی بھی اس کی مدد کو کیوں نہیں آیا۔ وہ سخت تکلیف کے عالم میں البم کے صفحے پلٹ رہی تھی۔ پھر اس کی نظر اپنی ایک تصویر پر ٹھہر گئی تھی۔ جس میں اس نے ٹائٹس پر کالے رنگ کی فراک نما قیمص پہن رکھی تھی۔ قیمص کے اوپر کا حصہ نیٹ سے بنا ہوا تھا۔ اس نے غور سے خود کو دیکھا اور پھر اسے خوف سے جھرجھری آگئی، یہ بھلا اس نے کیا پہن رکھا تھا۔ اسے تو خیر ان باتوں کی کیا خبر ہوتا تھی۔ کیا ممی نے بھی کبھی اسے ایسے کپڑے پہناتے ہوئے خیال نہیں کیا تھا اچانک ہی اسے خود سے، اپنے لباس سے گھن محسوس ہوئی تھی۔

اب ہر تصویر میں اسے اپنا لباس بہت ناکافی لگ رہا تھا۔ جو اس کے جسمانی خدوخال چھپانے کے بجائے واضح کر رہا تھا۔ سوئمنگ کاسٹیوم والی تصویریں تو دوبارہ دیکھنے کی ہمت ہی نہیں تھی اس میں مگر پھر بھی کسی خیال کے تحت اس نے ساری البم دوبارہ دیکھ ڈالی تھی۔ اور پھر اس پر ایک خوفناک انکشاف ہوا تھا۔ اس کے مجرم کوئی اور نہیں خود اس کے اپنے ماں، باپ تھے۔ ممی نے ماڈرن ازم کی قیمت اپنی بیٹی کے طور پر چکائی تھی۔ اور اس کے خلاف ہونے والی دہشتگردی کی راہ خود اس کے ماں، باپ نے ہموار کی تھی۔ جو ناکافی لباس کے نام پر اس کے جسم پر گویا کے خون مل کر اسے مگرمچھوں کے تالاب میں پھینکتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ شکار ہوگئی۔ اپنے آدھے پورے لباس میں وہ کس طرح گھر کے ملازموں اور باہر کے لوگوں کو بھڑکاتی رہی ہوگی۔ اس کا وجود جھٹکوں کی زد میں تھا۔ اس کی موت تو دراصل آج واقع ہوئی تھی اس سے پہلے تو وہ محض جانکنی کے عالم میں تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ ناسمجھ اور کم عمر بچیوں کی بربادی کے ذمے دار کہیں نہ کہیں خود ان کے ماں، باپ ہوتے ہیں۔ جو ملازموں کو انکلو کو، کزنز کو گھر کے ان قیمتی خزانوں تک رسائی دیتے ہیں اور پھر یہ خزانے کبھی ورغلا کر اٹھائے جاتے ہیں اور کبھی چرا کر......

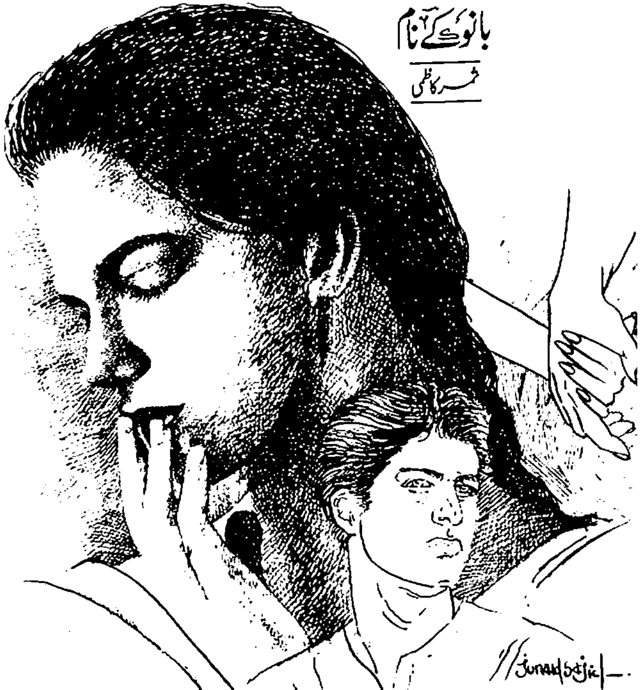
بہت دیر تک وہ اپنی بے وقت موت کا ماتم کرتی رہی تھی۔ آج وہ تاراج تھی برباد تھی......اور آباد ہونے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

اچانک وہ اٹھ کر چل پڑی تھی اور ایسے چلی تھی جیسے اس سے پہلے کبھی نہ چلی ہو۔ وہ بہت مضبوطی سے قدم زمین پر رکھ رہی تھی۔ اپنی ننھی بیٹیوں کے کمرے میں آکر اس نے الماری سے ان کے تمام کپڑے نکال کر بیڈ پر رکھ دیے تھے اور پھر تھوڑی دیر بعد لان میں وہ سارے کپڑے آگ میں جل رہے تھے جو تنگ تھے، جو کم تھے، جو چھوٹے تھے جو آدھے تھے، اس نے حوا کی بیٹیوں کے سارے دشمن جلا دیے تھے۔ آج برسوں بعد وہ زندہ تھی، خوش تھی، پُرسکون تھی۔

بانو کے نام

ثمر کاظمی

”پیاری دوست السلام علیکم!
سب سے پہلے تو معذرت اتنے عرصے بعد خط لکھ رہی ہوں۔ پہلے پہل تو سمجھ نہیں آیا کیا لکھوں۔ ہم سادہ لوگ بھی بڑے بے وقوف ہوتے ہیں اکثر سراب کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں اور ہمارے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ ہم خالی کشکول کے مانند ہوتے ہیں۔ یاد ہے ناں بانو ہم اکثر ہاشم چاچا کے باغ سے آموں کی چوری کیا کرتے تھے، اس وقت کیریاں کھانے کا انتہائی مزہ ہوتا تھا۔ بچپن کی یادیں بھی کتنی قیمتی ہیں۔ ان واقعات کو بندہ بھول ہی نہیں پاتا، خیر میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی۔ لیکن میں کیا کروں تم مائنڈ مت کرنا۔ تمہیں تو پتا ہے بولنے کی عادت میری پرانی ہے اور عادتیں بقول اماں کے مشکل سے ہی چھوٹتی ہیں پر آج ایک بات کا مجھے شدت کے ساتھ احساس ہو رہا ہے کہ کاش میں تمہاری باتوں کو سمجھ جاتی تو آج یوں تہی دامن نہ ہوتی۔ تمہیں اکثر گلہ رہتا تھا ناں کہ میں تمہاری کسی بات کو سیریس نہیں لیتی اور یونہی اڑا دیتی ہوں۔ یہ باتیں اب سمجھ میں آئی ہیں تو دل کرتا ہے تمہاری شاگردی اختیار کرلوں لیکن اب ان حالات میں پھنس چکی ہوں کہ چاہ کر بھی ان



سے چھٹکارا نہیں ملتا اور تمہاری یہ پٹر پٹر بولنے والی دوست کسی سے نظر ملانے سے ڈرتی ہے۔ اُف میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی تم بھی سوچ رہی ہو گی کہ میں باتیں کیوں گول مول گھما رہی ہوں۔ ٹھہرو ذرا سانس لو پھر بتاتی ہوں۔ ہاں تو میں کہاں تھی تمہیں تو یاد ہو گا مجھے اپنے گھر کا ماحول پسند نہیں تھا۔ مائرہ اور فوزیہ میری بہنیں تمام گھریلو کاموں میں طاق تھیں۔ مائرہ کے ہاتھوں میں تو گویا لذت تھی اور فوزیہ سلائی کڑھائی کی ماہر ایسے، ایسے ڈیزائن بناتی تھی کہ بعض اوقات میں بھی حیران رہ جاتی لیکن میرے حسن کے سامنے مائرہ کے ہاتھوں کی لذت اور فوزیہ کی سلائی کڑھائی میں مہارت، دھری کی دھری رہ جاتی۔ وہ دونوں مجھ سے بڑی ہونے کے باوجود اکثر میرے سارے کام کر دیتی تھیں اور میں شہزادیوں کی طرح آرام کرتی رہتی۔ بقول اماں کے مجھے بگاڑنے میں ابا کا زیادہ ہاتھ تھا اور ابا مجھ سے بہت پیار کرتے تھے لیکن سچ کہتی ہوں بانو والدین کو سب بچوں کے ساتھ یکساں رویّہ رکھنا چاہیے۔ میں اکثر مائرہ اور فوزیہ کو ابا کی طرف حسرت سے دیکھتے ہوئے پاتی۔ تب مجھے اپنی اہمیت جتانے کا نشہ چڑھ جاتا۔ اسکول ختم کرنے کے بعد میں نے کالج میں داخلہ لینے کی ضد کی تھی تو ابا نے فوراً میری بات مان لی تھی حالانکہ میرے تو نمبر بھی مائرہ اور فوزیہ سے کم تھے۔ فوزیہ کا تو اے گریڈ تھا اور مائرہ کے اس کے برابر تھے اور میرا آرٹس کے ساتھ بھی بہ مشکل سی گریڈ بنا تھا تب میں نے پہلی دفعہ مائرہ کو چھپ کر روتے دیکھا اور میں نے اسے تنفر سے کہا تھا کہ وہ جلتی ہے مجھ سے ''نہیں تم غلط سمجھ رہی ہو'' اس نے صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔ ''بس، بس میں جانتی ہوں سب۔'' میں نے غصے سے کہا تھا۔ تب میں نے مائرہ کی آنکھوں میں ہلکورے لیتا کرب نہیں دیکھا تھا۔ تمہیں یاد ہو گا جب ہماری فرسٹ ائیر کی کلاسز شروع ہوئی تھیں اور کالج کا وہ پہلا دن میں تو آج تک نہیں بھولی، کتنے رنگ بکھرے پڑے تھے ہر طرف رنگ برنگے کپڑوں کے ساتھ کھلکھلاتی ہوئی لڑکیاں۔ میری تو مانو آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں۔ یہ الگ بات کہ میں اب سمجھ پائی ہوں کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی لیکن اپنی تعریف تو مجھے بہت پسند تھی اور کسی، کسی کو اپنی تعریف سننے کا چسکا پڑ جاتا ہے اور بقول تمہارے میری تو عقل آدھی ہے۔ ویسے مجھے ایک بات کا تم سے گلہ بھی ہے کہ تم نے مجھ سے تعلق برقرار نہ رکھا۔ تم تو کافی سمجھدار تھیں کیا ہوتا جو کچھ سمجھداری مجھے ادھار ہی دے دیتیں۔

تمہیں یہ جاننے کا اشتیاق ہو گا کہ میں فیئر ویل پارٹی کے بعد کہاں غائب ہو گئی تھی تو سنو میں بتاتی ہوں۔ اچھا تمہیں مہرینہ کا بھائی حسن تو یاد ہو گا۔ کتنا حسین و جمیل لڑکا تھا۔ میں نے جب اسے پہلی بار دیکھا تھا تو میری تو مانو آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ جیسا ہم نے اکثر ناولز میں پڑھا تھا ہیرو کتنے کبرو جوان اور سوہنے ہوتے ہیں اور جیسے ہم لڑکیوں کی چھٹی حس ہمیں بتا دیتی ہے کہ کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے۔ اسے بھی میری نظروں کا ارتکاز محسوس ہوا ہو گا۔ وہ کتنی دلکشی سے مسکرایا تھا۔ اس دن کے بعد وہ اکثر مہرینہ کو لینے آتا اور ہم ایک دوسرے کو گھنٹوں تکتے رہتے۔ تم مجھے پاگل سمجھنے لگی تھیں کاش میں تمہیں اعتماد میں لے کر سب بتا دیتی تو آج...... خیر جس دن ہمارا پریکٹیکل تھا مہرینہ نے مجھے خوشبو میں لپٹا ایک رقعہ دیا اور اسے لیتے ہوئے میری ہتھیلیاں بھیگ گئی تھیں، دل خوف سے دھڑک رہا تھا کوئی انجانا احساس دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔

خط میں لکھا تھا۔

''میں نے تھر کی سسی کو نہیں دیکھا، میں نے ہیر کے قصے سنے ہیں لیکن میں نے ایک گاؤں کی شہزادی کو دیکھا ہے جو مجھے میری کائنات لگتی ہے کیا تم سسی پنوں کے قصے کو ختم کرنے میں میرا ساتھ دے دو گی؟ تمہارے جواب کا منتظر...... محسن شاہ۔'' ان چند جملوں نے میرے دل کی دنیا زیر و زبر کر دی تھی۔ لیکن میں اسے جواب نہ دے پائی پھر ایک دن وہ میرے سامنے آ گیا جس دن تم کالج نہیں آئی تھی پتا ہے اس نے مجھ سے بس اتنا کہا تھا۔

''اساور مجھے تمہاری کوئل جیسی آواز سے عشق ہو گیا ہے۔'' میں نے خوف سے اردگرد دیکھا۔

''کوئی دیکھ لے گا۔'' میں نے کپکپاتی آواز میں بس اتنا کہا تھا۔

''کتنے دن سے جواب کا منتظر تھا لیکن آپ نے مجھے

مایوس کیا۔'' دوپٹا میرے سر سے سرک گیا تھا اس نے غور سے میری طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''آپ کے بال بہت خوب صورت ہیں، یہ میرا موبائل نمبر ہے۔'' وہ مجھے کارڈ دے کر چلا گیا تھا اور رات کو میں نے ابا سے موبائل مانگا تو وہ حیران ہوئے۔

''کس کو فون کرنا ہے دمی؟''

''ابا وہ پرچوں کے بارے میں سہیلی سے پوچھنا ہے۔ بہت مشکل پرچہ ہے۔'' میں اپنے فراٹے سے جھوٹ بولنے پر حیران رہ گئی تھی اور کچن میں آ کر کپکپاتی ہوئی انگلیوں سے میں نے نمبر ملایا تھا۔ پہلی گھنٹی پر ہی کال ریسیو ہو گئی تھی۔

''ہیلو!'' اسپیکر سے نکلتی گمبھیر آواز نے مجھے سن کر دیا۔ مجھے کچھ لمحوں تک تو جیسے ہوش نہ رہا وہ آگے سے ہیلو، ہیلو کر رہا تھا۔ مجھے لگا وہ کال کاٹ دے گا۔

''میں اساور بول رہی ہوں۔'' میں نے جلدی کہا تھا۔

''اساور!'' وہ جیسے بے یقین ہوا تھا۔ اس رات ہم نے ڈھیروں باتیں کی۔ پھر ہم کئی بار کالج کے باہر مہرینہ کے گھر پر بھی ملے۔ جس دن ہمارا آخری پیپر تھا اس دن مجھے اماں نے وہ خبر سنائی جس نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ خالہ اپنے بیٹے شرجیل کے لیے میرا رشتہ لائی تھی۔ کہاں میں کہاں وہ جاہل شرجیل (اس وقت لگتا تھا)

''اماں میں شرجیل سے کبھی شادی نہیں کروں گی، اس کی دہی اور دودھ کی دکان ہے مجھے کسی کے گھر میں باندی بن کر نہیں جانا۔'' تب اماں نے پہلی بار مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ میں احتجاجاً کمرے میں بند ہو گئی تھی اور آدھی رات کو جب سب سو گئے تھے تو دبے پاؤں اٹھی کالج بیگ میں پاؤچ میں رکھے موبائل کو نکالا تھا اور محسن کو کال کی تھی۔ وہ موبائل اس نے مجھے گفٹ کیا تھا۔ پہلے پہل تو انکار کیا تھا پھر اس کی ناراضی کے خیال سے لے لیا تھا میں نے روتے ہوئے اسے ساری بات بتائی تھی۔ اس نے مجھے ملنے کا کہا تھا پھر میں نے ایک سنگین فیصلہ کیا اس کے مشورے پہ عمل کرتے ہوئے گھر سے بھاگنے کی تیاری کر لی۔ تمہیں یاد ہو گا پارٹی والے دن تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اتنا بڑا بیگ کیوں لے جا رہی ہو اور میں نے کہا تھا مجھ سے ایمان نے کچھ منگوایا ہے۔ اس دن میں ساری کشتیاں جلا کر محسن کے ساتھ چلی گئی تھی۔ پتا نہیں میرے پیچھے گھر والوں کا کیا حال ہوا ہو گا تمہیں تو علم ہو گا دوست؟

وہ مجھے ایک دوست کے فلیٹ پر لے گیا تھا تب مجھے کوئی خوف نہیں تھا۔

''ہم کل صبح نکاح کریں گے۔'' وہ میرے قریب آیا تھا۔ میں نے احتجاج کرنا چاہا تو اس نے کہا تھا۔ ''صبح تو ہم نکاح کر لیں گے ناں!'' اس کی بری نیت میں نے بھانپ لی تھی مگر میں اس کے جال میں بری طرح پھنس چکی تھی۔ اور اس رات کے بعد دوست کو بلانے کا کہہ کر ایسا گیا کہ پھر اگلی صبح قاضی اور وہ واپس نہیں آیا تھا۔ اس لمحے مجھے ادراک ہوا کہ میں کیا کر بیٹھی ہوں۔ تین دن اس کے دوست کے فلیٹ پر پڑی رہی اور وہ میری مجبوری سے فائدہ اٹھاتا رہا اور جب اس کا دل مجھ سے اوبنے لگا تو اس نے مجھے بیچنا شروع کر دیا۔ تم یہ بین کر رہو تامت کیونکہ مجھے پتا ہے تم بہت حساس ہو ہر کسی کا غم تمہیں اپنا لگتا ہے۔ میں ایک بند گلی میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر چوتھے دن وہ آیا تو پولیس اس کے ساتھ تھی۔ آگے کی کہانی سنانے کی تاب نہیں اب میں دارالامان میں ہوں۔ سب راہ بند ہے اور اماں اور ابا کی بہت یاد آتی ہے۔ فوزیہ اور مائرہ کے چہرے نگاہوں میں گھومتے ہیں۔ اماں کہتی تھی باہر کی دنیا لڑکیوں کے لیے عفریت کے مانند منہ کھولے ہوتی ہے۔ جوان کو نگل لیتی ہے۔ ان کو پھونک، پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ ایک غلط قدم ان کو اندھیری دنیا میں لے جاتا ہے۔ دعا کرتی ہوں زندگی میں کبھی تم سے ملاقات نہ ہو کیونکہ میں تم سے نظریں ملانے کے قابل ہی نہیں۔ ذہن پر بڑا بوجھ تھا سو میں نے اپنا بوجھ تم پر ڈال دیا۔ تم مجھے ہرگز نہ بتانا کہ اماں، ابا اور گھر والوں پر کیا گزری۔ مجھے تو ویسے ہی پچھتاوؤں کے ناگ ہر آن ڈستے ہیں اور جانے کب تک ڈستے رہیں۔

فقط تمہاری بدنصیب دوست

اساور''





ناولٹ

دوسرا اور آخری حصہ

بدلے رشتے

غزالہ عزیز

''اماں...... تم سمجھتی کیوں نہیں ہو...... میرا اور ساجدہ کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ میرا اس کے ساتھ گزارہ نہیں ہوگا۔'' جاذب مسلسل ماں کو اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر زینب بی بی اپنے مزاج کے باعث اپنی ضد سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھیں۔ انہیں شروع سے اپنی من مانی کرنے کا شوق تھا۔ شوہر کی زندگی میں بھی وہ اتنی ہی دبنگ تھیں۔ ہمیشہ اپنی مرضی ہی چلائی تھی۔ اس لیے بیٹے کو دوٹوک لہجے میں

سمجھایا تو جواباً وہ اُن کے لہجے کے قطعی پن کے آگے مزید کچھ بول ہی نہیں سکا۔

''دیکھ جاذب...... میں نے تجھے اپنا فیصلہ ہی نہیں سنایا، تیرے چاچے کو زبان دی ہے۔ تو جانتا ہے ہماری برادری میں زبان دے کر مکرا نہیں جاتا ہے اور مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ آخر تجھے ساجدہ کے لیے اعتراض کیوں ہے۔ کس بات کی کمی ہے اس میں...... خوب صورت ہے، کم عمر ہے۔ تو جس طرح چاہے اپنے رنگ میں رنگ سکتا ہے اسے۔''

اور ماں کی بات سن کر جاذب کو سمجھ نہیں آیا کہ وہ اپنے اعتراض کو کن لفظوں میں ماں کو سمجھائے کہ وہ ساجدہ کو بہو بنانے کی خواہش سے دستبردار ہو جائیں۔

''بس جاذب...... تو نے میرے سامنے تو اعتراض کر دیا ہے لیکن اپنے چاچا، چاچی کے سامنے بالکل زبان مت کھولنا۔ ورنہ میری تربیت پر لوگ برادری والے باتیں بنائیں گے۔ اب تجھے میری زبان کی لاج نبھانی ہے۔''

زینب بی بی نے اپنا فیصلہ سنایا اور ساتھ ہی دبے لفظوں میں سرزنش بھرے انداز میں اسے سمجھایا بھی کہ وہ بلاوجہ کے اعتراض کو جواز بنا کر اس رشتے سے پیچھے ہٹنے کی کوشش ہرگز نہیں کرے۔ یہ اس کی بھی عزت کا معاملہ ہے۔ لہٰذا ان کے کمرے سے باہر جانے کے بعد جاذب بیٹھا سوچنے لگا کہ وہ چاہ کر بھی ماں کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکے گا۔ جانتا تھا کہ اس طرح ماں کو دکھ ہی نہیں پہنچے گا ان کی سُبکی بھی ہوگی۔ اس لیے خاموش ہو کر ان کی خواہش کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

جاذب پندرہ برس کا تھا...... جب زینب بی بی بیوہ ہوئی تھیں۔ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے زہریلے سانپ نے اس کے باپ کو ڈس لیا تھا۔ اور وہ اتنا زہریلا سانپ تھا کہ جاذب کے باپ کو طبی امداد ملنے کی مہلت بھی نہیں ملی...... چھوٹی بہن ہاجرہ اس سے پانچ برس چھوٹی تھی۔ جاذب اس وقت میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔ اتنا سمجھدار اور مضبوط نہیں تھا کہ بے آسرا ہونے والی ماں کا سہارا بنتا۔ کیونکہ عورت صرف شوہر کے مرنے سے بے آسرا نہیں ہوتی بلکہ جب گھر کا کمانے والا نہ رہے تو بے سہارا بھی ہو جاتی ہے لیکن زینب بی بی عام عورتوں کی طرح کوئی کمزور عورت نہیں تھیں۔ باہمت اور حوصلے والی تھیں۔ اسی لیے سر کے سائیں سے محروم ہونے کے بعد انہوں نے گھر کی ذمّے داری کا بوجھ بیٹے کے کاندھوں پر نہیں ڈالا۔ نہ ہی اس کی پڑھائی چھڑائی تھی بلکہ خود لوگوں کے گھروں میں کھانا پکانے کا کام کر کے جاذب اور ہاجرہ کی پرورش کرنے لگیں۔ انہیں پڑھایا، لکھایا تب جا کر جاذب اس قابل بنا کہ آج بیوہ ماں کا مضبوط سہارا بن سکے۔ جس کی چھاؤں میں اب زینب بی بی پُرسکون بیٹھی تھیں۔ جاذب نے شہر سے گریجویشن کیا تھا...... جبکہ ہاجرہ کو زیادہ پڑھائی کا شوق نہیں تھا تو انہوں نے میٹرک کے بعد ہاجرہ کی اپنے دیور کے بیٹے سے شادی کر دی۔ اور ساتھ ہی ساجدہ جو ہاجرہ کی نند تھی...... اسے اپنے جاذب کے لیے مانگ لیا تھا۔

یوں چند سال پہلے جاذب اور ساجدہ کی زبانی کلامی شادی کی بات پکی ہو گئی تھی۔ جاذب اس وقت شہر میں پڑھ رہا تھا۔ اس لیے اس کا دھیان ہٹ جانے کے خیال سے انہوں نے اسے بتایا نہیں تھا۔ اور اب جب وہ کالج سے بی کام کی ڈگری لے کر اپنے علاقے کی گارمنٹس فیکٹری میں کام کر رہا تھا۔ زینب بی بی کو کماؤ بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کا خیال آیا تھا۔ ساجدہ جس نے صرف آٹھ جماعتیں پاس کی تھیں اسے پڑھنے لکھنے سے زیادہ سجنے، سنورنے نت نئے فیشن کے کپڑے پہننے کا شوق تھا، ساتھ ہی گڈے، گڈی کا بیاہ بھی بڑے چاؤ سے رچانے اور گھر، گھر کھیلنے کی شوقین تھی۔ حالانکہ گھر والے جاذب کی نسبت سے چاہتے تھے کہ وہ کم از کم میٹرک ہی کر لے۔ مگر ساجدہ نے خود ہی پڑھائی چھوڑ دی۔ کیونکہ اب وہ بچپن و لڑکپن کی حدود سے نکل کر جوانی کے سنہرے دور میں داخل ہو چکی تھی۔ جب اس کی سہیلیاں جاذب کے ساتھ اس کی نسبت کے حوالے سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی تھیں۔ پھر وہ اٹھتے

بیٹھتے بس جاذب کی سنگت کے خواب دیکھنے لگی۔ لہٰذا ساجدہ کی پڑھائی میں عدم دلچسپی دیکھ کر گھر والوں نے بھی اس کے ساتھ زور زبردستی کرنے کے بجائے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ البتہ ساجدہ سے بڑے ماجد نے میٹرک کر لیا تھا اور کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ انہوں نے بچوں کا رشتہ بھی اپنے جیسی حیثیت کی ذات برادری میں طے کیا۔ اور بھلا جاذب سلطان جیسے خوبرو، پڑھے لکھے اور کماؤ لڑکے کا رشتہ کوئی بے وقوف ہی کفرانِ نعمت کے مترادف گنوا سکتا تھا۔ حالانکہ جاذب نے ماں کو وٹے سٹے کے رشتوں کے نقصانات بھی جتائے تھے۔ لیکن زینب بی بی کی بات اور زبان سے نکلا لفظ پتھر کی لکیر تھا۔ جسے مٹانا جاذب کے لیے مشکل تھا۔ پھر بھی اس نے ایک موہوم سی کوشش اور کر ڈالی کیونکہ اس نے اپنے لیے ساجدہ جیسی کم تعلیم یافتہ ماں، باپ کے لاڈ پیار میں بگڑی لاابالی لڑکی سے شادی کا کبھی نہیں سوچا تھا۔ جانے اس کی ماں کو ساجدہ میں کون سے گُن نظر آئے تھے۔

''اماں...... سب جانتے ہیں، وٹے، سٹے کا رشتہ اکثر آپسی ...گھریلو جھگڑوں اور ناچاقیوں کی نذر ہو کر کھٹا پڑ جاتا ہے۔ پھر آپ میرے ساتھ ہاجرہ کی گرہستی بھی کسی آزمائش میں مبتلا کرنا کیوں چاہتی ہیں، آپ نہیں سمجھ پا رہیں...... مگر مجھے یقین ہے میری اور ساجدہ کی ذہنی ہم آہنگی کبھی نہیں ہو سکے گی۔''

اور جاذب کی مشکل باتیں زینب بی بی کے پلے خاک نہیں پڑی تھیں۔ البتہ زبان دینے والی بات قول یا عہد کے برابر درجہ رکھتی ہے۔ اور اپنے عہد سے پھر کر وہ ساری برادری میں اپنی بے عزتی نہیں کرا سکتی تھیں۔ اس لیے دوٹوک لہجے میں اپنا فیصلہ سنا کر ہر اعتراض رد کر دیا۔

''تجھے خواہ مخواہ کے اندیشے پالنے کی ضرورت نہیں ہے جاذی، میں جانتی ہوں ساجدہ تھوڑی بے پروا اور سیدھی سادی لڑکی ہے مگر وہ بہت سوہنی اور معصوم ہے۔ بیوی بن کر تیرے پاس آئے گی تو، تو آپے ہی سارے فرق بھول جائے گا...... ویسے بھی اپنی عورت کو اپنے ڈھب پر چلانا مرد کا کام ہوتا ہے۔ وہ کم سن ہے، جلدی تیرے رنگ میں رنگ جائے گی۔ بس ایک بات میری اچھی طرح سمجھ لے جاذی...... تیری ماں اپنی زبان سے مکرنے والی عورت نہیں ہے۔ اس لیے اب تو مجھ سے اس معاملے میں کوئی ضد، بحث نہیں لگائے گا۔''

انہوں نے گویا بات ہی ختم کر دی تھی۔ جاذب بیچارہ کیا کرتا...... ماں کی قربانیوں کو بھول کر وہ ان کا دل توڑ کے ساری عمر کی ناراضی مول نہیں لے سکتا تھا۔ ماموں کے قصے سے آگاہ تھا وہ سو اس نے ہار مان لی۔ اور ساجدہ ایک ماہ بعد اس کی بیوی بن کر اس کے گھر اور زندگی میں داخل ہو گئی۔

اس شادی سے اس کی ماں اور بہن کے بعد کوئی بہت خوش تھا تو وہ خود ساجدہ تھی۔ جس نے جاذب کی منگیتر بننے کے بعد سے ہی اس کے سنگ زندگی بِتانے کے سنہرے سپنے دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ اور آج یہ سارے سپنے پورے ہو گئے تھے۔ وہ بہت خوش تھی۔ جانتی نہیں تھی کہ جاذب نے اس رشتے کی کتنی مخالفت کی تھی۔ کیونکہ زینب بی بی نے بیٹے کے انکار کی ہوا بھی گھر کی دہلیز سے پار جانے نہیں دی تھی۔ اور جاذی کو بھی سمجھا دیا تھا کہ وہ ساجدہ پر بھی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کرے گا۔ ان کا خیال تھا کہ ساجدہ کے ساتھ رہ کر رفتہ، رفتہ وہ سارے فرق خود ہی بھول جائے گا۔ اور شاید ایسا ہو بھی جاتا اگر جاذب واقعی اپنے اور ساجدہ کے درمیان ذہنی فاصلوں اور سوچ کے فرق کو بھلا دیتا۔ وہ تو پہلی رات ہی اس کے معیار پر پوری نہیں اتری تھی۔ پھر دل میں کیسے اترتی اور یہ مرادوں والی رات جاذب کی زندگی میں دوسرے شادی شدہ مردوں کی طرح آئی تھی مگر عام سے انداز میں ڈھل کر گزر بھی گئی۔

وہ صبح اٹھ کر نئی دلہن کے کوئی چاؤ چونچلے کرنے کے بجائے فیکٹری چلا گیا۔ اس نے زیادہ چھٹی نہیں لی تھی۔ جو لی تھی وہ شادی کے کاموں کی بھاگ دوڑ میں گزر گئیں۔ جبکہ ساجدہ اپنے میکے کی عادت کے

مطابق صبح دیر تک سوتی رہی۔ وہ تو ہاجرہ اسے کمرے میں آ کر نہ اٹھاتی تو ساجدہ نے دن چڑھے تک سوتے رہنا تھا۔ زینب بی بی کو اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ میکے کی عادتیں سسرال ساتھ لے آئی تھی۔ مگر پہلے دن ہی بہو پر روک ٹوک کر کے انہوں نے تائی سے ساس بننے کی کوشش نہیں کی۔ سوچا تھا کہ کسی دن اطمینان سے سمجھا دیں گی۔ مگر انہیں اندازہ چند دنوں بعد ہی ہو گیا کہ ساجدہ چکنا گھڑا ثابت ہوئی ہے۔ اسے کچھ بھی سمجھایا جاتا۔ وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتی۔ اپنی مرضی سے سوتی، اپنی مرضی سے جاگتی۔ حالانکہ بھائی کی شادی کی خوشی میں ہاجرہ ایک ہفتہ مزید ٹھہر گئی۔ لیکن ساجدہ کے رنگ ڈھنگ بدلتے نہ دیکھ کر اس نے بھی بچوں کے ساتھ سسرال کی راہ لی۔ لہٰذا ہاجرہ کے سسرال سدھارنے کے بعد زینب بی بی نے خود ہی ساجدہ کو چولھا، چوکی سنبھالنے کا حکم نامہ صادر کر دیا۔ کیونکہ تین ہفتوں میں ہی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ساجدہ خود سے احساس کر کے اپنی ذمّے داری اٹھانے والی نہیں ہے۔ ان کا دیور کے گھر زیادہ آنا جانا نہیں تھا۔ البتہ ہاجرہ ایک گھر میں رہتے ہوئے نند کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر بھی اس لیے خاموش رہی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ذمّے داری پڑنے پر ساجدہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح ذمّے دار بن جائے گی۔ دوسرے ہاجرہ کا نند، بھاوج کا رشتہ تھا جو بہت نازک ہوتا ہے۔ پھر بھلا وہ نند کے خلاف ماں سے کچھ بھی کیسے کہہ سکتی تھی...... ساجدہ حد سے زیادہ ناسمجھ اور بے پروا تھی لیکن ہاجرہ تو نہیں تھی۔ جو جانتے بوجھتے اپنی گرہستی کو اپنے ہاتھوں سے خراب کرتی۔ اور پھر بہو کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر زینب بی بی کو بھی اپنی بیٹی کے سسرال میں بیٹی کی خوشی اور عزت کا بڑا خیال تھا۔ پھر وہ کس سے شکوہ گلہ کرتیں۔ غلطی تو ان کی اپنی تھی۔ جلد بازی میں غلط فیصلہ کر بیٹھیں۔ البتہ ایک دن رسانیت سے پاس بٹھا کر ساجدہ کو سمجھایا تو اس نے بھی مجبوری میں شوہر کو خوش کرنے کے لیے جیسے تیسے گھر، گرہستی سنبھال لی۔ لیکن رفتہ، رفتہ زینب بی بی کو احساس ہونے لگا تھا کہ ان کے ہاتھ ایک خام پتھر آیا ہے جیسے کسی جوہری کی طرح تراش خراش کے ہیرا بنانا ان کا کام تھا مگر یہ تو بعد کی بات تھی۔ ابھی تو یہ طے کرنا تھا کہ وہ خام پتھر ہیرا ہے یا کوئلہ...... اور اس کا فیصلہ بھی جلد ہی وقت نے کر دیا تھا۔ وہ شادی کے ابتدائی دنوں میں ہی دعوتیں کھا، کھا کر اپنا، اتنا سارا وزن بڑھا چکی تھی کہ گھر کے کاموں میں چستی و پھرتی ناپید ہو چکی تھی...... پھر وہ لگن و دلچسپی کے بجائے مارے باندھے کام کیا کرتی...... زینب بی بی کی ہدایتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا آہستہ، آہستہ وہ بھی جھکنے لگی تھیں۔ اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ زیادہ سختی کرنے کی کوشش کرتیں تو ہاجرہ کو اس کی سسرال میں پریشانی سے دوچار ہونا پڑتا۔ سو زینب بی بی کی وہ مثال تھی کہ ساجدہ نام کی ہڈی حلق میں اس طرح اٹک گئی تھی جو نہ نگلی جاتی تھی اور نہ اگلی...... رہا جاذب تو اس نے ایسی چپ سادھی تھی جیسے وہ کوئی روبوٹ مشین ہو۔ جس کا کام وقت پر ہر فرض سرانجام دینا ہو اور بس...... اور جاذب کو بیوی کی بے پروائیوں پر باز پرس نہ کرتے دیکھ کر زینب بی بی کو یہی لگتا تھا کہ جاذب کی بے پروائی جیسے اس کا خاموش احتجاج ہو۔ سو انہوں نے بھی مجبوراً بیٹے کی طرح چپ سادھ لی۔ اگر جو جاذب سے کوئی بات کرتیں تو اس کی چپ ٹوٹنے کا خدشہ تھا۔ سو اس بند پر بند بندھا رہنے دیا۔ اسی میں شاید سب کی بہتری تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ عادت بدلی جا سکتی ہے مگر فطرت نہیں......

ساجدہ کو میکے میں کام کی عادت نہیں تھی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی...... سارا گھر تینوں بھاوجیں ہی سنبھالتی تھیں۔ لہٰذا اب سسرال کے بکھیڑے اس سے اکیلے سنبھلتے نہیں تھے۔ اور پھر وہ امید سے ہوئی تو اس نے ہاتھ پاؤں بالکل ہی چھوڑ دیے۔ بچے کی خوش خبری کے ابتدائی دنوں کی خراب حالت نے اسے ہلکان کر دیا تھا۔ دن بھر کا کھایا پیا سب الٹ جاتا۔ گھر کے کام نبٹانا تو دور اس سے تو اپنا آپ سنبھالنا مشکل

ہو رہا تھا۔ مجبوراً ہاجرہ کو ہی پندرہ دنوں کے لیے میکے آ کر ساجدہ اور گھر کی دیکھ بھال کرنا پڑی۔ پھر وہ کچھ دنوں بعد واپس چلی گئی تو گھر کے اوپر کے کاموں کے لیے زینب بی بی نے ملازمہ رکھ لی تھی۔ وہ خود بھی ملازمہ کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ چونکہ وہ بھی پہلی بار دادی بن رہی تھیں، اس لیے بہو کے ناز نخرے خوش دلی سے برداشت کر رہی تھیں۔ بالآخر ساجدہ نے صحت مند خوب صورت بیٹے کو جنم دیا۔ پہلا بچہ...... وہ بھی بیٹا...... سسرال میں ساجدہ کی آؤ بھگت بڑھ گئی تھی تو میکے میں بھی سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔

جاذب بھی بیٹے کی پیدائش پر خوش تھا۔ کیونکہ وہ صحت مند پیدا ہوا تھا۔ اور اولاد کا لڑکا یا لڑکی ہونے سے زیادہ صحت مند پیدا ہونا زیادہ خوشی کی بات ہوتی ہے۔ یہ جاذب کی اپنی سوچ تھی۔ بچے کا نام جمال رکھا گیا تھا۔ اور میکے، سسرال دونوں میں بچے کی خوب خوشی منائی گئی تھی۔ جس نے ساجدہ کا وزن خاصا بڑھا دیا تھا۔ اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ ساجدہ کی کوکھ سے اگلے پانچ سالوں میں دو بیٹے مزید پیدا ہوئے تھے۔ جس کے بعد وہ خود کو پہلے سے زیادہ معتبر اور نصیبوں والی عورت سمجھنے لگی تھی۔ جس نے شوہر کو تین، تین وارث دیے تھے۔ اس لیے اب سسرال میں وہ ساس کی کم ہی سنتی تھی۔ ساس کی ہر وقت کی ہدایتیں اسے ناگوار گزرتی تھیں۔ حالانکہ زینب بی بی اسے جو بھی سمجھاتیں، وہ اسی کے بھلے کے لیے ہوتا تھا لیکن ساجدہ کو لگنے لگا تھا کہ تائی رفتہ، رفتہ ساس بنتی جا رہی ہے۔ اس لیے وہ ان کی باتوں کو ہوا میں اڑانے لگی۔ جاذب تو ان کے درمیان کسی معاملے میں بولتا ہی نہیں تھا۔ جیسے اپنے کیے کی سزا وہ خود بھگت رہی ہوں۔ کیونکہ ساجدہ ان کی اکلوتی بہو تھی۔ جس نے انہیں بہت مایوس کیا تھا۔ شادی کے چھ سالوں بعد بھی وہ گھر اور بچوں کو ٹھیک طرح سے سنبھالنے سے قاصر تھی۔ اور ان چھ سالوں میں وہ چوتھی بار امید سے ہوئی تھی۔ وزن بھی پہلے سے کچھ بڑھ گیا تھا۔ چھ سالوں میں چار بچے...... ساجدہ سے تو سسرال کے دو افراد کی ذمّے داری سنبھالی نہیں جاتی تھی۔ اب تین اوپر تلے کے بچوں کے بکھیڑوں نے اس کی مت مار دی...... وہ پہننا اوڑھنا، بجنا سنورنا سب بھول چکی تھی۔ صرف چوبیس سال کی عمر میں ڈھلتے جسم کی عورت بن چکی تھی۔ زینب بی بی کو اب اپنے پڑھے لکھے، کم گو، سوبر سے بیٹے کے ساتھ ساجدہ جیسی کم تعلیم یافتہ اور آدابِ زندگی کے قرینوں سے نابلد لڑکی کو دیکھ کر احساس ہونے لگا تھا کہ جاذب نے ان سے کتنا درست کہا تھا۔ مگر تب انہوں نے بیٹے کی ایک نہیں سنی۔ یہ تو واقعی بے جوڑ رشتہ تھا پھر اتنی آسانی سے کیسے جڑ گیا۔ وہ سوچتی تھیں...... شاید قسمت یا تقدیر اسی کو کہتے ہیں۔ زینب بی بی اپنا قصور قسمت کے کھاتے میں ڈال کر خود کو تسلیاں دے لیا کرتیں...... اب چھ سال گزر چکے تھے۔ جاذب نے نصیب سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ اور زینب بی بی نے حالات سے۔ شادی کے ساتویں سال وہ چوتھے بچے کو جنم دینے جا رہی تھی۔ اس لیے آج کل ساجدہ کی بری حالت تھی۔

گھر کے اوپری کاموں کے لیے ملازمہ اپنا کام ختم کر کے چلی جاتی۔ اور سارا دن بچے گندے، میلے کپڑوں میں صحن میں کھیلتے رہتے۔ شور مچاتے تو ساجدہ سر پر دوپٹا باندھ کر کمرا اندر سے بند کر کے ساری دوپہر سوئی رہتی۔ یا پھر لائٹ نہ ہوتی تو شور مچاتے بچوں پر چیختی، انہیں مارتی...... صرف جمال ہی اسکول جانے والا تھا۔ ورنہ شعیب اور ذوہیب تو ابھی بہت چھوٹے تھے۔ ویسے بھی گاؤں میں دو، دو سال کے بچوں کو نرسریوں میں بھیجنے کا رواج نہیں ہوتا۔

ان ہی کڑے دنوں میں بشیر احمد کی کراچی سے موت کی خبر آ گئی تھی۔ اور سالوں کی ناراضی بھول کر زینب بی بی روتی پیٹتی جاذب کے ساتھ کنجاہ سے کراچی روانہ ہو گئیں۔ امجد نے ہی انہیں بشیر احمد کے انتقال کی خبر دی تھی۔ وہ بشیر احمد کا سالا جو تھا۔ اور زینب بی بی پیچھے گھر اور ساجدہ کی دیکھ بھال کے لیے ہاجرہ کو چھوڑ کر آئی تھیں۔ اور یہاں آ کر احساس ہوا کہ بشیر احمد تو واقعی ان کا چھوٹا لاڈلا اکلوتا بھائی تھا۔ جس سے انہیں بہت

پیار تھا مگر اپنی ضد اور انا پرستی کے ہاتھوں اتنے سالوں سے چھوٹی سی بات کو بڑھا کر جس بھائی سے سارے رشتے ناتے ختم کر ڈالے تھے ..... موت کے ظالم ہاتھوں نے وہ اکلوتا واحد رشتہ بھی ان سے چھین لیا۔ وہ اتنے سالوں بعد مردہ بھائی کے چہرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا سوچ کر آئی تھیں۔ مگر یہاں آ کر پتا چلا تھا کہ ان کا انتظار کیے بغیر بشیر احمد کو منوں مٹی تلے دبا بھی دیا گیا۔ ساری عمر کے لیے وہ پیارا چہرہ ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اب ان کے پاس پچھتاوے اور ملال کے سوا کچھ نہیں تھا۔ البتہ اپنا غصہ انہوں نے امجد اور بھتیجی شاہینہ کے ساتھ اس کے شوہر عامر پر بھی نکالا۔ اور انہیں خوب ملامت بھی کی تھی۔

جواب میں شاہینہ نے بھی کوئی لحاظ کیے بغیر پھوپی کو کھری کھری سنائی تھیں وہ کتنی کٹھور بہن تھیں۔ پھر اب غم سے گیلی لکڑی کی طرح چیخ کیوں رہی تھیں...... وہ جواباً شاہینہ کے طعنوں اور ملامتوں کا کوئی جواب نہیں دے سکیں تو ہار مان کر چپ چاپ بیٹے کے ساتھ یہاں سے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر جانے سے پہلے انہیں گھر میں بسمہ کی واحد بچ جانے والی ذات کی بے وقعتی کا اندازہ بھی ہو چلا تھا۔ ماموں اپنی بیوی کی وجہ سے مجبور تھے تو شاہینہ کے اپنے اعتراضات اور خدشات تھے۔ جس کے باعث وہ بسمہ کو اپنے ساتھ رکھنے پر تیار نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے مردہ بھائی کی زندہ نشانی (بسمہ) کو اپنے ساتھ لے جانے کا آناً فاناً فیصلہ کر لیا۔ جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوا تھا۔ بسمہ نے بھی ان دو دنوں میں بدلتے خونی رشتوں کے بھرم ٹوٹتے دیکھ لیے تھے۔ اس نے ماموں ہی نہیں بہن کے بچوں کو بھی اپنی گود میں کھلایا تھا۔ وہی سگے رشتے اب اس کے وجود کو ناپسندیدہ بوجھ سمجھ رہے تھے۔ اس لیے اس نے بھی پھوپی کے فیصلے پر اعتراض اٹھانے کے بجائے قسمت کی ستم ظریفی سے سمجھوتا کر لیا...... جس نے اسے یتیم ہی نہیں بے آسرا بھی کر دیا تھا۔ اب یہ تقدیر کی مرضی تھی کہ وہ آگے جا کے اس پر مہربان ہوتی یا نہیں ...... یہ بسمہ کی قسمت پر منحصر تھا۔

فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ جب بس منزل پر پہنچ کر جھٹکے سے رکی تھی۔ جاذب چونک کر سیدھا ہوا تھا۔ اس نے رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی۔ اس کی پچھلی زندگی کے چھ سالوں کا سفر اس کی سوچوں نے چھ گھنٹوں میں طے کر لیا تھا۔ بسمہ بھی جاگ رہی تھی۔ مگر جاذب کی طرح وہ ماضی کے بجائے حال اور مستقبل کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔ گاڑی کے رکنے پر اس کی سوچوں کا سفر بھی تمام ہوا تھا۔

وہ منگول کے علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں سے جاذب نے ٹیکسی کا انتظام کر کے اپنے گاؤں کنجاہ پہنچنا تھا۔

ٹیکسی گھر کے سامنے چھوٹی سی تنگ گلی میں جا کر رکی تھی۔ وہ گھر کے سامنے اترے تو گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ جس سے گھر کے اندر کا سارا نقشہ صاف نظر آ رہا تھا۔ بچوں نے صحن سے لے کر برآمدے تک کھلونے اور پھل کے چھلکے پھیلا رکھے تھے۔ جاذب ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے گھر کے دروازے پر دستک دینا چاہتا تھا۔ لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر شرمندگی سے ایک طرف ہو کر ماں اور ان کے ساتھ کھڑی بسمہ کو گھر کے اندر جانے کا راستہ دیا۔ جاذب کے ساتھ زینب بی بی کو بھی ایک لمحے کے لیے گھر کی یہ حالت دیکھ کر بسمہ کی موجودگی میں خفت محسوس ہوئی...... پھر وہ بسمہ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''آ جاؤ پتر...... یہ ہمارا غریب خانہ ہے، آج سے تم بھی اسے اپنا ہی گھر سمجھنا...... ہم سب بھی غیر نہیں، تمہارے اپنے ہیں۔'' زینب بی بی نے اپنائیت بھرے لہجے میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ ان کے ساتھ گھر میں داخل ہو گئی۔ جاذب ان کے پیچھے سامان اٹھائے گھر کے صحن میں داخل ہوا تو اندر سے ساجدہ کے بچوں پر چیخنے چلانے کی آوازیں بڑی واضح طور پر وہاں کھڑے تینوں افراد کو سنائی دے رہی تھیں۔ جاذب ایک بار پھر سے شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ جبکہ

زینب بی بی، بیٹی (ہاجرہ) کو آواز دیتے ہوئے صحن سے گزرتی برآمدے میں رکھے بڑے سے رنگین پلنگ پر جا بیٹھیں۔ بسمہ ابھی تک صحن میں ہی کھڑی تھی۔ ماں کی آواز پر برآمدے کے دائیں جانب بنے باورچی خانے سے ہاجرہ نکل کر سامنے آئی اور ماں کی جانب بڑھ گئی۔

''ارے اماں...... آپ لوگ اتنی جلدی واپس آ گئے۔ آپ لوگ تو......؟''

بسمہ کو بیچوں بیچ صحن میں گم صم کھڑا دیکھ کر ہاجرہ نے اگلی بات منہ کے اندر روک لی۔ اور ماں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ تب ہی زینب بی بی نے بسمہ کی طرف دیکھ کر ہاجرہ سے اس کا تعارف کرایا۔

''یہ بسمہ ہے ہاجرہ...... تمہارے ماموں کی چھوٹی بیٹی...... اب یہ ہمارے ساتھ ہی رہے گی...... آ جاؤ بسمہ پتر...... وہاں کیوں کھڑی ہو۔''

ہاجرہ نے بغور اسے دیکھا تھا اور بسمہ نے خاموشی سے زینب بی بی کی طرف برآمدے میں قدم بڑھا دیے۔

''السلام علیکم......'' بسمہ نے ہاجرہ کو سلام کیا تو اس نے رکی سا جواب دیا۔

''وعلیکم السلام...... اور جاذب بھائی...... آپ وہاں کیوں کھڑے ہو؟''

''اماں...... میں جا کر ساجدہ کو بتاتی ہوں۔'' ہاجرہ اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔ جبکہ جاذب سامان لے کر برآمدے کی جانب بڑھتے ہوئے ایک کمرے میں چلا گیا۔

بسمہ اب پلنگ پر بیٹھ چکی تھی۔

''تم آرام سے بیٹھو پتر...... ابھی ہاجرہ آتی ہے تو میں اسے کہتی ہوں کہ تمہیں اندر لے جائے۔ تم ہاتھ منہ دھو کر دو گھڑی آرام کر لینا۔ پھر دوپہر کا کھانا ساتھ کھائیں گے۔''

زینب بی بی نے نرم لہجے میں کہا تو بسمہ سوچنے لگی کہ یہ ساجدہ کون ہے۔ اور اس سے باہر ملنے کیوں نہیں آئی۔ مگر صرف سوچ سکی تھی۔ بولی کچھ نہیں......

جانے اندر جاذب نے اپنے کمرے میں جا کر ہاجرہ کو کیا بتایا تھا کہ وہ جلد ہی باہر برآمدے میں واپس آ گئی تھی۔ اور کچھ دیر وہیں کھڑی سوچتی رہی کہ اس گھر میں ساجدہ سے اپنی ساس، شوہر اور بچوں کا بکھیڑا سنبھلتا نہیں تھا اور اس کی ماں اپنے ساتھ ایک اور مہمان کو لے آئی۔ جانے کیوں اور کس مقصد سے؟ تب ہی بسمہ کی نظر اس پر پڑی تو وہ جھینپ کر اس کی طرف چلی آئی۔ اور ذہن میں کلبلاتے سوالوں کو جھٹک کر بسمہ سے ماموں کی بے وقت موت کا افسوس کرنے لگی۔

''بہت دکھ ہوا تھا ہم سب کو ماموں کے انتقال کی خبر سن کر...... اور میں تو اماں کے ساتھ تمہارے گھر کراچی آنا بھی چاہتی تھی۔ ماموں سے ملنے کی بڑی خواہش تھی مگر......!''

ہاجرہ ایک لمحے کے لیے رکی تو بسمہ کی آنکھوں میں باپ کے ذکر پر پھر سے نمی تیرنے لگی۔ جسے وہ اندر ہی اندر پینے لگی تھی۔

''مگر کیا کرتی...... ساجدہ بھابی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس کو گھر پر اکیلا چھوڑا جاتا...... اس لیے نہیں آ سکی۔ پر یقین مانو...... مجھے بہت افسوس اور دکھ ہے۔ اتنی سی عمر میں ماں، باپ کا سایہ تمہارے سر سے چھن گیا۔ لیکن تم خود کو اکیلا مت سمجھنا۔ ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔'' ہاجرہ نے آگے بڑھ کر بسمہ کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''بس ہاجرہ آپی...... قسمت کی مرضی کے آگے کوئی کیا کر سکتا ہے۔ وہ تو پھوپی زینب کی مہربانی ہے جو مجھ بے سہارا کو بے آسرا ہونے سے بچا کر اپنے ساتھ یہاں لے آئیں۔ ورنہ میں تو واقعی قسمت کی ستم ظریفی کے ہاتھوں رُل جاتی۔'' بسمہ نے پہلی بار اپنے لب کھولے تو ہاجرہ اسے اپنے سے الگ کر کے ماں کی طرف سنجیدگی سے دیکھنے لگی۔ جبکہ بسمہ تو پھوپی کو تشکرانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی اور اس کی عاجزی دیکھ کر زینب بی بی کا دل بھی گداز ہونے لگا تو اسے پکڑ کر اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا اور تسلی دینے لگیں۔

''او نہ پتر...... کیسی مہربانی...... تو، تو میرا اپنا خون

ہے، میرے سگے ماں جائے کی بیٹی ہے۔ اس کے جانے کے بعد تجھے سنبھالنا میری ذمے داری ہے۔ کیا ہوا جو تیرے مامے اور بہن، بہنوئی نے اپنی ذمے داری کا احساس نہیں کیا، ہم بھی تیرے اپنے ہیں تو کسی بات کی فکر مت کرنا۔"

اور ماں کی بات سن کر ہاجرہ کو بسمہ کی یہاں آمد کی اصل وجہ کا کچھ، کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ مگر وہ اب بھی ماں کے اس اقدام پر متجسس تھی۔ بسمہ کے اندر جاتے ہی اس نے ماں سے ساری بات جان لینی چاہی تھی۔ اس لیے فی الوقت بسمہ اور ماں کے سفر سے آنے کا سوچ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ البتہ جانے سے پہلے بسمہ کو مخاطب کر کے ماں کی تائید ضرور کرتی گئی۔

"اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں بسمہ...... اب تمہیں کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم لوگ سفر سے تھکے ہوئے آئے ہو، میں تم لوگوں کے لیے کچھ چائے پانی کا بندوبست کرتی ہوں پھر سب مل کر ساتھ کھانا کھائیں گے۔" ہاجرہ پُرسکون سی ہو کر وہاں سے کچن کی جانب چلی گئی۔ کیونکہ بسمہ کی آمد ہی نہیں خود بسمہ بھی اس کی نجات دہندہ بن سکتی تھی۔ اسی لیے وہ مطمئن نظر آ رہی تھی۔

اندر کمرے میں ساجدہ اور جاذب کے درمیان کیا بحث ہو رہی تھی۔ اس کا اندازہ زینب بی بی کو بخوبی ہو چکا تھا۔ اس لیے انہوں نے فوری طور پر بسمہ کو اندر فریش ہونے کے لیے بھیجنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ وہیں برآمدے میں پلنگ پر زینب بی بی کے پاس بیٹھی ان سے ان کے خاندان کی باتیں سن رہی تھی۔

☆☆☆

"خدا کے واسطے ساجدہ...... کبھی تو اپنے مزاج پر سکون سے قابو پانے کی کوشش کیا کرو...... ہر وقت معصوم بچوں پر چیختی چلاتی رہتی ہو۔ تمہیں تو نہ گھر والوں کا لحاظ رہا ہے اور نہ محلے والوں کی پروا...... کم از کم مہمانوں کی ہی پروا کر لیا کرو۔"

جاذب کی ملامت پر وہ غصے سے اسے گھور رہی تھی۔ سفر سے واپسی پر نہ اس کی طبیعت پوچھی نہ مزاج پُرسی کی تھی۔ بس نصیحتیں کرنے بیٹھ گیا تھا۔ اسے جاذب پر تاؤ آیا۔ اور وہ اس کی دلی کیفیت سے بے خبر اپنی بولے جا رہا تھا۔

"وہ لڑکی بیچاری کیا سوچ رہی ہوگی۔ تمہاری آواز باہر صحن تک سنائی دے رہی تھی اور کسی کا نہ سہی تو اپنی صحت کا ہی کچھ خیال کر لو۔ اس طرح بچوں پر چیخ چلا کر تم اپنا بی پی ہائی کر لیتی ہو۔ اور اس کنڈیشن میں یہ تمہارے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے کچھ اندازہ بھی ہے تمہیں۔" جاذب نے غصے کے بجائے رسانیت سے اسے سمجھاتے ہوئے روتے ہوئے شعیب کو بازو سے تھام کر اپنی گود میں بٹھایا تھا۔ وہ ماں کو شکایتی نگاہوں سے دیکھتا باپ سے چمٹ گیا۔ جبکہ ساجدہ کی سوئی لفظ "لڑکی" پر اٹکی تھی۔ اس کا شوہر کس لڑکی کی بات کر رہا تھا اور وہ چپ نہیں رہی۔

"کون لڑکی...... کس کی بات کر رہے ہو تم؟" ساجدہ نے بے ساختہ نروٹھے لہجے میں استفسار کیا۔ جاذب نے اس کے لہجے پر چونک کر اسے دیکھا پھر وضاحت کرنے لگا۔

"میں بشیر ماموں کی بیٹی بسمہ کی بات کر رہا ہوں۔ وہ ہمارے ساتھ ہی آئی ہے۔ اماں اسے اپنے ساتھ لے آئی ہیں۔ صحن میں اماں کے پاس بیٹھی ہے۔ جانے کیا سوچ رہی ہوگی تمہارے بارے میں۔ کیسی ماں ہو تم...... اپنے ہی بچوں پر اتنا چیخ چلا رہی ہو۔" جاذب نے اس کو سرزنش بھرے لہجے میں کہا تھا مگر وہ الٹا اسے ہی ملامت کرنے لگی۔

"ہاں تو کچھ بھی سوچا کرے وہ۔ مجھے کیوں پروا ہوگی، میرے بچے ہیں، میں ڈانٹوں یا ماروں...... وہ کچھ بھی سوچنے والی کون ہوتی ہے۔ اور تمہیں اس حالت میں میری پروا ہونے کے بجائے اس مہمان لڑکی کی فکر ستا رہی ہے۔ ذرا اپنے آفت کے پرکالہ، ٹیڑھے بچوں کو دیکھا ہے، سارا، سارا دن میرے سر پر شور مچا، مچا کے سر میں درد کر دیتے ہیں۔ تمہیں پورا دن

ان کے ساتھ گزارہ کرنا پڑے تو پتا چلے۔"

ساجدہ نے لڑاکا عورتوں کی طرح سائڈ پر پڑا دوپٹا اٹھا کر اپنے سر کے گرد کس کر باندھ لیا۔ ساتھ، ساتھ دُکھتے سر کو ہاتھ سے دباتی جا رہی تھی۔ اور جاذب سوچنے لگا کہ اس عورت کو سمجھانا واقعی بہت مشکل ہے، اگر وہ مزید بحث کرے گا تو شاید بحث جھگڑے میں بدل جائے۔ شور کمرے سے باہر جائے گا تو بعد میں اسے ہی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے وہ بیوی سے مزید الجھے بغیر بچے کو گود سے اتار کر سفر کی تھکن کے باعث فریش ہونے کے لیے بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جھک کر بچے کے گال پر پیار کرتے ہوئے بولا۔

"جاؤ شوبی بیٹا...... جا کر باہر صحن میں کھیلو۔ تمہاری ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، انہیں آرام کرنے دو۔" جاذب نے ساڑھے تین سالہ شعیب عرف شوبی کو نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ چپ چاپ باپ کی گود سے اتر کر بھاگتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ مبادا ساجدہ پکڑ کے پھر سے پٹائی کرنے لگے اور ساجدہ سر پر دوپٹا باندھنے کے بعد بیڈ پر لیٹنے کے بجائے بیٹھی رہی۔ اسے باہر آنے والی لڑکی (مہمان) کے بارے میں کھد بُد ہو رہی تھی۔ جبکہ جاذب الماری سے خود اپنے کپڑے نکالنے لگا تاکہ نہا کر چینج کر سکے۔

"تائی جی کو بھی چھوٹے سے گھر میں میلا لگانے کا شوق ہے، بھلا اس لڑکی کو یہاں ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب اس کی مہمان نوازیاں کون کرے گا۔ میری تو کسی کو پروا ہی نہیں ہے ناں اس کے اپنے مامے، مامی نہیں تھے۔ جو یہاں ہمارے سر پر آ کر بیٹھ گئی۔"

جاذب کو باتھ روم کی جانب جاتا دیکھ کر ساجدہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اپنا غصہ نکالنے لگی۔ اسے بسمہ کی آمد اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ تو جاذب جلدی سے واش روم میں جا کر دروازہ بند کر چکا تھا۔ ورنہ ساجدہ کی بات سن کر اسے سرزنش ضرور کرتا۔ جبکہ ساجدہ آج کل ضرورت سے زیادہ چڑچڑی ہو رہی تھی۔ اس لیے جاذب اس کی حالت کے پیشِ نظر خود

ہی خاموش رہنے میں عافیت سمجھتا تھا۔ البتہ پورے گھر میں صرف اماں (زینب بی بی) کی ذات تھی جس سے ساجدہ دبتی تھی۔ وہ شروع سے دبنگ اور حاکمانہ مزاج کی مالک تھیں۔ اس لیے ساجدہ کی لگام انہوں نے کسی حد تک کس رکھی تھیں۔

جاذب نے تو صرف ماں کے کہنے پر شادی کے لیے ہامی بھری تھی۔ اور یہ بات اسے اچھی نہیں لگی تھی۔ مگر کیا کرتی...... وہ خود شروع سے جاذب کو پسند کرتی تھی۔ اس کی سنگت کے خوش نما خواب دیکھا کرتی تھی۔ ورنہ برادری میں جاذب جیسے نوجوان کی جانے کتنی خوب صورت اور طرح دار لڑکیاں طالب تھیں۔ جو بنا کسی کوشش کے اس کے نصیب کا ستارہ بن گیا تھا۔ کیونکہ شاید اس کے...جذبے صادق تھے۔ جبکہ اس کا اپنا دل جاذب کے لیے دھڑکتا تھا۔ اس کا ساتھ مانگتا تھا۔ وہ اس سے محبت کرنے لگی تھی۔

مگر جاذب کو پا کر اندازہ ہوا کہ اس کے دل کو لگی عشق کی آگ یک طرفہ ہی رہی تھی۔ جاذب کی رفاقت میں اسے اپنے لیے وہ گرمجوشی اور بے قراری نہیں ملی تھی۔ جو کسی من چاہی ہستی کو پا کر ملا کرتی ہے۔

اور اب مگر شادی کے سات سالوں میں جاذب کے لیے اس کی محبت میں گزرتے وقت کے ساتھ اضافہ ہی ہوا تھا۔ اس لیے وہ ساس کو ناراض کر کے جاذب کا ساتھ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ جانتی تھی کہ جاذب ماں کا کتنا فرماں بردار اور خدمت گزار ہے، اگر ماں کی خواہش اور خوشی کی خاطر وہ ساجدہ کو اپنا سکتا تھا تو ماں کے کہنے پر اسے چھوڑ بھی سکتا تھا۔ اسی لیے ساجدہ شوہر کی خوشی اور خواہش کے مطابق ڈھلنے کے بجائے ساس کی خوشنودی میں خود کو بدلنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن شاید اپنی فطرت اور مزاج کے برعکس زیادہ دیر سمجھوتا نہیں کر سکی۔ کیونکہ اب وہ تین بیٹوں کی ماں بننے کے بعد سسرال میں اپنے قدم مضبوط کر چکی تھی۔ اس لیے اب ساس کی پروا کرنا بھی چھوڑ دی اور سمجھوتا تو زینب بی بی کو بھی کرنا پڑا تھا۔ ساجدہ ان کا اپنا انتخاب تھی۔ لہٰذا وہ بیٹے سے اس کی بے پروائیوں کی شکایت بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے بھی اب بہو کو کچھ کہنا، سننا چھوڑ دیا تھا۔ اور جب وقت گزرنے کے ساتھ ساجدہ کے مزاج میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ آنے لگا تو وہ بھی ساس کی باتوں پر دھیان دینے لگی۔ لیکن اوپر تلے کے تین بچوں کو سنبھالنا جن کی عمروں میں دو، دو سال کا فرق تھا۔ ساتھ ہی گھر داری کی ذمے داری کو خوش اسلوبی سے نبھانا اب چوتھے بچے کی آمد اس کے لیے یہ سب کٹھن ثابت ہو رہا تھا۔ کم عمری میں ہونے والی شادی کے باعث شادی شدہ زندگی کو جس قرینے سے سنبھالنے کی ضرورت ہوتی ہے، ساجدہ اس امتحان میں ناکام ہو چکی تھی۔ اور اب صورتِ حال سب کے سامنے تھی۔

بہر حال آج بسمہ کی آمد پر دوپہر کے کھانے پر بسمہ کا باقاعدہ اس سے تعارف ہوا تھا۔ کیونکہ اپنے کمرے میں بیٹھے اس سے صبر نہیں ہوا تو وہ صحن میں آ گئی تھی۔ تب تک ہاجرہ بھی دوپہر کا کھانا بیٹھک میں لگا چکی تھی۔ اور بسمہ سے مل کر ساجدہ کو یہ بھی پتا چل گیا کہ اب وہ یہیں رہے گی۔ اور یہ بات ساجدہ کو پسند نہیں آئی۔ ساس جوان بھتیجی کو اپنے گھر ساتھ رکھنے کے لیے لے آئی۔ اگرچہ شوہر پر اسے پورا بھروسا تھا۔ وہ لڑکیوں یا پرائی عورتوں میں دلچسپی لینے والا مرد نہیں تھا۔ کیونکہ ساجدہ کا شمار شادی کے سات سالوں بعد بھی خوب صورت عورتوں میں ہوتا تھا۔ جاذب کا اس سے شادی پر اعتراض صرف اس کا کم تعلیم یافتہ اور غیر ذمے دار مزاج کا حامل ہونا تھا۔ لیکن وہ ایک عورت تھی اور جاذب کی بیوی تھی۔ مرد چاہے جتنا بھی عابد، زاہد ہو اس کے لیے چچا زاد، خالہ زاد اور ماموں زاد نامحرم ہی ہوتی ہیں، اسی لیے اسے بسمہ کے یہاں مستقل قیام کا سن کر اعتراض ہوا تھا۔ جسے اس نے ان کے سامنے اٹھانے کے بجائے کسی اور وقت پر چھوڑ دیا۔ اور بے دلی سے بسمہ سے زیادہ بات کیے بغیر کھانا کھاتی رہی۔ اس بات سے بے خبر کہ زینب بی بی نے بھی بالوں کی

سیاہی سے سفیدی تک کا سفر عقل کی آنکھوں کو کھول کر طے کیا تھا۔ بسمہ کو ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کتنی بے ضرر اور سادہ مزاج کی حامل لڑکی ہے۔ اگر تیز طرار ہوتی تو چھوٹی سی عمر میں طلاق پا کر میکے میں آ کر نہ بیٹھ جاتی۔ آج کل کی تیز طرار لڑکیوں کی طرح شوہر کو مٹھی میں کر کے اس کے دل اور گھر دونوں پر راج کرتی۔ مگر شاید وہ بد قسمت بھی تھی۔ اس لیے سسرال میں ساس، نندوں کی گھریلو سیاست کا شکار ہو گئی۔ اوپر سے شادی کے دو سال تک اس کی گود بھی خالی رہی تھی۔ لہٰذا اسے سسرال میں بانجھ اور بنجر دھرتی کا خطاب دے کر طلاق کا پروانہ پکڑا کر میکے روانہ کر دیا گیا جبکہ وہ ابھی صرف بائیس سال کی تھی۔ یہ ساری کتھا شاہینہ نے زینب بی بی کو خود بتائی تھی۔ اب وہ بسمہ کو اپنے ساتھ گھر لا کر مطمئن تھیں دوسرے انہیں اپنے بیٹے پر بھی پورا بھروسا تھا۔ مگر ایک چیز ہوتی ہے قسمت...... اور دوسرا دل جس پر کسی کا زور نہیں چلتا...... دونوں آسمانی عطا ہوتی ہیں جو زندگی کے ساتھ ہی انسان کو عطا ہوتی ہیں اور جس کے جادو کے سامنے انسان بالکل بے اختیار ہو جاتا ہے۔

محبت کبھی، کبھی صرف ایک لمحے کا معجزہ ہوتی ہے جو لمحے میں وقوع پذیر ہو کر کبھی، کبھی انسان کی ساری عمر پر محیط ہو جاتی ہے، جاذب کی زندگی میں وہ لمحہ آ کر گزر بھی گیا تھا مگر شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ چاہ کر بھی پاگل دل کی بے اختیاری پر دھیان نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بسمہ کو بچوں کے کمرے میں بھیجنے کے بعد ہاجرہ ماں کے کمرے میں چلی آئی۔ اس وقت زینب بی بی آرام کیا کرتی تھیں۔ کیونکہ اسے ماں سے بسمہ کی یہاں آمد کا اصل مقصد جاننا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں کوئی بھی فیصلہ بغیر سوچے سمجھے نہیں کرتیں۔ لہٰذا ماں کے کمرے میں ان کے بستر پر بیٹھی وہ ماں سے پوچھے بغیر نہیں رہی۔

”مجھے آپ سے اس ناسمجھی کی امید نہیں تھی اماں، آپ آخر کیا سوچ کر جوان جہان لڑکی کو اپنے ساتھ لے آئی ہیں، کل کو اگر ساجدہ اور اس کے گھر والوں کو اس کے یہاں رہنے پر اعتراض ہوا تو کیا جواب دیں گے ہم انہیں۔“ ہاجرہ نے اپنے دل میں ہلچل مچانے والا خدشہ بیان کیا جسے وہ فوراً ہی سمجھ گئی تھیں کہ اس کا اشارہ کس بات کی طرف ہے۔ لہٰذا وہ جواب دینے کے بجائے الٹا روٹھے پن سے اس سے سوال کرنے لگیں۔

”تو کیا تجھے اپنے بھائی پر بھروسا نہیں ہے؟“ زینب بی بی کے چبھتے ہوئے لہجے میں کیے سوال پر ہاجرہ بے ساختہ گھبرا کے وضاحت دینے لگی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا اماں، میں تو صرف ساجدہ کے مزاج کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔ ورنہ مجھے جاذب پر پورا بھروسا ہے مگر یہ بھی جانتی ہوں کہ آگ اور تیل کو ایک ہی جگہ پر ساتھ نہیں رکھا جاتا۔ جوان جہان لڑکی ہو یا عورت، نامحرم مردوں سے اس کو فاصلے پر ہی رہنا ضروری ہوتا ہے۔“ ہاجرہ نے اس بار صاف لفظوں میں اپنی بات کا مفہوم بیان کیا کیونکہ اس کا شوہر بھی تو سسرال آتا جاتا تھا۔ زینب بی بی کو بھی احساس ہونے لگا کہ انہوں نے یہ قدم اٹھا کر بہت بڑی ذمے داری اپنے کاندھوں پر اٹھائی ہے۔

”جانتی ہوں ہاجرہ...... تو کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ مگر میں نے یہ قدم بھی تیری اور ساجدہ کی بھلائی کے لیے اٹھایا ہے۔ آخر کو تو کب تک اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں ساجدہ کی ذمے داریوں کو سنبھالتی رہے گی۔ اس کی طبیعت تو اگلے نو مہینے تک نہیں سنبھلنی ہے، کبھی، کبھی عورت کے ساتھ اس حالت میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ پھر آگے بچے کی پیدائش کے بعد بھی کافی وقت ساجدہ کو سنبھلنے میں لگ جائے گا۔ بس اسی خیال سے بسمہ کو اپنے ساتھ لے آئی ہوں تاکہ ساجدہ کی ڈلیوری تک بسمہ گھر کی ذمے داری سنبھال لے اور تجھے اپنے سسرال اپنے میاں اور بچوں کے پاس جانا نصیب ہو۔“

اور ماں کی سمجھداری پر ہاجرہ کا دل چاہا کہ ان کا منہ چوم لے۔ وہ اس سے کتنی محبت کرتی تھیں۔ کتنا

خیال تھا اس کا نہیں۔ وہ خود بھی اس بے گار کی چاکری سے بیزار آچکی تھی۔ اوپر سے بھاوج کے ناز نخرے اٹھانا بڑا صبر آزما عمل تھا۔ اور اب اسے میاں اور بچوں کی یاد بھی بہت آرہی تھی۔ اس لیے وہ پُرسکون نظر آرہی تھی۔ ورنہ بسمہ کو ان کے ساتھ دیکھ کر وہ یہی سمجھی تھی کہ ماں نے ترس کھا کر یتیم بھتیجی کو اپنایا ہے۔ پھر بسمہ کے حوالے سے اس کے ماموں، مامی اور بہن، بہنوئی کی خود غرضی کا احوال بھی انہوں نے بیٹی کو سنا دیا تھا۔ لہٰذا اسے بھی ماں کا فیصلہ بروقت اور صائب لگا۔ اور ماں کی طرح اسے بھی یقین تھا کہ بسمہ جیسی پھرتیلی لڑکی بہت جلد اس گھر کے بکھیڑے سنبھال لے گی۔ کیونکہ ابھی دوپہر کے کھانے کے بعد ہاجرہ کے منع کرنے کے باوجود نہ صرف سب کو چائے بنا کر دی بلکہ کھانے کے جھوٹے برتن دھو کر کچن کا پھیلاوا بھی منٹوں میں سمیٹ دیا۔ وہ اب ماں کے سامنے شکر گزار ہو رہی تھی۔

”یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا اماں...... مجھے بھی اب ہار، بار اس قیدِ با مشقت سے چھٹی مل جائے گی۔ میں تو آج ہی اپنا سامان سمیٹ کر ماجد کو فون کرتی ہوں...... شام تک آکر مجھے لے جائے۔“ ہاجرہ نے ماں کے ہاتھوں کو تھام کر ممنون ہوتے لہجے میں کہا تو وہ مسکرانے لگیں۔

”اس میں شکریے والی کون سی بات ہے، تیرے بھلے کے لیے تیری ماں نہیں سوچے گی تو اور کون سوچے گا۔ رہی بات بسمہ کی تو میں نے کون سا عمر بھر اسے بٹھا کر گھر کی چاکری کروانی ہے۔ ساجدہ کے فارغ ہونے کے بعد کوئی مناسب سا لڑکا اور بھلا خاندان دیکھ کر اس کا رشتہ پکا کر کے رخصت کر دوں گی۔ میرے بھائی بشیر احمد کی بیٹی ہے، مرنے کے بعد اسے آخر منہ بھی دکھانا ہے۔ بیٹی بنا کر لائی ہوں تو بیٹی کی طرح رخصتی بھی کروں گی۔“ زینب بی بی کی نیت میں کھوٹ نہیں تھا۔ بس وقتی طور پر اپنے غرض کے لیے خود غرضی اختیار کر لی تھی۔ اور اب ماں کی نیت کا حال جان کر ہاجرہ کے دل کا بوجھ بھی یک دم ہلکا پھلکا ہوا تھا۔ ماں کی طرح وہ بھی برے دل کی نہیں تھی اور بسمہ کے حالات جان کر اسے اس سے ہمدردی ہی محسوس ہوئی تھی۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے اماں...... میں ابھی جا کر ماجد کو فون کرتی ہوں۔“ ہاجرہ اب ماں کے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ زینب بی بی بھی اسے ہنسی خوشی اجازت دے کر تھوڑی دیر کے لیے کمر سیدھی کرنے بستر پر لیٹ گئیں۔ آخر وہ بھی تو سفر سے تھک گئی تھیں۔

☆☆☆

ہاجرہ اپنی سسرال چلی گئی تو بسمہ نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے پھوپی کے بنا کہے ہی گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔ جس کے لیے زینب بی بی پل، پل اس کی شکر گزار ہوتیں، بسمہ یہ کہہ کر انہیں تسلی دیتی کہ وہ کسی غیر کی نہیں اپنی پھوپی کی خدمت کر رہی ہے اور وہ اسے دعائیں دینے لگتیں۔ اسے کچن میں کام کرتے دیکھ کر جاذب کو شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ ابھی تو وہ اتنے بڑے صدمے سے گزری تھی اور اماں نے اسے یہاں آتے ہی گھر کے کاموں پر لگا دیا۔ وہ ماں سے اس بارے میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن زینب بی بی نے خود ہی یہ کہہ کر اسے سمجھا دیا کہ بسمہ گھر کے کاموں میں مصروف ہو کر اپنے باپ کی موت کا صدمہ اور دکھ ...بھلا سکے گی۔ کیونکہ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا بلکہ زندہ انسانوں کو اپنے سکھ دکھ کے ساتھ جینا ہی پڑتا ہے۔ اور جب زندگی آگے کی طرف سفر کرتی ہے تو انسان رفتہ، رفتہ اس دکھ کی گہرائی سے ابھرنے لگتا ہے اور واقعی صبر کے بعد بسمہ مصروف ہو کر سنبھل بھی گئی۔

وہ صبح کے ناشتے کی تیاری سے لے کر رات کے کھانے اور کچن سمیٹنے سے لے کر جمال کو تیار کر کے اسکول بھیجنے اور پھر اس کے واپس آنے کے بعد تینوں بچوں کو نہلا دھلا کر روز صاف ستھرے کپڑے پہناتی۔ شام میں جمال کو ہوم ورک بھی کراتی۔ اس کے بعد کچھ دیر ان کے ساتھ صحن میں کوئی کھیل بھی کھیل لیتی تھی جس کے باعث چند دنوں میں ہی بچے اس سے مانوس ہو گئے تھے۔ بلکہ ہر وقت گندے میلے حلیے میں شور مچانا

بھی چھوڑ چکے تھے۔ بسمہ نے انہیں چند دنوں کی باقاعدہ روٹین سے ہر کام وقت پر کرنے کی عادت ڈال دی تھی۔ لہٰذا گھر میں سکون و امن کے ساتھ ساجدہ کی طبیعت بھی بہتر رہنے لگی تھی۔ اور اس سب میں زینب بی بی ہی نہیں جاذب کو بھی گھر میں ہونے بلکہ آنے والی خوشگوار تبدیلی واضح نظر آرہی تھی۔ جس سے گھر کا ہر فرد پُرسکون اور خوش نظر آرہا تھا۔ زینب بی بی ...اٹھتے بیٹھتے بھتیجی کو دعائیں دیتیں۔ کیونکہ اسی کی وجہ سے جمال کے ساتھ، ساتھ شعیب بھی قرآن کی تعلیم کے لیے باقاعدگی سے محلے کے مدرسے میں ناظرہ پڑھنے جانے لگا تھا۔ بسمہ انہیں رات میں اسٹوری بکس پڑھ کر سناتی، پہلے وہ رات میں زینب بی بی کے ساتھ ان کے کمرے میں سوتے تھے اب وہ ضد کر کے بسمہ کے کمرے میں ہی سونے لگے تھے۔ یوں صرف چند دنوں میں بسمہ کی آمد نے گھر اور گھر کے مکینوں کے رنگ ڈھنگ بدل دیے تھے۔ البتہ جاذب کے سارے کام ساجدہ خود اپنے ہاتھوں سے کرتی۔ کبھی کبھار کچن کے کاموں میں بسمہ کی مدد بھی کر دیا کرتی۔ کیونکہ اسے بھی ہاجرہ کی زبانی علم ہو گیا تھا کہ زینب بی بی نے بسمہ کی ذات سے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے۔ ورنہ پہلے تو اسے بسمہ کے صرف چند دنوں میں سارے گھر والوں کا دل جیت لینے پر ایک نئی فکر اور پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ بسمہ کی ذات کی خوبیوں نے ساجدہ کی خامیوں کو نمایاں کر دیا تھا۔ اسے بسمہ سے پرخاش ہونے لگی۔ مگر پھر جلد ہی وہ اس کی طرف سے اطمینان کرنے کے بعد اپنی ڈیلیوری کے دن گننے لگی۔ اسے اس گھر میں اس سے زیادہ دنوں کے لیے اس کا وجود گوارا نہیں تھا۔

بسمہ کو کراچی سے آئے تین ماہ ہو رہے تھے اور اتنے مہینوں میں شاہینہ نے بہن کی خیر خیریت معلوم کرنے کے لیے صرف دو بار فون کیا تھا۔ جبکہ ماموں نے صرف ایک بار...... وہ بھی شاید بیوی سے چھپ چھپا کر...... پھر پلٹ کر خبر تک نہیں لی تھی کہ بھانجی دوسرے شہر میں اپنوں سے اتنی دور کن حالوں میں ہے۔ شاید زمانے کا یہی چلن ہے۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل...... یہاں کوئی کسی کے لیے زیادہ دیر نہیں سوچتا وقت اور حالات کے ساتھ انسانی رویوں میں بھی تبدیلی آتی ہے تو خونی رشتے بھی بدل جاتے ہیں، سب کے لیے اپنی، اپنی ترجیحات اہم ہو جاتی ہیں اور بسمہ نے بڑی جلدی اس تبدیلی سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ وہ اپنی قسمت سے راضی ہو گئی تو خود بخود پُرسکون ہوتی چلی گئی۔ پھر رب کی عبادت نے اسے رب سے اور قریب کر دیا۔ یوں زندگی کا سفر آگے کی جانب رواں دواں ہو گیا۔

☆☆☆

ساجدہ برآمدے میں رکھے آئرن اسٹینڈ پر جاذب کے کپڑے استری کر رہی تھی۔ تب اچانک ہی اس کا جی متلایا تھا اور وہ تیزی سے منہ پر ہاتھ رکھ کر واش روم کی طرف بھاگی تھی۔ اتفاق سے جاذب کسی کام سے اِدھر آنکلا تو ساجدہ کو واش روم جاتا دیکھ کر آئرن اسٹینڈ پر پڑے کپڑے خود جا کر پریس کرنے لگا۔

بسمہ کچن سے فارغ ہو کر برآمدے میں جاذب کو کپڑے پریس کرتے دیکھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

”لائیں جاذب بھائی، کپڑے میں پریس کر دیتی ہوں۔“ اس کی بات سن کر جاذب نے مناسب نہ سمجھتے ہوئے سہولت سے انکار کر دیا۔

”نہیں کوئی بات نہیں، میں کر لوں گا، ساجدہ ذرا واش روم تک گئی ہے، وہی پریس کر رہی تھی لیکن شاید اس کی طبیعت......“ جاذب مزید کچھ کہتے، کہتے رک گیا تو بسمہ کو اس کی بات سمجھ کر بولنا پڑا۔

”پھر تو آپ کو ساجدہ بھابی کے پاس جانا چاہیے کہیں ان کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو گئی ہو۔ اپنے کپڑوں کی آپ فکر نہیں کریں، مجھے بھی کپڑے استری کرنے آتے ہیں۔ ابا کے کپڑے میں ہی استری کرتی تھی۔“

اور باپ کے ذکر پر بسمہ کا لہجہ خود بخود دلگیر ہو گیا۔ جاذب نے بس ایک نظر اس پر ڈالی تھی۔ جو اس کے دیکھنے سے پہلے ہی نگاہیں جھکا چکی تھی۔ شاید آنکھوں کی نمی چھپانا مقصود تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے چند لمحوں بعد صرف اتنا ہی کہا تھا۔ پھر پلٹ کر اندر کی جانب چلا گیا۔

بسمہ آئرن اسٹینڈ پر رکھے کپڑے پریس کرنے لگی۔ ساتھ ہی وہ جاذب اور اپنے سابقہ شوہر خاور کے مزاجوں کا موازنہ کرتے سوچ رہی تھی کہ ایک جاذب ہے، جو بیوی کی حالت کے پیشِ نظر اپنے ذاتی کام خود ہی بنا کسی شور شرابے کے کر لیتا ہے۔ دوسرا خاور تھا۔ جو گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے کاموں کے لیے اس پر چیخنا چلّانا شروع کر دیتا تھا حالانکہ اس کی ضرورت کی ہر شے سامنے ہی موجود ہوتی تھی۔ لیکن بیوی کے سر پر کھڑے ہو کر حکم چلانے میں جانے ہی کے کس جذبے کی تسکین ہوتی تھی۔ ورنہ بسمہ تو اس کے سارے ذاتی کام اس کے گھر آنے سے پہلے ہی کر کے رکھ دیتی تھی۔ جبکہ اس کی ساس بھی بیٹے کو اٹھتے بیٹھتے بس یہی سبق پڑھاتی تھی کہ مرد کا کام اپنی عورت پر حکم چلانا ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کی ملکیت ہوتی ہے اور عورت (بیوی) کا فرض ہر حال میں اپنے مرد کی خدمت کرنا ہے۔ چاہے بیوی جس حال میں بھی ہو۔۔اور بسمہ نے ساس کے یہ سارے ہدایت نامے بیاہ کر آتے ہی ازبر کر لیے تھے۔ اسے مرد کا عورت پر ہاتھ اٹھانا بہت برا لگتا تھا۔ اور سسرال آ کر اسے پتا چلا کہ خاور صرف غصے کا ہی تیز نہیں ہے بلکہ ہاتھ چھوڑ بھی ہے، اس لیے بسمہ کو ہی کسی غلطی سے پرہیز کرنا ہوگا۔ اور یہ انکشاف بسمہ کی بڑی بیاہی نند نے ولیمے والے دن ہنستے ہوئے اس کے گوش گزار کیا تھا۔ اور بیچاری بسمہ نے اسی وقت یہ بات اپنے پلو میں گرہ کر لی کیونکہ وہ اپنی کسی نادانستہ غلطی پر بھی ساس اور نندوں کے سامنے خاور کے ہاتھوں.... بے عزت ہونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر اس کی ساری احتیاطیں بیکار ہو گئیں۔ جب شادی کے ایک ہفتے بعد اس نے پہلی بار ناشتا بنا کر خاور کے سامنے رکھا اور اس نے چائے کے تیز گرم نہ ہونے پر ہفتے بھر کی بیاہی بسمہ کو بری طرح جھڑک کے رکھ دیا تھا۔ اور وہ الٹے پاؤں چائے کا مگ اٹھا کر دوبارہ گرم کرنے کچن کی طرف بھاگی تھی۔ یہ اور ایسی بہت سی باتوں نے خاور کا ظاہر و باطن دنوں میں اس پر عیاں کر دیا تھا، وہ ہر وقت ڈری سہمی رہنے لگی تھی۔ جانے کون سی بات شوہر کے مزاج کے خلاف ہو جائے اور بسمہ اس کے ہاتھوں ذلیل ہو جائے۔ دراصل کچھ گھرانوں میں اب بھی بیوی کو بے دام کی غلام ہی سمجھا جاتا ہے اور کچھ مرد شادی کے بعد بیوی کو صرف اپنی ملکیت سمجھنے لگتے ہیں۔ جس پر وہ جیسے چاہیں حکمرانی کریں۔

بے دھیانی میں بسمہ کا ہاتھ جلتی استری کے کونے سے ٹکرایا تھا۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ سسکاری سی نکلی۔ وہ چونک کر ماضی کے خیالوں کے سفر سے حال میں لوٹی تو اپنے ہاتھ کے سرخ پڑتے حصے کو دیکھنے لگی۔ جہاں استری لگی تھی حالانکہ کپڑے تو وہ کب کے استری کر کے ہینگ کر چکی تھی۔ بس استری آف کر کے سائڈ اسٹینڈ پر رکھنا بھول گئی۔ اب جلے ہاتھ کو دیکھ کر پھر سے جاذب کا موازنہ کرنے لگی۔ اس نے ان تین ماہ میں جاذب کی اونچی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ بیوی، بچوں پر چیخنا چلّانا تو دور...... وہ تو ماں اور بیوی دونوں سے نہایت دھیمے لہجے میں بات کرتا۔ اور بسمہ سوچتی کہ مرد ایسے بھی ہوتے ہیں، جاذب اور اس کے اپنے باپ جیسے۔ بسمہ کے ابا نے غصے میں بھی اس کی ماں کو بھی جھڑکا نہیں تھا، بچوں پر چیخ چلّا کر گھر میں اپنے عہدے کا سرپرست ہونے کا جبراً احساس نہیں جتایا تھا۔ جیسے اس کی سسرال میں شوہر اور سسر جتایا کرتے تھے۔ وہ اپنی سوچوں میں سفر کرتی، بے دھیانی میں جاذب کے جوتے بھی پالش کر کے رکھ چکی تھی۔ شاید اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ اس وقت وہ اپنے سسرال میں نہیں پھوپی کے گھر میں موجود ہے۔ وہ تو خاور کے جوتے بھی پالش کیا کرتی تھی اور اب وہ صحن میں الگنی پر لٹکے سوکھتے کپڑے سمیٹنے چلی آئی تھی۔ آج جانے کیوں اسے اس گھر میں رہتے ہوئے پرانی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ صحن سے کپڑے اتار کر برآمدے کی دیوار کے ساتھ بچھے پلنگ پر رکھ کر انہیں تہ کر رہی تھی

تب ہی جاذب اس کے پاس چلا آیا۔

''یہ آپ نے کیا کیا؟'' جاذب اس کے سر پر کھڑا شکایتی بلکہ شرمندگی بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ جس پر بسمہ نے اپنے خیالوں سے چونک کر گھبرا کے اسے دیکھا تھا اور پلنگ سے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی جیسے اس سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی۔ مگر غور کرنے پر پتا چلا کہ جاذب کا لہجہ کرخت اور نوکیلا نہیں بلکہ نرم اور شرمندگی بھرا تھا۔

''آپ کو میرے جوتے پالش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اپنے جوتے تو میں نے کبھی ساجدہ کو بھی پالش کرنے نہیں دیے۔ یہ کام تو میں خود کرتا ہوں اور آپ تو اس گھر میں مہمان ہیں، پلیز...... آپ کو یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور آپ میرے جوتوں کو ہاتھ لگائیں، یہ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔''

اور بسمہ اس سے پہلے کوئی وضاحت دیتی وہ پلٹ کر اندر جا چکا تھا۔ وہ تو اس کے لہجے پر غور کرتی رہ گئی۔ اس گھر میں آ کر اسے کافی باتوں پر حیران ہونا پڑا تھا۔ مگر آج یہ سب سے حیرانی والی بات ہوئی تھی۔ پھر وہ سر جھٹک کر پورے دھیان سے پلنگ پر رکھے کپڑے تہ کرنے لگی...... مبادا پھر کہیں بے دھیانی میں کوئی مزید کوتاہی...ہو جائے۔

☆☆☆

ساجدہ نڈھال سی بیڈ پر لیٹی تھی جبکہ جاذب ہاتھ میں جوس کا گلاس لیے اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ چوتھے بچے کی دفعہ اس کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب چل رہی تھی۔ مگر جاذب بھی اس کا بہت خیال رکھ رہا تھا۔ اسے سمجھا رہا تھا۔

اور یہ جاذب کے نرم سلجھے ہوئے لہجے کا اثر تھا کہ ساجدہ نے اس کے ہاتھ سے جوس کا گلاس لے کر پینا شروع کر دیا۔ تب ہی بسمہ ٹرے میں ان دونوں کے لیے گرما گرم سوپ لے کر چلی آئی۔

''وہ دراصل آج سردی کچھ زیادہ ہی ہے اور ان بچوں نے بھی سوپ پینے کی فرمائش کی تھی تو اس لیے میں سوپ بنا لائی۔'' اگرچہ بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن پھر بھی وہ دستک دے کر کمرے میں آئی تھی۔

جاذب بیڈ سے اٹھ کر ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔

''بھابی رات کے کھانے میں تو ابھی دیر ہے۔ آپ لوگوں کو بھوک لگ رہی ہوگی۔ اس لیے ابھی اسے پی لیں۔ ورنہ ٹھنڈا ہو گیا تو مزہ نہیں دے گا۔'' بسمہ نے سوپ کی ٹرے بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھ کر ساجدہ کو مخاطب کر کے کہا تو مروتاً اسے لینا پڑا۔

''اس کی کیا ضرورت تھی بسمہ...... مجھ سے تو یہ جوس ہی ختم نہیں ہو رہا...... سوپ تو بالکل بھی پیا نہیں جائے گا۔ تم دیکھ تو رہی ہو میری حالت......''

اور ساجدہ کے جواب پر بسمہ کھسیا کر رہ گئی تو جاذب نے آگے بڑھ کر سوپ کی ٹرے اٹھاتے ہوئے بسمہ کا شکریہ ادا کیا۔

''آپ کا بہت شکریہ...... آپ نے اتنی محنت کی ہے اور آپ فکر ہی نہیں کریں۔ ساجدہ کو یہ سوپ میں خود ختم کراؤں گا۔ اسے اپنا اور اپنی صحت کا کچھ خیال ہی نہیں ہے اور دوسرے خیال رکھیں تو اعتراض کرنے بیٹھ جاتی ہے۔'' جاذب نے ذرا ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو بسمہ بھی پُرسکون تاثر کے ساتھ پلٹ کر کمرے سے باہر جانے لگی۔ اور جاذب اسٹول کھینچ کر سوپ کی ٹرے گود میں رکھ کر ساجدہ کے سامنے بیٹھ گیا تو ساجدہ بھی جلدی سے اس کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

''جاذب ٹھیک کہہ رہے ہیں، تمہارا بہت شکریہ بسمہ تم واقعی ہم سب کا بہت خیال رکھ رہی ہو۔ بہت خدمت کی ہے تم نے ہم سب کی۔ لیکن بس کچھ دنوں کی بات ہے، میں فارغ ہو جاؤں تو تمہیں بھی اس ذمے داری سے چھٹکارا مل جائے گا۔ ورنہ تم تو یہی سوچتی ہو گی کہ تائی زینب نے یہاں آتے ہی تمہیں گھر کی ذمے داریوں میں الجھا دیا۔'' جذباتی پن میں جو بات نہیں کہنے کی تھی۔ ساجدہ نے وہ بات بھی اس کے سامنے کہہ دی اور شاید یہی فرق تھا جو ساجدہ کو کم تعلیم یافتہ اور لاابالی ظاہر کرتا تھا۔ ورنہ اس کی جگہ کوئی پڑھی

لگی، سمجھدار عورت ہوتی تو اس آخری بات کا ذکر اس انداز میں نہیں کرتی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے ساجدہ بھابی...... میں اپنے گھر میں بھی گھر کے سب کام کرتی تھی...... اور یہ بھی کسی غیر کا نہیں میری پھوپی کا گھر ہے۔ پھر انسان جس گھر میں تین وقت کی روٹی کھاتا ہے اس کا حق ادا کرنا بھی اس کی ذمّے داری ہوتی ہے۔ میں بھی بس اپنا فرض پورا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں، آپ شکریہ ادا کر کے مجھے شرمندہ مت کریں۔'' بسمہ نے متانت سے کہا تو ساجدہ سامنے بیٹھے جاذب کو دیکھنے لگی۔

''آپ لوگ اطمینان سے سوپ ختم کریں۔ میں ذرا کھانے کی تیاری کرلوں۔'' اس سے پہلے کہ وہ دونوں کچھ بولتے بسمہ اپنی بات مکمل کر کے کمرے سے باہر چلی گئی۔ اور اس کے جانے کے بعد ساجدہ دل میں شرمندگی محسوس کرنے لگی۔ کیونکہ اب تک وہ بسمہ کے لیے اپنے دل میں کتنی کدورت پالے ہوئی تھی۔ اسے بسمہ کا اپنے بچوں کے ساتھ گھلنا ملنا بہت برا لگتا تھا۔ اس لیے وہ وقتاً فوقتاً تائی کے کان میں ڈالتی رہتی تھی کہ وہ بسمہ کے لیے ابھی سے رشتہ دیکھنا شروع کر دیں۔ تاکہ اس کا وجود اس گھر سے جلد سے جلد دور ہو جائے۔ لیکن رفتہ، رفتہ بسمہ کے خلوص اور دل کی اچھائی نے بالآخر آج ساجدہ کے دل میں بھی اپنی جگہ بنالی۔ وہ اپنے رویّے اور سوچ پر شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس کے دل کی کدورت کا آئینہ صاف ہوا تو چہرے کے تاثرات کے ساتھ لہجے میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔ اب سامنے بیٹھا جاذب پیالہ اٹھا کر سوپ پینے لگا۔

''کیا ہوا...... تم کیا سوچنے لگی ہو، سوپ اچھا ہے، تم بھی پی کر دیکھو...... تمہیں اچھا لگے گا۔'' بیوی کو گم صم ہوتا دیکھ کر جاذب بولا۔

اس کی آواز پر وہ اپنی سوچوں کے دائرے سے چونک کر باہر نکلی۔

''ہاں اچھا ہی ہوگا۔ تب ہی تو تم سارا پیالہ صاف کر چکے ہو۔ لیکن اب میرے پیالے پر نظر نہ لگانا۔'' اور اس کی بات پر جاذب خوشگوار حیرانی سے اسے دیکھنے لگا۔ اتنے دنوں بعد آج ساجدہ اتنے خوشگوار موڈ میں بات کر رہی تھی۔ جاذب نے جواباً مسکراتے ہوئے سوپ کا دوسرا پیالہ ساجدہ کی طرف بڑھا دیا۔ ساجدہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

''سوپ تو میرے حصے کا ہے لیکن اگر تم اپنے ہاتھ سے پلاؤ گے تو مجھے زیادہ مزے کا لگے گا۔'' جواباً جاذب مسکراتے ہوئے اسے اپنے ہاتھ سے سوپ پلانے لگا۔

لیڈی ڈاکٹر نے اگلے ماہ کے چیک اپ پر ساجدہ کے لیے سیزرین تجویز کیا تھا۔ جسے سنتے ہی ساجدہ نے صاف انکار کر دیا۔ وہ آپریشن کے لیے بالکل بھی تیار نہیں تھی۔ پہلے بچوں کی دفعہ نارمل ڈلیوری ہی ہوئی تھی لیکن اس مرتبہ لیڈی ڈاکٹرز نے اس کے مکمل چیک اپ کے بعد جاذب کو سمجھا دیا تھا کہ اس بار آپریشن ہی ضروری ہے کیونکہ ساجدہ کو اس دوران شوگر اور ہائی بی پی کی شکایت بڑھ گئی ہے۔ ساجدہ کے انکار پر لیڈی ڈاکٹر نے جاذب سے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر نارمل ڈلیوری کے دوران ساجدہ کا بی پی شوٹ کر گیا یا کوئی اور پیچیدگی ہوگئی تو وہ ذمّے دار نہیں ہوگی۔ جاذب نے انہیں تسلی کرادی تھی کہ وہ ساجدہ کو راضی کر لے گا اور یوں یہ معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔

☆☆☆

آج چھٹی کا دن تھا۔ صبح سے موسم بھی بہت اچھا ہو رہا تھا۔ بسمہ بچوں کی فرمائش پر پکوڑے تل رہی تھی جبکہ ساجدہ اور زینب بی بی اپنی، اپنی دوائیں لے کر کچھ دیر آرام کے لیے لیٹ گئی تھیں۔ جاذب ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا میچ دیکھ رہا تھا۔ اور صحن میں کھیلتے بچے اپنا کھیل چھوڑ کر بسمہ کے پاس کچن میں ہی کھڑے بڑے شوق سے اسے کام کرتے دیکھ رہے تھے۔ تب ہی اچانک بارش شروع ہوگئی۔ بچے خوشی سے شور مچانے لگے۔ بسمہ بھی کچن کی کھڑکی سے صحن میں برستی بارش دیکھنے لگی۔ تب ہی لائٹ بھی چلی گئی۔ دوسری مرتبہ

پکوڑے ڈالنے پر معلوم نہیں کیسے ذرا سی بے احتیاطی سے تیل اچھل کر اس کے ہاتھ پر آ گیا تھا۔ اس نے.... بے ساختہ سسکاری بھری تو تینوں بچے شور مچاتے ہوئے کچن سے باہر بھاگے اور جا کر باپ کو بسمہ آنٹی کے ہاتھ جلنے کا بتایا۔ جاذب بنا کچھ سوچے بے ساختہ کچن کی جانب لپکا تھا اور جس وقت جاذب کچن میں داخل ہوا۔ بسمہ چولھا بند کر کے ایک طرف کھڑی اپنے ہاتھ کی جلن پر پھونکیں مار کے اسے کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

جاذب نے آگے بڑھ کر بسمہ کی کلائی تھام کر جلے ہوئے حصہ کو دیکھنے لگا۔

''یہ تو اچھا خاصا جھلس گیا ہے۔ چلو تم برآمدے میں چل کر بیٹھو۔ میں اندر سے مرہم لے کر آتا ہوں۔''

اور بسمہ جو جاذب کے اس اچانک ردِّعمل کی توقع ہرگز نہیں کر رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ جاذب کی گرفت سے چھڑا کر پیچھے کیا تھا اور اس کی جھینپ مٹانے کے لیے خود کو ٹھیک ظاہر کرنے لگی۔

''ارے نہیں...... دوا کی ضرورت نہیں ہے، اب اتنا بھی نہیں جلا ہے، یہ چولھے کی آگ تو ہم عورتوں کو روز ہی تھوڑا بہت جلاتی ہے، اس میں پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں ساری جلن خود بخود دور ہو جائے گی۔'' بسمہ نے لہجے میں... بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا تو جاذب اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جو بلاوجہ اپنے ہاتھ کی پشت کو دوپٹے کے پیچھے چھپانے کی سعی کرنے میں مگن تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ حالانکہ اس کا جلا ہوا ہاتھ جاذب دیکھ بھی چکا تھا پھر جانے اسے کیا ہوا۔

''ہاں، جب آگ بندے کے اتنے قریب ہو تو وہ جلنے سے کیسے بچ سکتا ہے۔ اس آنچ کی تپش سے بچنا اتنا آسان کب ہوتا ہے۔''

اور جاذب کی بات سے زیادہ اس کے لہجے نے بسمہ کو چونکنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ بے ساختہ چہرہ اٹھا کر جاذب کی طرف دیکھنے لگی تو نگاہ اس کی نگاہوں سے جا ٹکرائی اور بسمہ کو اس لمحے لگا کہ اس کی بات میں گہرائی سے زیادہ اس کی آنکھوں میں گہرائی تھی۔ جس میں کسی کا دل یا وجود دونوں ڈوب سکتے تھے۔ اس نے اگلے لمحے گھبرا کے سیاہ پلکوں کی ریشمی پلکوں کی جھالروں کی آڑ میں خود کو سنبھالا تھا۔

''آپ بلاوجہ پریشان مت ہوں۔ میرا ہاتھ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ بچوں کو لے کر برآمدے میں جا کر بیٹھیں۔ میں پھوپی اور ساجدہ بھابی کو بھی اٹھا دیتی ہوں پھر سب مل کر چائے اور گرم، گرم پکوڑے کھائیں گے۔''

بسمہ بات کو بے پروائی سے بدلتے ہوئے اس کی سائڈ سے ہو کر کچن سے باہر نکل گئی...... اور جاذب وہیں کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔ جانے جاذب کو اچانک کیا ہوا تھا وہ خود بھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سب برآمدے میں بچھے پلنگ اور موڑھوں پر بیٹھے گرما گرم پکوڑوں اور چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بسمہ کو دعائیں دے رہے تھے۔ جو اتنے اچھے موسم کا لطف دوبالا ہو گیا تھا۔ سارا ماحول خاصا خوشگوار ہو رہا تھا۔ اور یہ سب بسمہ کی بدولت ہوا تھا۔ جس نے چند دنوں کی توجہ اور محنت سے گھر کے ماحول کو پُرسکون بنا دیا تھا۔ ہر کام وقت پر ہو جاتا تھا۔ بچے بھی پہلے کی طرح ہر وقت شور شرابا اور بدتمیزی کرنا جیسے بھول چکے تھے۔ اور اس خوشگوار تبدیلی سے بسمہ نے صرف زینب بی بی ہی کے دل میں جگہ نہیں بنائی تھی بلکہ کسی اور کے دل میں بھی اپنا محترم مقام بنا لیا تھا۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کر کچن کا سارا پھیلاوا سمیٹنے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے تازہ ہوا لینے چھت پر چلی آئی تھی۔ سیاہ آسمان پر چمکتا روشن چاند...... وہ بڑی محویت سے چاند کو تکنے لگی۔ تب اچانک اس کا ہاتھ اپنی جلی ہتھیلی کے کونے سے جا ٹکرایا تھا۔ ہلکی سی جلن نے بسمہ کو بے چین کر دیا تھا۔ وہ اپنی ہتھیلی کو چاندنی میں دیکھنے لگی۔ بس صرف ایک لمحے کی بات تھی مگر اس لمحے کا لمس بسمہ کی ہتھیلی پر ٹھہر گیا تھا۔ وہ لاکھ ذہن جھٹکنے کی کوشش کرتی، دل کو سمجھاتی..... مگر

سوچیں بھٹک، بھٹک کر اسی لمحے پر جا ٹھہرتیں۔ جس سے وہ بھاگنا چاہتی تھی۔ وہ تو بھولے سے بھی نگاہیں اٹھا کر نہیں دیکھتی تھی۔ ان آنکھوں کی گہرائیوں سے اسے ڈر لگتا تھا۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں بے دھیانی میں نگاہیں ان نگاہوں سے جا ٹکرائیں تو وہ اپنا دل کھو بیٹھے گی۔ اور وہ ایسا کبھی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کبھی اس شے کی چاہ نہیں کی تھی جو اس کی نہیں تھی۔ نہ ہی اسے مانگنے یا چھیننے کی عادت تھی۔ لیکن یہ بھی سچ تھا جب، جب جاذب سلطان اس کی طرف دیکھتا تھا اس کا دل اتھل پتھل ہونے لگتا۔ وہ اس جگہ سے دانستہ ہٹ جاتی۔ اور آج تو جاذب کی بے ساختہ حرکت نے اسے اندر تک ڈرا دیا تھا۔ تکلیف تو ذرا سی تھی پھر جاذب نے اتنی کیوں محسوس کی۔ وہ واقعی ڈر گئی تھی۔ اور اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی کمزور نہیں پڑے گی۔ خود کو بہت مضبوط بنا لے گی۔

☆☆☆

لیڈی ڈاکٹر نے ساجدہ کو پہلے ہی آپریشن کی ڈیٹ دے دی تھی۔ اور وہ وقت آ گیا جب ساجدہ کو اسپتال لے جانا پڑا کیونکہ اس کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔

اسپتال میں جاذب نے ساجدہ کا نام تو پہلے ہی لکھوا رکھا تھا۔ اس لیے اس کی خراب حالت کے پیشِ نظر اسے فوراً ہی ایڈمٹ کر لیا گیا۔ جاذب نے ماں کے کہنے پر ساجدہ کے میکے والوں کو بھی فون کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہاجرہ سمیت سارے گھر والے اسپتال میں موجود تھے اور جاذب و زینب بی بی کو تسلی دینے کے ساتھ ساجدہ کے لیے دعا بھی کر رہے تھے۔ دوسری جانب ساجدہ کا شوگر اور بی پی کنٹرول نہیں ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے بچے اور ماں کی جان بچانے کی سر توڑ کوششیں شروع کر دی تھیں۔ مگر شاید بہت دیر ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کوشش کے باوجود ساجدہ کو نہیں بچا سکی تھی۔ اور ساجدہ ایک بہت ہی خوب صورت بیٹی کو جنم دینے کے بعد حوصلہ چھوڑ چکی تھی۔ بیٹی کے پیدا ہونے کے چند منٹوں بعد ساجدہ کی سانسوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ نرس کو باہر جا کر مریضہ کی کنڈیشن بتانے کا موقع بھی نہیں ملا۔ بس ڈاکٹر نے لیبر روم سے باہر آ کر افسوس کا اظہار کیا تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق ان لوگوں نے اسے اسپتال لانے میں بہت دیر کر دی تھی۔ اور اسپتال میں دیکھتے ہی دیکھتے ساجدہ کی موت پر کہرام مچ گیا۔ جہاں اس کے ماں، باپ اور بھائی صدمے سے نڈھال تھے وہیں جاذب، ہاجرہ اور زینب بی بی کا بھی برا حال تھا۔ انہوں نے تو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ ساجدہ اپنے پیچھے چار معصوم بچوں کو روتا بلکتا چھوڑ جائے گی۔

اُدھر گھر پر بسمہ تینوں بچوں کے ساتھ گھر پر رکی ساجدہ کی خیر و عافیت سے فارغ ہو جانے کی دعاؤں میں مصروف تھی۔ اور جب اسپتال سے گھر تک ایمبولینس میں سفر کر کے ساجدہ کا بے جان جسم گھر لایا گیا تو محلے میں بھی اس کی جواں موت پر کہرام برپا ہو گیا۔ محلے بھر کی عورتیں اطلاع ملتے ہی زینب بی بی کے گھر میں جمع ہونا شروع ہو گئیں۔ باقی رشتے داروں کو بھی خبر کر دی گئی تھی۔ نومولود بچی کو اندر کمرے میں ہاجرہ نے سنبھال رکھا تھا جبکہ زینب بی بی گھر کے برآمدے میں اپنے مخصوص پلنگ پر بیٹھی گیلی آنکھوں کے ساتھ رشتے داروں اور محلے والوں کی تعزیت لے رہی تھیں۔ جبکہ بسمہ کو تو ساجدہ کو ابدی نیند سوتے دیکھ کر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ صدمے کی کیفیت میں برآمدے کا ستون تھامے کھڑی تھی۔ اور تینوں بچے اندر کمرے میں بے خبری کی نیند سو رہے تھے۔ بسمہ انہیں دوپہر کا کھانا کھلا کر سلا چکی تھی۔ تاکہ وہ اسپتال گئی ماں کے بارے میں زیادہ سوال جواب نہیں کریں۔ اور جب وہ نئے مہمان کے ساتھ گھر واپس آئے گی تو بچے ان دونوں کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ مگر قسمت نے خوشی کے ساتھ غم بھی ساتھ دے دیا تھا۔ اب وہ نئے مہمان کے گھر آمد کی خوشی مناتے یا ماں کے دنیا سے چلے جانے کا غم...... وہ معصوم تو ہر دکھ سے بے خبر میٹھی نیند سو رہے تھے۔

آج صبح سے اس کا دل بے چینی کے باعث گھبرا رہا تھا۔ اس نے کراچی شاہینہ کو فون کر کے سب کی خیریت دریافت کی۔ پھر جانے بے چینی کس بات کی تھی جو بسمہ کا دل ہولا رہی تھی۔ اسے کیا پتا تھا کہ یہ انہونی ہو جائے گی۔ جس کے بارے میں کسی نے گمان بھی نہیں کیا ہوگا۔ اور اب رشتے داروں اور محلے داروں کی موجودگی میں ساجدہ کو اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچانے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ وہ پتھرائی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ وہ سارے انتظامات نبٹاتے جاذب کو بھی دیکھ رہی تھی۔ جانے اس صدمے کو سہنے کے لیے اس نے خود پر کتنے ضبط کے بند باندھے ہوں گے۔ یہی سوچ کر کہ اگر وہ صدمے سے کمزور پڑ گیا تو اس کے چار معصوم بچوں کو کون سنبھالے گا۔ بسمہ سب کچھ بھری آنکھوں اور بھاری دل کے ساتھ دیکھ اور محسوس کر رہی تھی...... لیکن جاذب کے پہاڑ جیسے دکھ کو بانٹنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ وہ بس چپ چاپ دکھ بھری آنکھوں سے سارے انتظامات دیکھتی رہی پھر جب ساجدہ کے جنازے کو گھر سے رخصت کرنے کا وقت آیا تو معصوم بچے مردہ ماں کے وجود سے لپٹ کر زار و قطار رو رہے تھے۔ ہاجرہ نے جانے کب ان معصوموں کو جگا کر صحن میں بھیج دیا تھا تاکہ وہ آخری بار اپنی ماں کو دیکھ سکیں...... اور اس دلخراش منظر کو دیکھ کر وہاں موجود سارے افراد زار و قطار رو رہے تھے۔ پھر بسمہ ہی تینوں بچوں کو لے کر اندر گئی تھی۔ جس کے بعد ساجدہ کا جنازہ گھر کی دہلیز سے رخصت ہو گیا۔ وہ سہاگن بن کر اس گھر میں آئی تھی اور سہاگن ہی رخصت ہوئی۔

کہتے ہیں دکھ اور صدمہ جتنا بڑا اور گہرا ہوتا ہے بھرنے میں اتنا ہی وقت لیتا ہے۔ وقت ایک طرف اگر سنگدلی دکھاتا ہے تو دوسری طرف مرہم بھی یہی گزرتا وقت رکھتا ہے۔ بچوں کو زینب بی بی اور بسمہ نے مل کر سنبھال لیا۔ شاہینہ نے بھی کراچی سے فون کر کے پھوپی اور جاذب سے تعزیت کی تھی۔ اور پھر یہ بسمہ کی ہی کوششیں تھیں جن سے زینب بی بی کے ساتھ، ساتھ اس نے بچوں کو بھی اس جذباتی صدمے بلکہ سانحے سے باہر نکال لیا۔ ماں کو یاد کر کے بچے جب بھی اس کا ذکر کرتے تو بسمہ یہ کہہ کر انہیں بہلا دیتی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے گھر چلی گئی ہے۔ اور جب وہ بڑے ہو جائیں گے تو ان کے پاس واپس آ جائے گی۔ معصوم بچوں کو سمجھانے کا اور کوئی طریقہ اسے سمجھ نہیں آیا تھا۔ ساجدہ کی ننھی گڑیا کو دنیا میں آئے تین ماہ ہو چکے تھے۔ اور ابھی تک اس کا باقاعدہ نام نہیں رکھا گیا تھا۔ گھر کے سب افراد اسے گڑیا ہی پکارتے تھے۔ لہٰذا اس ذمے داری کا احساس بھی بسمہ نے ہی زینب بی بی کو دلایا تھا اور

امتحان

جب اسکول میں پڑھتے تھے تو امتحان سے مشکل اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اور جب پڑھائی ختم ہوئی اور زندگی کا امتحان شروع ہوا تو محسوس ہوا کہ زندگی سے بڑھ کر کوئی امتحان نہیں۔

زندگی کا ہر امتحان انسان صرف ذہانت اور محنت سے پاس نہیں کر سکتا اس میں قسمت کا بھی دخل ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر دعا جیسا ہتھیار قسمت کو بھی بدل دیتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے استاد سبق دے کر امتحان لیتا ہے اور زندگی امتحان لے کر سبق دیتی ہے اور یہ سو فیصد صحیح بھی ہے۔

کچھ لوگ امتحان کو بھی کھیل کی طرح لیتے ہیں...... لیکن کھیل اور زندگی میں بہت فرق ہوتا ہے کھیل کو ہم کھیلتے ہیں۔ زندگی ہمیں کھیلتی ہے ہم زندگی کے مُہرے ہوتے ہیں۔ زندگی کو مہرہ نہیں بنا سکتے۔

تقدیر کا شکوہ بے معنیٰ جینا ہی تجھے منظور نہیں
آپ اپنا مقدر بن نہ سکے اتنا تو کوئی مجبور نہیں

از: فریدہ، فضل ڈالاس
یو۔ ایس۔ اے

انہوں نے جاذب سے بات کی تھی۔ اسے ہی بیٹی کی خواہش تھی۔ لہٰذا نام بھی اسے ہی رکھنا چاہیے اور جاذب نے ماں کے سامنے یہ ذمّے داری بسمہ کے سر ڈال دی کہ اسے یہی سنبھال رہی ہے، یہی نام بھی رکھے گی۔ جاذب کے جواب نے زینب بی بی کی پریشان کُن سوچوں کا خاتمہ کردیا۔ کیونکہ ساجدہ کے جانے کے بعد سے وہ دن رات یہی سوچ کر ہلکان رہتی تھیں اگر بسمہ نہ ہوتی تو وہ ان چار چھوٹے بچوں اور گھر کو اکیلے کیسے سنبھالتیں اور اگر بسمہ اس گھر سے کہیں چلی گئی تو وہ کیا کریں گی۔ پچھلے کئی دنوں سے یہی سوچ انہیں پریشان کررہی تھی۔ جاذب کے جواب نے ان کی مشکل ہی آسان نہیں کی بلکہ ان کی عقل کو ایک نئی راہ بھی دکھائی تھی اور اس راہ پر چلنے کے لیے انہوں نے بس حتمی فیصلہ کرنا تھا۔ اور وہ فیصلہ اسی وقت عقل نے ان سے کرادیا۔ بس اب اس پر عمل درآمد کرنا باقی تھا۔

بھلا وہ اتنی اہم بات کیسے نظر انداز کرگئیں کہ پیدا کرنے سے زیادہ پالنے والے کا حق بنتا ہے۔ اگر گڑیا کو پیدا کرنے والی ماں ساجدہ تھی تو اس کی پرورش کرنے والی بسمہ بھی تو اس کی ماں بن سکتی تھی۔ اگر وہ بسمہ کی شادی کہیں اور کروانے کے بجائے اپنے جاذب سے ہی کروادیتیں تو سارے مسئلے خود بخود حل ہوجائیں گے۔ وہ یہ سوچ کر اتنی پُرسکون و مطمئن ہوگئیں کہ اگلے دن ہی ہاجرہ کو گھر بلوالیا۔ تاکہ بیٹی سے مشورہ کرکے جاذب سے اس بارے میں بات کرسکیں۔ صرف بسمہ کے بارے میں تو انہوں نے اب بھی نہیں سوچا تھا۔ بسمہ کو کراچی سے کنجاہ (گجرات) اپنے ساتھ لانے میں بھی انہی کی غرض شامل تھی۔ تاکہ وہ ساجدہ کی ڈیلیوری تک گھر اور بچوں کو سنبھال لے۔ اور آج جاذب کے بچوں اور گھر کو پھر سے سنبھالنے کے لیے ایک سمجھدار اور ذمّے دار عورت کی ضرورت تھی تو انہیں بسمہ کا ہی خیال آیا۔ وہ کتنی خود غرضی سے صرف اپنے بیٹے کے گھر اور اس کے بچوں کا بھلا سوچ رہی تھیں۔ بسمہ کی بھلائی، اس کی خوشی اور مرضی کے بارے میں تو انہوں نے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا اور یہ احساس انہیں ہاجرہ نے دلایا تھا۔ کیونکہ بندے کی نیتوں کا حال تو اللہ جانتا ہے یا پھر بندہ خود اور زینب بی بی!!...کی نیت کا حال ہاجرہ اچھی طرح جانتی تھی کیونکہ وہ ان کی بیٹی تھی۔ اس لیے ماں کی تجویز مناسب لگنے کے باوجود اس نے ماں کی بات پر اعتراض کیا۔ کیونکہ وہ خود غرض بننا نہیں چاہتی تھی ان کی طرح...... حالانکہ وہ کوئی فرشتہ صفت اعلیٰ درجے کی انسان نہیں تھی مگر ساجدہ کی بے وقت موت نے اس کا دل پہلے سے زیادہ گداز کردیا تھا۔

''نہیں اماں...... ہمیں صرف اپنے بھلے کا نہیں سوچنا چاہئے بسمہ کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔ اس کے خلوصِ نیت اور بے لوث خدمت کی قدر کرنی چاہیے۔'' اور ہاجرہ کی بات پر زینب بی بی اچنبھے سے اسے دیکھنے لگیں۔

''تو میں کب اس کا برا چاہتی ہوں، میں بھی تو بسمہ کے بھلے ہی کی بات کررہی ہوں۔ اگر کہیں غیروں میں بیاہ کر جائے گی تو جانے وہ لوگ کیسے ہوں۔ بسمہ کے ساتھ کیا سلوک کریں، اس کے ساتھ پہلے ہی بہت برا ہوچکا ہے۔'' زینب بی بی نے رسانیت سے بیٹی کو وضاحت دی۔

''لیکن اماں......!''

''تو نہیں جانتی ہاجرہ...... یہ دنیا بڑی ظالم ہے، ایک یتیم' وہ بھی مطلقہ لڑکی جس کے آگے پیچھے کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ سسرال والے اسے پلکوں پر بٹھا کے نہیں رکھتے۔ پھر میں تو اس کی سگی پھوپی ہوں، مجھ سے بڑھ کر اس کا خیال کون کرسکتا ہے۔ اور پھر جاذب میں کس بات کی کمی ہے۔ جوان ہے، اچھا کماتا ہے، بسمہ سے کوئی پانچ سال ہی تو بڑا ہوگا پھر اپنا گھر بھی ہے، بسمہ کو اور کیا چاہیے؟'' اپنے مطلب کے ساتھ انہیں بسمہ کی بھلائی بھی مقصود تھی۔ اسی لیے وہ بیٹی کو سہولت سے سمجھا رہی تھیں۔

''جاذب بھائی میں واقعی کوئی کمی نہیں ہے

اماں...... مگر وہ کنوارا نہیں چار بچوں کا باپ بھی ہے۔ اس لیے ہمیں کوئی یک طرفہ فیصلہ کرنے سے پہلے اس بارے میں بسمہ سے بات کرنی چاہیے۔ اور اگر اسی کی مرضی نہ ہو تو ہمیں اس پر دباؤ نہیں ڈالنا۔'' اور بیٹی کی بات سن کر زینب بی بی سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگیں۔

''اماں...... وہ یتیم ہوئی تھی تو آپ نے اسے سہارا دیا تھا۔ مگر اب اس سے سہارے کی غرض رکھو گی تو یہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اور اللہ یتیم کے ساتھ ناانصافی اور حق تلفی کرنے والے کو معاف نہیں کرے گا۔'' ہاجرہ نے اب صاف لفظوں میں ماں کو جتادیا کہ وہ بسمہ کے بارے میں ازخود فیصلہ کرکے اپنی غرض کا سودا کررہی ہیں۔ اور زینب بی بی کو بیٹی کی بات سمجھ آگئی۔ وہ واقعی خود غرض بن کر سوچ رہی تھیں کہ اگر بسمہ کی جگہ کوئی دوسری عورت اس گھر اور جاذب کی زندگی میں آگئی تو شاید ساجدہ کے معصوم بچوں کے ساتھ انصاف نہ کرسکے۔ جبکہ چاروں بچے بسمہ سے مانوس ہوچکے تھے...... اگر جاذب سے نکاح ہوجاتا تو بسمہ کو ہی ماں سمجھنے لگتے۔ اور گڑیا کو تو پیدا ہونے کے بعد سگی ماں کا لمس اور پیار نصیب ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ تب سے بسمہ کی گود میں پل رہی تھی۔ اب اس کا نام بھی بسمہ نے ہی رکھنا تھا تو پھر وہ اس کی ماں کیوں نہیں بن سکتی۔ بس اسی سوچ نے انہیں مطلبی بنادیا تھا۔ لیکن اب ہاجرہ کی باتوں سے احساس ہوا کہ بسمہ نے بیٹی کی طرح ان کی خدمت کی۔ پھر وہ اس کے لیے ماں بن کر کیوں نہیں سوچ سکتیں اور انہوں نے سوچ لیا کہ وہ بسمہ کی مرضی اور خوشی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کریں گی۔

''خدا کا شکر ہے ہاجرہ...... تو نے مجھے یتیم کے ساتھ ناانصافی کرنے سے بچالیا۔ ورنہ میں تو واقعی اپنی غرض کی خاطر سوادی ہورہی تھی مگر تو دعا کر کہ بسمہ ہماری رضا میں خوشی سے راضی ہوجائے۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ ساجدہ کے بچوں کو کوئی دوسری عورت سوتیلی ماں بن کر پالے۔ بسمہ تو انہیں ایسے عزیز رکھتی ہے جیسے خود ان کی ماں ہو۔'' زینب بی بی نے گلوگیر لہجے میں کہا تو ہاجرہ کو بھی ماں کی غرض میں چھپی محبت کا احساس ہوا تھا۔ اور وہ انہیں تسلی دینے لگی۔

''کیوں نہیں اماں...... دعا اگر خلوصِ دل سے مانگی جائے تو ضرور پوری ہوتی ہے۔ بات صرف نیتوں کے اخلاص کی ہے۔''

اور بیٹی کی بات سن کر زینب بی بی کا دل سکون سے بھر گیا اور انہوں نے آج ہی بسمہ سے جاذب کے رشتے کے سلسلے میں اس کی مرضی معلوم کرنی تھی۔ تاکہ اپنے بیٹے کی سونی زندگی کو پھر سے خوشیوں سے آباد کرسکیں۔ اور انہیں بیٹے پر پورا یقین تھا۔ اس بار بھی وہ ان کی خواہش وخوشی کی لاج رکھے گا۔

☆☆☆

''تم پر کوئی زور زبردستی نہیں ہے بسمہ پتر، تمہارا جو بھی فیصلہ ہوگا۔ مجھے خوشی سے قبول ہوگا۔ کیونکہ میں صرف تمہاری خوشی چاہتی ہوں۔ مجھ بڑھیا کی زندگی کا کیا بھروسا ہے اپنے سامنے جوان بہو کا جنازہ اٹھتے دیکھا ہے۔ اب چاہتی ہوں کہ اپنی آنکھیں بند ہونے سے پہلے بیٹی کی زندگی کا فیصلہ اپنی زندگی میں کردوں...... کیونکہ میں نے تو پہلے دن ہی سوچ لیا تھا کہ کسی اچھے گھرانے میں تمہیں بیاہ دوں گی۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ میری بوڑھی آنکھوں کے سامنے جوان بیٹے کا گھر اجڑ جائے گا۔ اسی لیے جاذب کا گھر آباد کرنے سے پہلے تمہارا بیاہ کرنا چاہتی ہوں...... لیکن میری خواہش ہے کہ تم میرے جاذب کی دلہن بنو...... پر مرضی صرف تمہاری ہوگی۔ تم اپنا فیصلہ مجھے سنادو۔ تمہارے دل میں کیا ہے؟''

زینب بی بی نے بڑی تفصیل سے بات کی تھی۔ اور بسمہ تو ان کے لبوں سے اپنے لیے بیٹی کا لفظ سن کر ہی پگھل گئی تھی۔ وہ زینب بی بی کی آنکھوں میں چھپی نمی اور چہرے کی مایوسی دیکھ کر سمجھ رہی تھی کہ انہیں لگ رہا ہوگا کہ جاذب سے اس کی شادی کا فیصلہ کرکے وہ خود غرضی کررہی ہیں تاکہ ان کے دل پر یتیم بھتیجی کے ساتھ ناانصافی کرنے کا بوجھ نہ رہے۔ مگر وہ پھوپی کی بوڑھی

آنکھوں سے جھانکتی شدید خواہش بھی پڑھ چکی تھی۔ پھر وہ کوئی ایسا فیصلہ کیسے کر سکتی تھی۔ جس سے پھوپی زینب کے دل کو ہی نہیں اس کے اپنے دل کو بھی ٹھیس پہنچتی۔ اتنے ماہ اس گھر کے مکینوں کے ساتھ رہتے ہوئے ان سے قلبی لگاؤ پیدا ہو چکا تھا۔ وہ اس گھر کے در و دیوار ہی نہیں مکینوں سے بھی مانوس ہو چکی تھی۔ رہی بات جاذب کی تو وہ جانے کب اس کے دل میں نرم گوشہ بنا چکا تھا۔ اپنی خوبیوں کے باعث یا پھر محبت...... جو دلوں کا سنجوگ ہوتی ہے اور یہ محبت اسے اپنے شوہر سے نہیں ملی تھی۔ اس کے شوہر نے بسمہ کے دل و دماغ پر صرف حکمرانی کرنی چاہی تھی، محبت نہیں، نہ کبھی اپنی محبت و لگاؤ کا احساس ہی دلایا تھا۔ محبت نہ سہی عزت تو دیتا۔ اس نے تو بس اپنے نفع و نقصان (اولاد نہ ہونے) کا حساب کتاب لگا کر فیصلہ سنایا تھا۔ اور بسمہ کو بیکار، فالتو اور ناکارہ شے سمجھ کر اپنی زندگی سے نکال کر پھینک دیا اور اب پھوپی زینب اسے کتنی چاہ سے اس شخص سے منسوب کرنے کی بات کر رہی تھی۔ جس کے بارے میں بسمہ کو یقین تھا کہ وہ اسے محبت دے نہ دے مگر عزت ضرور دے گا۔ اور بسمہ کے لیے یہی کافی تھا۔ لہٰذا اس نے اپنی جانب امید بھری نگاہوں سے دیکھتی پھوپی کو جواب دینے میں دیر نہیں لگائی۔

''میں نے اپنی زندگی کے سارے فیصلے کرنے کا اختیار آپ کو دے دیا ہے پھپو...... آپ میرے لیے جو بھی فیصلہ کریں گی وہ مجھے منظور ہوگا۔ امی، ابا کے بعد اگر مجھے کسی رشتے میں اخلاص ملا ہے تو وہ آپ کی اور اس گھر کے لوگوں کی ذات ہے۔ میں اس گھر کے مکینوں کی محبتوں کی مقروض ہوں اور مجھے وہ ساری محبتیں لوٹانی ہیں...... مگر......!''

اور بسمہ کا اقرار سن کر خوشی سے چھلکتی زینب بی بی کی آنکھوں نے یک دم تحیر سے اسے رک کر دیکھا وہ اسے بے ساختہ گلے لگانا چاہتی تھیں لیکن اس کے آخری لفظ نے انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔

''مگر کیا جاذب کی مرضی بھی اس رشتے میں شامل ہے پھپو؟'' بسمہ نے جھجکتے ہوئے آخری جملہ ادا کیا تو جواباً زینب بی بی نے بے ساختہ مسکراتے ہوئے اسے پکڑ کے اپنے سینے سے لگا لیا۔

''جیتی رہے پتر...... تیرے جواب نے مجھے بہت بڑی خوشی دی ہے۔ اور رہی بات جاذب کی تو اس کی مرضی نہ ہوتی تو میں کبھی یہ فیصلہ تجھے کرنے کو نہ کہتی...... کیونکہ اب تو مجھے بیٹی کی طرح عزیز ہے۔ اور میں اپنی بیٹی کے ساتھ کیسے ناانصافی کر سکتی ہوں۔ جاذب کو اعتراض نہیں ہے۔ پھر بھی اپنی تسلی کے لیے تم خود اس سے پوچھ لینا۔ میں تو بس اسی جمعے ہی تم دونوں کا نکاح رکھ رہی ہوں۔''

زینب بی بی نے اسے خود سے الگ کر کے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے مسکرا کر کہا تو جواباً بسمہ نے جھینپ کر نگاہوں کے ساتھ چہرہ جھکا لیا۔ تب زینب بی بی..... اس کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھ کر اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ یہ خوش خبری ابھی فون پر ہاجرہ کو بھی تو سنانی تھی۔ ساری تیاریاں اسی نے تو کرلی تھیں۔ کیونکہ اسے اپنے بھائی نہیں ساجدہ بھابی کے بچوں کا گھر اور معصوم دل آباد کرنا تھا۔ بسمہ کی صورت میں جن معصوموں کو بچی ممتا مل رہی تھی بھلا بسمہ سے بڑھ کر جاذب اور ساجدہ کے بچوں کو ماں کا پیار کون دے سکتا تھا۔

اور پیچھے بچوں کے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی بسمہ سوچ رہی تھی کہ نصیب میں اگر سچی خوشیاں لکھی ہوں تو دیر سے سہی مگر مل ضرور جاتی ہیں۔ ساتھ ہی یہ یقین تھا کہ جب زینب بی بی شاہینہ کو کراچی فون کر کے اس بابت بات کریں گی تو وہ اعتراض نہیں کرے گی۔ لہٰذا یہ سوچ کر پُرسکون ہو گئی کہ رشتے بدلتے ہیں تو کبھی، کبھی ان کے بدلنے پر بہت دکھ ہوتا ہے۔ لیکن کچھ رشتے ایسے ہوتے ہیں جن کی پچھلی نوعیت بدل جائے تو بندے کی زندگی میں سکھ کے موسم خود بخود چلے آتے ہیں، اس کی زندگی کا موسم بھی جاذب کے ساتھ اس کے رشتے کے بدلنے سے بدلنے والا تھا۔

سائن ان سائن آؤٹ

سیما رضا ردا

حریم افتخار نے بچپن ہی سے تربیت کے سارے زیور پہنے۔ اسکول سے لے کر کالج اور کالج سے یونیورسٹی کا سفر کامیابی سے طے کیا...... اس کے بابا نے اس کی کامیابیوں کو اعزاز کے ساتھ ہر جگہ سنایا۔ تعلقات عامہ میں ماسٹرز کے بعد اس نے مقابلے کا امتحان پاس کیا اور جب اس کی پوسٹنگ بطور اسسٹنٹ کمشنر بدین ہوئی تو اس کے بابا کو اس پر بے انتہا فخر محسوس ہوا۔ اس کی زندگی کتنی خوب صورت تھی۔ روشن ذہن افراد، تعلیم یافتہ



گھرانا، دو بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ تب ہی اس کے خالہ زاد اعزاز نے اس کو شریکِ حیات بنانے کا فیصلہ کیا اور یوں وہ شادی کے بندھن میں بندھ گئی۔ مگر اتنی ساری کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد کہانی ختم نہیں ہوجاتی بلکہ کہانی یہاں سے ہی جنم لیتی ہے۔ جب اس نے سسرال میں قدم رکھا۔

وہ زندگی میں کامیابی کے مدارج طے کرتے ہوئے یہ بھول گئی تھی کہ ہر رشتہ مخلص نہیں ہوتا۔ اور کبھی، کبھی خونی رشتے، غیروں سے زیادہ دکھ دیتے ہیں۔ اس کی سگی خالہ کی بیٹی، نند بن کر زیادہ خطرناک ہوگئی تھی۔ حریم کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنے حرفوں کی بنی ہے۔ اس کی اور حریم کی شادی ساتھ، ساتھ ہوئی تھی مگر ایک مہینے دس دن کے اندر، اندر وہ اس گھر میں واپس آچکی تھی اپنے شوہر سمیت۔

وہ عجیب مزاج کی لڑکی تھی، نام تو اس کا روزینہ تھا مگر اس نے اپنا نام سروپا رکھ لیا تھا۔ خالہ نے احتجاج بھی کیا کہ تم نے کیا ہندوانہ نام رکھا ہے مگر اس نے کہا۔

''میرے شوہر کو میرا یہ نام پسند ہے اور وہ اس کو سوشل میڈیا پر بھی دے چکے ہیں۔ اب میری آئی ڈی بھی اسی نام سے ہے۔'' اس نے اپنی بڑی، بڑی تیز چمکدار آنکھوں کو گھماتے ہوئے کہا۔

حریم کی تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی اس ماحول نے اسے اچھے برے کی تمیز سکھائی تھی۔ کچھ وقت تدریس کے شعبے سے وابستہ رہی۔ طالبات سے اس کی ذہنی ہم آہنگی تھی۔ وہ لڑکیاں آج بھی حریم سے ہر معاملے میں مشاورت کرتی تھیں۔ مگر سروپا احساسِ برتری کے لبادے میں لپٹی ایسی لڑکی تھی جسے خود سے زیادہ دنیا میں کوئی پسند نہیں تھا۔ حریم کو اس کا مزاج سمجھنے میں کچھ وقت لگا۔ حالانکہ بچپن سے جانتی تھی مگر کچھ جوہر اب کھلے تھے۔ بظاہر حریم بھابی کہہ کر گلے لگنے والی سروپا یا تو بیوقوف تھی، نادان تھی یا پھر شاطر...... حریم کی دیورانی کا خیال تھا کہ وہ سراسر شاطر ہے۔ بہت جلد کھل کر سامنے آجائے گی لیکن حریم ہمیشہ خوش گمان اور اپنی آنکھ سے دنیا دیکھنے والی تھی۔ وہ سب کی سنتی ضرور تھی مگر فیصلہ خود کرتی تھی۔ اس کے شوہر اعزاز کو اس کی یہ عادت بہت پسند تھی۔

اعزاز کو بھی سروپا کے مزاج کا بخوبی اندازہ تھا۔ ظاہر ہے وہ اس کے بڑے بھائی تھے اور سروپا کو اگر لحاظ تھا تو صرف اعزاز بھائی کا۔ باقی دونوں بھائیوں کو وہ قطعاً خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ دوسرے بھائی کی بیوی سے مسلسل رابطے میں رہتی تھی۔

''دوسری ڈائننگ ٹیبل اتنی جلدی آگئی؟ ایک سال پہلے تو ٹی لاؤنج میں قالین بچھا تھا اور اب نیا؟ واہ! معراج خالہ نے کس، کس کو دعوت میں بلایا؟ کھانے میں گوشت کے پکوان کتنے تھے؟ حیدر آبادی بریانی تھی یا کچے گوشت کی بریانی؟'' ان سب لوگوں کی زندگی ان ہی موضوعات کے گرد گھومتی تھی۔ ایک دوسرے کی کمزوریاں ڈھونڈ، ڈھونڈ کر برائیاں کرنا اور سامنے تعریف کرنا اور پھر ایک ہوجانا۔

اُف...... ایسے چاپلوس ماحول میں رہنا آسان نہیں تھا۔ اگر ذہن کے دریچے میں روشنی نہ ہو تو جاہلوں کے درمیان رہنا مشکل ہوجائے۔ اور ایسا ہی جیتا جاگتا کردار سروپا تھی۔ جس کی بے سروپا حرکتیں حریم کو کوفت میں مبتلا کردیتیں۔ مگر اسے سب رشتوں کا بھرم قائم رکھنا تھا۔ گو کہ ایسا کرنا بھی کانٹوں پر چلنا تھا۔ اس کی ساس کا کہنا تھا کہ بس میرے بچوں کو کوئی کچھ نہ کہے۔ خاص طور پر سروپا کے معاملے میں خالہ اور خالو دونوں بہت حساس تھے۔

''لیکن زندگی کا مقصد یہ تو نہیں ہے جس طرح سروپا گزار رہی ہے۔'' وہ فیس بک پر اس قدر ان تھی کہ کچھ حد نہیں۔ ایک بار تو اس نے اس کی بڑی بھابی ہونے کی حیثیت سے سمجھانا چاہا کہ ''تم کس قسم کے سطحی اسٹیٹس دیتی ہو اور طرح، طرح کے لوگ عجیب، عجیب کمنٹس دیتے ہیں۔''

''آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

وہ بے پروائی سے بولی۔

''مگر...... مگر تم روز فیس بک پر اپنے ذاتی مسائل کیوں شیئر اور پوسٹ کرتی ہو؟ آئے دن تمہارا اسٹیٹس اپنے شوہر کے خلاف آتا ہے۔ ابھی تو تم اسے ہنس کر رخصت کررہی تھیں۔ اگر تمہیں احسن سے کوئی شکایت ہے تو سامنے بیٹھ کر مسئلہ حل کرو۔ فیس بک پر سارے لوگ تماشا دیکھتے ہیں۔''

''اس میں تماشا بننے کی کیا بات ہے؟'' وہ کسی بات کا اثر لیے بغیر بولی۔

''خدایا...... تم کس مٹی کی بنی ہو؟'' اس نے تقریباً زچ ہوتے ہوئے کہا۔

''اسی مٹی کی جو تمہاری ہے۔'' ڈھٹائی کی انتہا تھی۔

''سنو! اگر احسن تمہیں آئس کریم پارلر لے کر نہیں گیا تو تم نے ایف بی پر لکھ دیا۔''

''آج میں اداس ہوں، احسن اپنی امی کو مجھ سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔'' اور پھر تم نے احسن کے غم میں جلی ہوئی ہنڈیا بھی فیس بک پر دکھادی۔ کیا تمہیں احساس ہے تم کس قدر سطحی انداز میں اس سہولت کو استعمال کررہی ہو۔''

حریم نے آخری جملہ بہت سختی سے کہا۔ وہ سمجھی شاید وہ برا مان جائے گی۔ مگر وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

''ارے بھابی...... آپ کو کیا پتا، دنیا کہاں جارہی ہے۔ میرے اتنے فرینڈز ہیں۔ پاکستان میں تو کم ہیں۔ ملائشیا، کینیڈا، امریکا، نیوزی لینڈ، نائیجیریا... کیا بتاؤں کہاں کہاں دنیا میں میری دوستی کے جال پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے ڈونٹ وری۔ میرے بارے میں پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اچھا اور برا بھلا... میں سب جانتی ہوں۔ دنیا میری مٹھی میں ہے، صرف ایک انگلی کے فاصلے پر۔''

وہ حریم کے سر پر ہاتھ رکھتی یہ جا وہ جا۔ اور حریم کو اپنا آپ اس وقت بہت عجیب لگ رہا تھا۔ اس گھر میں سوائے اس کے شوہر اعزاز کے کوئی ایسا نہیں تھا جس سے وہ اپنے اس دکھ کا مداوا کرسکتی جو اسے بے چین کررہا تھا۔ اور یہ تو طے تھا کہ انسان جب تباہی کے راستے پر چلتا ہے

تو نتیجہ بھی بھگتنا ہے۔ سروپا کا احساسِ تفاخر، خود کو اعلیٰ و ارفع سمجھنا یہ سب اچھی علامات نہیں تھیں۔ حریم کا رشتہ بھی اس کے ساتھ بہت نازک تھا۔ وہ اسے یہ کہہ بھی نہیں سکتی تھی کہ سب چھوڑ کر اپنی سسرال میں اچھی بہو کا رشتہ نبھاؤ۔ وہ صرف سوچ کر رہ جاتی۔

وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ بھی کے گوہر کھلتے چلے گئے۔ حریم کے پیشہ ورانہ فرائض کٹھن تھے۔ مگر وہ سسرال اور دفتر دونوں کو ایسے لے کر چلتی کہ سب اس کی قدر کرتے۔ قدرت نے اس کی جھولی میں ایک پھول ڈال دیا۔ اس کی زندگی مکمل ہوگئی تھی۔ وہ اذان کی پرورش میں اطراف سے بے نیاز ہوگئی تھی۔ دنیاداری بھی کچھ ختم سی ہوگئی تھی۔ چھوٹے بچے کی پرورش میں وہ اپنا آپ بھول گئی تھی۔

کچھ دنوں سے سروپا بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ خالہ نے بتایا کہ وہ لیبر ٹریننگ کے کسی کورس کے لیے ڈیڑھ مہینے کے لئے کوئٹہ گئی ہوئی ہے۔ ٹائم لائن پر اکثر اس کی ایکٹویٹیز نظر آجاتیں۔

وہ عام دنوں کی طرح کا ایک دن تھا۔ اچانک گھر میں ایک طوفان سا اٹھا۔ وہ اذان کے ساتھ اس کی معصوم اداؤں پہ قربان ہورہی تھی۔ جب بہت تیز باتوں اور ساتھ میں چلانے کی آواز آئی۔ حریم دہل سی گئی۔ اذان بھی یک دم رونے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ فوراً سیڑھیاں پھلانگتی نیچے جائے اور معلوم کرے کہ کیا ہوا ہے۔ مگر اذان کو چپ کرا کے اور اسے کاندھے سے لگا کے جب وہ نیچے پہنچی تو لاؤنج کا ماحول بہت عجیب و غریب ہورہا تھا۔ خالہ اور خالو کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح خاموش بیٹھے تھے۔ احسن اپنا سامان سمیٹ کر باہر نکل رہا تھا۔ اس کا حلیہ ابتر تھا۔

”کیا ہوا احسن بھائی...... خیریت تو ہے؟“ اس نے محتاط لہجے میں پوچھا۔ ”آپ کہاں جارہے ہیں اس طرح۔ کیا ہوا سب ٹھیک ہے ناں؟“

”کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ سب کچھ تباہ ہوگیا حریم بھابی۔ جس کی خاطر میں نے اپنی ماں کو چھوڑا...... اپنے بھائی کو خفا کیا، اس گھر میں آکر رہنے لگا، اس کی خاطر اُن لوگوں سے ملا جن سے وہ چاہتی تھی۔ اور اس نے کیا کیا؟ دیکھیں ذرا سوشل میڈیا پر جا کر اس آوارہ لڑکی کے کرتوت۔ میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ اسے کوئی حیا نہیں، شرم نہیں۔ میں نے اپنی ماں کا دل دکھایا ہے۔ یہ سب اسی کی سزا ہے۔“ وہ تیز، تیز قدم اٹھاتا اس گھر سے نکلتا چلا گیا۔

حریم حیران و پریشان سوالیہ نظروں سے سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سب مجرم بنے بھیگی آنکھیں لیے بیٹھے تھے۔ کیا ہوگیا تھا ایسا، سروپا ٹھیک تو ہے۔ اعزاز بھی خاموش تھے، کوئی جواب دینا نہیں چاہتا تھا اور سوال کرنا اذیت سے کم نہ تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کے لیے سیڑھیاں طے کرنے لگی۔ تب اچانک اپنی کزن ثوبیہ کی آواز اس کے کان میں گونجی جو دو دن پہلے فون پر کہہ رہی تھی۔

”حریم تمہاری نند نے تو بڑے پُرزے نکال لیے ہیں۔ کیا اس کے لیے اس کے شوہر کی محبتیں کافی نہیں ہیں جو عجیب و غریب مردوں کے ساتھ تصویریں اتار کر FB پر پوسٹ کررہی ہے اور کس قدر گھٹیا کمنٹس آرہے ہیں...... توبہ توبہ!“

اس نے اپنی کزن کی بات سنی ان سنی کردی تھی۔

مگر معاملہ اتنا خطرناک ہوگا اسے اندازہ نہیں تھا کہ احسن سروپا کو چھوڑ دے گا اور طلاق دے کر فوراً یہ جا وہ جا۔ سروپا (روزینہ) اور احسن کی محبت کا یہ انجام۔ وہ دکھ سے سوچتی رہی اور جب اس نے سوشل میڈیا پہ اپنا پروفائل کھولا اور سروپا کی آئی ڈی دیکھی جہاں وہ دلہن بنی بیٹھی تھی اور ساتھ میں برطانوی نژاد راحیل قمر تھا۔ جس سے اس کی دوستی زوروں پہ تھی۔

یہ سب کیا تھا؟ ایک شوہر کے نکاح میں ہوتے ہوئے وہ دوسری شادی کیسے کرسکتی ہے۔ مگر وہ ایسا کرچکی تھی۔ پورے خاندان اور محلے میں بدنامی ہوچکی تھی۔ خالہ اور خالو برسوں کے بیمار لگ رہے تھے۔ پورے گھر میں ویرانی طاری تھی۔ تینوں بھائیوں کو شدید غصہ تھا اور

بس نہیں چل رہا تھا کہ روزینہ کو قتل کردیں۔ مگر اس سے رابطہ نہیں ہو پارہا تھا۔ ان ہی دنوں کوئٹہ میں بم بلاسٹ کی اطلاع نے دل دہلا دیا۔ حریم نے خود خالہ کے منہ سے سنا کہ وہ کہہ رہی تھیں۔ ”اللہ کرے سروپا کو موت آگئی ہو۔“ مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اگر کچھ ہوا تو یہ کہ سروپا ڈیڑھ ماہ بعد گھر لوٹ آئی۔

وہ والہانہ انداز میں اپنے امی ابو کی طرف لپکی مگر خالہ نے نفرت سے کہا۔ ”خبردار وہیں لوٹ جا...... جہاں سے آئی ہے۔ ہمارا تمہارا رشتہ ختم ہوچکا ہے......“

”ہوا کیا ہے......؟“ وہ بولی

”ہم سے پوچھ رہی ہے کیا ہوا ہے؟ تو بتا بے حیا، بے غیرت کہ تیری جرأت کیسے ہوئی یہاں آنے کی۔ ذرا سی بھی غیرت ہے تو، تو نکل جا ورنہ تیرے بھائی تجھے قتل کردیں گے۔ جا یہاں سے......“ خالو نے اسے ...... بے دردی سے دھکیلتے ہوئے کہا۔

”لیکن امی! مجھے بتایئے تو میں نے کیا کیا ہے؟“

وہ سب کی طرف سے مایوس ہوکر حریم کی طرف پلٹی۔

”آپ بتایئے حریم بھابی...... یہ لوگ ایسا کیوں کررہے ہیں اور احسن میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہا ہے۔ بہت دنوں سے بات نہیں ہوئی۔ کوئٹہ کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ وہاں نیٹ کی سہولت میسر نہیں تھی۔ اس لیے کچھ پتا نہیں چل سکا۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔ حریم کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

”کیا......؟ نیٹ کی سہولت نہیں تھی وہاں......؟“ حریم نے پوچھا۔

”نہیں...... آپ لوگوں کو نہیں پتا کیا......؟ یہ تو ٹی وی اور اخباروں میں بھی بتایا گیا تھا...... جب ہی تو میرا کوئی اسٹیٹس نہیں دیکھا ہوگا آپ لوگوں نے۔ کوئی تصویر، کوئی ایونٹ وغیرہ۔ احسن میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہا آخر......؟ وہ ہے کہاں......؟“

”کیا بکتی ہے تو......؟ تجھے کچھ نہیں پتا کہ احسن نے تجھے طلاق دے دی ہے......“ اعزاز کے چھوٹے بھائی اعتصام نے اسے بالوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔

”طلاق! مجھے، کیسی باتیں کررہے ہیں آپ لوگ......؟ کیا ہوگیا ہے آپ کو......؟“ وہ چیختے ہوئے بولی۔

”جب تو دوسری شادی کرے گی تو طلاق تو ملے گی ہی ناں......“ خالو نے کہا

”مگر کیوں......؟ میرا قصور کیا ہے......؟“ وہ نہ سمجھتے ہوئے چیخ رہی تھی۔ اس کے ہوش و حواس جواب دے رہے تھے اور پھر تحقیق کرنے کے بعد بہت سارے حقائق سامنے آئے۔

جب سروپا کوئٹہ گئی تو وہاں کے حالات شدید خراب تھے۔ دہشت گردی کے پیشِ نظر موبائل سگنلز کے ساتھ، ساتھ وائی فائی سسٹم بھی ختم کردیا گیا تھا۔ جس ہوٹل میں سروپا ٹھہری تھی۔ وہاں بھی بڑی سختی تھی۔ [illegible] کرنے کے لیے زیارت جانا پڑتا تھا۔

لیکن سروپا کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ کیا وہ سائبر کرائم کا شکار ہوگئی تھی۔ یا احسن کو زبردستی اپنے گھر لے آنا، اس کی ماں سے بدتمیزی کرنا، اس کا گناہ تھا۔ مگر سوشل میڈیا کے مضر نقصانات نے اس کی زندگی تباہ کردی...... وہ سائبر کرائم کا شکار ہوئی تھی۔ اس کے انہی نام نہاد دوستوں نے اس کو نقصان پہنچایا تھا جو اس کے جاں نثار بنتے تھے۔ آج کے دور میں کسی کی آئی ڈی ہیک کرکے اس کی کمزوریاں جان کر اسے بلیک میل کرنا، اس کی شادی شدہ زندگی کو اجاڑنا، پیسے ہتھیانا، غلط کام کروانا، عام ہوگیا ہے۔

احسن نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ کوئٹہ میں تو انٹرنیٹ بحال نہیں ہے تو پھر سروپا ٹائم لائن میں سائن اِن کیسے ہوئی۔ سروپا اس حادثے سے ذہنی مریض بن کر رہ گئی۔ احسن کو بہت بعد میں احساس ہوا کہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ سروپا کے بے پروا رویّے سے چڑتا ضرور تھا۔ مگر اس کی جنونی محبت سے واقف تھا کہ وہ اس کے علاوہ کسی کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ مگر اب بہت دیر ہوچکی تھی۔





ناولٹ

حیاتِ جاوداں تو ہے

نزہت جبیں ضیا

میں آہستہ، آہستہ چلتے ہوئے کھڑکی میں آکر کھڑی ہوگئی، صحن کا منظر صاف نظر آرہا تھا عشوہ اور اجوہ ، زین کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ زین بوتل میں بنے جھاگ سے بلبلے ہوا میں اڑا رہا تھا اور ننھی عشوہ اور اجوہ بھاگ، بھاگ کر ان بلبلوں کو پکڑنے کی کوشش کررہی تھیں۔

''میری زندگی بھی تو ان بلبلوں کے مانند تھی، خوب صورت انداز میں شروع ہوئی۔ رنگین اور شفاف' خوب صورت بلبلا جو چند لمحوں میں ہوا میں تحلیل ہوکر ختم ہوجاتا...... ایسے ہی تو میری خوشیاں ، رنگینیاں سب...... سب...... اُف......'' میں نے ایک سرد آہ بھری ...اور نچلا ہونٹ دانتوں سے کاٹنے لگی۔

عشوہ کی ہنسی کی آواز پر میں چونکی، عشوہ اور اجوہ کتنی خوش اور مطمئن تھیں۔ بھاگتی، دوڑتی اور کھلکھلاتی وہ کتنی حسین لگ رہی تھیں اور زین...... زین بھی بالکل بچوں کی طرح سے ان کے ساتھ صحن میں بھاگ رہا تھا۔ دونوں کو

بہلا رہا تھا، میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔ میں پلٹ کر آہستگی سے چلتی ہوئی بیڈ کی طرف آگئی اور بیڈ پر بیٹھ گئی، دکھ کی شدید لہر میرے رگ و پے میں اتر آئی۔
''اُف......'' بے ساختہ میرے منہ سے سسکاری کی صورت نکلا...... عین اسی وقت اماں میرے کمرے کے سامنے سے گزریں، میری اُف کی آواز پر چونک کر دوڑی چلی آئیں۔
''کیا ہوا ہے......؟ طبیعت خراب ہو رہی ہے کیا...... ٹیکسی منگواؤں کیا......؟'' ایک ہی سانس میں گھبرا کر اماں نے کئی سوال کر ڈالے۔
''جی نہیں اماں...... میں ٹھیک ہوں، آپ گھبرا کیوں رہی ہیں؟ میں کوئی بچی نہیں ہوں اور نہ ہی پہلی بار اس کیفیت سے دوچار ہوں، آپ اس قدر پریشان کیوں ہو جاتی ہیں...... اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں کہہ دوں گی میرے لیے کوئی نئی بات یا پہلا تجربہ نہیں ہے یہ...... بس تھوڑا سا آرام کرنا چاہتی ہوں۔'' میں نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا میں شاید نادانستگی میں تلخ ہو گئی تھی، میرا لہجہ سخت اور کھردرا تھا۔
''چلو ٹھیک ہے، تم آرام کر لو۔'' اماں نے مجھ پر پائنتی رکھی چادر پھیلاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں ڈھیر سارے آنسو میری بند پلکوں کی باڑ توڑ کر مختلف سمتوں میں بہنے لگے بالکل ایسے ہی جیسے آج کل میں اور باقر دو الگ، الگ سمتوں میں چلنے والے مسافر بن گئے تھے۔ باقر کے سامنے تو شاید کوئی منزل، کوئی راستہ تھا لیکن میں...... میں...... میں اپنے اور اپنی بچیوں کی طرف سے خاصی فکر مند تھی۔

☆☆☆

اس روز میں کالج سے واپس آئی تو گھر میں خوب شور تھا ثروت آپا اور قرأت آپا دونوں بچوں سمیت آئی ہوئی تھیں۔
''ارے واہ...... آج تو گھر میں خوب رونق لگی ہے ماشاء اللہ......!'' میں نے ننھے سے گول مٹول زیرک جسے پیار سے موٹو کہتی تھی کو گود میں اٹھاتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ایسا بہت کم ہی ہوتا ہے کہ دونوں آپائیں ایک ساتھ آتیں، دونوں کی سسرالیں بڑی، بڑی تھیں۔ اپنی، اپنی مصروفیات تھیں، اس لیے مجھے اچانک سے دونوں کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی۔ اماں نے بھی آج کھانے میں خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ جب دونوں اکٹھی ہوتیں، میرے عیش ہو جاتے، بچوں کے ساتھ مل کر خوب موج مستی کرتی اور ساتھ، ساتھ فرمائشی پروگرام کے تحت اپنی پسند کی ڈشز بھی بنوا لیتی۔ شام کو دونوں کی اکٹھی آمد کا عقدہ یوں کھلا جب مجھے پتا چلا کہ قرأت آپا کے شوہر دائم بھائی کے دوست کے بارے میں کہ ان کا رشتہ میرے لیے آیا ہے۔
''چلو گڑیا! تم جلدی سے نہا کر فریش ہو جاؤ اور کوئی اچھے سے کپڑے پہن لو۔'' ثروت آپا نے آکر مجھے مخاطب کیا میں جو موٹو کو بہ مشکل اچھالنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی چونکی۔
''کیوں آپا...... کوئی خاص وجہ......؟'' موٹو کو بیڈ پر بٹھاتے ہوئے پلٹ کر میں نے سوال کیا ساتھ ہی چہرے پر آئے ہوئے پسینے کے قطروں کو دوپٹے کے پلو سے صاف کیا۔
''ہاں جی......! خیریت ہی ہے، ہم لوگ سوچ رہے ہیں کہ اب تمہیں بھی اس گھر سے چلتا کر دیں۔'' ثروت آپا نے شریر لہجے میں کہا۔
''ارے اتنی جلدی......؟'' میں نے آنکھیں پھیلا کر تعجب کے ساتھ ناگواری سے کہا۔
''ارے بھئی جلدی کہاں......؟ نیکسٹ منتھ تم پورے بیس سال کی ہو جاؤ گی اور اس عمر میں ہم دونوں بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔'' ثروت آپا نے احساس دلایا تو میں مسکین سی شکل بنا کر سر کھجانے لگی۔
میں بھی عام لڑکی تھی میرے دل میں بھی اپنے جیون ساتھی کے حوالے سے خوب صورت جذبے تھے۔ میرا بھی دل کرتا تھا کہ کوئی اسمارٹ سا بندہ میرا ہم سفر

بنے۔ میرے اندر کے تجسس نے ہوا دی تو میں رشتے کے بارے میں کُریدنے لگی۔ تب ثروت آپا نے مسکراتے ہوئے تفصیل بتائی۔
''ارے بھئی پچھلے دنوں ہم لوگ قرأت کے دیور کی شادی میں گئے تھے ناں وہاں پر ان موصوف نے بذاتِ خود تم کو پسند کیا تھا۔ اور اب ساری زندگی خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کا پکا ارادہ کر کے بیٹھے ہیں انہیں کیا خبر کہ اپنی معصومیت میں وہ کس بلا کی آرزو کر بیٹھے ہیں، تب سے ہی دائم کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔'' ثروت آپا نے شرارتی انداز میں تفصیل بتائی۔
''تو یہ بات ہے...... مطلب یہ کہ نیناں کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا ہے۔'' میں نے اتراتے ہوئے خود کو آئینے میں دیکھا اور شرارت سے آنکھیں گھما کر ثروت آپا کی جانب دیکھا۔
''اُف توبہ! اس وقت تو پکی بھنگن لگ رہی ہے قسم سے۔ سر جھاڑ منہ پھاڑ پسینے میں نہائی ہوئی ہماری ماسی بشیراں کی کاپی۔'' ثروت آپا کی بے ساختہ شرارت پر مجھے ہنسی آگئی۔
ہمارے ابا جی ایک دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ ہم تین بہنیں ہی تھیں ثروت آپا؟ قرأت آپا اور میں ان دونوں سے پانچ اور چھ سال چھوٹی نیناں فاروق۔ ہم تینوں بہنوں نے ناک نقشہ ابا جی کا لیا تھا تو رنگ، عادت، اطوار اور سلیقہ مندی اماں کی طرف سے لی تھی یوں صورت کے ساتھ، ساتھ سیرت میں بھی مثالی تھے۔ ابا جی نے کبھی بیٹا نہ ہونے کا کوئی گلہ شکوہ نہ کیا تھا، نہ ہی اس بات کو اپنی کمزوری بنایا تھا۔ وہ ہم تینوں بہنوں پر جان دیتے تھے جبکہ اماں کو ایک بیٹے کی کمی کا احساس ہوتا جب وہ کبھی افسردہ ہو کر یہ بات کرتیں تو ابا جی فوراً انہیں ٹوک دیتے۔ انہیں نرمی اور محبت سے سمجھاتے اِدھر اُدھر کی مثالیں دیتے کہ اگر ہمارے بیٹے ہوتے وہ نافرمان، آوارہ نکلتے تو ہم تو جیتے جی مر جاتے...... وہ دکھ، وہ اذیت اس کمی سے زیادہ، شدید اور تکلیف دہ ہوتی اس لیے اللہ پاک کا شکر ادا کیا کرو کہ اللہ پاک نے ہمیں نیک، صالح اور سلیقہ مند بیٹیاں عطا کی ہیں اور اماں سر ہلا کر چپ ہو جاتیں۔
ابا جی کے ساتھ ان کے دفتر میں ایک لڑکا زین بھی جاب کرتا تھا۔ وہ ابا جی کی بہت عزت کرتا، ان کا خیال رکھتا۔ سانولا سا دراز قد اسمارٹ اور جاذب نظر زین اکثر ہمارے گھر آجاتا۔ ہمارے گھر کے چھوٹے موٹے کام کر دیتا وہ خود کو اماں اور ابا جی کا بیٹا کہتا ہی نہیں تھا بلکہ اس کا ثبوت بھی دیتا تھا۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہتا تھا اور دفتر کی ملازمت کے ساتھ، ساتھ پڑھائی بھی مکمل کر رہا تھا۔ کم گو، سلجھا ہوا، بردبار اور شریف لڑکا تھا بہت کم وہ مجھ سے بات کرتا جب بھی بات کرتا اس کی نظریں جھکی ہوتیں، اس بات پر میں اس کا مذاق بھی اڑاتی تھی۔ پھر ثروت آپا اور قرأت آپا کی شادی پر اس نے ابا جی کے ساتھ، ساتھ ایسے کام کیا کہ جیسے کوئی سگا بیٹا کرتا ہے۔ کبھی بھی کسی بھی موقع پر بیٹے کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اپنی امی کو بھی لے کر آتا تھا وہ بھی اچھی سوبر سی خاتون تھیں۔
ثروت آپا کی شادی کو دو سال ہو گئے تھے اور قرأت آپا کی شادی کو کچھ ماہ گزرے تھے۔ ثروت آپا کی گود میں زیرک تھا تب ایک دن دفتر میں کام کے دوران اچانک ابا جی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ابا جی، کے دوست اور زین ان کو لے کر فوراً کر اسپتال بھاگے۔ زین نے کال کر کے ہمیں اطلاع دی، ہم لوگ بھی بدحواس ہو کر اسپتال بھاگے، ثروت آپا، اعظم بھائی، قرأت آپا، دائم بھائی اماں، میں اور زین ہم سب ایمرجنسی کے باہر بیٹھے دعائیں مانگ رہے تھے۔ ابا جی کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور حالت کافی سیریس تھی میرا رو، رو کر برا حال تھا۔ ڈاکٹرز کی انتھک کوششیں، ہماری دعائیں، سب دھری کی دھری رہ گئیں کیونکہ اللہ پاک قادرِ مطلق ہے، وہ ہر چیز کے لیے اور ہر کام کے لیے اپنی حکمت کے مطابق وقت مقرر کرتا ہے اور ہم انسان اس کے آگے بے بس اور مجبور ہیں۔ شدید ہارٹ اٹیک ابا جی برداشت نہ کر پائے اور ان کی

آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں۔ نہ ہم بیٹیوں کی چیخیں ان کو جگا سکیں اور نہ اماں کی سسکیاں اور بین......

ہماری تو دنیا اندھیر ہوچکی تھی۔ مجھے کوئی ہوش نہ تھا وہ تو روز کی طرح صبح، صبح ہنستے مسکراتے ہم سے مل کر آفس کے لیے نکلے تھے، ہمیں کیا خبر تھی کہ صبح اپنے پیروں پر چل کر جانے والے ابا جی شام کو ایمبولینس کے اسٹریچر پر یوں واپس لوٹیں گے......اور جب زین، ابا جی کی ڈیڈ باڈی لے کر آیا تو اماں سے مل کر وہ ضبط کی ساری حدوں کو بھلا کر یوں تڑپ، تڑپ کر رویا جیسے واقعی آج اس نے اپنے باپ کو کھو دیا ہو۔ دکھ اور تکلیف کے ان لمحات میں جس طرح ابا جی کے دوستوں نے اور خصوصاً زین نے ہمارا خیال رکھا وہ قابلِ ستائش تھا۔ اماں سیدھی، سادی اور گھریلو خاتون تھیں انہوں نے بس گھر کی ذمے داریاں اور ہماری تربیت میں کوئی کمی نہیں رکھی تھی، اس کے علاوہ اخراجات سے لے کر دونوں بیٹیوں کی شادی تک کی تمام تر ذمے داری ابا جی نے ہی نبھائی تھی اور اس سلسلے میں اماں پر ابا جی نے کوئی بوجھ نہیں ڈالا تھا۔ یوں اچانک سے اب ساری ذمے داریاں اماں کے ناتواں کاندھوں پر آپڑی تھیں۔ اعظم بھائی نے بھی ہمارا کافی ساتھ دیا تھا۔ زین بیچارہ گھر کے فرد کی طرح ہر کام کے لیے موجود ہوتا مگر اس کے باوجود بھی اماں کے سامنے ڈھیروں مسائل درپیش تھے۔ میری تعلیم، میری شادی اور گھریلو امور کو احسن طریقے سے چلانا یہ سب اماں کے لیے باعثِ فکر تھا۔ میں ان دنوں انٹر میں تھی، بڑے سے گھر کے کونے، کونے سے مجھے ابا جی کی آوازیں سنائی دیتیں، ان کے قدموں کی چاپ محسوس ہوتی ان کے ساتھ گزارے ہوئے ایک، ایک پل کو یاد کرتی۔ میں اتنی بڑی ہوجانے کے باوجود آج بھی ابا جی کے گلے میں بانہیں ڈال کر اپنی فرمائشیں پوری کرواتی، کبھی، کبھی اماں سے مجھے ڈانٹ بھی کھانی پڑتی لیکن ابا جی ان کو خاموش کروادیتے۔

”نہیں سکینہ! میری بچیوں کو کچھ مت کہا کرو اور یہ...... یہ تو میری نیناں ہے، میرے نینوں کا چین ہے میرے دل کی ٹھنڈک ہے۔“ اور میں مزید اترا جاتی کبھی، کبھی ابا جی بولتے۔ ”سکینہ یہ تو ہمارے آنگن کی چڑیاں ہیں، ہماری بیٹیاں ہمارے گھروں کی رونق ہوتی ہیں، چڑیوں جیسی خوب صورت، رنگین اور اِدھر سے اُدھر پھدکنے والی حسین خوب صورت چہچہاتی چڑیاں جن کی معصوم اور جلترنگ سی آوازیں تو ہمارے آنگن کی رونق ہیں اور پھر یہ ایک، ایک کر کے اڑ جاتی ہیں۔ کوئی کہیں چلی جاتی ہے تو کوئی کہیں، ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوجاتی ہیں، ہمارے آنگنوں کو ویران کر کے کسی اور کے آنگن کی رونق بن جاتی ہیں، پرائی ہوجاتی ہیں، ہمارے لیے مہمان بن جاتی ہیں، دیکھو دو بیٹیاں تو چلی گئیں اب کسی دن یہ بھی چھوڑ کر چلی جائے گی۔“ ایسا کہتے، کہتے ابا جی کی آواز رندھ جاتی اور آنکھیں نم ہوجاتیں۔

”ابا جی! میں آپ کو اور اماں کو چھوڑ کر کہیں جانے والی نہیں ہوں۔“ میں حتمی انداز میں فیصلہ سنا دیتی۔

”چلو بھئی سکینہ اب تیسرا داماد گھر داماد ڈھونڈنا پڑے گا ہمیں۔“ ابا جی مسکراتے ہوئے ماحول کو بدلنے کی کوشش کرتے، میں مسکرا کر سر ہلا دیتی اور اماں کے لبوں پر بھی ہنسی آجاتی...... یوں وہ ہنستے مسکراتے پل جھٹ پٹ ہی گزر گئے۔ ابا جی اپنے بنائے ہوئے سارے پلان بھول بھال کر انجانے دیس جا بسے۔

قرأت آپا، دائم بھائی کے ساتھ مستقل چلی گئیں۔ ثروت آپا کچھ عرصے رہ کر سسرال واپس چلی گئیں اور اب میں اور اماں اتنے بڑے گھر میں تنہا رہ گئے۔ اب زین بھی صرف کام کے وقت آتا، وہ جانتا تھا کہ اس طرح ہر وقت منہ اٹھا کر چلے آنا مناسب نہیں...... کوئی کام ہوتا تو اماں اسے کال کر کے بلوا لیتیں...... پیسوں کی ہمیں کوئی پریشانی نہ تھی ابا جی کو دفتر کی طرف سے معقول رقم ملی تھی۔ دفتر والوں نے واجبات کی ادائیگی میں بھی کافی ساتھ دیا تھا۔ گھر کے اوپر والے پورشن کا

کرایہ بھی آتا تھا اور اماں کے نام ابا جی کی پنشن کا بھی آسرا تھا۔ بس ابا جی کی کمی ہر وقت محسوس ہوتی تھی۔ پھر میں نے گھر کا مکدر اور سوگوار ماحول بدلنے کے لیے گھر پر بچوں کو ٹیوشنز دینا شروع کردیا۔ ہمارے بڑے سے آنگن میں اب بچوں کا شور اچھا لگتا تھا۔ گھر کی اداسی کچھ کم ہوئی تھی، اماں نے بھی خود کو معروف کرلیا تھا۔ میں اپنی پڑھائی بھی کررہی تھی۔

زین اسی خلوص اور سعادت مندی سے ہمارا خیال رکھتا۔ مجھے کبھی، کبھی لگتا کہ جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مجھے اس کے خاموش لبوں پر کوئی بات مچلتی محسوس ہوتی جس کو وہ بیان نہیں کرپاتا۔ کبھی، کبھی جب وہ نظریں اٹھا کر مجھے دیکھتا ہماری نگاہیں آپس میں چار ہوتیں تو مجھے اس کی چمکیلی اور روشن آنکھوں میں کوئی سوال نظر آتا جسے کھوجنے کی کوشش میں، میں اسے گہری نظروں سے دیکھتی تو اتنی دیر میں وہ سنبھل کر نگاہیں جھکا لیتا، میں اپنا سر جھٹک دیتی۔ مجھے لگتا شاید یہ میرا وہم ہے۔ اسی طرح دو سال سے زیادہ کا عرصہ بیت گیا۔ قرأت آپا کچھ عرصے بعد پاکستان واپس آئیں تو ان کے دیور کی شادی کے ہنگامے شروع ہوگئے اب وہ شادی سے فارغ ہوکر ہمارے یہاں رہنے کے لیے آئیں تو ساتھ ہی رشتے کی نوید بھی لے کر آئی تھیں۔ باقر کا اپنا بزنس تھا اور وہ لوگ شہر کے پوش ایریا میں رہائش پزیر تھے۔ نشاط بیگم خاصی مغرور عورت تھیں جنہیں اپنی امارت کا بہت غرور تھا اماں کو وہ کچھ خاص پسند نہیں آئیں مگر باقر اچھا لگا تھا۔ یوں ضروری معلومات کے بعد رشتہ طے ہوگیا۔ میں نے اور باقر نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ باقر نے تو خیر شادی کے فنکشنز میں مجھے اچھی طرح دیکھ لیا تھا اور میں نے اسے اب دیکھا وہ اسمارٹ، چارمنگ اور ویل سیٹلڈ بندہ تھا، نہ پسند آنے والی کوئی بات نہیں تھی پھر میں نے کبھی کسی لڑکے کے بارے میں اس انداز سے سوچا بھی نہیں تھا اس لیے مجھے باقر ہر لحاظ سے اچھا لگا۔ زین ان دنوں کچھ ماہ کے لیے آفس کے کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ باقر کی مما کو بھی شادی کی جلدی تھی اور دوسری طرف قرأت بھی اس بار جاتی تو آنے میں... کم ازکم دو سال لگ جاتے یوں جھٹ پٹ شادی کی تاریخ بھی طے کردی گئی اور زور شور سے شادی کی تیاریاں ہونے لگی تھیں۔ میں ایک طرف تو باقر کی پرسنالٹی، اس کی باتوں اور اس کے بی ہیور سے مطمئن تھی تو دوسری جانب اماں کی تنہائی کے خیال سے ہراساں تھی۔

وہ بے حد خوشگوار شام تھی قرأت آپا اور اماں بازار گئی ہوئی تھیں میں گھر پر اکیلی تھی کچھ دیر پہلے ہی باقر کی کال آئی تھی۔ بہت دیر تک باتیں ہوئیں۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ واقعی مجھے بہت چاہتا ہے۔ مجھے اس سے بات کر کے اچھا لگا، ذہن سے تمام خدشات نکل چکے تھے۔ کچھ اس کی خوب صورت باتوں اور پھر شاور لینے کے بعد میں خود کو بہت فریش محسوس کررہی تھی۔ اپنے لیے ایک کپ چائے بنا کر میں کپ لے کر صحن میں آگئی اسی وقت ڈور بیل بجی، میں نے دروازہ کھولا تو سامنے زین کھڑا تھا۔

”السلام علیکم......!“ میں نے گرمجوشی سے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام......!“ اس کے لہجے میں کوئی گرمجوشی نہ تھی۔ ”کوئی نہیں ہے گھر پر؟“ چاروں طرف دیکھتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

”نہیں، اماں اور قرأت آپا بازار گئی ہوئی ہیں بس آتی ہوں گی۔“ میں نے اسے راستہ دیتے ہوئے کہا۔

”ہونہہ......! تیاری ہورہی ہے، دراصل مجھے ثروت آپا نے تمہاری شادی کے بارے میں اطلاع دی تھی میں رات کو ہی واپس آیا تو مبارک باد دینے چلا آیا تھا۔“ اس کے لہجے میں دکھ بول رہے، اس کی آواز میں، اس کے چہرے پر نہ جانے ایسا کیا تھا کہ میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس نے جلدی سے نگاہیں جھکالیں۔ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے نمایاں تھے، بجھا، بجھا سا اور دکھی سا لگ رہا تھا، ہمیشہ وہ آتا تو ہنستا مسکراتا نظر آتا۔ باتوں میں ٹھہراؤ ہوتا مگر

آج...... وہ بے کل، بے کل سا تھا۔

’’زین، کیا ہوا......؟ تم ٹھیک تو ہو......‘‘ میں نے اس کے بالمقابل کرسی پر بیٹھ کر اس کو غور سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

’’نیناں! تمہاری شادی...... وہ بھی اتنی جلدی سب کچھ ہوگیا......‘‘ اس نے نگاہ اٹھا کر دکھی لہجے میں کہا۔

اُف......! اس کی آنکھوں میں جانے کیا کچھ تھا......؟ اس کے ٹوٹے لہجے میں کیسا کرب تھا میں...... اس کی آنکھوں کے بھنور میں پھنستی چلی گئی۔

’’نیناں، زین نے تم کو چاہا تھا تم پر کبھی میری خاموش محبت کا ادراک نہ ہوا؟ تمہیں کبھی میری خاموش نظروں میں کوئی پیغام نظر نہیں آیا؟‘‘ اس کے سوال پر میں تڑپ گئی۔ کتنی معصومیت سے وہ سوال کر رہا تھا۔

’’نیناں میں تو وقت کا انتظار کر رہا تھا، مجھے کیا خبر تھی کہ چند ماہ میں یہ سب کچھ ہو جائے گا۔‘‘ اس کے لہجے میں گہرا دکھ تھا۔ میرا سارا وجود لرز رہا تھا، یہ کیسا انکشاف تھا، کیسا ادراک تھا......؟ جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

تب مجھے لگا جیسے کہیں نہ کہیں میرے اندر بھی یہ کسک، یہ چبھن موجود تھی جو مجھے زین کی آنکھوں میں نظر آتی تھی اور ہر بار میں کھوجنے کی کوشش کرتی اور زین نگاہیں چرا لیتا۔ آج...... آج اس انکشاف نے خود میرے اعتراف نے مجھے بری طرح جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میری بڑی، بڑی آنکھوں سے بے شمار آنسو ابل پڑے۔

’’نیناں پلیز......‘‘ اس نے تڑپ کر میرے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ’’غلطی میری ہی تھی کہ میں نے کبھی کوئی اشارہ تک نہیں دیا اور آج بھی میری غلطی ہے کہ میں نے تمہارے سامنے یہ اعتراف کر کے تمہیں پریشان کر ڈالا۔ مجھے یہ بات کبھی نہیں کہنی چاہیے تھی مگر...... میں برداشت نہ کر سکا۔ اب میں ہاتھ جوڑ کر تم سے التجا کرتا ہوں کہ خدارا اس بات کا ذکر کبھی کسی سے بھی مت کرنا...... بس میری دلی دعا ہے کہ اللہ پاک تمہیں ہمیشہ خوش رکھے، کبھی کوئی غم تمہارے پاس نہیں آئے، میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔ ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ اس بات کو یہیں ختم کر دیں۔ خدا کرے کہ تم باقر کے ساتھ بہت خوش رہو۔‘‘ اور میں نم، نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ ایک پھانس جیسے میرے دل میں چبھ سی گئی، کوئی کسک، کوئی خلش ضرور تھی جس نے مجھے اندر سے دکھی کر دیا تھا۔

’’کاش...... کاش زین...... تم یہ سب کچھ پہلے کہہ دیتے۔‘‘ میں دل ہی دل میں بولی منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔

’’پلیز نیناں......! مجھے معاف کر دو، شاید مجھے اب یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ بات یہیں پر ختم ہو جانی چاہیے۔‘‘ اس کے ہاتھ بدستور جڑے ہوئے تھے۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر میں نے دیکھا زین ایک دم بدل گیا۔ اس کی آنکھوں کی اداسی نہ جانے کہاں غائب ہوگئی۔ ہنستا، مسکراتا وہ میری شادی کے امور میں حصہ لے رہا تھا، اماں کو بھی اس کے آنے سے بہت اطمینان ہوگیا تھا۔ کبھی، کبھی مجھے زین کو دیکھ کر حیرت ہوتی، میرا دل نہ جانے کیوں ڈوبا سا جاتا۔ لیکن دوسرے لمحے میں خود پر کنٹرول کر لیتی۔ میں دل سے تمام خدشات، کسک اور پچھتاوے نکال کر باقر کی زندگی میں قدم رکھنا چاہتی تھی جو کچھ بھی تھا وہ میرا ماضی تھا اور اب میں مستقبل میں ایسا کچھ نہیں رکھنا چاہتی تھی تمام تر سچائیوں اور خلوص کے ساتھ مجھے باقر کی زندگی میں داخل ہونا تھا۔ اور پھر میں رخصت ہو کر باقر کے گھر آگئی۔ شادی کی رسومات کے دوران باقر کی مما کی باتوں سے نخوت اور امارت جھلکتی تھی لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ انشاء اللہ مما کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دوں گی اور اپنے کردار اور عمل سے ان کو بدلنے کی بھرپور کوشش کروں گی۔

شادی کے بعد مجھے اس بات کا پتا چلا کہ مما میری سوچوں سے زیادہ ضدی، مغرور اور منہ پھٹ قسم کی خاتون ہیں اور میں صرف اور صرف باقر کی پسند سے اس گھر میں آئی ہوں۔ مما نے تو اپنی فرینڈ کی بیٹی مدیحہ کو باقر کے لیے پسند کر رکھا تھا۔ مگر باقر کی ضد کے آگے مجبور ہو کر انہوں نے بادلِ ناخواستہ اپنے اکلوتے

بیٹے کی پسند کو بہو بنانا گوارا کیا تھا لیکن مجھے خوب اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ دل سے مجھے قبول نہیں کر پائیں کیونکہ میں ان کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی بہر حال مجھے اپنے طور سے تو ہر ممکن کوشش کرنی تھی کہ مما کے دل میں میرے لیے اپنائیت کے جذبات ابھریں۔ شادی کے لیے لی گئی باقر کی چھٹیاں ختم ہوگئی تھیں اور وہ آفس جانے لگے تو مجھے گھر کے ماحول کا صحیح سے اندازہ لگانے کا موقع ملا۔ گھر میں ایک کام والی صفائی ستھرائی کے لیے آتی تھی۔ ایک کھانا بنانے کے لیے رکھی ہوئی تھی، مما کی اپنی مصروفیات تھیں، وہ گھر پر ہوتیں تو اپنے روم میں ہوتی تھیں اور میرا کام ان کے ساتھ رہ کر ان کو کمپنی دینا ہوتا، مجھے اماں کی طرف جانا ہوتا تو باقر آفس سے گاڑی اور ڈرائیور بھیج دیتے اور میں باقر کے آفس سے آنے سے پہلے، پہلے اماں سے مل کر واپس آجاتی۔ باقر کو میرا اماں کے یہاں جا کر رات کو ٹھہرنا پسند نہ تھا اس لیے میں بہت کم جاتی تھی۔ مجھے اماں کی طرف سے فکر تو تھی مگر کم تھی کیونکہ کرایے دار بہت اچھے لوگ تھے جو اماں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ثروت آپا اکثر آجاتی تھیں اور اس کے علاوہ دوسرے کاموں کے لیے زین تھا جو تقریباً روز ہی ایک چکر لگا لیا کرتا۔ شادی کے بعد میرا زین سے بھی سامنا ہو جاتا مگر وہ بالکل نارمل انداز میں ملتا۔

پھر ایک روز اچانک میری طبیعت خراب ہوگئی۔ چکر، گھبراہٹ اور کمزوری سے میں نڈھال سی ہوگئی تب باقر گھبرا کر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور پھر ڈاکٹر کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سن کر جہاں میں شرمندہ سی ہو رہی تھی مما اور باقر بے حد خوش تھے۔

’’ارے واہ یار......! آئی ایم ویری ہیپی......! تم نے مجھے اتنی جلدی یہ گڈ نیوز سنا دی، تھینک یو سو مچ، آئی لو یو، آئی لو یو سو مچ......‘‘ گھر آتے ہی باقر نے مجھے بانہوں میں بھر کر خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔ میں بلش ہوگئی باقر اور مما میرا بہت خیال رکھتے تھے، میں بھی بہت خوش تھی کہ خوب صورت چاہنے والا شوہر، آسائشیں، اچھی زندگی اور اب اللہ پاک اتنی بڑی خوشی بھی دے رہا تھا۔ اس روز میں اماں کے گھر سے ہو کر آئی راستے میں سگنل پر گاڑی رکی تو میں نے دیکھا دس بارہ سال کا بچہ بڑے، بڑے پوسٹرز اٹھائے بیچ رہا ہے، میری نظر ایک خوب صورت سے پوسٹر پر پڑی نوزائیدہ حسین سی بچی، پنک کپڑوں میں ملبوس دھیرے، دھیرے نیند سے بیدار ہوتی ہوئی وہ خوب صورت سی بچی گلابی گلاب کے پھولوں کے درمیان خود بھی ننھی معصوم سی کلی نظر آرہی تھی، اسے دیکھ کر میرے دل میں نہ جانے کیوں ہلچل سی ہوئی اور میں نے بے ساختہ وہ پوسٹر خرید لیا اور لا کر کمرے میں بیڈ کے سامنے اسے لگا دیا۔

دوسرے دن نہ جانے کیوں میری طبیعت کافی سست تھی باقر ہدایات دے کر گئے تھے کہ تم کمرے سے بھی مت نکلنا، آرام کرنا سارا دن اور میں نے مسکرا کر سر ہلا دیا تھا۔ مما کو پتا چلا تو وہ کمرے میں مجھے پوچھنے کے لیے آگئیں۔

’’کیا ہوا؟ باقر بتا رہا تھا کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے تمہاری......؟‘‘ انہوں نے آتے ہی سوال کیا۔

’’جی مما...... بس ذرا سی سستی ہے......‘‘ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

’’دوائیں لے رہی ہو نا ٹائم پر......؟‘‘ انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

’’جی لے رہی ہوں......‘‘ انہوں نے مجھے کچھ ہدایات دیں اور جانے کے لیے پلٹیں...... تب ہی ان کی نظر دیوار پر لگے پوسٹر پر پڑی۔

’’یہ...... یہ...... کون لایا ہے؟ کس نے لگائی ہے یہ فوٹو یہاں......‘‘ ان کا لہجہ یک دم ہی بدل چکا تھا۔

’’مما......! یہ میں لے کر آئی ہوں۔‘‘ میں خواہ مخواہ ہی شرمندہ ہونے لگی۔

’’اسے اتارو فوراً یہاں سے اور آئندہ کسی بے بی گرل کی کوئی تصویر نہ دیکھوں تمہارے روم میں۔‘‘ انہوں نے نہایت سخت لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کر پوسٹر کو دیوار سے نوچنے کے انداز میں زور سے کھینچا، وہ پھٹ چکا تھا، پھٹے ہوئے پوسٹر کو دونوں ہاتھوں سے

مروڑ کر زمین پر پھینک دیا۔ میں دیکھتی رہ گئی...... میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مما کہنا کیا چاہ رہی تھیں۔ وہ تیز، تیز قدموں سے کمرے سے نکل گئیں اور میں آنکھیں پھاڑے ان کو جاتا دیکھتی رہی۔ میں سارا دن ڈسٹرب رہی۔ مما کی یہ حرکت میرے لیے پریشان کن تھی اور شام کو یہ بات اور مما کا رویہ مجھ پر واضح ہو گیا جب باقر آفس سے آئے اور مما کے کمرے میں گئے۔

''باقر اپنی بیوی کو سمجھا دو کہ آئندہ میں اس کے کمرے میں کوئی لڑکی کی تصویر نہ دیکھوں، ہمارے یہاں سات پیڑیوں سے لگاتار پہلے، پہل دو، دو بیٹے ہوتے ہیں اس لیے بیٹیوں کا تصور بھی کرنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔''

''ارے مما! یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ......؟ یہ انسان کے اپنے ہاتھ کی بات تو نہیں ہے۔'' باقر کو مما کی بات اچھی نہیں لگی تھی، میں لاؤنج میں کھڑی تھی جہاں دونوں آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ کیسی جاہلانہ بات کر رہی تھیں وہ......

''اُف......'' میں نے اپنا سر تھام لیا۔ ''باقر یہ کیسی شرط ہے......؟ اگر خدانا خواستہ ایسا نہ ہوا تو؟'' رات میں، میں باقر کے سامنے رو پڑی۔

''اُفوہ بھئی......! تم کیوں فکر کر رہی ہو جب سات جنریشن سے ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے تو ہمارے ساتھ بھی ضرور ایسا ہی ہوگا انشاء اللہ...... اور ہاں اس بات کا خیال رکھنا کہ مما کے سامنے بیٹی کا ذکر بھی مت کرنا۔'' ان کی اس بات پر میں سر تھام کر رہ گئی۔ بہ ظاہر میرے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں تھا، روپیہ، پیسہ، عیش آرام، کھانا پینا، کسی چیز کی کمی نہ تھی لیکن اب...... میں ایک نئی ٹینشن اور ڈپریشن کا شکار ہو رہی تھی۔

ابتدا کے کچھ ماہ تو خیریت سے گزرے لیکن جب سے مما نے یہ بات کی تھی تب سے تو میں اندر سے بہت ڈر گئی تھی ہر وقت اسی فکر میں رہتی، ہر وقت ایک ہی بات سوچتی رہتی۔ حالانکہ باقر میرا بہت خیال رکھتے، مجھے سمجھاتے، مجھے گھمانے لے جاتے، ہر طرح سے مجھے بہلانے کی کوشش کرتے لیکن میں اندر سے بہت ڈری ہوئی تھی نہ جانے کیوں مجھے یہی لگتا کہ مجھے بیٹی ہوگی اور...... ''اگر ایسا ہوا تو......؟'' بس اپنی الٹی سیدھی سوچوں میں بہ مشکل وقت گزرا...... اور آخر کار وسوسوں، الجھن اور پریشانیوں سے گزر کر میرے پہلو میں عشوہ آ گئی۔

''بہت مبارک ہو نیناں ماشاء اللہ سے بہت حسین گڑیا آئی ہے۔'' لیڈی ڈاکٹر کی آواز پر لگا میرے دل نے دھڑکنے سے انکار کر دیا...... میرے چہرے پر کچھ دیر پہلے کی اذیت اور تکلیف سے زیادہ دکھ کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ مجھے مما کی طرف سے تو خوف تھا مگر مجھے امید تھی کہ باقر ضرور وارفتگی کا اظہار کریں گے، میری تکلیف کو محسوس کر کے مجھے پیار کر کے اس خوب صورت لمحات کو شیئر کریں گے اور مجھے مبارک باد دیں گے کہ اللہ پاک نے ہم دونوں کو ماں اور باپ جیسا عظیم رتبہ دے دیا ہے لیکن...... باقر کا جھکا سر اور مایوس چہرہ دیکھ کر میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔

''مما نہیں آئیں......؟'' میرے خشک ہونٹوں پر پہلا سوال ابھرا۔

''نہیں، مما گھر پر ہیں۔'' باقر نے نگاہیں چراتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا تب ہی باقر کی نظر ننھی گڑی پر پڑی۔

''ماشاء اللہ بہت پیاری ہے۔'' بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا۔

''باقر...... باقر...... آپ خوش ہیں ناں......؟'' اس حالت میں جب عورت کو شوہر کے پیار اور دل جوئی کی ضرورت ہوتی ہے تو میں ہراساں اور پریشان ہو کر سوالات کر رہی تھی۔

''آں...... ہاں...... ہاں......'' باقر نے کہا۔

''بٹ مما کافی شاکڈ ہیں۔''

''شاکڈ!'' میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ ''کیا ان کو دادی بننے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی......؟'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے نقاہت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اوہو...... تم پریشان مت ہو ٹھیک ہو جائیں گی وہ......''

''یہ بتاؤ تم کیسی ہو......؟'' کافی دیر بعد انہیں میرا خیال آیا تھا۔

''کیسی ہو سکتی ہوں......'' نہ چاہتے ہوئے بھی میں تلخ ہو گئی...... پھر دو دن بعد میں گھر آ گئی۔ حیرت کی بات تھی کہ مما اسپتال نہیں آئی تھیں نہ گھر آنے پر ہی پوتی کو دیکھا تھا، کوئی خوشی، کوئی مبارک باد نہ دی نہ ہی میرا حال پوچھا۔ میں اندر سے ٹوٹ گئی تھی۔ مسلسل ٹینشن پہلے سے ہی تھی اور اب عشوہ کی پیدائش کے بعد بھی ویسے ہی خود کو قصوروار سمجھنے لگی تھی۔ ذہنی طور پر اطمینان نہ تھا تو جسمانی طور پر بھی کمزور ہو گئی تھی۔ باقر بھی بچی کی طرف سے بے پروا سے رہتے، ان میں بھی وہ جوش، محبت نہ تھی جو باپ کے دل میں ہونی چاہیے انہیں اس کا رونا برا لگتا ایسا لگتا تھا کہ بچی کا پیدا کرنا میرا کوئی بہت بڑا گناہ ہے۔ عشوہ ابھی چھ ماہ کی ہوئی تھی کہ مما کا دباؤ بڑھنے لگا کہ اب دوسرا بے بی بیٹے کی صورت میں ہو جانا چاہیے کیونکہ بیٹی کو پیدا کر کے جو غلطی میں نے کر دی فوری طور پر اس کا ازالہ بیٹے کی صورت میں کرنا تھا۔ نہ جانے کیسے لوگ تھے پڑھے لکھے ہو کر بھی کیسی جاہلانہ سوچ تھی ان کی، باقر جو پہلے اپنی مما کی بات پر اختلاف بھی کر جاتے اب نہ جانے کیوں وہ بھی مجھ سے کٹے، کٹے رہنے لگے، نہ جانے مما نے کیسا خناس بھر دیا تھا کہ ان کے ذہن میں۔

''باقر! ابھی عشوہ بہت چھوٹی ہے۔'' میں نے دبا، دبا سا احتجاج کرنا چاہا لیکن خود ہی بولنا اور خود ہی سننا تھا۔ میں سخت ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ اماں کو یا ثروت آپا کو بھی کچھ نہیں بتاتی، اماں بیچاری ویسے ہی بیمار رہتی تھیں۔ خواہ مخواہ میری طرف سے بھی پریشان ہو جاتیں۔ مما پہلے ہی اپنی مرضی کے خلاف مجھے بہو بنا کر لائی تھیں۔ اب وہ باقر کو اس کی غلطی کا احساس دلاتی رہتی۔ ایک بار پھر میں مستقبل کے اندیشوں سے بے تحاشا خوفزدہ ہو کر خدا کے حضور گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگی تھی۔ میری نمازیں اور دعائیں طویل ہو گئی تھیں لیکن...... لیکن اس بار بھی اللہ پاک نے ہماری جھولی میں اجوہ کی صورت میں رحمت ڈال دی۔

اس بار تو مما نے کھلم کھلا شور مچایا اور مجھے ایسے سنایا جیسے میں نے کوئی گناہ کر ڈالا ہو۔ اس بار اماں بھی میرے ساتھ تھیں اور وہ سب جو میں اماں کے علم میں نہیں لانا چاہتی تھی سب کچھ اماں کے سامنے کھل کر آ چکا تھا۔ میں اماں کی نرم آغوش میں منہ چھپا کر سسک پڑی۔ اماں نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے سختی سے منع کر دیا مبادا کوئی اور مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ ایک بار پھر میں بچی کا ننھا سا وجود لیے اپنے گھر آ گئی۔ پہلے سے زیادہ کمزور اور مضمحل...... اداسی میرے اندر تک اتر آئی تھی ایک نہیں دو، دو بیٹیوں کی ماں بننا گویا مما کے سامنے ناقابلِ معافی جرم تھا۔ باقر سر جھکائے مما کے سامنے کھڑے تھے۔

''باقر دیکھ لیا ناں تم نے...... ہم نے صرف تمہاری پسند اور خواہش کو دیکھتے ہوئے اپنے خاندانی وقار اور مرتبے کو پسِ پشت ڈال کر یہ زہر پی لیا۔ عام سے خاندان کی عام سی لڑکی کو بہو بنا کر لے آئے۔ ہمیں کیا پتا تھا کہ یہ لڑکی ہماری پشتوں سے چلی آتی ہوئی عزت، غرور اور فخر سب خاک میں ملا دے گی۔ ایسا تو ہماری کئی نسلوں میں نہیں ہوا تھا تب ہی تو میں چاہتی تھی کہ خاندان کی کسی لڑکی کو تمہاری دلہن بناؤں مگر تمہارا عشق تو سر چڑھ کر بول رہا تھا نہ جانے ایسا کیا جادو چل گیا تھا تم پر...... ایک بار تمہاری صورت لے برداشت کر لیا لیکن...... بار، بار ہم سے برداشت نہیں ہوگا۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کی ماں کے یہاں بھی بیٹا نہ ہوا اس لیے...... اب میں برداشت نہیں کر پاؤں گی اس لیے اب تم اس لڑکی کو طلاق دے دو، ہم تمہاری دوسری شادی اپنی مرضی سے کریں گے۔'' مما کے زہر میں بجھے ہوئے لفظ پگھلے ہوئے سیسے کے مانند میرے کانوں میں اترے تھے۔ کمزوری، نقاہت اور اذیت کے مراحل سے گزرتی میں اپنے ناتواں وجود کا بوجھ برداشت نہ کر پائی۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا

چھانے لگا، سر چکرانے لگا جیسے زمین میرے پیروں سے نکلنے لگی ہو، میں نے اپنے لڑکھڑاتے وجود کو سنبھالنے میں ساری کوششیں صرف کردیں لیکن...... لیکن میں نے دیوار کو پکڑنا چاہا...... مگر ہوش و خرد سے بیگانہ ہوتی چلی گئی۔ آنکھ کھلی تو سامنے باقر کو دیکھا۔ میں نے پلکیں جھپکا کر ذہن پر زور ڈالا۔

''باقر...... باقر...... مما کیا کہہ رہی ہیں...... کیا...... کیا...... آپ......؟'' لفظ میرے لبوں پر آکر دم توڑ گئے، میرے لہجے میں دکھ اور آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔

''نیناں، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' باقر کے دو لفظوں نے جیسے میرے بے جان وجود میں جان ڈال دی، میں نے ٹھنڈی سانس لے کر آنکھیں موندلیں۔

ایک بار پھر میں گھر گرہستی میں آگئی ایک ناکردہ گناہ کی سزا پانے کے لیے...... وہ گناہ جو خواہ مخواہ میرے لیے گناہ بن گیا تھا۔ قدم، قدم پر مجھے طعنوں اور طنز کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ مما جانے کیا، کیا بولتی رہتیں حتیٰ کہ اماں کو بھی بیٹا نہ ہونے کا طعنہ بھی دیا جانے لگا۔ میرا دل چاہتا کہ میں مما کو کہہ دوں کہ جو کہنا ہو مجھے کہہ دیں، میری اماں کو بیچ میں مت لائیں لیکن...... مما جب لفظ طلاق کی دھمکی دیتیں تو میں تڑپ جاتی۔ مجھے معلوم ہے کہ ہمارے معاشرے میں طلاق یافتہ لڑکی کو کیسی نگاہوں سے دیکھا جاتا۔ اس کے بارے میں کیسی، کیسی قیاس آرئیاں کی جاتی ہیں، جھوٹے، سچے اور الٹے سیدھے الزامات لگائے جاتے۔ اس سے وہ باتیں بھی منسوب کردی جاتیں جن سے اس کا دور، دور تک کا واسطہ نہیں ہوتا۔ اگر خدانخواستہ ایسا کچھ ہوجاتا تو میں دو ننھی بچیوں کو لے کر دنیا کا سامنا کرپاتی، کیا جواز دیتی......؟ بس یہی سوچ کر میں خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ مگر جب دونوں بچیوں کو دیکھتی تو رونا آجاتا۔ کیسی بد نصیب بچیاں تھیں، دادی تو پلٹ کر دیکھتی بھی نہیں اور باپ بھی صرف نام کا تھا۔ وہ تو کہیں نہ کہیں شاید باقر کے دل میں میری تھوڑی سی محبت باقی تھی جو میں آج تک ان کی زندگی میں شامل تھی اور اس گھر میں نام ہی کی سہی مگر جیسے دار تو تھی۔ پھر اچانک سے ہی مما کی بہن اپنی دو عدد بیٹیوں سمیت امریکا سے آگئیں ایک بیٹی جو طلاق یافتہ تھی جبکہ دوسری وہ جس کو اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں۔

''یہ باقر کی بیوی نیناں ہے۔'' آواز پر میں نے اجوہ کو کپڑے چینج کرواتے، کرواتے چونک کر دیکھا، بنا کسی دستک کے مما اپنے رشتے داروں سمیت میرے سر پر کھڑی تھیں۔

''السلام علیکم......!'' میں نے گھبرا کر جلدی سے سلام کیا۔

''اوہ...... تو یہ ہیں نیناں باقر علی۔'' ان کی بیٹی مدیحہ نے سر سے پیر تک مجھے گھور کر دیکھتے ہوئے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا ساتھ ہی بڑی ادا سے اپنے بالوں کی لٹ کو شہادت کی انگلی سے پیچھے کیا۔ وائٹ کلر کی چھوٹی سی سلیولیس شرٹ اس پر ٹخنوں سے اونچی ٹائٹس، دوپٹے سے بے نیاز میک اپ زدہ مدیحہ کے چہرے پر تفاخر نمایاں تھا۔ دوسری فاکہہ نے بھی اسی طرح کے کپڑے پہن رکھے تھے جبکہ مما کی بہن نے ٹائٹ، جینز پر چھوٹی سی کرتی پہن رکھی تھی اپنے عمر رسیدہ چہرے کو میک اپ سے چھپانے کی ناکام کوشش میں خاصی عجیب لگ رہی تھیں۔ میں ان لوگوں کو دیکھ کر پزل ہورہی تھی۔ دراصل فاکہہ کا رشتہ دوبارہ کہیں طے ہوگیا تھا اور وہ لوگ شادی کی غرض سے یہاں آئے تھے اور قیام ہمارے یہاں ہی تھا۔ ان لوگوں کے آنے سے میں گلٹی فیل کرنے لگی تھی سارے مل کر خوب ہلسی مذاق، چھچھورا پن کرتے...... بے باک گفتگو ہوتی، شور، ہنگامے، شاپنگ اور پکنک منائی جاتی، باقر کو بھی وہ لوگ اپنے ساتھ شامل کرلیتے، میں خود کو ان سب کے درمیان مس فٹ محسوس کرتی نغمانہ آنٹی کا قیام طویل تر ہوتا جارہا تھا۔ میری، عشوہ اور اجوہ کی اپنی دنیا تھی، باقر کا رویّہ بھی میرے ساتھ عام سا ہوتا پر جب وہ کمرے میں آتے تو مجھ پر مہربان ہوجاتے۔ بچیوں سے بھی سرسری سا پیار کرتے۔ میری طبیعت پھر سے خراب رہنے لگی گو کہ مما کو مجھ سے کوئی اچھی امید نہ تھی۔ لیکن باقر میں اب بھی تھوڑی سی امید باقی تھی۔ یہی میرے جینے کی وجہ اور اس گھر میں میرے رہنے کا جواز بنی ہوئی تھی۔ میں پھر ایک بار سولی پر لٹکنے جارہی تھی، اپنے رب کے حضور دستِ سوال دراز کیے دعائیں مانگ رہی تھی، دن پر دن گزرتے رہے اور میں اسی سولی پر لٹکتی دعاؤں پر گزارہ کرتی رہی۔ اس بار مما نے نئی بیخ ڈال دی تھی۔ انہوں نے باقر سے کہہ دیا تھا کہ میرا الٹراساؤنڈ کرواؤ۔

''کیوں مما......!'' ڈاکٹر نے تو ایسا نہیں کہا۔'' باقر نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہاں، ڈاکٹر نے ایسا کچھ نہیں کہا، یہ سب میں کہہ رہی ہوں کیونکہ میں اب مزید کسی اندھیرے میں رہ کر انتظار نہیں کرسکتی۔ میں معلوم کرلینا چاہتی ہوں کہ اس بار میرے نصیب میں کیا ہے؟''

''اُف توبہ! مما تو حد کررہی ہیں۔'' ایک بار پھر میں مما کے فیصلے پر تڑپ گئی تھی کیونکہ آج کل مما، باقر اور نغمانہ آنٹی مل کر نہ جانے کیا، کیا میٹنگیں کررہے تھے۔ جانے کیوں میرے دل میں آنے والے حادثے کا الارم بجنے لگا تھا۔ اس وقت جبکہ مجھے باقر... کی محبت، ان کی توجہ اور ساتھ کی ضرورت تھی باقر مجھ سے بے پروا ہوتے جارہے تھے، زیادہ تر مدیحہ اور فاکہہ کے ساتھ ٹائم گزارتے اور اپنے ہی گھر میں، میں شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہوگئی تھی۔ تنہائی کے احساس نے مجھے عجیب سے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا، اس پر مما کا ہتک آمیز رویّہ میرے لیے نہایت تکلیف دہ تھا۔ دونوں معصوم بچیاں بھی شاید میری مجبوری سے آگاہ تھیں تبھی نہ کوئی ضد کرتیں' نہ زیادہ تنگ کرتیں، میں دونوں کو دیکھتی تو بے تحاشا رونا آجاتا۔ میرے ساتھ، ساتھ میری، معصوم بچیاں بھی محبت، شفقت اور توجہ سے محروم زندگی گزار رہی تھیں، میں دعائیں کرتی کہ اللہ پاک اس بار ایسا کردے کہ میرے ساتھ، ساتھ میری معصوم بچیوں کو بھی اس گھر میں صحیح مقام مل جائے۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا موسم خاصا خوشگوار تھا لیکن میرے لیے تو سارے موسم ایک جیسے تھے، اداس...... بے رنگ، پھیکے اور سوگوار...... میرا تو ہر، ہر لمحہ، فکر، ٹینشن اور خدشات میں گزرتا...... باقر آفس سے آئے تو لاؤنج میں ہی سب کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگے کافی خوشگوار موڈ میں تھے۔ کچھ دیر بعد روم میں آئے تو سیریس اور سنجیدہ سے تھے۔

''کیا بات ہے، آپ باہر ہوتے ہیں تو خوب ہنستے ہیں، خوش رہتے ہیں، کمرے میں آتے ہی آپ اتنے سیریس کیوں ہوجاتے ہیں؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لبوں پر گلہ آگیا۔

''ہاں کیا کروں یار جہاں جیسا ماحول ہوتا ہے ویسا ہی ہوجاتا ہوں، میں کمرے میں آتا ہوں تو تمہارا یہ مسکینوں والا، سوگوار اور یتیم چہرہ دیکھنے کو ملتا ہے، میں تو خود عاجز آگیا ہوں تمہاری رولی ہوئی شکل دیکھ، دیکھ کر...... نہ ہنستی بولتی ہو، نہ گھلتی ملتی ہو۔ عجیب سی بیزاری خود پر سوار کرکے رکھتی ہو، نہ جانے خود کو کیا سمجھتی ہو تم؟ جب سے نغمانہ آنٹی آئی ہیں ایک دن بھی تم ان لوگوں کے ساتھ مل کر نہیں بیٹھیں۔ کیا ایسا ہی بی ہیو کرتی ہیں گھر کی بہوئیں......'' وہ باقاعدہ مجھ پر برس رہے تھے۔

''گھر کی بہو......'' میرا حلق تک کڑوا ہوگیا۔ ''گھر کی بہو کو کون سی اہمیت حاصل ہے اپنے ہی گھر میں اجنبی اور بیکار شے کے مانند زندگی گزارنے والی، کونے میں پڑی رہنے والی کمزور، بیکار اور غیر اہم سی چیز ہوں میں تو...... کون سا مان، کون سی عزت دی گئی ہے گھر بھر کی بہو کو......؟'' میرے حلق کی کڑواہٹ میرے لبوں تک آگئی۔

''ہاں، میری ہی مت ماری گئی تھی شاید......'' وہ بڑبڑاتے ہوئے ذومعنی جملہ کہہ کر باہر جاچکے تھے۔ تب ہی دو منٹ بعد مما میرے کمرے میں آئیں۔

''سنو کل تم جاکر اپنا الٹرساؤنڈ کروالینا۔'' آتے ہی کرخت لہجے میں حکم صادر کیا۔

''مما! یہ ضروری ہے کیا؟'' میرا دل نہ جانے کیوں خوفزدہ تھا، میں نے بیچارگی سے ان کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''ہاں، بہت ضروری ہے کیونکہ میرے پاس اب ٹائم نہیں ہے کہ مزید تجربات کرتی پھروں...... پہلے بھی باقر کی بے جا ضد کے آگے میں ہار گئی تھی اور اب...... میں وقت سے پہلے سب کچھ جان لینا چاہتی ہوں تاکہ آئندہ کے لیے کوئی قدم اٹھا سکوں اور...... کان کھول کر سن لو کہ اگر الٹرا ساؤنڈ میں بیٹا نہ ہونے کا پتا چلے گا تو پھر اس گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ تم اپنی بیٹیوں کو لے کر ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے ہماری دنیا سے نکل جاؤ گی اور یہ بات میں تمہیں پہلے ہی بتا رہی ہوں تاکہ بعد میں کوئی ڈرامے، کوئی واویلا اور کسی قسم کی فریاد اور التجاؤں کی کوئی گنجائش نہیں رکھنا چاہتی جانے سے پہلے یہ بات اچھی طرح اپنے دل و دماغ میں بٹھا کر اسپتال جانا۔'' وہ نہایت بے دردی، بے رحمی اور سفاکی سے اپنا فیصلہ سنا کر جا چکی تھیں اور سامنے کھڑے باقر چپ چاپ کھڑے تھے۔ وہ جو ذرا سی انسیت، محبت اور مجھ سے لگاؤ تھا نہ جانے کہاں چلا گیا تھا اب ان کو بھی میں قصور وار لگنے لگی تھی۔ مدیحہ کی ادائیں، اس کے حسن کا نشہ اور مما کا مسلسل دباؤ مکمل طور پر اپنا اثر دکھا رہے تھے۔

وہ رات میرے لیے بے حد اذیت ناک تھی، نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی، رات کے نہ جانے کون سے پہر باقر آ کر مست سو رہے تھے اور میں...... ہاں اور نہ کی سولی پر لٹک رہی تھی...... الٹے سیدھے خیالات، خدشات اور واہمے ناگ بن کر ساری رات ڈستے رہے۔ میں رو، رو کر اپنے رب سے دعائیں مانگتی رہی۔ میرے لیے وہ رات قیامت کی رات تھی، صبح میری زندگی کا اہم فیصلہ ہونے والا تھا۔ الٹرا ساؤنڈ کی شکل میں چھوٹا سا کاغذ میری قسمت بدلنے والا تھا۔ اس کاغذ پر میری آئندہ زندگی کا دار و مدار رکھ دیا گیا تھا۔ میرے نام کے ساتھ باقر کا نام صرف ایک کاغذی حد تک رہ گیا تھا۔ اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ جس خوف نے مجھے شادی کے بعد سے سولی پر لٹکا رکھا تھا۔ جو ڈر میرے اندر سرائیت کر گیا تھا۔ میرے اوپر کسی آسیب کی طرح قابض ہو چکا تھا۔ الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ نے میرے رہے سہے اوسان خطا کر ڈالے تھے۔ میرا سارا وجود ریت کی دیوار کی طرح ڈھے گیا تھا، بہ مشکل تمام اپنا لڑکھڑاتا وجود لے کر اپنی قسمت کا پروانہ ہاتھ میں لے کر گھر پہنچی۔

''تم عشوہ اور اجوہ کو لے کر اپنی اماں کے گھر چلی جاؤ آنے والی کے سارے اخراجات تمہیں مل جائیں گے۔'' باقر کے الفاظ بم کے مانند عین میرے وجود پر آ کر پھٹے تھے جس نے میرے کمزور وجود کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔

''باقر...... یہ...... میری ہی نہیں آپ کی بھی بیٹیاں ہیں، حیرت ہے مجھے آپ بھی ایسا کر رہے ہیں، اس میں ان معصوموں کا کیا قصور ہے۔ خدا کے لیے ایک باپ بن کر سوچیں۔ اتنا ظلم تو نہ کریں......'' میں ہاتھ جوڑے سراپا التجا تھی۔

''نیناں یہ میری محبت ہی تھی کہ میں نے ایک نہیں بلکہ تین، تین بار برداشت کیا۔ مما کے خلاف جا کر میں نے تم سے شادی کی، انہیں اب تک امید پر اپنے ساتھ رکھا لیکن اب...... اب...... میں خود بھی ناامید ہو چکا ہوں، اس لیے مما کی خواہش پر میں بہت جلد مدیحہ سے شادی کرنے والا ہوں...... اس لیے تمہارے لیے بھی یہی بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلی جاؤ...... ہاں! تمہیں تمہارا اور تمہاری بیٹیوں کا خرچہ ملتا رہے گا۔''

''باقر آپ کیسے لوگ ہیں...... دورِ جاہلیت کی طرح بیٹیوں سے بیر رکھنے والے، بے رحم لوگ، آپ کیسے پڑھے لکھے ہیں کہ اللہ پاک کے کاموں میں دخل دینے کی جاہلانہ کوشش کر رہے ہیں، اس کی رحمتوں کو عذاب اور بوجھ سمجھ کر منہ موڑ رہے ہیں۔''

''میں تمہیں چھوڑ تو نہیں رہا ہوں صرف تم سے علیحدہ ہو رہا ہوں کیونکہ میں نئے سرے سے اپنی زندگی

کی شروعات کرنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کی سوچ پر شرم آتی ہے مجھے، ٹھیک ہے آپ اپنی زندگی کی شروعات کیجیے بڑے شوق کے ساتھ کیجیے، میں روکوں گی نہیں لیکن...... لیکن...... میں آپ کے گھر اور دل سے نکل بھی رہی ہوں تو میں آپ کی زندگی میں بھی نہیں رہنا پسند کروں گی...... آپ مجھے۔''

''ٹھیک ہے تم فارغ ہو جاؤ تو ڈیورس پیپرز بھجوا دوں گا۔'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اتنی بڑی بات باقر نے نہایت اطمینان سے کہہ دی تھی۔ ایک وقت تھا باقر مجھ پر جان دیتے تھے...... اور آج...... کتنی بے رحمی سے وہ مجھے اپنی زندگی سے نکالنے کی بات کر رہے تھے...... کوئی یوں بھی بدل جاتا ہے...... ان کے دل میں میرے لیے رتی برابر بھی گنجائش نہ تھی۔ نہ ہی ان کو خاموش سہمی ہوئی معصوم بیٹیوں پر رحم آ رہا تھا۔ کتنے ظالم اور سفاک بن گئے تھے وہ......

''مسٹر باقر......! آپ اپنی دولت، اپنی امارت کو سنبھال کر رکھیں...... آپ کی آئندہ آنے والی نسلوں کے کام آئے گی...... ان بچیوں پر آپ کا کوئی حق نہیں ہے...... یہ صرف اور صرف میری بچیاں ہیں اور میں ان کی تمام ذمے داریاں پوری کر سکتی ہوں...... لیکن آپ ڈریں اس خدا کی بے آواز لاٹھی سے جو کسی وقت بھی گر سکتی ہے، آپ کا یہ اقدام آپ کے لیے کسی پچھتاوے کا باعث نہ بنے۔'' میں اس وقت خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھی ضبط کی شدتوں سے گزرتے ہوئے میرے حوصلے جواب دینے لگے...... اپنا اور بچوں کا مختصر سا سامان سمیٹتے ہوئے میں مسلسل سوچوں کے بھنور میں گھری ہوئی تھی، دل تھا کہ امڈا چلا آ رہا تھا اور میں خود پر کنٹرول کرتے، کرتے ضبط کی آخری حدوں تک آ پہنچی تھی۔ کتنے ارمانوں سے بیاہ کر لائے تھے باقر مجھے، مما تو روزِ اول سے ہی مجھ سے خوش نہیں تھیں کیونکہ میں ان کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ لیکن مما کے سرد اور تیکھے رویّے کے باوجود میرا خیال رکھتے۔

قابلِ دید

''ایک کالج میں رزلٹ کا دن تھا۔ ایک طالب علم نے اپنے دوست سے کہا۔

''یار میرے ساتھ میرے ابو کھڑے ہیں تو جلدی سے جا اور میرا رزلٹ دیکھ کر آ...... اگر میں ایک مضمون میں فیل ہوں تو کہنا ایک مسلمان بھائی سلام کہتا ہے اور اگر دو میں فیل ہوں تو کہنا دو مسلمان بھائی سلام کہتے ہیں۔''

دوست گیا اور تھوڑی دیر بعد آ کر بولا۔

''یار پوری امت مسلمہ تمہیں سلام کہتی ہے۔''

شوگر کوٹڈ

شوہر اپنی شوگر کی مریضہ بیوی سے بولا۔

''سیلف کنٹرول تو کوئی تم سے سیکھے۔''

بیوی نے خوش ہو کر پوچھا...... ''وہ کیسے؟''

شوہر: ''جسم میں اتنی شوگر ہے زبان پر ذرا بھی نہیں آتی۔''

از: یاسمین اقبال، لاہور

باقر کی محبتوں کے زیرِ اثر میں مما کی تلخ باتوں کو بھی دل پر نہیں لیتی تھی مگر یہ...... تو کچھ عرصہ ہی رہا عشوہ کی پیدائش کے بعد باقر کے رویّے میں تھوڑی سی تبدیلی آ گئی تھی اور...... اور...... چار سال میں...... میں صرف ان لوگوں کی خواہش کو دیکھتے ہوئے اپنی صحت کی پروا کیے بنا تیسری بار اس تخلیقی عمل سے گزرنے کو تیار ہو گئی تھی...... ایک امید...... ایک آس پر...... لیکن...... اس بار تو ان لوگوں نے ٹائم کا انتظار بھی نہیں کیا کیونکہ نعمانہ آنٹی کے پاس ٹائم کم تھا اور اس بار مما اپنی خواہش ہر صورت پوری کرنا چاہتی تھیں...... اس موقع کو کسی صورت گنوانا نہیں چاہتی تھیں اور اب تو معقول جواز بھی مل گیا تھا۔

جب میں مختصر سا سامان اور دونوں بچیوں کو لے کر ٹیکسی سے گھر کے دروازے پر اتری مجھے اس حالت میں دیکھ کر اماں میری جانب لپکیں...... ثروت آپا بھی آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے دوڑ کر میرے ناتواں

لرزتے وجود کو اپنی بانہوں میں سمو لیا اور میں...... میں...... ان کی بانہوں میں آکر ایسے بکھری کہ میرے ساتھ، ساتھ اماں اور ثروت آپا کی برداشت بھی جواب دینے لگی۔ ثروت آپا بے حد غصے میں تھیں اور وہ باقر سے بات کرنا چاہتی تھیں ساتھ ہی قرأت آپا کو بھی بتانا چاہتی تھیں کہ وہ دائم بھائی سے بات کریں کہ باقر ایسا کیسے کرسکتا ہے لیکن...... مجھے اندازہ تھا کہ سب کچھ کرنا یا کہنا فضول ہے۔ باقر اور ممانے جو ٹھان لیا ان سے عاجزی یا منتوں سے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے، خود کو کمزور نہیں ظاہر کرنا چاہیے کیونکہ وہ لوگ تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کھو چکے تھے۔ نعوذ باللہ وہ خدا کے کاموں میں دخل اندازی کرنے لگے تھے۔ ایسے لوگوں سے کیسا شکوہ......؟ کیسی شکایت......؟ میں نے اپنا فیصلہ اپنے رب کے ہاتھ میں دے دیا تھا ہمارا رب ہی تو ہے ہمارے لیے صحیح فیصلے کرنے والا...... وہ وہی کرتا ہے جس میں ہماری بھلائی ہو...... جو اس کی خدائی میں دخل اندازی کرتا ہے اس سے بڑھ کر وحشی اور پاگل کون ہوگا اور پاگلوں سے بات کرنا بھی محض پاگل پن ہی تھا۔

میں اپنے کمرے میں آگئی، کتنے دنوں کے بعد میں اپنے کمرے میں آئی تھی یہاں آکر پرانی یاد کی گرہیں ایک، ایک کرکے کھلنے لگیں، ساتھ ہی اچانک زین بھی یاد آگیا نہ جانے کیوں میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ثروت آپا دونوں بچیوں اور زیرک کے ساتھ صحن میں کھیل رہی تھیں...... میں بیڈ پر لیٹ گئی یہ سب کتنی جلدی ہوگیا تھا لگتا تھا کہ پلک جھپکتے میں میرے ساتھ اتنا سب کچھ ہوگیا۔ صرف چار سالوں میں وقت نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا......؟ میں جولا ابالی، ذہین اور چلبلی سی حاضر جواب لڑکی تھی...... آج...... آج سنجیدہ بُردبار، کم گو اور خاموش طبع عورت بن چکی تھی، حالات نے کیسا پلٹا کھایا تھا......؟ مجھے یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ اندر سے میں کتنی ٹوٹ گئی تھی۔ اپنی کوئی حیثیت، کوئی اہمیت نہ منوا سکی تھی...... اب...... عجب بے بسی محسوس کررہی تھی۔ دفعتاً میرے سامنے میری معصوم بچیوں کی شکلیں آئیں...... بچیوں کی صورت میں مجھے زندہ رہنے کا جواز مل گیا تھا...... میں نے خود کو آنے والے حالات کے لیے مکمل طور پر تیار کرلیا تھا۔ یہاں آکر عشوہ اور اجوہ بھی بہتر محسوس کررہی تھیں۔ وہاں تو زندگی ایک بڑے سے کمرے تک محدود ہوکر رہ گئی تھی یہاں اماں، ثروت آپا اور زیرک کی توجہ پاکر وہ کچھ بہتر لگ رہی تھیں۔ اسی روز زین آیا ان مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا...... میں بھی پہلے والی بے تکلفی سے نہ مل سکی...... البتہ بچیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا...... دو گھنٹے وہ بیٹھا اور امی اور ثروت آپا نے اسے سب بتا دیا تھا۔ وہ غصے سے پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

''آخر وہ لوگ اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہیں، اماں آپ لوگوں کو کوئی تو قدم اٹھانا چاہیے۔''

لیکن اماں اور ثروت آپا نے نہ جانے اسے کیا، کیا بتایا کہ وہ چپ ہوگیا۔ اسے میرے حالات کے بارے میں جان کر بے حد دکھ ہوا تھا۔ وہ بھی کیا کرتا صرف مجھ سے ہمدردی ہی کرسکتا تھا۔ مجھے سخت شرمندگی ہورہی تھی۔ جب کسی انسان پر کوئی پریشانی، مصیبت، آزمائش، کوئی مسئلہ ہو تو اس سے وابستہ سچے اور پُرخلوص رشتے اس کا دکھ چھین تو نہیں سکتے لیکن جس شخص پر مصیبت آتی ہے جھیلنا اور برداشت کرنا تو اسی کو پڑتا ہے لیکن ایسے میں مورل سپورٹ بے جان ہوتے ہوئے وجود میں نئی جان ڈال دیتی ہے اس وقت وہ شخص خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا، وہ مڑ کر دیکھتا ہے تو اس کے اپنے، اس کے چاہنے والے، اس کے پُرخلوص رشتے اس کے ساتھ ہوتے ہیں اور میں اس وقت ایسے ہی حالات کا شکار تھی اور مجھے اماں، ثروت آپا اور اب زین جیسے سچے اور کھرے لوگوں کا خلوص و محبت بھرا ساتھ مل رہا تھا جو میرے لیے بہت تھا۔ اب مجھے باقر کی کمی کا احساس بھی نہیں ہورہا تھا۔ کیا فائدہ ایسے رشتے کا جس میں محبت اور خلوص ناپید ہوچکا ہو اور پھر وہ وقت بھی آگیا کہ جب تخلیق کے تکلیف دہ عمل سے

گزر کر ایک جیتا جاگتا وجود دنیا میں آیا تھا۔

''مبارک ہو میری گڑیا، اللہ پاک نے تمہیں چاند سا بیٹا عطا کیا ہے۔'' ثروت آپا نے میری پیشانی پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

''ک...... ک...... کیا بیٹا......؟'' میں جو ابھی تک تکلیف کی شدت کو محسوس کررہی تھی حیرانی سے سوال کیا۔

''آپا یہ کیا کہہ رہی ہو...... بیٹا کیسے ہوسکتا ہے مجھے۔'' میں نے نقاہت سے کہا۔

''ارے پاگل لڑکی! سچ میں تمہیں بیٹا ہوا ہے، ماشاء اللہ سے بہت خوب صورت اور صحت مند بالکل عشوہ اور اجوہ کی طرح سرخ و سفید......'' ثروت آپا خوشی سے بے قابو ہوئی جارہی تھیں۔ مگر میں ابھی تک غیر یقینی کیفیت میں تھی کہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔

''ہاں بیٹی! اللہ پاک نے تمہیں بیٹا دیا ہے۔'' اماں نے آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لگا کر بھیگے لہجے میں کہا۔ لیکن میں ابھی تک ہاں اور نہ کی کیفیت سے دوچار تھی۔

''ہاں بیٹا! انسان چاہے چاند پر پہنچ جائے، زمین کے اندر چھپا خزانہ دیکھ لے، سمندروں کی گہرائیوں میں چھپے سیپ اور موتیاں کھوج لے حتیٰ کہ وقت سے پہلے ہونے والے بچے کا بھی پتا چلا لے...... سائنس جتنی بھی ترقی کرلے انسان چاہے جتنا بھی علم حاصل کرلے لیکن اللہ کے کاموں میں اس کی حکمت میں دخل دینے والوں کو وہ کبھی، کبھی یوں بھی رسوا کرتا ہے۔ انسان اور انسان کی بنائی ہوئی مشین اللہ پاک کے فیصلوں کو اس کی قدرت کو چیلنج نہیں کرسکتیں۔ وہ قادر ہے، وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے جو انسان کو آزماتا ہے اور دیکھو اس بار اس نے کیسی قدرت دکھائی ہے، دیکھو ماشاء اللہ سے تمہیں بیٹا عطا کیا ہے۔'' اماں کی بات پر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

''تم کہو تو باقر کو......؟''

''نہیں اماں......!'' میں نے سختی سے ان کی بات درمیان سے کاٹی۔ ''جس طرح عشوہ اور اجوہ میری بچیاں ہیں اسی طرح یہ بچہ بھی صرف میرا ہے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا تو اماں چپ ہوگئیں۔

''واہ میرے اللہ تیری قدرت...... تیرا جتنا شکر ادا کروں کم ہے تو نے مجھ پر جو کرم کیا ہے اس کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔'' وقت نے کیسا طمانچہ مارا تھا باقر اور مما کے منہ پر...... ثروت آپا نے منے کو میرے برابر میں لٹا دیا تھا تو اس کو دیکھ کر نہ جانے کیوں ڈھیر سارے آنسو میری آنکھوں سے بہہ نکلے...... دونوں بیٹیوں کے وقت باقر موجود تھے، بیٹیوں کو دیکھ کر ان کا منہ بن گیا تھا اور آج...... بیٹا ہوا تو وہ موجود نہ تھے اور نہ ہی ان کو خبر تھی۔ جانے کون بدنصیب تھا، وہ یا میرا ہونے والا معصوم بچہ...... جو باپ کے پیار سے پیدائشی طور پر ہی محروم تھا۔ ابھی ننھا واسع ڈیڑھ ماہ کا تھا کہ مجھے باقر کی طرف سے طلاق کے پیپر زمل گئے۔ طلاق جیسا لفظ کسی بھی عورت کے لیے لعنت ہوتا ہے مگر مجھے تو امید تھی کہ ایسا ہونے والا ہے، یہ میرے لیے شاکڈ نہیں تھا مگر پھر بھی مجھے دکھ تو ہوا تھا مگر میں نے خود کو مضبوط کرلیا تھا۔ اپنے بچوں کے لیے مجھے ہر حال میں مضبوط بننا تھا۔

☆☆☆

دن یونہی گزرتے رہے...... اماں اور ثروت آپا کا خیال تھا کہ کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر میرا نکاح کردیں لیکن میں کسی صورت اب یہ کرنے پر تیار نہیں تھی، میری زندگی کا مقصد صرف اور صرف میرے بچے تھے گو کہ ابھی میری عمر صرف پچیس سال تھی مگر میں نے اتنی سی عمر میں بھی بہت برے حالات دیکھے ساتھ، ساتھ تین بچوں کی ماں بھی بن گئی تھی۔ جس عمر میں لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں میں اس عمر میں شادی کرکے تین بچوں کی ماں بن کر طلاق یافتہ عورت بھی بن گئی تھی۔

زین جب بھی آتا بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آتا میں نے اعتراض کیا تو وہ بولا۔

''نیناں......! یہ سب تو میں انکل کی زندگی میں

بھی کیا کرتا تھا انہوں نے کبھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یہ گھر اور گھر والے میرے اپنے ہیں یہاں کے دکھ سکھ میرے اپنے ہیں۔ مجھے انکل نے ہمیشہ ایک بیٹے کی طرح ہی سمجھا اور میں نے بھی ان کو اور اماں کو ماں اور باپ کی طرح سمجھا...... تم...... تم نے تو شادی کے بعد اس گھر سے بھی رابطہ کم کر دیا تھا تو میں کس گنتی میں تھا۔ مجھے تو تم بھول ہی گئیں۔ تم کو تو یہ بھی علم نہیں ہوگا کہ میں ہمیشہ تمہاری شادی کے بعد بھی اس گھر سے ایسے ہی جڑا رہا......'' اس کی بات پر میں شرمندہ ہوگئی واقعی شادی کے بعد اس سے میری ملاقات ہی نہیں ہوتی تھی...... میں آتی ہی کم، کم تھی جب میں آتی تو اتفاق سے وہ نہیں آتا، میں تو اپنی زندگی، اپنے گھر اور اپنے حالات کی چکی میں اس بری طرح پستی رہی کہ مجھے تو اماں سے ملے ہوئے بھی ہفتوں گزر جاتے۔

گھر میں ابا جی کی پنشن آتی تھی اوپر والے پورشن کا کرایہ تھا اخراجات تو بہ آسانی پورے ہو جاتے لیکن اس کے باوجود میں نے جاب کرنے کا فیصلہ کرلیا، میں اپنے بچوں کو کسی بھی چیز کے لیے ترستا نہیں دیکھ سکتی تھی گریجویشن تو تھی سوچا کہ اپنے ڈاکومنٹس نکال کر سی وی بنوالوں اور مناسب جگہوں پر اپلائی کر دوں میری ترجیح ٹیچنگ تھی جہاں بچے بھی میرے ساتھ جاسکتے تھے وہیں پر ایڈمیشن کروالیتی تو مجھے بھی اور بچوں کو بھی سہولت رہتی۔ بس یہی سوچ کر کاغذات پھیلائے بیٹھی تھی۔ واسع سو رہا تھا اور عشوہ اور اجوہ صحن میں کھیل رہی تھیں تب ہی دروازہ پر دستک ہوئی۔

''زین انکل...... زین انکل......'' بچیاں اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکیں۔

''عشوہ یہ کیا حرکت ہے، آپ بڑی ہوگئی ہو بیٹا ایسے نہیں کرتے۔'' میں نے عشوہ کو زین کے کاندھے سے لٹکتا دیکھ کر سرزنش کی۔

''نیناں پلیز...... ! بچیوں کو منع مت کیا کرو، مجھے اچھا لگتا ہے یہ میری گود میں آتی ہیں، میں انہیں پیار کرتا ہوں تو مجھے سکون حاصل ہوتا ہے۔ یہ ننھی، ننھی کلیوں جیسی یہ تتلی جیسی ننھی پریاں...... جنہیں دیکھ کر مجھے بہت کچھ یاد آجاتا ہے۔'' زین کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔

''زین...... اگر کوئی اس طرح سے دیکھے گا تو اچھی بات نہیں ہے ناں......'' میں نے وضاحت دی۔

''نیناں یہ بات تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میری بھی ایک ننھی گڑیا جیسی بہن تھی ایسی ہی ہنستی کھلکھلاتی اور میرے ساتھ نخرے اور لاڈ کرتی، مجھ سے چھ سال چھوٹی تھی۔ اس کے دم سے ہمارے آنگن میں رونق تھی، اس کی ہنسی کی جلترنگ سے ہمارے گھر کا کونا، کونا گونجتا تھا...... میری تو اس میں جان اٹکی رہتی تھی۔ اس کے ذرا سے دکھ پر ذرا سی تکلیف پر سب تڑپ جاتے میرا بس نہیں چلتا کہ میں کیا کروں کہ اس کی تکلیف دور ہو جائے...... میں اسے دیکھ، دیکھ کر جیتا تھا، میں پندرہ سال کا تھا اور وہ آٹھ، نو سال کی تھی جب وہ بیمار ہوگئی...... اور ایسی بیمار ہوئی کہ میں جو اس کے کھانسنے پر تڑپ جاتا تھا، اس کو تڑپتا دیکھ کر...... اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکا...... میرے سامنے وہ لمحہ بہ لمحہ موت سے قریب ہوتی رہی اور میں...... میں لاچار، مجبور اور...... بے بس تھا میں، اس کے لیے کچھ نہ کرسکا...... کاش اگر جان کے بدلے جان بخش دی جاتی تو میں، میں اپنی جان دے کر اس کی زندگی کی بھیک مانگ لیتا...... کبھی کبھی ہم کتنے بے بس، مجبور اور لاچار ہو جاتے ہیں۔ ہمارے اپنے، ہمارا پیارا رشتہ، جس کی ذرا سی تکلیف پر ہم تڑپ جاتے ہیں وہ...... ہمارے سامنے موت اور زیست کی کشمکش میں ہوتا ہے...... ایک، ایک لمحہ اسے زندگی سے ہم سے دور کر رہا ہوتا ہے...... وہ ہمیں روتا بلکتا اور تڑپتا چھوڑ کر موت سے لڑتے، لڑتے آخر کار زندگی کی بازی ہار جاتا ہے۔ یہی میرے ساتھ ہوا میں...... کچھ بھی نہیں کرسکا اور...... میری زندگی، میری جان، میری ماں جائی، میری بہن بھی ہم سب کو چھوڑ کر ابدی سفر کی مسافر بن گئی۔ اور تب سے ایسی ننھی سی بچیاں دیکھتا ہوں تو دل کرتا ہے کہ ان کے لیے کیا کچھ نہ کر دوں...... مجھے میری ننھی پری یاد آجاتی ہے۔'' اس نے بات ختم کی تو اس کی

آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''اوہ سوری...... زین...... مجھے اس بات کا علم نہیں تھا۔ آئی ایم سوری...... اگر تم کو برا لگا تو۔'' میں اس کے دکھ پر بے تحاشا دکھی تھی۔ کتنا بڑا درد چھپا کر وہ جی رہا تھا۔

''اٹس اوکے...... ! تم لوگوں کو بتایا ہی نہیں تھا میں نے تو کیسے پتا چلتا...... بس یہ سمجھ لو کہ ایسی گڑیا اور پریوں جیسی بچیاں میری کمزوری ہیں۔'' زین نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلایا مجھے واقعی اس کی بات سن کر دلی افسوس ہوا تھا۔

''کہیں بیٹیاں اتنی عزیز، اتنی پیاری ہوتی ہیں اور کہیں......؟'' میں نے سر جھٹکا اور زین کے لیے پانی لے کر آگئی۔

''تھینکس!'' اس نے گلاس تھام کر لبوں سے لگالیا۔

''یہ کیا پھیلایا ہوا ہے......؟'' پانی پی کر وہ قدرے بحال ہوا تو مجھے کاغذات پھیلائے دیکھ کر سوال کیا۔

''دراصل میں سوچ رہی تھی کہ کسی اسکول میں اپلائی کر دوں ٹیچنگ کے لیے۔'' میں نے کاغذات سمیٹتے ہوئے کہا۔

''نیناں کیا یہ ضروری ہے کہ تم جاب کرو......؟'' اس کے بے تکے سوال پر مجھے ہنسی آگئی۔

''زین! یہ کیسا سوال ہے......؟ میرے تین، تین بچے ہیں یوں فالتو تو نہیں رہ سکتی ناں، اس لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتی ہوں۔''

''یہ اتنا ضروری بھی نہیں۔'' اس کی بات پر میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

''کیا مطلب......؟'' میں نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

''مطلب یہ نیناں کے میں...... ان بچیوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔''

''یہ فضول سی بات ہے اور قطعی ناممکن بھی۔'' میں اس کا مطلب سمجھ کر ترش لہجے میں بولی۔

''کیوں، ناممکن کیوں ہے؟'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھ کر سوال کیا۔

''اس لیے کہ میں ایسا نہیں چاہتی۔'' میں حتمی انداز میں کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی کیونکہ واسع بھی جاگ چکا تھا۔ میں کمرے کی جانب چلی گئی۔ پھر جب تک زین رہا میں کمرے سے نہیں نکلی...... اس بات کا ذکر اماں سے بھی نہیں کیا کیونکہ میں ایسا ہرگز نہیں چاہتی تھی اگر اماں کو پتا چل جاتا تو وہ تو میری جان کو آجاتیں...... بالآخر مجھے اپنی دوست کے توسط سے ایک فرم میں جاب مل گئی۔ میں نے گھر میں ایک ملازمہ رکھ لی تھی جو کام کے ساتھ، ساتھ بچوں کو بھی دیکھ لیتی... دونوں بچیاں تو اسکول جاتیں وہاں سے آکر کھانا کھا کر سو جاتیں۔ پانچ بجے اٹھتیں اس لیے زیادہ تنگ نہیں کرتی۔ چھ بجے تک میں آجاتی البتہ واسع کو ملازمہ سنبھالتی اور اماں بھی ساتھ دیتیں۔ میری جاب اچھی چل رہی تھی ماحول بھی اچھا صاف ستھرا تھا۔ باس بھی عمر رسیدہ اور شفیق تھے۔ اس روز میری اہم میٹنگ تھی اس لیے سیل بھی آف تھا۔ میں دن میں میٹنگ میں بزی تھی۔ عشوہ اسکول سے آکر واش روم گئی تو سلپ ہو کر گر گئی تھی ٹائلز کا کونا اس کے سر پر لگا تھا اور سر سے خون بہنے لگا اتفاق سے اس روز ملازمہ بھی جلدی چلی گئی تھی اماں بیچاری حواس باختہ ہوگئیں مجھے کال لگائی، میرا سیل آف تھا تب انہوں نے زین کو بلوایا اور تھوڑی دیر میں ہی زین بھاگا چلا آیا عشوہ کو اپنے ساتھ، اسپتال لے گیا اس کے سر پر تین ٹانکے آئے تھے۔ مجھے کوئی خبر بھی نہیں تھی حسبِ معمول جب میں شام کو گھر آئی دیکھا اماں کچن میں تھیں اور زین عشوہ کو گود میں لیے جوس پلا رہا تھا اجوہ اس کے سامنے بیٹھی چاکلیٹ کھا رہی تھی جبکہ واسع کیری کاٹ میں تھا۔

''ہائیں...... یہ کیا ہوا...... کیسے ہوا......؟ کہاں سے چوٹ لگی......؟'' میں نے عشوہ کے سر پر پٹی بندھے دیکھی تو تڑپ کر ایک سانس میں کئی سوالات کر کے اس کے پاس آکر اسے زین کی گود میں سے اپنی گود میں

سے لیا۔

”عشوہ گر گئی تھی‘ میں نے تمہیں کال کی تمہارا فون مسلسل بند تھا تب میں نے زین کو بلوالیا۔ میرے تو بدحواسی میں پسینے چھوٹ گئے۔ خون دیکھ کر ہراساں ہوگئی تھی وہ تو دس منٹ میں زین آگیا اسپتال لے کر گیا۔ شکر ہے اللہ کا کہ زین فوری آگیا ورنہ...... میری تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں......“ اماں نے جلدی، جلدی سارا قصہ سنایا اس وقت بھی ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

”اُف اللہ...... تھینکس زین......!“ میں نے تشکر بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”تھینکس کہہ کر میرے خلوص کو بے وقعت نہ کرو نیناں...... شکر کرو کہ میں اس وقت فارغ تھا اور فوراً پہنچ گیا۔“

اس کی بات پر میری آنکھیں نم ہوگئیں۔

عشوہ کے گرنے کے بعد سے میں اتنی خوفزدہ ہوگئی کہ میں نے مہینہ پورا کر کے جاب ہی چھوڑ دی اور گھر پر بچوں کو ٹیوشن دینے لگی، اس روز اچانک اماں کی طبیعت خراب ہوگئی، بی پی شوٹ کر گیا میں نے ثروت آپا کو بلوالیا ہم دونوں ان کو لے کر اسپتال بھاگے، میں اور ثروت آپا بہت فکر مند تھے، اماں کی زندگی میرے لیے بہت اہم تھی ان کے سہارے تو میں یہاں تھی اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہوجاتا تو میں...... نہیں، نہیں میں بالکل پاگل ہوجاؤں گی الٹے سیدھے خیالات مجھے ہراساں کررہے تھے۔

”اللہ پاک میری اماں کو صحت وتندرستی اور لمبی عمر عطا کردے، آمین۔“ میں صدقِ دل سے دعا گو تھی۔

فوری ٹریٹمنٹ سے اماں کی طبیعت کافی سنبھل گئی۔ اور شام تک ہم گھر آگئے تھے۔ ثروت آپا اس رات گھر پر ہی رک گئیں۔ زین کو پتا چلا تو وہ بھاگا، بھاگا آیا اور بہت دیر تک ہمارے ساتھ رہا بلکہ مجھ پر غصہ بھی کیا کہ مجھے کال کیوں نہیں کی۔

”ثروت آپا اور اعظم بھائی آگئے تھے ناں......“ میں نے وضاحت دی مگر اسے یہ بات بری لگی کہ اسے کیوں بے خبر رکھا گیا۔ رات کو اماں کچھ بحال ہوئیں تو نیند بھی اچھی آئی لیکن میں جاگ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں نیند نہیں آرہی تھی۔

بچے سوگئے میں تو بچوں کے دھلے کپڑے تہہ کرنے لگی تب ہی ثروت آپا آگئیں۔

”ارے آپا، آیئے، آیئے......“ میں نے جلدی سے بیڈ پر جگہ بنائی۔

”نیناں......! مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔“ ثروت آپا نے بیڈ پر بیٹھ کر کچھ لمحوں کے بعد کہا۔

”جی آپا بولیں۔“ میں ہمہ تن گوش ہوگئی۔

”دیکھو نیناں جو میں کہنے جارہی ہوں وہ خاموشی اور ٹھنڈے دل ودماغ سے سنو۔“ انہوں نے تمہید باندھی۔

”جی آپا......!“

”نیناں جو حقیقت ہے اسے کھلے ذہن سے مان لینا چاہیے ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اماں کی طبیعت آج کل کتنی خراب رہنے لگی ہے کچھ عمر کا تقاضا بھی ہے۔ اماں میں اب نہ تو حوصلہ اور نہ ہمت ہے۔ ظاہر ہے صحت اس قابل نہیں کہ وہ تمہارے بچوں کی اور تمہاری دیکھ بھال کرسکیں اور اگر خدانخواستہ کل کو انہیں کچھ ہوجاتا ہے تو تم اور تمہارے چھوٹے، چھوٹے بچے کسی طرح رہ پائیں گے...... آج کل کے حالات میں اکیلی جوان عورت کا اس طرح رہنا کتنا دشوار اور کٹھن ہوتا ہے، اس کا تو تمہیں بھی اندازہ ہوگا۔“

”اللہ نہ کرے آپا کہ اماں کو کچھ ہو۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔

”نیناں اللہ نہ کرے...... میرے منہ میں خاک...... لیکن اس حقیقت سے نہ تم انکار کرسکتی ہو اور نہ ہی میں منہ چھپا سکتی ہوں...... تم جانتی ہو کہ اماں کو ساری فکر، پریشانی تمہارے حوالے سے ہے، وہ تمہارے لیے کتنی پریشان، کتنی ٹینشن میں رہتی ہیں تم اچھی طرح سے واقف ہو اور وہ اپنی زندگی سے بھی پُر امید نہیں ہیں...... ان کے لیے تم اور تمہارے بچے بہت اہم

ہیں...... وہ ہر وقت بس اسی فکر میں غلطاں رہتی ہیں کہ ان کے بعد تمہارا اور ان معصوم بچوں کا کیا ہوگا......؟ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی زندگی میں، ان کی آنکھوں کے سامنے وہ تم سے مطمئن ہوجائیں۔ تمہارا مستقبل کسی مضبوط ہاتھوں میں سونپ کر وہ اس فکر سے آزاد ہونا چاہتی ہیں نیناں...... زین تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ تمہیں اور تمہارے بچوں کو اپنی پناہ میں لینا چاہتا ہے۔“

ثروت آپا اصل بات پر آگئی تھیں۔

”نہیں آپی......! اب یہ ناممکن ہے۔“ میں نے حتمی انداز میں کہا۔

”زین عام مردوں سے بالکل مختلف ہے بہت نائس نیچر ہے اس کی...... وہ کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل بننے کے لائق ہے لیکن...... یہ تمہاری خوش قسمتی ہے نیناں کہ وہ اب بھی تمہیں چاہتا ہے۔ تمہارے ساتھ کا خواہاں ہے، اب تم اچھی طرح سے سوچ لو اور پھر اپنا فیصلہ سنا دینا لیکن فیصلہ سنانے سے پہلے ان تمام باتوں پر اچھی طرح سے غور کرنا جن، جن باتوں کی میں نے نشان دہی کی ہے۔“ اپنی بات مکمل کر کے ثروت آپا کمرے سے جا چکی تھیں اور...... مجھے سخت ترین امتحان میں ڈال دیا تھا۔ اماں اور ثروت آپا کی بات بھی اپنی جگہ درست تھی مگر میں کیا کرتی......؟ دل عجیب سی کشمکش کا شکار تھا مجھے اندازہ تھا کہ کسی بچے کو سوتیلے پن کے رشتوں کا سامنا کرنا پڑے تو وہ کس محرومی کا شکار ہوجاتے ہیں اگر بچے اس بات کو محسوس نہ بھی کریں تو لوگ اس بات کا احساس دلاتے ہیں ان کو سگے اور سوتیلے رشتوں کا موازنہ کرنے لگتے ہیں ان کی شخصیت دُہری ہوجاتی ہے...... میں کیا کروں......؟ میری سمجھ سے باہر تھا کیا فیصلہ کروں......؟ یہ سوچیں مجھے مسلسل تنگ کررہی تھیں نیند بھی مجھ سے روٹھ چکی تھی۔ تب ہی میرا اسیل فون بج اٹھا...... دوسری جانب زین تھا۔

”ابھی تک جاگ رہی ہو؟“ سلام کے جواب کے بعد سوال کیا۔

”ہاں!“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”کیوں......؟“ پھر سوال کیا۔

”بس......“ میں کیا جواب دیتی۔

”بس...... کیا مطلب......؟ صاف کہو کہ تم میرے بارے میں سوچ رہی ہو...... تم اس وقت الجھی ہوئی ہو...... تمہیں نیند اس لیے نہیں آرہی کہ تم اپنے لیے کوئی مناسب فیصلہ کرنے میں دشواری محسوس کررہی ہو...... تم کشمکش میں ہو...... نیناں تمہیں آخر سب کی بات مان لینے میں کیا پرابلم ہے؟“

”زین پلیز...... مجھے ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں اس کی بات کاٹ کر تلخی سے بولی۔

”نیناں پلیز...... میری محبت کو میری ریاضت کو میرے صبر وانتظار کو...... میری برداشت کو صرف اور صرف ہمدردی کا نام دے کر میرے جذبات کی توہین تو مت کرو...... تمہیں اندازہ نہیں ہے نیناں کہ میں تمہیں کتنی شدتوں سے چاہتا ہوں، میں نے تم سے ایک عرصے تک خاموش اور یک طرفہ محبت کی ہے اور جب تمہاری شادی کے بارے میں سنا تو میں نے تم سے اپنی باتیں شیئر بھی کیں، تم سے اظہار بھی کیا لیکن...... خود پر مکمل قابو کر کے تمہاری شادی کے انتظامات میں حصہ لیتا رہا...... میرے ذہن نے قبول کرلیا تھا کہ تم میرے لیے نہیں بنی ہو، میں اللہ کے فیصلے پر راضی ہو کر مطمئن بھی ہوگیا...... لیکن...... اماں کی لاکھ ضد اور کوششوں کے باوجود بھی آج تک شادی کے لیے ہامی نہیں بھر سکا کیونکہ میرے دل، دماغ اور رگ، رگ میں صرف اور صرف تمہاری چاہت سمائی ہوئی تھی۔ اور میں کسی لڑکی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرسکتا تھا اس لیے بہتر یہی سمجھا کہ شادی ہی نہ کروں لیکن جب اللہ کی جانب سے ہی یہ سب کچھ ہوگیا اور ایک بار پھر ہمیں موقع مل رہا ہے تو پھر تم کیوں میرے صبر کو آزما رہی ہو......؟ کیوں مجھے تڑپا رہی ہو نیناں......؟“ وہ سراپا سوال تھا۔

”زین، میرے تین بچے ہیں اور...... اور تم...... تم غیر شادی شدہ...... جو میرے نصیب میں تھا وہ میں نے بھگت لیا۔ اب شادی کا تصور بھی کرتی ہوں تو شرم

آتی ہے......سوچو تو لوگ کیا کہیں گے؟ میں مزید تماشا نہیں بننا چاہتی زین...... میں اپنے بچوں کو کسی الجھن میں نہیں ڈال سکتی زین۔'' میرے دل کی بات میرے لبوں پر آگئی۔

''نیناں اگر تمہارے ذہن میں عشوہ، اجوہ اور واسع کے حوالے سے کوئی ایسا خدشہ یا وہم ہے تو ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہمارا کوئی بے بی نہیں ہوگا، میرے لیے یہ تینوں بچے ہی بہت ہیں، میں انہیں اتنا پیار دوں گا، اتنا خیال رکھوں گا کہ بچوں کو کبھی کسی قسم کی کمی یا احساسِ کمتری کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔ میری دنیا صرف تم اور تینوں بچے ہوں گے۔'' اُف زین نے کتنی بڑی بات کہہ دی تھی...... وہ اتنا سچا، پُرخلوص اور واقعی مجھ سے محبت کرنے والا تھا مجھے بے ساختہ رونا آگیا۔

''نیناں پلیز...... پلیز...... دیکھو رونا نہیں...... میں تمہاری آنکھ میں ایک آنسو بھی برداشت نہیں کرسکتا...... جو بھی ہوگا تمہاری مرضی کے مطابق ہوگا۔''

''زین! میں ایسا کبھی نہیں چاہوں گی...... میں ایسی کوئی شرط یا پابندی نہیں چاہتی...... میں...... تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' زین کی بات میرے دل پر جا لگی تھی، سچ میں وہ واقعی مجھے اور بچوں کو دل سے چاہتا تھا۔ اس کے پیار میں کوئی کھوٹ کوئی لالچ نہ تھی...... میں نے ایک پل میں ہی فیصلہ کرلیا جو مجھے اپنے اور بچوں کے لیے سو فیصد درست اور مناسب لگا۔

''سچ نیناں......!'' دوسری جانب اس کی خوشی سے بے قابو آواز ابھری۔

''تھینک یو سو مچ نیناں! آئی لو یو...... آئی لو یو سو مچ!'' اس کی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کس طرح سے وہ اپنے جذبات کا اظہار کرے۔

میں نے اس کا مان رکھ لیا تھا۔ میرے سچے اظہار پر وہ بے پناہ خوش تھا اور جب اماں ثروت آپا اور قرات آپا نے یہ سنا تو سب بہت خوش ہوگئے۔ اماں کو میری طرف سے اطمینان ہوگیا تھا پھر نہایت سادگی سے میرا اور زین کا نکاح پڑھوا دیا گیا...... زین میری سوچوں، میری توقعات سے زیادہ پیار کرنے والا، خیال کرنے والا اور جان نچھاور کرنے والا شوہر اور باپ ثابت ہوا۔

زین ہم لوگوں پر جان نچھاور کرتا گزشتہ ہونے والی ساری تلخیاں، زیادتیاں، احساسِ کمتری میں وہ سب کچھ بھول چکی تھی۔ میرے بچے بھی بہت خوش تھے۔ زین سے قائم ہونے والا نیا رشتہ وہ دل و جان سے قبول کرچکے تھے۔ سابقہ باپ کے رویّے کے بعد زین کا رویّہ ان لوگوں کے لیے نعمت تھا۔ خوب صورت، محبت سے سرشار، مطمئن اور آسودہ زندگی گزارتے، گزارتے وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ اسی طرح دس سال کا عرصہ بیت گیا۔ میری بچیاں ماشاءاللہ سے بڑی ہونے لگی تھیں۔ وقت نے ہماری گود میں رافع کی شکل میں ایک اور نعمت ڈال دی تھی۔ عشوہ، اجوہ، واسع اور رافع ان چاروں بچوں پر مجھ سے زیادہ زین جان چھڑکتا تھا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا تھا اس کی جاب بھی ماشاءاللہ سے مسلسل پروموشن ملتی رہی اور آہستہ، آہستہ ہمارے پاس بہترین گھر، گاڑی اور ساری آسائشیں میسر ہوگئیں اور زین ان تمام آسائشات کو عشوہ، اجوہ سے منسوب کرتا کہ میری بیٹیوں کے نصیب سے میں اس حال میں ہوں۔ زین کی چاہت پر کبھی، کبھی میری آنکھیں نم ہوجاتیں۔ میں اللہ پاک کا لاکھ، لاکھ شکر ادا کرتی کہ اس نے زین کی صورت میں مجھے خوب صورت تحفہ عطا کیا تھا میں اس کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔

اس روز زین کے کسی دوست کی بیوی کو دیکھنے میں اور زین اسپتال گئے تھے۔ تب پتا چلا کہ وہ بلڈ ٹیسٹ کے لیے لیبارٹری گئی ہوئی ہیں، زین مجھے وہیں کاریڈور میں بٹھا کر باہر چلے گئے۔ میرے ساتھ رافع اور واسع بھی تھے جو شرارتیں کر رہے تھے۔ میرے برابر میں ایک خاتون بیٹھی تھیں جو مسکرا مسکرا کر دونوں بچوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی گود میں ننھی سی بچی تھی جبکہ برابر میں بھی پیاری سی بچی بیٹھی تھی۔ میں نے ٹائم پاس کرنے کی غرض سے ان سے بات چیت شروع کردی تب مجھے پتا چلا کہ ان خاتون کی پانچ بیٹیاں ہیں

اور اب مزید اولاد کے چانس بھی نہیں ہیں۔ ہائے! مجھے دل ہی دل میں افسوس ہوا...... دیکھو کیسا شوہر ہے کہ چھ بیٹیوں تک برداشت کیا اور باقر......

''میں اپنے ہزبینڈ کی تیسری وائف ہوں......''

شاید وہ میرے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو محسوس کرچکی تھی تب ہی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ......'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''پہلی وائف سے بھی بیٹیاں تھیں، دوسری سے بھی تین، بیٹیاں اور......'' وہ خاموش ہوگئیں ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔

''اُف اللہ......!'' میرے منہ سے بس یہی نکل سکا...... تب ہی وہ اتنی حسرت سے رافع اور واسع کو دیکھ رہی تھی۔ تب ہی میں نے سامنے سے آتے شخص کو دیکھا تو میری آنکھیں پھیلتی چلی گئیں وہ کوئی اور نہیں...... باقر تھا...... کمزور، چہرے پر بیزاری لیے...... اس کی بھی نظر مجھ پر پڑی اس کی حالت بھی میرے جیسی تھی اس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا اور ساتھ ہی اس کی نظر واسع اور رافع پر جا ٹکیں...... دفعتاً اس کی آنکھوں میں اداسی اور بیچارگی سی اتر آئی...... ان کا نمبر آگیا تھا۔ وہ لوگ ڈاکٹر کے روم کی جانب جانے کے لیے آگے بڑھے تب میں نے دیکھا کہ سامنے سے زین بھی آرہا تھا۔

''پاپا، پاپا......'' بچے بھاگ کر زین کی جانب لپکے۔ زین نے انہیں گود میں اٹھالیا۔ باقر نے پلٹ کر ایک بار زین کو مجھے اور بچوں کو دیکھا اس کی آنکھوں میں جو پچھتاوا، اذیت اور کرب تھا وہ شاید میرے ساتھ، ساتھ زین نے بھی محسوس کرلیا تھا۔

''آجاؤ یار، صمد آگیا ہے بھابی کو لے کر۔'' زین نے کہا تو میں بھی کرسی سے اٹھ گئی۔ میرے چہرے پر عجیب قسم کے آثار تھے ایک طرف تو مجھے قدرت کے انتقام پر خوشی ہورہی تھی تو دوسری جانب اس عورت کے دکھ کا احساس بھی تھا۔ میں خاموشی سے اٹھ کر زین کے پیچھے، پیچھے چل دی۔

گھر آکر بھی میں کچھ گم صم سی تھی مگر قدرت کے کمال پر خوش بھی تھی کہ ایک وقت تھا کہ نعوذ باللہ باقر خود کو نہ جانے کیا...... سمجھتا تھا۔ اللہ پاک کی لاٹھی...... بے آواز ہوتی ہے مگر انسان گھمنڈی ہے، دولت کے نشے میں وہ خود کو بہت کچھ سمجھنے لگتا ہے یہ بھول جاتا ہے کہ ہوتا وہی ہے جو رب چاہے۔ رب کی نعمتوں سے منہ پھیرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ تین، تین شادیاں کرکے بھی باقر کو ایک بیٹا نہ مل سکا تھا۔

''نیناں کیا ہوا......؟'' زین نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے آواز دی تو میں چونک گئی۔ میں کچن میں چائے بنانے آئی تھی اور چائے کا پانی رکھ کر ابھی اسپتال کے کاریڈور میں الجھی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا جب سے اسپتال سے آئی ہو تم کچھ گم صم سی ہو؟'' زین ملائمت سے میرے ہاتھ تھام کر دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''وہ...... باقر کی فیملی تھی ناں......؟'' میرے جواب دینے سے پہلے اس نے ایک اور سوال کر ڈالا میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''دیکھو نیناں، اس نے نعمتوں کو ٹھکرایا تو اللہ پاک نے اس کی جھولی میں صرف بیٹیاں ہی ڈالیں۔ لیکن نادانوں کو یہ نہیں معلوم کہ یہ بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں رحمت...... ہمارے گھروں کی رونق، ہمارے دل کا سکون، ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک...... ان سے تو ہماری زندگیوں میں بہاریں ہوتی ہیں۔'' میں نے زین کو اس خاتون سے کی گئی پوری بات بتا دی تھی۔ پھر زین نے لاؤنج میں کیرم کھیلتے چاروں بچوں کی جانب دیکھا۔ میں نے مسکرا کر اس کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔ کتنا سکون، آسودگی اور قرار تھا اس کی موجودگی میں اس کے ساتھ اور اس کی باتوں میں۔

''اللہ پاک میرے گھر کی رونقیں یونہی برقرار رکھنا۔'' میں نے بلند آواز میں آنکھیں موند کر صدقِ دل سے دعا مانگی۔

''آمین ثم آمین۔'' زین کی آواز پر میں مسکرا دی تھی۔

خاموش سمندر

ہاجرہ ریحان

''اوہو بھئی، تم تو مجھے پکا گاہک سمجھ کر روز بروز پیسے بڑھاتے ہی چلے جارہے ہو...... یہ تو سراسر زیادتی ہوئی ناں...... جس دن میں نے کسی اور ریڑھی والے کے ہاں سے لینا شروع کردیا تو تم کیا کروگے؟'' میں جانتی تھی کہ میری دھمکی کا اس لمبے دانتوں اور کالے پتلے ہونٹ والے کم عمر ریڑھی والے پر کوئی اثر نہیں ہوگا کیونکہ وہ جانتا تھا، واقف تھا کہ میں چاہ کر بھی کسی دوسرے ریڑھی والے کا رخ نہیں کروں گی۔ میں اسی طرح اس کے پاس آتی رہوں گی اس کی بے اعتنائی کی، بے پروائی اور چالاکی کی ہار، بار شکایت کروں گی مگر اس کو ترک کرکے کسی اور کے پاس نہیں جاؤں گی۔ قصور اس کا نہیں میرا ہے...... ایسا ہے کہ ہم جیسے اب بھی کچھ نااہل، ناکام اور نالائق لوگ اس دنیا میں پائے جاتے ہیں جو وقت کی رفتار کا ساتھ دیتے ہوئے آگے نہیں بلکہ ایک ہی جگہ منجمد کھڑے رہتے ہیں۔ ہاں یہ میں ہی ہوں جو پڑھی لکھی ہوں، پیسے والی ہوں، اپنی مرضی کی مالک بھی ہوں مگر پھر بھی ڈر کر، سہم کر ایک ہی جگہ کب سے مقید ہوں...... گویا قید ہوں اپنی ہی تنہائی میں اور ایسے ہی ساری زندگی گزارنے پر بضد بھی ہوں...... مجھ جیسے لوگ چھوڑ بھی تو نہیں سکتے...... ان کو بھی جو ہمیں چھوڑ جائیں...... نہ اپنے اطوار ہی بدل سکتے ہیں اور نہ ہی ہمیں جستجو ہوتی ہے نت نئی دنیاؤں کی...... جہاں ہوں جیسی بھی ہوں اگر سانس بحال ہے اور کبھی کبھار رات کے کسی پہر دل کی دھڑکن بھی کانوں میں دھمک بن کر سنائی دے جاتی ہے تو...... میرے لیے بہت ہے...... اتنا ہی کافی ہے...... کیا یہ اطمینان کم ہے کہ میں اب بھی زندہ ہوں...... پھر بھی اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب بھی نوکری سے واپسی پر سٹی جیٹی کے پل سے گزر رہی ہوتی ہوں تو ہر طرح کے ٹریفک اژدحام میں بری طرح پھنسے ہونے کے باوجود میرا پورا وجود ڈولنے لگتا...... عجیب سی بے چینی ہونے لگتی...... اور دل کہتا کہ عین بیچ پل پر پہنچ کر چھوٹے پتلے فٹ پاتھ سے لگا کر گاڑی روک دوں...... ایک کاغذ کا پرزہ گاڑی میں چھوڑ دوں ...... جس پر بس اتنا ہی لکھا ہو......

''یہ خودکشی نہیں ہے...... یہ وقت کی رفتار کے ساتھ نہ بھاگ سکنے کا خمیازہ ہے......'' پھر اتری میں گاڑی سے اتروں اور آؤ تاؤ دیکھے بنا پل سے کود پڑوں...... پتا نہیں پانی کتنا گہرا ہو...... پتا نہیں سمندر کا یہ حصہ جس پر دیوقامت سٹی جیٹی کا پل بنایا گیا ہے اپنے پل جیسا آدم خور ہے کہ نہیں...... کہیں بچا نہ لی جاؤں؟ بس یہی سوچ کر میں دل مسوس کر رہ جاتی...... کہیں بچا نہ لی جاؤں...... پھر بھی کئی سال کش مکش میں گزارنے کے بعد میرے اندر اتنی ہمت آہی گئی کہ اکثر گاڑی فٹ پاتھ سے جوڑ کر میں گاڑی کا دروازہ کھلا چھوڑ کر پل کے جنگلے کے پاس آ کھڑی ہوتی...... شام کا وقت، نیچے ٹھنڈے دھیمے مزاج کا سمندر اور دور ہلکا نارنجی ہوتا ہوا آسمان کا وہ ٹکڑا جہاں پر سورج تو موجود ہوتا مگر تمازت کھونے کے باعث تھکا ہارا، سستی مارا دکھائی دیتا...... بالکل میری طرح، کبھی میری توجہ وہ لوگ بانٹ لیتے جو یہاں پرندوں کو کھانا کھلانے آتے تھے...... اوپر بے چینی سے پرواز کرتے پرندوں کی شور مچاتی آوازیں...... نیچے پرندوں کی توجہ اپنی طرف پا کر آٹے کی گولیاں اچھالتے جوش میں آئے ہوئے طرح، طرح کے لوگ...... جو مجھے اپنے آپ سے بہت الگ محسوس ہوتے...... ظاہر ہے وہ رفتار کے قیدی تھے...... جبکہ میں رفتار سے آزاد تھی...... ان کے دلوں میں کچھ ولولے تھے امیدیں تھیں، آنکھوں میں سپنے تھے...... جبکہ میرے پاس بس ایک ہی سوال تھا...... کہیں بچا نہ لی جاؤں؟ پھر بھی مجھے ان سب کو دیکھنا اچھا لگتا تھا، ان کے بارے میں سوچنا ایک مختلف اور بہتر مشغلہ تھا۔ شاید میں اسی لیے شام کے چند لمحے ضرور سٹی جیٹی کے پل پر رکتی تھی۔ اس کا میرے پاس ایک بہت دنیاوی جواز بھی تھا کہ میں گاڑی چلاتی اور ٹریفک میں پھنسی رہ کر تھک جاتی ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے پل پر کھڑے ہوکر سمندر اور شام کا سہارا لیتی ہوں، سانس بحال کرتی ہوں تاکہ باقی ماندہ سفر خیریت سے پورا کرسکوں اور جب تک ہم اپنے ہر قدم پر، ہر کام کا کوئی نہ کوئی واضح جواز دنیا کے گوش گزار نہ کریں۔ انہیں لگتا ہے کہ ہم اپنا قیمتی وقت ضائع کررہے ہیں لہٰذا میں بہت سے سوالوں اور کئی طرح کے طعنوں سے بچنے کے لیے یہ جواز تراش چکی تھی...... اور یہ جھوٹ میرے لیے بہت ضروری تھا۔

پل کی اسی جنگلے کی آدھے قد کی دیوار سے ٹکے بیٹھے کئی ایک ریڑھی والے تھے جن کی ریڑھی پر گندھے ہوئے آٹے کی چھوٹی، چھوٹی گولیاں ڈھیر میں پڑی ہوتیں۔ لوگ دس یا بیس روپے کی آٹے کی گولیاں لے کر پل کے جنگلے سے لگ کر کھڑے ہوکر آٹے کی گولیاں مٹھیوں میں بھر کر ہوا میں اچھال دیتے اور پل کے اسی حصے میں اونچی نیچی پرواز کرتے پرندے زیادہ تر جنگلی چیلیں کرتب دکھاتے، ہوا میں بل کھاتے آٹے کی گولیاں اچک لے جاتے...... شاذ ہی کوئی گولی پانی میں گرنے دی جاتی ہوگی اور اگر گر بھی جاتی ہو تو وہ سمندر میں موجود مچھلیوں کی غذا بن جاتی ہو...... وہاں موجود پرندوں کو کرتب دکھا، دکھا کر غذا کے حصول کی عادت ہوگئی تھی۔ وہ اس طرح سدھ گئے تھے کہ جیسے ہی کوئی انسان جنگلے کے پاس آ کر کھڑا ہوتا، وہ اس کے سر پر منڈلانے لگتے۔ اور ان بھانت، بھانت کی بولیاں بولنے والوں کو پرندوں کو اس طرح رزق پہنچانے میں مزہ آتا۔ آٹے کی گولیاں اچھالتے اور تیزی سے لپکتے پرندوں کا ان سے انصاف کرنا جیسے ان کی آنکھوں میں چمک سی پیدا کردیتا۔ ان کے چہرے جوش اور خوشی سے تمتمانے لگتے۔ اگر وہ گروہ یا جوڑے کی شکل میں ہوتے تو ایک دوسرے کے ساتھ اور بھی لگ کر کھڑے ہوجاتے۔ ایک دوسرے کے اوپر محبت سے نظریں ڈال کر خوشی سے انگلی کے اشارے سے اپنے ساتھی کی توجہ آٹے کی گولیاں جھپٹنے والے پرندوں کی طرف کرواتے گوکہ انہیں معلوم ہوتا کہ یہ سب پچھان کا ساتھی پہلے ہی بہت ذوق شوق سے دیکھ چکا ہے، ان میں اکثر بچے بھی ہوتے جو ضد کرکے اپنے بڑوں سے تھوڑی بہت آٹے کی گولیوں کو اپنی پوری طاقت سے آسمان کے سپرد کرتے مگر پھر ان کو سمندر میں گرتا دیکھ کر ہار مان کر اپنے بڑوں کے گولیاں اچھالنے پر اکتفا



کر لیتے۔

چند ہی مہینوں میں مجھے وہاں موجود ریڑھی والوں اور کچھ مستقل آنے والوں کو دیکھنے کی عادت ہوگئی......ٹیٹی جیٹی پل کا یہ حصہ...... دروازہ کھلی فٹ پاتھ سے لگی ہوئی میری گاڑی......شام، دھیما سمندر، مرجھایا ہوا نارنجی سورج اور اپنی مخصوص کی ہوئی جگہوں پر بیٹھے یہ ریڑھی والے، آٹے کی گولیاں خریدتے......آسمان پر اچھالتے رفتار کے قیدی......شور مچاتے جھپٹتے پرندے، میں اور یہ سب مل کر جیسے ایک مکمل جامع خاندان بن گئے تھے......اور اسی خاندان میں شامل وہ بھی تھا جس کو میں نے اس شام سے پہلے اس قدر غور سے نہیں دیکھا تھا۔غور سے دیکھنے سے مراد ہے کہ اس کی ظاہری حالت......شکل صورت......کپڑوں پر نظر نہیں ڈالی تھی۔اس سے پہلے بھی میں نے کئی بار اسے آٹے کی گولیاں پرندوں کو کھلاتے دیکھا تھا......وہ اکثر ہی میرے پہنچنے سے چند منٹ بعد اچانک ہی منظر پر نمودار ہوتا......شاید وہ بس سے آتا تھا......اس کے ہاتھ میں ایک خاکی پتلی سی فائل ہوتی تھی جو وہ ریڑھی والے کے پاس رکھوا کر اس سے آٹے کی گولیاں لیے دو چار قدم اِدھر اُدھر ہو کر ہی پرندوں کو کھانا دیا کرتا تھا......یہ بھی مزیدار تماشا ہوتا......پرندے اس کی چال سے چال ملا کر کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر ہوتے......مگر وہ ہمیشہ اکیلا ہوتا تھا لہٰذا پرندوں کے کھانا جھپٹنے پر وہ کسی کو ان کی طرف متوجہ نہیں کرتا تھا، نہ ہی اس کا چہرہ خوشی اور جوش سے تمتماتا......بس ہونٹ بھینچے سنجیدہ صورت بنائے آسمان پر نظریں گاڑے رکھتا......اس دن اتفاق سے وہ اسی طرح چکراتا ہوا میرے بہت قریب سے گزرا اور اس کی بڑبڑاہٹ مجھے سنائی دی۔

’’خداوند......یارا پلیز......اس انٹرویو میں کامیابی دے دیں، میں وعدہ کرتا ہوں......ان پرندوں کی ہی سن لیں......اپنے کرایے سے بچا کر ان کا پیٹ بھرنے آتا ہوں......کچھ تو رحم کر یارا......‘‘ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا میرے پاس سے کئی بار......گزرا اور ہر بار اس کی کچھ اسی طرح کی دعائیں سنائی دیتی رہیں...... مجھے ہنسی آگئی......اب تک میں ان سب کو بس دور سے دیکھتی رہی تھی......ان کی آپس میں بات چیت کو کبھی سن نہیں سکی تھی۔ وہ یہاں اس جنگلے کے پاس آکر کیا، کیا بات کرتے ہیں اگر اکیلے آئے ہوں تو کیا سوچتے ہیں، میں نے آج تک سب کچھ خود سے اخذ کیا تھا۔آج پہلی بار میں کسی کو باقاعدہ سن رہی تھی......گو میرا چہرہ سمندر کی طرف تھا اور وہ میرے عقب میں کئی بار اِدھر اُدھر ہوا تھا۔پھر بھی میں نے اس پر چند اچٹتی نظریں ضرور ڈال لی تھیں۔لمبا متناسب ڈیل ڈول کا تمیں، پینتیس سال کا متوسط طبقے کا جوان......نیلی شرٹ اور خاکی پینٹ میں وہ کافی خوش شکل نظر آتا تھا مگر بے روزگار تھا۔خداوند کی بہت سی نعمتوں سے مالا مال ہو کر بھی وقت کی رفتار کے ساتھ بھاگ نہ سکنے پر افسردہ......میں چند منٹ سانس بحال کرنے کا وقفہ گزار کر واپس ہونے لگی اور پھر اچانک رک کر میں نے دل سے اس کے لیے دعا کی۔اگلے چند دن تک وہ اسی طرح نظر آتا رہا۔بے چینی اور امید کی انتہاؤں کے درمیان ڈولتا ہوا وجود، بے پروائی اور کبھی سنجیدگی چھلکاتی آنکھیں جیسے خداوند سے کہتی ہوں۔’’آج ہم اپنی دعاؤں کا اثر دیکھیں گے۔‘‘ اور پھر وہ منظر سے غائب ہوگیا۔خاندان کی ایک اکائی نے خود کو الگ کرلیا تھا۔میں نے اسے کئی بار سوچا۔اس کی غیر موجودگی کو محسوس کیا مگر دل میں خوشی سی ہوئی یقیناً اسے نوکری مل گئی تھی......تب ہی تو اب یہاں نہیں آتا......پتا نہیں اس نے نوکری ملنے پر خداوند سے کیا وعدہ کیا تھا؟ کہیں اس خاندان کے پرندوں کو کھلانے کا وعدہ نہ کر بیٹھا ہو بے وقوف......اگر ایسا ہے تو اسے کچھ بھی کر کے اپنا وعدہ نبھانے کا سوچنا چاہیے مگر کیا معلوم ایسا کچھ نہ ہو وعدہ تو کیا ہو مگر اس کا متن کچھ اور ہو......اللہ کرے کہ ایسا ہی ہوا ہو، میں دل میں ہزاروں باتیں سوچتی، ہزاروں وسوسوں کو ٹالتی، سانس بحال کر کے اپنی راہ لیتی۔

چند ہفتے گزرے بیچ میں چند ایک چھٹیاں آئیں اور کئی بار کچھ ضروری کاموں کے باعث میں پل پر رکے بغیر گزری پھر ان دنوں جب سورج نارنجی ہونے کی فرصت میں نہیں رہتا اور جلد از جلد ڈوب جانے کو ترجیح دیتا ہے میں نے اسے اچانک منظر پر نمودار ہوتے دیکھا۔بس یوں ہوا کہ میں معمول میں اِدھر سے ہٹا کر اُدھر نظریں گھما رہی تھی کہ اس پر ٹک گئیں وہ میرے کافی قریب کھڑا تھا۔مگر مجھ سے اور اپنے اردگرد سے بے پروا...... اب کی بار اس کی مٹھیوں میں آٹے کی گولیاں نہیں تھیں اور وہ ٹہل، ٹہل کر پرندوں کو اپنی طرف متوجہ بھی نہیں کر رہا تھا بلکہ دونوں ہاتھوں سے زنگ آلود لوہے کے خستہ جنگلے کو مضبوطی سے تھامے سمندر کو تک رہا تھا......میرا دل ڈوبنے لگا کہیں یہ بھی میری طرح اپنے آپ سے ’’بچانہ لیا جاؤں‘‘ جیسا سوال نہ پوچھتا ہو......ہم دونوں کے درمیان فاصلہ تو تھا مگر کوئی دوسرا موجود نہیں تھا۔

’’کیا ہوا انٹرویو میں کامیابی نہیں ہوئی......نوکری نہیں ملی؟‘‘

آخر کار ہمت کر کے بلند آواز میں نے پوچھ ہی لیا......اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا......پھر سمندر کی طرف......جیسے اندازہ کر رہا ہو کہ واقعی میں نے اس سے ہی کچھ پوچھا ہے۔پھر مجھے متوجہ پا کر دو چار بار گہری سانس لینے کے بعد اس کی نظریں جھک گئیں۔

’’ملی تھی......پھر......میں نے چھوڑ دی۔‘‘ اس نے اٹکتے ہوئے ہلکے سے جواب دیا غیر ارادی طور پر ہم دونوں اپنی جگہ سے کھسک کر ایک دوسرے کے قریب تو آگئے تھے مگر ہماری نظریں سمندر پر ٹکی ہوئی تھیں۔

’’چھوڑ دی...... کیوں، کیا تنخواہ؟‘‘ میں نے بات بڑھانے کے لیے پوچھ تو لیا مگر مجھے شرمندگی ہوئی......ابھی اگر جواب دینے کے بجائے مجھے یہ کہہ دے کہ میں ہوتی کون ہوں اس سے یہ سب پوچھنے والی تو اچھی خاصی بے عزتی ہو جانی ہے۔

’’بس عزت والی نوکری نہیں تھی...... باس کہنے لگا......میری بہن کو کالج سے لاؤ، کبھی کسی سہیلی کے ہاں کسی پارٹی میں چھوڑ کر آنا پڑتا......یہاں تک بھی برداشت کر لیتا مگر پھر اس کی بہن......بس میں نہیں بتا سکتا۔‘‘ اس نے سر جھٹک کر بات نمٹانی چاہی۔

میرے دل میں کسک جاگی......خداوند جب کسی کو خوب صورت بنائے تو اسے غریب نہ رکھے......اسے کسی طرح کی مجبوری نہ دے......اسے ہمیشہ غنی رکھے...... کیونکہ مرد ہو یا عورت، غریب خوب صورتوں کے لیے دنیا بہت ہی بے رحم ہوتی ہے۔

’’چلو، کوئی بات نہیں دوسری ڈھونڈ لو۔‘‘ میں نے دلاسا دینے کی خاطر کہا تو وہ طنزیہ ہنس پڑا۔میں اس کی طنزیہ ہنسی کا مفہوم سمجھ رہی تھی کہ ابھی اتنے جتن سے ایک نوکری ملی تھی وہ بھی چل نہ سکی......آگے کیا ڈھونڈے گا۔

’’چھوٹی بہن نوکری کر، کر کے بوڑھی ہو رہی ہے، گھر والوں کا پیٹ پال رہی ہے اور اس کا بڑا بھائی......بے غیرت ......نکھٹو......سوائے سیر سپاٹے کے کرتا ہی کیا ہے؟‘‘ اس نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

ایک اور رفتار کا قیدی......میں نے سر جھٹکا......اس کی تلاش ایک بار پھر سے زور شور سے شروع ہو چکی تھی اور اب ہم ایک دوسرے سے کافی باتیں کرلیا کرتے تھے۔مگر کبھی، کبھی ایسا بھی ہوتا کہ میں اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرنے لگتی...... مجھے اس کا وجود حاوی ہوتا محسوس ہونے لگتا تو میں بے اختیار سمٹنے لگتی......میں ہرگز، ہرگز اس قابل نہیں ہوں......ہونا بھی نہیں چاہتی......آگے بڑھ کر جستجو کرنا نہیں چاہتی......امید......انتظار......وعدہ......یہ سب بہت جان لیوا ہوتا ہے۔

مگر مرتی کیا نہ کرتی......وہ کچھ اس شوق سے مجھے دیکھتے ہی میری طرف قدم بڑھاتا کہ میں چاہ کر بھی اس کو مایوس نہیں کرپاتی......کبھی سوچتی کیا فرق پڑتا ہے، میں پل پر سے گزر جایا کروں......رکنے اور رک کر اس سے ملنے کے بجائے آگے بڑھ جایا کروں......عجیب انسان تھا خود تو وقت کے ساتھ چل نہیں پا رہا تھا اور مجھے اپنے ساتھ گھسیٹنے پر بضد تھا......اور میں، میں تو کبھی اپنے پیروں کے نیچے کی زمین کو سنبھال نہ سکی......اس کے قدم سے کیا قدم ملاتی......اکثر قدم بڑھاتی تو ڈر کر واپس لے لیتی کہ کہیں آگے بڑھنے والا قدم زمین پر پڑنے کے بجائے کسی ان دیکھی کھائی کسی اندھیرے خلا میں نہ جا پڑے......میری اپنی ذات اس قدر ڈگمگائی ہوئی تھی ایسے میں بھلا میں کسی کے ساتھ کیسے چل سکتی تھی۔

ایک دو بار اس کی چھوٹی بہن جو اس کی جگہ اپنے گھر والوں کی کفیل تھی اس کے ساتھ آئی تھی اور مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ صرف مجھ سے ملانے ہی اسے لے کر آیا تھا......اب میں اس کو کس طرح سمجھاتی کہ ہم جیسوں کے ایک نہیں ہزار مسئلے ہوتے ہیں جن میں سے ایک یہ کہ جب کوئی نظر انداز کر دے تو تکلیف ہوتی ہے اور اگر کوئی نظروں میں رکھنے لگے تو اور زیادہ تکلیف ہو جاتی ہے......اپنی کم مائیگی، نااہلی اور ناکامی کا احساس بڑھ جاتا ہے......پھر بھی میں نے بہت کوششوں سے اس کو بہت کچھ بتانے سمجھانے کی کوشش کی تھی......خود پر پڑتی اس کی امید اور خوشی بھری نظروں سے بچنے کے لیے میں نے اسے اپنی چیدہ، چیدہ برائیاں بتادی تھیں ’’میں طلاق یافتہ ہوں......ماں، باپ نہیں ہیں، بھائی، بہن ملک سے باہر ہیں......اپنے اکلوتے ماموں کے خاندان میں بس رہنے کے بجائے میں اس معاشرے میں بھی اکیلی رہتی ہوں، نوکری کرتی ہوں، اپنے بھائیوں کی ایک نہیں سنتی......اپنی بہنوں کے مشوروں پر عمل نہیں کرتی اور

سب سے بڑھ کر ماموں جان کے کہنے پر ان کے بیٹے سے شادی نہیں کرتی...... سمجھ لو میں ایک ہٹ دھرم ضدی انسان ہوں...... جس سے کوئی بھی خوش نہیں ہے...... نہ ہی میں لوگوں کو خوش کرنے کی کوئی صلاحیت ہی رکھتی ہوں...... میں بس بہت ہی خراب دکھ دینے والی اور خود غرض انسان ہوں...... اسی لیے میں یہاں اس پل پر پرندوں کو کھانا کھلانے کے لیے آٹے کی گولیاں بھی نہیں خریدتی...... مجھے ڈر ہے کہ میری خود غرضی کہیں میرے ہاتھوں سے آٹے میں منتقل ہو کر ان پرندوں کو نہ لگ جائے...... یہ بھی میری طرح خود غرض ہو جائیں تو پھر رزق حاصل کرنے پر دعائیں نہ دیں یہ تو پھر بڑا نقصان ہو جائے گا......" کبھی وہ میری باتوں پر سر ہلاتا کبھی ہنس پڑتا...... کبھی دلاسا دینے لگتا۔

"ایسا ہے کہ جب تک ہم لوگوں کے ہاتھوں بے وقوف نہیں بنتے لوگ ہمیں اچھے، صابر اور خوش اخلاق کی سند نہیں دیتے...... وہ چاہتے ہیں کہ ہم صرف ان کی باتوں پر عمل کریں...... ان کی ہاں میں ہاں ملاتے جائیں...... تب ہی ہم عقلمند ہیں، دانا اور سمجھدار ہیں...... جو تمہارا دل کرتا ہے وہ کرو...... باقی سب کو کہنے دو جو کہتے ہیں۔"

میں اس کی بات سن کر خاموش ہو جاتی، نہیں چاہتی تھی کہ وہ میری حمایت میں کچھ کہے، میں چاہتی تھی کہ وہ بھی مجھے باقی دوستوں، رشتے داروں اور ملنے جلنے والوں کی طرح مشورہ دے کہ میں ماموں جان کی مان لوں...... یا پھر میرے بھائی، بہنوں کی طرح آئینہ دکھائے آخر مجھے خود پر مان کیوں ہے...... یہ مغروریت کس بات پر ہے...... میرے پاس ہے ہی کیا......؟ مگر کیا کرتی کہ ماموں جان کے اس بیٹے نے جس طرح اپنی پہلی بیوی کو دو سال میں ہی بچہ نہ ہونے پر مار بھگایا تھا مجھے اس سے شدید قسم کی الجھن ہونے لگی تھی...... کیا عورت صرف اسی لیے بیاہی جاتی ہے؟

بہر حال وہ ایک سلجھا ہوا اور تمیز دار دوست ثابت ہوا، مجھے کئی سالوں بعد اپنے پیروں کے نیچے مضبوط، واضح اور ٹھوس زمین کا احساس ہونے لگا تھا...... دل چاہنے لگا تھا کہ میں بھی سرشار ہو کر...... بے خیالی اور مسرت کے ساتھ قدم بڑھاؤں...... مجھے اپنے بڑھتے قدموں پر اعتماد سا محسوس ہونے لگا تھا...... رستے کھلے لگنے لگے تھے اور ابھی سمت کا تعین ہی ہو رہا تھا کہ اس نے میرے پیروں سے زمین کھینچ لی۔

"میں امریکا جا رہا ہوں۔" اس نے بلا تمہید مجھے بتایا بلکہ جیسے اس نے اعلان کیا...... میں گڑبڑا گئی...... اب کیا کہوں...... مبارک باد دوں...... روک لوں...... یا کسی قسم کا کوئی ردِعمل نہ دکھاؤں...... پھر اچانک مجھے غصہ آنے لگا...... ہونہہ جاتا ہے تو جائے......

"تم کچھ کہو گی نہیں؟"

اس نے میرے پلٹنے پر اچانک پوچھا...... وہ یقیناً مجھ سے کچھ سننا چاہتا تھا مگر میں سمجھ نہیں سکی، اس دن ہم خاموشی سے سمندر تکتے رہے اور میں سانس بحال کر کے آگے بڑھ گئی...... مجھے افسوس ہوا اور خود پر حیرت بھی کہ میں نے انجانے میں اس سے امیدیں لگائی تھیں اور امید صرف یہی تھی کہ وہ مجھے اپنے اس طرح کے کسی بڑے قدم اٹھانے سے پہلے شاملِ حال ضرور کرے گا...... ایسا تو نہیں کہ ایک ہی دن میں اس نے امریکا جانے کا فیصلہ کر لیا ہو گا...... کئی ہفتوں بلکہ مہینوں سے وہ اس پر کام کر رہا ہو گا...... پاسپورٹ...... نوکری...... ویزا...... مگر اس نے مجھے عین وقت پر آ کر بتایا جیسے میں بس اعلان سننے کو یہاں بیٹھی تھی...... چند دنوں میں پل پر رک نہ سکی...... بلکہ میں نے اپنا رستہ بھی بدلنے کی کوششیں شروع کر دیں...... اتفاق سے باقی سارے راستے یا تو بہت لمبے تھے یا پھر ان میں اس راستے سے زیادہ ٹریفک ہوتا...... آخرکار ایک دن میں اتر ہی گئی اور حیران ہوئی کہ اس کی جگہ اس کی چھوٹی بہن ٹہلتی ملی...... مجھے دیکھتے کے ساتھ ہی میری طرف لپکی۔

"آپ اتنے دنوں سے کیوں نہیں آ رہی تھیں...... میں تو کافی دنوں سے یہاں آ رہی ہوں...... آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے شاید......؟"

اس نے ایک ساتھ کئی باتیں کر ڈالیں...... میں نے اتنے دنوں خود پر غور نہیں کیا تھا کہ اتنے دنوں میں مجھ پر کیا کچھ گزر گئی تھی...... میں ضبط کی حالت میں تھی اور ایسے میں انسان کا چہرہ یکسر بدل جاتا ہے...... میں نے مسکرا کر بات ٹالنی چاہی۔

"آپ جانتی ہیں بھائی اتنا پڑھے لکھے نہیں ہیں، کوئی بہت اعلیٰ نوکری تو نہیں ملے گی انہیں، کسی پٹرول پمپ پر یا کسی اسٹور میں سیلز مین لگ جائیں گے زیادہ سے زیادہ کسی آفس کے چپراسی...... کسی پیزا ہال کے ویٹر...... پھر کیا ضرورت ہے جانے کی...... یہاں رہ کر ہی کچھ کر لیں...... امی، ابو بھی نہیں چاہتے کہ وہ ہم سے اتنی دور

جائیں، ہم تو کوشش کر ہی چکے ہیں۔ آپ انہیں روکتی کیوں نہیں؟" اس کی چھوٹی بہن اسی کی طرح باتیں تو بالکل ٹھیک، ٹھیک ہی کر رہی تھی مگر یہ آخری بات اس نے کچھ عجیب سی کہہ دی تھی شاید غلطی سے منہ سے نکل گئی ہو گی۔

"اب کچھ جواب بھی دیں کب سے بول رہی ہوں؟ اپنی حالت دیکھی آپ نے...... اتنا دکھ ہے تو بھائی کو جانے سے روکتی کیوں نہیں؟ آپ کو معلوم نہیں شاید مگر مجھے یقین ہے آپ کہیں گی تو بھائی نہیں جائیں گے...... میں ضرور بتاؤں گی ان کو آپ کے بارے میں...... آپ دونوں نے تو ایک دوسرے سے چپ کی قسم کھا رکھی ہے مگر میں آزاد ہوں ناں......"

میں اسے کیا کہتی اور پھر وہ میرے بارے میں اپنے بھائی کو بھلا کیا بتانا چاہتی ہے؟ میں ایک ہاری ہوئی انسان ہوں، اس کا بھائی پہلے سے ہی جانتا ہے...... ایک منجمد رکا ہوا انسان کسی دوسرے پر آگے بڑھنے کی روک کیسے لگا سکتا ہے...... لگانی بھی نہیں چاہیے...... اس کا بھائی میری طرح ہار ماننے والا نہیں تھا...... اور میرے خیال میں اسے ہار ماننی بھی نہیں چاہیے کہ "جتے رہنے دو...... کبھی نہ کبھی کسی ریس میں تو یہ گھوڑا ابھی جیت جائے گا......" اس کی بہن چند ایک اور باتیں کر کے چلی گئی اور میں بھی اپنی راہ پر آ گئی...... اب مجھے اس کا انتظار تھا، اتنا تو میرا حق تھا کہ وہ جانے سے پہلے مجھ سے مل کر جاتا...... شاید ہفتے ڈیڑھ ہفتے میں اس کو فرصت مل جائے...... مگر حیرت انگیز طور پر وہ اپنی چھوٹی بہن کے مجھ سے ملنے کے دوسرے ہی روز وارد ہو گیا...... مجھے بغور دیکھا، میرا جائزہ لیا...... وہ جذبات میں میرے گاڑی سے اترتے ہی مجھ سے آن ملا...... کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر خاموشی سے میرے ساتھ جنگلے کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"کچھ لوگ ہماری کوششوں کے لائق ہوتے ہیں اور ان کو پانے کے لیے ایک دو بار ہمت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے...... کچھ لوگ ہمارے اعتراف کے قابل ہوتے ہیں، ہمارے اعتبار کو سنبھالنا جانتے ہیں...... ایک بار ان پر بھروسا کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔" اس نے ہلکے سے کہا۔

"یہ دیو قامت پل، دھیما سمندر اور نارنجی ہوتا ہوا یہ سست سورج یقیناً امریکا میں بھی ہو گا......" میں نے سمندر پر نظریں جمائے آخرکار بات بدلنے کو کہا۔

"ہوتا تو ہو گا مگر...... مگر اپنا نہیں ہو گا...... صرف یہی نہیں اور بھی بہت سے اپنے نہیں ہوں گے۔" اس نے میری کوشش پر پانی پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر قدم سے قدم ملانا...... وقت کی رفتار سے بھاگنا تمہاری مجبوری بھی تو ہے۔" میں نے کہا تو اس سے تھا مگر دلاسا خود کو دیا تھا۔

"ہاں درست کہتی ہو مگر وقت کے ساتھ بھاگنے اور اپنوں سے دور بھاگنے میں کافی فرق ہوتا ہے۔" اب یہاں تک آ کر میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ مجھ سے کیا سننا چاہتا ہے...... اے کاش وہ مجھے خود ہی بتا دے کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے...... بس اب ضبط کی انتہا ہو گئی تھی...... پھر وہ بول پڑا۔

"میں یہیں رہ کر بھی...... مگر وقت لگ سکتا ہے...... کیا تم میرا انتظار کر سکو گی؟" اس نے ادھوری بات کی۔ اس کے ادھورے نامکمل جملے مجھے سمجھ آ گئے تھے...... میں نے سمندر کی خنک اور نمکین فضا میں گہری سانس بھری...... تو وقتِ اعتراف آخرکار پہنچ ہی گیا اب آر یا پار جو ہو سو ہو۔

"تم نے کبھی مجھے جلدی میں دیکھا؟ میں تو ہمیشہ کی منجمد...... رکی ہوئی انسان ہوں...... وقت مجھے چھو کر گزر جاتا ہے بس...... میں شاید صدیوں بعد بھی یہیں کہیں ملوں گی۔"

اس کے بعد ہم دونوں میں کوئی بات نہ ہو سکی کیونکہ وہ پھر سے آٹے کی گولیاں پرندوں کو کھلانے کے لیے خریدنے لگا تھا۔

اس کے بعد کے چند ہفتوں وہی روز کا معمول...... پہلے میں پہنچتی پھر وہ ہاتھ میں خاکی فائل لیے اچانک وارد ہوتا...... کبھی ٹہل، ٹہل کر پرندوں کو کھانا کھلاتا...... دعائیں مانگتا...... کبھی مجھ سے دو، چار بات چیت بھی کر لیتا اور میرے جانے تک موجود رہتا...... ایک دن میں نے اسے انٹرویو میں کامیابی کی دعائیں مانگتے سنا اور پھر اس کے چند دنوں بعد وہ پھر سے غائب ہو گیا...... میرے دل کو کچھ اطمینان ہوا...... شاید کہیں چھپی ہوئی تھوڑی بہت خوشی بھی محسوس ہوئی...... اب میں نے اپنے معمول سے پہلی بار ہٹ کر پرندوں کا کھانا خریدنا شروع کر دیا تھا۔ جب میں مٹھیوں میں بھر کر آٹے کی گولیاں آسمان پر اچھال رہی ہوتی تو میں یکسر بھول جاتی کہ میں ایک خراب، دکھ دینے والی خود غرض انسان ہوں...... میں بھی نیٹی جیٹی پل پر آنے والے تمام دوسرے انسانوں کی طرح تھی۔ جستجو، انتظار اور کسی کے مجھ سے کیے گئے وعدے کے وفا ہونے کی بہت ساری امیدیں لیے...... میں خاموش سمندر میں جانے سے واقعی بچالی گئی تھی۔

وہ محبت تھی

انعم زریں



مضبوط کسرتی جسم پر دھوپ کی تمازت سے سرخ ہوتی رنگت، ماتھے پر آئے سیاہ گھنے چمکدار بال، بلیو جینز اور وائٹ شرٹ پہنے، کہنی تک فولڈ کی گئی آستینیں......ایک ہاتھ میں مہنگا ترین سیل فون پکڑے، دوسرے ہاتھ میں پھول تھامے وہ منتظر نگاہوں سے اسی طرف ہی دیکھ رہا تھا جہاں سے عُلِ ہما کی آمد متوقع تھی۔ اس کی امارت کا پتا سر سے پاؤں تک ہر چیز کے برانڈڈ ہونے سے چلتا تھا پر روز وہ اسے نظرانداز کر

کے گزر جاتی تھی۔ آج بھی عُلِ ہما نے اسی راستے سے گزرنا تھا۔ یہ سلسلہ کافی دنوں سے چل رہا تھا۔ عُلِ ہما ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتی، وہ ان اسٹوڈنٹس میں سے تھی جو سمجھتے ہیں کہ وہ یونیورسٹی پڑھنے جاتے ہیں ناں کہ دوستیاں کرنے اور وقت ضائع کرنے۔ وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا ایڈمشن اسکالرشپ ..... پر ہوا تھا۔ پروفیسرز کی نظروں میں وہ ایک برائٹ اسٹوڈنٹ تھی۔ شاید اسی طرح وہ عائش کی نظروں میں بھی آ گئی تھی۔ عُلِ ہما کو اپنے کلاس فیلوز تک کے متعلق کوئی آگاہی نہ تھی۔ یہ بھی کافی دنوں کے بعد جا کر معلوم ہوا تھا کہ عائش اس کا کلاس فیلو ہے، اس کا لیا دیا رویہ دیکھ کر کوئی بھی لڑکا آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کرتا......نہ جانے عائش کے دل میں کیا آن سمائی تھی، وہ کس مٹی کا بنا تھا کہ یونیورسٹی سے ذرا فاصلے پر اس کے راستے میں روز صبح پھول لیے کھڑا ہوتا۔ پھول، عُلِ ہما کی کمزوری تھے، نہ جانے یہ بات اسے کیسے معلوم ہوئی تھی۔ وہ کبھی زبان سے کچھ نہ کہتا، کبھی اس نے یونیورسٹی میں عُلِ ہما سے بات کرنے کی کوشش تک نہیں کی تھی۔ بس دور سے دیکھتا اور معمول کے مطابق روز اسی خاص جگہ پر پھول لیے منتظر کھڑا رہتا۔ اتنے دنوں میں اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ عائش ایک ذہین طالب علم ہے اور کبھی اس نے کسی لڑکی سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کی تھی۔ اس جیسے ڈیسنٹ بندے کا عُلِ ہما کے لیے یوں تھرڈ کلاس ناکام عاشقوں کی طرح پھول لیے کھڑے ہونا اور اس کے مثبت ردِعمل کا انتظار کرنا عُلِ ہما کے لیے خاصی اچنبھے کی بات تھی۔

☆☆☆

اور آج پھر اسے دور سے ہی ہاتھ میں پھول تھامے کھڑا عائش محوِ انتظار نظر آیا تھا۔ غیرارادی طور پر وہ پچھلے چند دنوں سے اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ اپنے لیے کسی کے چاہے جانے کا احساس بندے کو ایک عجیب سے فخر و غرور میں مبتلا کر دیتا ہے۔ دل کی بدلتی کیفیت پر وہ خود حیران تھی۔ ان دونوں کے درمیان تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔ جب عُلِ ہما کے قدموں کی رفتار کچھ زیادہ ہی آہستہ ہو گئی تھی۔

”یہ اپالو کا چلتا پھرتا مجسمہ، سیرت و صورت میں یکتا، وجاہت کا عالیشان پیکر، کردار میں صاف و شفاف اسے کیا کمی ہے لڑکیوں کی؟ یہ کیوں میرے ایک اشارے کا منتظر ہے؟ چاہے کوئی سا بھی موسم ہو۔ یہ روز پابندی سے میرے پلٹ کر دیکھنے کا انتظار کرتا ہے۔ یہ کیا انداز ہے، اسے میں کیا نام دوں......کیا اس کا اس طرح میری راہ میں پھول بچھانا کسی جذبۂ خالص کا اظہار ہے......“ وہ اپنی کیفیت سمجھ نہ پائی۔ اس روز وہ دل ہی دل میں جمع تفریق کرتی عائش کے قریب پہنچ چکی تھی۔ نظر اٹھا کر پہلی بار اس نے عائش کی سمت براہِ راست دیکھا تھا۔ عائش کی نظریں ہمیشہ کی طرح جھکی ہوئی تھیں۔ نظر ہاتھ میں تھامے نازک پھولوں پر پڑی۔

”یہ جانتا ہے مجھے پھول پسند ہیں جب میری پسند کا اتنا احترام کرتا ہے تو میرا کتنا کرتا ہوگا۔ اب تک اس نے مجھ سے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ کوئی عامیانہ بات نہیں کی اس کا یہ عمل......کیا میں اب بھی اس کی خواہش کا احترام نہ کروں؟“ فیصلہ ابھی نہ ہوا تھا وہ تذبذب کا شکار تھی آخرکار وہ عائش کو پھر سے نظرانداز کر کے آگے بڑھ گئی۔

”کیا وہ مجھے حسرت سے نہیں دیکھ رہا ہوگا؟ میں روز اس کے دل پر پاؤں رکھ کر آگے بڑھ جاتی ہوں، کیا مجھے حق ہے کہ اس کی منتظر نگاہوں کو اور ترساؤں؟ آخر یہ کہتا کیوں نہیں، یہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔“ اس کے دل نے فریاد کی۔ ”ایک بار تو پلٹ کر دیکھ لو، وہ کب سے تمہاری اِک نگاہِ التفات کا منتظر ہے۔“ عُلِ ہما نے دل کی آواز پر کان نہ دھرا......اور آگے بڑھ گئی۔ اب دونوں کے درمیان قدم بہ قدم فاصلہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

”کیا میں رک جاؤں......؟ پلٹ کر دیکھوں......؟ شاید وہ میرے پلٹنے کا ابھی منتظر ہوگا......؟ ہاں وہ تب تک وہیں کھڑا رہے گا جب تک میں اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو جاتی۔“

نیت کا پھل

☆ بہترین لوگ بہترین نیت رکھتے ہیں جس کی وجہ سے رب ان کے تمام کاموں کو سنوار دیتا ہے اور جس کام کو رب سنوار دے اسے کوئی بندہ کیسے بگاڑ سکتا ہے۔

☆ دولت اور عہدے انسان کو عارضی طور پر بڑا کرتے ہیں جبکہ...... انسانیت اور اچھا اخلاق انسان کو ہمیشہ بلند درجے پر رکھتے ہیں۔

☆ مخلوق کی بھلائی کے لیے اختیار کی گئی خسارہ جوئی اللہ کے عظیم انعامات کا مستحق ٹھہراتی ہے۔

☆ اچھے انسان کی تعریف کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ کسی کو تکلیف نہیں دیتا اور نہ ہی کسی کا برا چاہتا ہے۔

از: صبا نور لیہ

ظلِ ہما کے قدم رک گئے تھے، دل و دماغ کی جنگ میں بالآخر جیت دل کی ہوئی تھی۔

”مجھے اس کی محبت کو اور آزمانا نہیں چاہیے۔ مجھے پلٹ کر اس کی محبت کا امتحان ختم کر دینا چاہیے۔ ہاں میں پلٹ کر دیکھوں گی۔ میں اس کے اس جذبے کی پزیرائی ضرور کروں گی...... ہاں۔“ فیصلہ ہو چکا تھا۔ ظلِ ہما نے بالآخر پلٹ کر دیکھا اور پتھر کی ہو گئی۔

کاش اے کاش کہ وہ پلٹ کر نہ دیکھتی...... اتنے دنوں سے وہ جس فیصلے پر قائم تھی وہ ہی ٹھیک تھا۔ شدت ذلت اور اک خوف سے ظلِ ہما کے وجود پر کپکپی طاری سی ہو گئی تھی۔ وہاں وہ کھڑا ضرور تھا اور اس کے ہاتھ میں وہی نازک پھول بھی تھے لیکن اب وہ اپنی...... ناقدری پر رو رہے تھے کہ عین اسی وقت وہ انہیں نیچے پھینک رہا تھا اور اپنے برانڈڈ جوتوں کی نوک سے مسلسل رہا تھا۔ اسے لگا ان نازک پھولوں کی جگہ ظلِ ہما کا نازک وجود ہے جسے اس نے پہلے عزت و احترام سے نوازا ہی اسی لیے تھا کہ بعد میں اپنے ہاتھوں سے اپنے جوتوں کے نیچے روندے۔ اپنی بے حرمتی دیکھ کر وہ خود کی نظروں میں ہی گر گئی تھی۔ یہ تھا ابنِ آدم کا بنت حوا سے خود کو نظر انداز کرنے کا انتقام...... وہ یہ کیوں بھول گئی تھی کہ احترام نسوانیت خود اسے ہی چاہیے تھا۔ وہ بھی تو اسی حوا کی بیٹی تھی۔ وہ جو چاہے جانے کے جذبے کے تحت غرور کی اونچائی کو چھونے جا رہی تھی۔ اسے زمین پر لانے کے لیے خدا نے اسے آئینہ ضرور دکھانا تھا۔ وہ ہمیشہ اللہ کی بنائی ہوئی حدود کے اندر ہی رہی تھی۔ آج اس نے وہ حد تجاوز کرنے کا سوچا ہی تھا تو کیسے قدم روک دیے گئے تھے۔ سچ ہے کہ وہ دلوں کا حال جانتا ہے، وہ شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ دھندلی آنکھوں کو رگڑ کر صاف کیا، منظر واضح ہوا۔

عائش اب پلٹ کر واپس جا رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی ظلِ ہما کی طرف نہ دیکھا تھا۔ وہ روز اس کے جانے کے بعد پھولوں کے ساتھ یہی سلوک کرتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے پھینکے ہوئے دانے پر چڑیا تقریباً پھنس ہی چکی تھی۔ وہ بے خبر تھا کہ ظلِ ہما نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ رب تعالیٰ کی شکر گزار تھی۔ جس نے اس کا بھرم رکھ لیا تھا۔ اگر وہ آج عائش کے پاس رک جاتی تو؟ اگر عائش اسے پلٹتا دیکھ لیتا تو وہ اس کے اندر چھپا ابلیس کیسے دیکھ پاتی...... محبت یوں سرِ عام رولنے والی شے نہیں ہوتی۔ یہ تحفۂ خداوندی ہے جو کسی، کسی کو نصیب ہوتا ہے اس کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا ہاں اس کو عزت دے کر اس کا کچھ نہ کچھ حق ضرور ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس بار ظلِ ہما کے اٹھتے قدم پہلے سے زیادہ مضبوط تھے کہ اس بار اسے اس کریم ذات کے ساتھ ہونے کا پختہ یقین تھا جو کبھی اسے رسوا نہیں ہونے دے گا لیکن شاید تھوڑا سا خفا ضرور ہو گیا تھا، اسے اپنے رب سے معافی مانگنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اسے اس عظیم ہستی کو راضی کرنا تھا۔ بس ندامت کے سچے آنسو گرانے تھے اور سچے دل سے توبہ کرنی تھی اور رحمان نے معاف کر دینا تھا۔ اس رحیم کا نام لیتے ہی اس نے اس پر مہربانیوں اور رحمت کی بارشیں برسانا شروع کر دی تھیں۔



فصلِ بہار کے آتے آتے

قانتہ رابعہ

پہلے ہاسٹل اور میکے میں اور پھر سسرال میں اپنا سلیقہ اور طریقہ دکھانے اور دھاک جمانے میں زندگی گزر گئی۔ خیر اس میں شک تو نہیں کہ وہ واقعی سلیقہ مند خاتون تھیں اور ان کے ماں، باپ کو چاہیے تھا کہ ساجرہ بتول سے نام بدل کر سلیقہ بیگم رکھ دیتے تو کوئی حرج نہیں تھا۔ اور یہ سلیقہ صرف سلائی، کڑھائی یا صفائی ستھرائی میں ہی نہیں کھانے پکانے تک میں تھا۔ ری سائیکلنگ کا مفہوم ہی اُن کے گھر داخل ہو کے سمجھ

آیا.....ایک سادہ سی سفید، سبز رنگ کی کولڈ ڈرنک کی بوتل ان کے سلیقے کی بدولت کئی شاہکار تخلیق پانے کا باعث ہوتی.....اوپر والا حصہ بوتلوں میں پانی بھرنے کے لیے کیف کے طور پر اور نیچے والا حصہ خوب صورت ملٹی کلر فینسی کپڑے کے ٹکڑے یا چمکیلے رنگیلے کاغذ کی بدولت ایک ڈیکوریشن پیس بنا ہوا ملتا۔ جس میں از قسم سوئیاں، دھاگے کی نلکیوں سے بچیوں کی پونیاں، صابنوں کے بچے ٹکڑے تک پائے جاتے.....بات کھانے پکانے کی ہو تو ان سے بڑھ کے کوئی مثال ان کا دشمن بھی نہیں دے سکتا تھا۔ ایک دو بوٹی کی ضرورت ہو تو وہ پاؤ ایک گوشت منگوانے کے بجائے دو کلو گوشت منگواتی تھیں.....ارے، رے.....آپ کہیں گے یہ تو بدسلیقگی ہے.....ٹھہریے جناب! سن تو لیں..... ایک دو بوٹی گوشت منگوانے میں دکاندار تولہ ماشہ وزن میں ڈنڈی مار سکتا ہے جبکہ دو اڑھائی کلو گوشت منگوانے کی صورت میں اس کی بدولت چودہ، پندرہ.....یا کم از کم بارہ، تیرہ ڈشز اور پکوان بن سکتے تھے۔

کیسے.....؟ آیئے ان کے کچن میں چلتے ہیں۔

اس گوشت میں سے بون لیس الگ کیا جو دس بارہ کوفتوں، کباب اور کٹلس کے کام آسکتا ہے.....اور اگر سارا گوشت بون لیس ہے تو اس کی ہانڈی، پسندے اور اسٹرپس تو ہر کوئی بنالیتا ہے مگر ساحرہ بتول کی طرح دو چار بوٹیوں میں مٹھی بھر چنے کی دال اور دو آلو ڈال کے چکن کباب کے علاوہ چکن رول بنانے کا کام تو ہر کوئی نہیں کرسکتا ناں.....

چکن کی صورت میں گردن کی ہڈیاں یخنی بنانے کے کام آتیں۔ چاول تو یخنی سے ہر کوئی بنا سکتا ہے مگر ایک کپ یخنی بچا کے وہ بالعموم اگلے وقت کی دال سبزی میں ڈالنے کے لیے رکھ لیتیں.....ہوتی تو ایک کپ یخنی تھی مگر کھانے والا یہ سوال کرتا پایا جاتا.....''آپ کے ہاتھ میں اتنی لذت کیسے ہے؟'' کچھ گوشت شوربے کے سالن کے لیے اور کچھ آنے والے وقت کے لیے فریز کر دیتیں۔

اب ہے کوئی عورت جو گوشت کے ایک پیکٹ سے ڈھیروں پکوان تیار کرسکے؟ یہی نہیں دال چاول عموماً بدھ کو بناتیں.....چاول مٹھی بھر بھی بچ گئے تو۔ نو ٹینشن.....دودھ میں ڈال کر کھیر بنالو۔ پسی سیاہ مرچ اور زیرہ ڈال کر تھوڑا سا پکالو اور بڑیاں بنا کر خشک کرلو.....وگرنہ اس ملغوبے کو شیکر میں ڈال کر شیک کیا.....چادر پر ڈال کر دھوپ میں سکھایا اور تیز چھری کی مدد سے کاٹ کر بچوں کے لیے پاپڑ تیار.....دال بچ گئی تو دال والی روٹی کے علاوہ دس نمکین چیزیں تیار کرنے کا فن آتا تھا..... یہ بات نہیں تھی کہ اس کی یہ عادات لوگوں کو پسند نہیں تھیں بلکہ لوگ باگ تو سراہتے تھے.....بہو، بیٹیوں کو مثال دیتے تھے.....ان مثالوں نے نفس کو پھلا پھلا کے غبارہ بنادیا..... اب اس کا ہدف بیٹیاں تھیں.....سائرہ بتول اور طاہرہ بتول.....بیچاری آنکھ کھول کر دنیا کو دیکھنے بھی نہ پائی تھیں کہ ماں کے سلیقے کا شکار ہوگئیں..... سوئی میں دھاگا بھی ڈالتیں تو دو سوا دو سال کی طاہرہ بتول کو آواز دے کر پاس بلاتیں۔

''طاہرہ بچے اِدھر آؤ.....''

''جی امی.....'' بچی طاہرہ پاس آ کے مؤدب ہو کر بیٹھ جاتی۔

''دیکھ بچے یوں سوئی میں دھاگا ڈالتے ہیں.....'' وہ لمبے سے دھاگے کے سرے کو منہ میں ڈال کر اپنے تئیں مزید باریک کر کے سوراخ میں ڈالتیں۔

اگر پیاز کاٹنے بیٹھتیں تو دونوں معصوم پریوں کو مخاطب کرتیں اور چھری کی تیز نوک سے پیاز کی جڑ کو گولائی کے رخ میں باہر نکال کے کہتیں۔

''دیکھ بچے پیاز کا چھلکا اتارنے سے پہلے اسے باہر نکالتے ہیں۔'' کپڑوں کی تہ لگاتیں تو کھیلتی کودتی بچیوں کو پاس بلایا جاتا۔

''دیکھ بچے پہلے بازو والا حصہ تہ لگاتے ہیں۔''

وغیرہ، وغیرہ.....

انہی کھیلتی کودتی ہنستی مسکراتی بچیوں کو سلیقہ سکھاتے، سکھاتے سولھواں اور پھر سترھواں سن لگ گیا۔ ایف اے بھی بہ مشکل مکمل کیا تھا کہ کئی رشتے

آگے پیچھے ہی آگئے.....نند وئی کا بھانجا مقامی کالج میں لیکچرار تھا.....بہن، نہ بھائی صاحب جائداد بھی تھا.....قرعۂ فال اسی کے نام نکلا اور یوں سائرہ بتول ماں سے سلیقے، طریقے، قرینے کی تربیت لے کر اپنے میاں، انجم شہزاد کے ساتھ دوسرے شہر روانہ ہوگئی.....سسرال میں ساس اور سسر کے علاوہ اس کی .....مرحومہ نند کی بیٹی بھی مقیم تھی۔ اچھی شستہ طور طریقوں والی سسرال تھی.....گھر اخوب قیمتی سامان سے سجا ہوا تھا..... ہر، ہر چیز سے صاحب مکان کے عمدہ ذوق کی نشاندہی ہو رہی تھی۔ کتابوں کے ریک میں ڈھیروں کتب اور رسالے سجے ہوئے تھے۔ سائرہ بتول کو کتابوں اور رسالوں سے خاص شغف نہیں تھا.....اگر نصابی کتب کے علاوہ کتب کی جھلک دیکھنے کی توفیق ہوئی بھی تو کھانے پکانے کی ترکیبوں اور گھر کو سجایئے جیسی کتب ہی تھیں۔

خیر.....سائرہ بتول کی آؤ بھگت بڑے اچھے طریقے سے ہوئی، میاں بھی دھیمے لہجے میں بات کرنے ہنسنے ہنسانے کی فطرت رکھتا تھا.....باہمی تعارف مشاغل دلچسپیوں کے بارے میں بھی اس نے بڑے سبھاؤ سے بات کی مگر ابتدائی دو چار فقروں میں ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ ان تلوں میں تیل نہیں.....مطلب شوق مشاغل کچھ نہیں، بہت حد تک فرق ہیں اور رشتہ طے اوپر ہوا تھا، سبب اسباب ماں باپ بنے ہیں مگر نبھانا انہیں ہی پڑے گا۔

دستک کی آواز سے صبح کا آغاز ہوا.....نند کی بیٹی تازہ، تازہ موتیا کی کلیوں کا ہار بنا کے لائی تھی۔

''السلام علیکم اور صبح بخیر مامی جان.....'' نند کی بیٹی میرا نے اسے سلام کیا اور گلے سے لگا لیا۔ عمر میں بس دو ایک سال ہی چھوٹی تھی وہ مامی سے۔

''وعلیکم السلام.....واہ موتیے کا ہار، کیا اچھی خوشبو

ہے مگر میں موتیے کی کلیوں سے کانوں کے آویزے بناتی ہوں بہت پسند ہیں مجھے......'' اس نے کہا۔

''اچھا...... بہت خوب، میں آپ سے ضرور سیکھوں گی...... ناشتا میں کیا لیں گی؟'' بڑے مؤدب لہجے میں اس نے پوچھا۔

''کیوں، ناشتا تو ہمارے ہاں سے نہیں آئے گا؟'' حیرانی سے سائرہ بتول نے پوچھا تو اس کی آواز کچھ بلند ہوگئی تھی۔

''مامی جان میرا خیال ہے نانا ابا نے منع کردیا تھا کہ ایک شہر سے دوسرے شہر ناشتا لے کر جانے کی کیا تُک بنتی ہے، ویسے بھی دلہن والے تو فنکشن بھگتا کے فارغ ہوئے ہوتے ہیں نئے سرے سے انہیں تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے؟'' نرمی سے سمیرا نے وضاحت کی۔

''یہ تو آپ کا خیال ہے مگر مجھے تو لگتا ہے شادی بیاہ میں سارا حسن ہی ان رسموں کا ہوتا ہے۔ امی تو بتارہی تھیں کہ کل چنے انہوں نے بھگو بھی دیے تھے۔ اس ناشتے کے لیے، پائے تک منگوا لیے تھے۔'' سائرہ بتول نے تھوڑی سی جرح کی۔

''مجھے تو ان باتوں کا نہیں علم...... آپ خود ان سے ہی پوچھ لیجیے فی الحال یہ بتائیں کہ اس وقت ناشتے میں کیا پسند کریں گی......'' سمیرا کا لہجہ کچھ بجھا سا تھا۔

''اس وقت......؟ جو آپ لوگ ناشتے میں لیتے ہیں وہی لے آیئے......'' اپنی طرف سے سائرہ بتول نے بھی باادب ہونے میں کسر نہ چھوڑی۔

''ٹھیک ہے آپ فریش ہوجائیں، میں ناشتا لے کر آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئی اور ایک سیکنڈ کے بعد واش روم کا دروازہ کھلا اور محسن ندیم...... سائرہ بتول کا نصف بہتر برآمد ہوا...... اس کے چہرے پر غیر محسوس سی شکنیں تھیں۔

''آواز آرہی تھی ابھی کسی کی یہاں......؟'' صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''سمیرا تھی، آپ کی بھانجی......'' سائرہ نے کہا۔

''کیا کہہ رہی تھی سوہی، ابا تو خیریت سے ہیں ناں......؟'' کچھ فکرمندی سے محسن نے سوال کیا۔

''ابا، اماں کا تو میں نے نہیں پوچھا، ناشتے کا پوچھنے آئی تھی وہ۔'' سائرہ بتول نے وضاحت کی۔

''اچھا، اچھا...... مجھے تو واقعی ناشتے کا سنتے ہی بھوک محسوس ہورہی ہے۔ میں پتا کرکے آتا ہوں بازار سے کچھ منگوانے والا آئٹم تو نہیں...... ابا تو ویسے ہی معذور اور بیمار ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے باہر چلا گیا اور سائرہ بتول چیزوں کا پھیلاوا سمیٹنے لگی۔

چند منٹوں کے بعد محسن اندر آیا تو سائرہ ابھی تک چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ جوتے وغیرہ ڈبوں میں بند کر کے ایک طرف رکھ دیے تھے، سیج کے دو چار گرے پھول پتیاں ہاتھوں سے ہی سمیٹ کے ایک پلیٹ میں رکھی ہوئی تھیں۔ رات اتاری ہوئی کانچ کی چوڑیوں کا سیٹ، نتھ ٹیکا سب پیک کرکے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں ڈال دیے تھے اور تو اور اس نے اپنے کلچ سے سلامی کے لفافے خالی کرکے دراز میں ڈالے ہوئے تھے۔

''ارے تم تیار نہیں ہوئیں ابھی تک؟'' محسن نے قدرے حیرانی اور زیادہ پریشانی سے پوچھا۔

''تیاری کیسے ہوتی؟ کمرے کا حال دیکھا تھا آپ نے کیا حشر ہورہا تھا؟'' نازوانداز سے اٹھلاتے ہوئے وہ بولی۔

محسن خاموش ہوگیا...... گربہ کشتن کے بجائے محبت فاتح عالم کے جذبات کی لہر نے ہلچل مچائی۔

اس کی خاموشی سے سائرہ بتول ٹھٹکی اور فوراً واش روم کی جانب قدم بڑھائے۔

محسن نے ایک لمبی سرد سانس خارج کی...... اسے بہت اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ نصف بہتر ہونا کس قدر دشوار ہے...... سائرہ بتول کے باہر تشریف لاتے ہی محسن اسے ڈائننگ روم میں لے گیا۔ اماں، ابا، سمیرا ناشتے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

آملیٹ، پراٹھے، نان، چنے، حلوا پوری، فرائی انڈے اور سنکے ہوئے توس میز پر ناشتے کے لوازمات کے طور پر موجود تھے۔

سائرہ بتول کرسی گھسیٹتے ہی اس پر بیٹھی اور حلوا پلیٹ میں ڈالا...... سب کی نظریں ایک دوسرے سے ملیں۔

''کیا حال ہے بیٹے، خیریت سے ہو؟'' بالآخر اماں نے کہا۔

''اوہ، سوری آنٹی، میں ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں؟'' سائرہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ سب خاموشی سے ناشتا کررہے تھے۔ محسن چائے کا کپ لے کر اٹھ کھڑا ہوا...... وہ گرم چائے کا عادی تھا۔ سائرہ بتول کے انتظار میں چائے ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ اس نے کپ اوون میں رکھ کر چائے گرم کی اور کمرے میں چلا گیا۔ سائرہ بتول بھی اس کے پیچھے روانہ ہوئی۔

محسن گہری سوچ میں گم تھا۔ اس کی آمد سے بے خبر رہا۔

''آپ لوگ خاموش کیوں ہوگئے تھے مجھے دیکھ کر......'' پاس بیٹھتے ہوئے سائرہ بتول نے پوچھا۔

محسن چونکا...... اِک ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کے کناروں کو چھوا۔

''کچھ نہیں...... تم سناؤ، ناشتا کیسا لگا؟''

''حلوا ٹھنڈا تھا، چنے بھی شاید کافی پہلے سے ڈالے ہوئے تھے۔'' بے سمجھ مگر سلیقہ مند سائرہ بتول بولی۔

''اِک بات کہوں برا تو نہیں مناؤ گی۔ اصل میں ہماری کمیاں، کوتاہیاں ہم تک ہی رہیں، اصلاح ہوجائے تو اچھی بات ہوگی۔'' محسن نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''میں سمجھی نہیں......'' کچھ پریشانی سے وہ بولی۔

''بات یہ ہے کہ ہر چیز کو اس کے اصل مقام پر رکھیں تو نمبر صحیح لگتے ہیں، میں مثال سے بات سمجھاتا ہوں، گھر میں آگ لگ گئی ہو تو ہم اون سلائیاں یا کڑھائیاں تو لے کر نہیں بیٹھتے ناں...... اسی طرح ہر جگہ ہر علاقے اور ہر خاندان کے اپنے، اپنے طور طریقے ہوتے ہیں، کہیں کھانے پکانے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اور کہیں گھر کے مینٹی نینس پر سارا جمع جتھہ لگاتے ہیں کوئی اللہ کے نیک بندے ایسے بھی ہیں جو کھانے پر لگاتے ہیں نہ گھر داری پر وہ سیر و تفریح سیر سپاٹے پر ساری مالی اور جسمانی توانیاں صرف کردیتے ہیں...... میں ان میں سے کسی کی نفی نہیں کررہا۔ بس کہنے کی بات یہ ہے کہ ان میں سے ہر شوق ایک حد تک اچھا لگتا ہے اور لازمی بات یہ ہے کہ ایک شوق، مشغلہ یا عادت دوسرے کا حق نہ مارے۔ کمرے کی صفائی بہت اہم تھی اور مجھے خوشی ہوئی کہ الحمدللہ میری بیوی کو صفائی کے لیے کہنے کی ضرورت نہیں پڑی مگر اس وقت ایمانداری سے بتاؤ صفائی زیادہ اہم تھی یا ناشتے کی میز پر بیٹھے منتظر لوگ جو گرما گرم چائے اور ناشتے کے عادی ہیں۔''

سائرہ بتول سر جھکائے سنتی رہی۔

محسن نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا...... اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں آب زر جیسا پانی جھلمل، جھلمل کررہا تھا۔

''سوری......'' بہ مشکل اس نے حلق سے پھنسی آواز باہر نکال کر کہا۔

''نہیں بھئی سوری کس بات کی؟ ہم آپ کے ہاں جائیں گے، ہم لوگوں سے آپ کے مطابق نہ ہوا تو ہم تو سوری نہیں کریں گے، سوری سے بات نہیں بنتی ہے بلکہ...... بلکہ......'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''جی بتایئے......'' بے ساختہ سائرہ بتول نے پوچھا۔

''بلکہ یہ کہ یہاں پر ہم سب استاد آپ شاگرد، آپ کے میکے میں آپ سب استاد ہم شاگرد...... کیسے ٹھیک ہے؟''

''کک...... کیا......'' وہ چونکی۔

''بالکل یہی ایک طریقہ ہے جو ہمارے اور ہمارے طور طریقوں میں افہام و تفہیم پیدا کرسکتا ہے اور سلیقے طریقے کو چند کاموں کے لیے نہیں زندگی کے ہر گوشے، ہر شعبے تک لے جاسکتا ہے۔''

سائرہ مسکرارہی تھی۔

اور اس کی مسکراہٹ کے سحر میں محسن کھو کر چائے کا گرم کپ پھر سے ٹھنڈا خ کرچکا تھا۔





مکمل ناول

پل صراط

نسرین جمیل سیال

''شازیہ کا بی اے کا رزلٹ کب تک نکل آئے گا؟'' اشرف تایا نے زینت بیگم سے پوچھا۔

''مجھے معلوم نہیں بھائی صاحب، میرا خیال ہے دو ماہ تک تو رزلٹ نکل آئے گا۔'' زینت بیگم نے ٹیبل پر چائے کے کپ رکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے سو کر اٹھے تو اسے میری طرف بھیج دینا، میں لگے ہاتھوں اس کے کاغذات جمع کرادوں۔ سوچ رہا ہوں اس مرتبہ ہم اسے اپنے ساتھ ہی دبئی

لے جائیں۔"

"لیکن بھائی صاحب، ابھی وہ اتنی بڑی تو نہیں کہ پردیس جاسکے اکیلی...... وہ بھی اتنی دور......؟" زینت بیگم نے نم آنکھوں سے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"اکیلی کیسے ہے بھئی، ہم لوگ اس کے ساتھ ہیں۔ زینت میں تمہارے بھلے کی کوشش کررہا ہوں شاید اس طرح تم لوگوں کے حالات بدل جائیں ورنہ لڑکے تمہارے تو مجھے کسی کام کے نہیں لگتے، ہاں البتہ شازیہ میں کچھ ایسی ذمے داری والی عادات دیکھتا ہوں تو سوچا اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤں، انشاء اللہ بہت ترقی کرے گی۔"

☆☆☆

ملک اشرف اعوان نے اپنی چھٹی کے دوران ہی شازیہ کا پاسپورٹ اور تمام ضروری کاغذات مکمل کروالیے۔ کاغذات بھیجے گئے اور ویزا لگ کر بھی آگیا۔ وہ کافی عرصے سے وہاں مقیم تھے اس لیے کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ یوں اس کا آب ودانہ بڑی تیزی سے اٹھ گیا اور شازیہ آناً فاناً دبئی پہنچ گئی۔

یہ خوب صورت دنیا اس کے لیے بالکل نئی تھی سرگودھا کے ایک چھوٹے سے چک (گاؤں) سے اٹھ کر ایک دم باہر پہنچ جانا بڑی حیرت کی بات تھی۔ تمام رشتے داروں کی لڑکیاں، لڑکے شازیہ کے نصیب پر حیران بلکہ حسد بھی کررہے تھے۔ اس خوب صورت اور نئی دنیا نے اسے بہت متاثر کیا۔ وہ خوش بھی تھی لیکن اپنی ماں اور بہنوں، بھائیوں سے بچھڑنے کا غم بھی تھا۔

☆☆☆

وہاں پہنچ کر پہلے تو تایا، تائی نے اسے گھمایا پھرایا۔ خوب سیریں کرلینے کے بعد ایک روز اشرف تایا نے شازیہ کو پاس بٹھا کر بتایا کہ اسے جاب مل گئی ہے ایک اسپتال میں ریسپشنسٹ کی جگہ خالی تھی اسے بڑی آسانی سے وہ سیٹ مل گئی۔

اس زمانے میں نوکریاں ملنا اتنا مشکل نہیں تھا۔ اور ملک اشرف کی کافی جان پہچان بھی تھی اس لیے کسی مشکل کا سامنا کیے بغیر شازیہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جو کام اس نے کرنا تھا سمجھا دیا گیا۔ وہ تو ویسے بھی بے حد سنجیدہ اور سمجھدار تھی جلد ہی اس نے ایڈجسٹ کرلیا۔

☆☆☆

زندگی اِک نئی ڈگر پر چل پڑی۔ خوب صورت نقش ونگار والی سانولی سی لڑکی نے قائداعظم کے اس قول کو پلے سے باندھ لیا۔ کام، کام اور صرف کام...... جب سیلری ملنی شروع ہوئی تو وہ رہم دیکھ کر شازیہ کی ساری اداسی ختم ہوگئی۔ رقم ہر ماہ پاکستان بھجوائی جانے لگی۔

ملک اشرف اعوان نے بڑی ایمانداری سے اپنی بھابی زینت بیگم کی فیملی کا ساتھ دیا۔ بھتیجی کا خیال بھی اپنے بچوں کی طرح ہی رکھا۔

پاکستان میں اس زمانے میں مردوں کے باہر جانے کا اتنا رواج نہیں تھا اور لڑکیاں تو بیرون ملک بھیجنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کجا کہ ایک پس ماندہ علاقے سے کوئی لڑکی کمائی کرنے کے لیے ملک سے باہر جائے لیکن اس زمانے میں بھی یعنی سن ستر کی دہائی میں بھی ایسا ہوگیا۔ نازک سے وجود والی سنجیدہ سی لڑکی نے اس زمانے میں کمائی کرنی شروع کردی جس عمر میں لڑکیاں رنگین خواب دیکھتی ہیں، دنیا انہیں خوب صورت نظر آنے لگتی ہے۔ ہر چیز ریشمی سی ہنستی مسکراتی نظر آتی ہے، اس عمر میں ایک حساس بچی نے اپنے والدین کی غربت کو مٹانے کے لیے اپنے خوب صورت خیالات وجذبات کو گروی رکھ دیا...... اور انتہائی ایمانداری سے ہر ماہ اپنے گھر ڈرافٹ بھجوانا شروع کردیے۔

رقم زینت بیگم کے نام ہی آتی تھی انہوں نے بچوں کے نام پلاٹ خریدنا شروع کردیے۔ پہلے بڑے بیٹے کا پھر باری، باری چاروں بیٹوں کے نام دس، دس مرلہ زمین ہوگئی اور اس مشن کو مکمل کرنے میں پانچ چھ سال سے بھی زیادہ کا عرصہ لگ گیا۔

زینت بیگم اب اپنے چک کی ملکانی بن گئی تھی، پاؤں زمین پر نہیں اٹکتے تھے، گھر میں اوڑھنا بچھونا بھی

بہت بہتر آگیا تھا۔ خوشحالی نے چہروں پر ایک خاص چمک پیدا کردی تھی۔ ہر فرد گھر کا نکھرا، نکھرا لگتا تھا۔ شازیہ اپنی دھن میں مگن اپنے مشن کو چلارہی تھی۔

"شازیہ بیٹا اِدھر آؤ میری بات سنو؟" ایک روز اشرف تایا نے غور کیا تو بڑا دکھ محسوس کیا کہ بچی اتنے سالوں سے گھر والوں سے بچھڑی ہوئی ہے کبھی اس نے جانے کے لیے اصرار نہیں کیا۔

"جی بڑے ابا...... آپ نے بلایا ہے۔" وہ چائے کا کپ لے کر ان کے پاس آکر ادب سے بولی۔

"اِدھر آؤ، میرے پاس بیٹھو بیٹا، تم تو مشین ہی بن گئی ہو۔" انہوں نے بیڈ پر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

"بڑے ابا میں جس مقصد کے لیے یہاں آئی ہوں وہ پورا ہورہا ہے، میرے گھر میں خوشحالی آگئی ہے۔ مجھے اور کیا چاہیے؟ ویسے بھی آپ سب میرا کتنا خیال رکھتے ہیں۔"

"لیکن بیٹا کچھ دن کے لیے پاکستان ہو آتیں اب تک۔ تو تمہاری کافی چھٹیاں جمع ہوچکی ہوں گی۔ پاکستان جانے کو دل نہیں کرتا۔"

شازیہ کو ایک دم اچھو لگ گیا...... اس نے کپ ٹیبل پر رکھ دیا آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ یہ پانی اچھو لگنے سے نکلا یا آنکھیں اپنے گھر سے جدائی کا منظر پیش کرنے کے لیے چھلکنے کو بے تاب ہوگئیں۔

"بڑے ابا میں تو اپنے وطن کے لیے اپنے چک، اپنے گھر اور گھر والوں کے لیے اداس ہوتی ہوں لیکن لگتا ہے وہ سب شاید مجھے بھول چکے ہیں، کبھی کسی نے گھر آنے کا بولا ہی نہیں۔" وہ بے حد اداسی سے بولی۔

"کیوں بیٹا...... بھلا تمہیں کیسے بھول سکتے ہیں، تمہارے ڈرافٹوں پر تو گھر چل رہا ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے۔" تایا اشرف بولے۔

"بڑے ابا آپ کو کیا پتا، ہر ڈرافٹ ملنے کے بعد گھر سے خط آجاتا ہے کہ اس دفعہ پیسے تو کافی تھے لیکن بیٹا! ثمینہ کی شادی کے لیے کافی سامان آگیا ہے۔ پھر بھی پورا نہیں بیٹا...... میں چاہتی ہوں کہ دو ماہ تک اس کی شادی کردوں۔ اچھا رشتہ مل گیا ہے لیٹ کرنے سے رشتہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔" اب آپ خود سوچیں مجھے یہاں آئے چھٹا سال ہے اس دوران سارا گھر گرا کر نیا بن گیا ہے دو بہنوں کی شادیاں ہوگئی ہیں اماں کہتی ہیں کہ ان کی شادیاں سادگی سے کی ہیں کیونکہ تمہارے چھوٹے بھائی کو دکان بنادی باقی تینوں تو اب اپنی، اپنی نوکری کررہے ہیں خالد کی فکر تھی یہ چھوٹا ہے، ساتھ ہی ثمینہ کا رشتہ مل گیا تو سوچا یہ کام بھی نپٹ جائے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ میرے اداس ہونے سے کیا فرق پڑے گا جب میری ماں، میرے بھائی بہنیں ہی اداس نہیں ہیں، کسی نے آج تک یہ نہیں پوچھا کہ تمہیں کس چیز کی ضرورت ہے یا تم گھر کب آرہی ہو ہم سب اداس ہیں تمہارے بغیر۔" اشرف صاحب نے اس کے دکھ بھرے لہجے کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔

"چلو تم اپنی تیاری کرلو اگلے ماہ چھٹی مل جائے گی تم ابھی سے اپلائی کردو...... میں شوکت صاحب سے بات کروں گا تم فکر نہیں کرو۔" انہوں نے شازیہ کو ساتھ لگالیا۔

☆☆☆

پھر دیکھتے ہی دیکھتے تیاری ہوگئی۔ مہینہ پورا ہوا تو چھٹی منظور ہوگئی۔ شازیہ ڈھیروں شاپنگ کررہی تھی۔ خوشی سے پھولے نہیں سمارہی تھی اسے پاکستان جانا تھا اپنے گھر، اپنی ماں اور بھائی بہنوں سے ملنا تھا، کتنی خوشی کی بات تھی۔ تائی جان نے بھی فرداً فرداً سب کے لیے گفٹ لے کردیے تھے۔ تایا، تائی اسے خوش دیکھ کر بہت خوش تھے، وہ سوچ رہی تھی کہ ثمینہ کی شادی کرکے ہی پاکستان سے واپس آئے گی۔

شام چار بجے کی فلائٹ تھی۔ سب اسے...... ائرپورٹ تک چھوڑنے آئے۔ وہ پہلی بار پاکستان جارہی تھی پورے چھ سال بعد آٹھ ماہ بعد خوشی اپنی انتہا کو پہنچ رہی تھی جہاز میں اسے نیند نہیں آئی۔ وہ ایک، ایک لمحہ گن رہی تھی، امی جان کا چہرہ بار، بار آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا سب بہن، بھائی باری، باری یاد

آ رہے تھے۔

☆☆☆

ائرپورٹ پر سب گھر والے موجود تھے جو صبح سے لاہور کی سیر کر رہے تھے۔ روز، روز تو لاہور آنا مشکل ہے۔ آج شازیہ کی بدولت سب لوگوں نے سیر بھی کر لی اور خوب مزے، مزے کے کھانے بھی کھائے اور اب ائرپورٹ بھی دیکھ لیا، سب لوگ بہت خوش تھے، شازیہ کو گلے لگا، لگا کر پیار کر رہے تھے اور اس کے اٹیچی اور بیگ ہر کوئی اٹھانے میں پہل کر رہا تھا اس قدر وزنی اٹیچی اور بیگ تو سب کے دل کو بھا رہے تھے۔

شازیہ تو اتنے بہت سے لوگوں کو دیکھ کر حیران تھی۔

''آپ لوگ کیسے لاہور آئے ہیں؟''

''ہم لوگ چھوٹی بس لے کر آئے ہیں بڑے کھلے ڈلے سیٹوں پر مزے کرتے آئے ہیں۔'' خالد نے بہن کو بازوؤں کے حصار میں لے کر کہا...... شازیہ بس کا سن کر حیران ہوئی۔

''اچھا چلو سامان اٹھاؤ اور بس میں رکھو بہن کو تنگ نہ کرو...... سب لوگ مل کر سامان اٹھاؤ احتیاط سے کہیں کوئی چیز رہ نہ جائے۔'' امی جان کو سامان کی زیادہ فکر تھی۔

شازیہ بغور سب کا جائزہ لے رہی تھی۔

''بھئی میں تو سمجھی تھی کہ شازیہ باجی دبئی سے آئیں گی تو بدل چکی ہوں گی، بیل باٹم پہنا ہوگا، گلے میں دوپٹا ہوگا کندھے پر بیگ ہوگا بڑا اچھا سا ہیئر اسٹائل ہوگا...... لیکن آپ تو ویسی کی ویسی ہیں، میں آپ کی جگہ ہوتی تو بڑی تبدیلی آچکی ہوتی میرے حلیے میں۔'' ثمینہ بڑی مایوس ہو کر خیالات کا اظہار کر رہی تھی۔

''ثمینہ میری جان میں اپنے گھر کے حالات بدلنے کے لیے باہر گئی تھی، آپ سب کو خوشیاں دینے کے لیے...... گھر میں خوشحالی لانے کے لیے۔ اگر میں اپنے آپ کو چینج کرنے میں لگ جاتی تو آج تمہاری شادی کی تیاری نہیں ہوتی۔''

ثمینہ اپنی شادی کے ذکر پر ذرا سا شرمائی لجائی اور پھر بہن کو گلے لگا لیا۔

''آپ بہت اچھی ہیں باجی، آپ نے ہماری تقدیریں ہی بدل دی ہیں۔''

''میں کون ہوتی ہوں ثمینہ تقدیریں بدلنے والی۔ یہ سب میرے مولا کی مہربانی ہے اور والدین کی دعائیں۔''

بس میں امی جان نے شازیہ کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ بار بار اس کی بلائیں لے رہی تھیں پھر اسے اپنے کندھے سے لگ کر سونے کا مشورہ دیا لیکن وہ ہنس پڑی۔

''امی جان میں زیادہ سونے کی عادی نہیں رہی، سب کچھ بھول چکی ہوں...... جب اوور ٹائم لگاتا ہو تو پوری، پوری رات جاگ کر گزارنا پڑتی ہے۔ اس لیے آپ میری فکر نہیں کریں۔''

☆☆☆

سرگودھا پہنچ کر سب لوگ سامان اتارنے میں لگ گئے۔

''شازیہ بیٹا بس کا کرایہ دینا ہے، پیسے تو میرے پاس تھے لیکن ان کم بختوں نے سیر سپاٹے اور کھانے پینے میں ختم کر دیے۔ اعجاز کہنے لگا ہماری دولت مند بہن دبئی سے آرہی ہے اس کے لیے بس کا کرایہ دینا کون سا مشکل کام ہے۔'' امی جان شرمندہ، شرمندہ سی بول رہی تھیں۔

''خیر ہے امی آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں، میں ابھی قیصر کو پیسے دے دیتی ہوں کہ ڈرائیور کو دے دے۔ مجھے تایا اشرف نے پاکستانی کرنسی بھی دی تھی کہ ضرورت نہ پڑ جائے۔''

''اچھا بیٹا جیتی رہو، ہمیشہ خوش رہو۔''

یہاں آئی تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ بڑا خوب صورت گھر بنایا گیا تھا۔ پرانی اکھڑے پلستر والی دیواروں کا نام ونشان نہیں تھا۔ خوب صورت فرنیچر، دیدہ زیب پردے، دبیز قالین...... ان سب چیزوں کو دیکھ کر شازیہ کو اچھا بھی لگ رہا تھا لیکن اس گھر کی ایک، ایک چیز سے اسے اپنے خون پسینے کی خوشبو آرہی تھی۔

آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے کس قدر محنت کی ہے، اس نے راتوں کی نیندیں بھلا دی تھی تب جا کر کہیں اس گھر میں خوشحالی آئی تھی۔ اس گھر کے لوگ خوش تھے تو ساری دنیا خوش لگ رہی تھی۔

☆☆☆

گھر میں شازیہ کے آنے سے گویا ہر جا بہار اتر آئی تھی۔ تمام رشتے دار ملنے آرہے تھے۔ محلے دار، گاؤں کے لوگ بڑی محبت سے اس شازیہ کو دیکھنے آرہے تھے جو اسکول سے پڑھ کر آتی تو ایک کمرے میں بند ہو جاتی، آنا جانا، محفلوں کو فیس کرنا، سیر سپاٹے، کچھ بھی اسے اچھا نہیں لگتا تھا ساری دنیا سے الگ تھلگ رہنے والی لڑکی آج چھ سات سال ولایت میں گزار کر آئی تھی۔ اس سانولی سلونی شرمیلی سی شازیہ نے اپنے گھر کی کایا ہی پلٹ دی تھی۔ جس دن سے شازیہ آئی تھی گھر میں ایک میلا سا لگا رہتا، گھر میں ہر وقت چائے کا پانی اور کھانا پینا چل رہا تھا۔

جو، جو تحائف، جس، جس کے لیے تھے وہ سب کو دے چکی تھی تو باقی ضروری سامان امی نے اپنی نگرانی میں اسٹور میں بڑی پیٹی کھول کر اس میں رکھوا دیا تھا۔

ثمینہ کی شادی کا تذکرہ چھڑا، شمشاد باجی اور زرینہ باجی کی شادی اس کی غیر موجودگی میں ہوئی تھی ان کے شوہر اور سسرال والے بھی ملنے آئے اور جو کچھ ہو سکا امی جان کی مرضی سے وہ سب کو دے دلا کر خوش کرتی رہی۔

☆☆☆

اسے پاکستان آئے پورا ہفتہ گزر گیا۔ امی جان اس سے دکھ سکھ بانٹ رہی تھیں۔ سب کے بارے میں اچھی بری بات کرتی رہیں۔

وہ حیران تھی امی جان بڑی بہنوں کے بعد ثمینہ کی شادی کے لیے فکر مند تھیں، اس کے جہیز میں کمی بیشی کا ذکر کرتی تھیں لیکن ایک بار بھی امی جان نے یا بھائیوں، بہنوں میں سے کسی نے بھی اس کی شادی، اس کے گھر بسانے کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ سب اپنی، اپنی مجبوریاں، اپنی، اپنی ضروریات کا رونا روتے رہے کسی نے اس سے چھ سال آٹھ ماہ جو گزار کر آئی تھی ان کا پوچھا نہیں تھا۔ اس کی زندگی کی محرومیوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس نے اس گھر کو چلانے کے لیے ان گھر والوں کی خوشیاں بڑھانے کو جو اپنے خواب، اپنے جذبات گروی رکھ دیے تھے ان کا کسی نے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔

اماں کو یہ خیال نہ آیا کہ بیٹی تھک چکی ہے، اس کے نازک کندھوں نے اپنی طاقت سے کہیں بڑھ کر بوجھ اٹھایا ہے۔ اب اسے بھی آرام کی ضرورت ہے۔ زندگی میں رنگ بھرنے کی خواہش اس کے اندر بھی کہیں موجود ہوگی۔ اس نے بھی کوئی خواب دیکھے ہوں گے۔

☆☆☆

موسم میں تبدیلی آچکی تھی گرم کپڑے نکلنے شروع ہو چکے تھے۔ اور آج تو بارش کا چھینٹا بھی پڑا تھا۔ مٹی کی سوندھی، سوندھی خوشبو جو ہلکی بارش کے بعد آتی ہے اسے ہمیشہ سے مسحور کر دیتی۔ اور آج تو کئی سالوں بعد اس نے اپنی دھرتی کی یہ خوشبو محسوس کی تھی۔

''آپی آپ کو ٹھنڈ نہ لگ رہی ہو، یہ پہن لیں آپ پر اچھی لگے گی۔'' ثمینہ نے میرون جیکٹ نکال کر شازیہ کو دی۔

''نہیں ثمینہ، میں تو اس موسم اور اس خوشبو کو ترس گئی تھی، میں یہ جیکٹ نہیں پہنوں گی۔ میں اس ٹھنڈ اور اس خوشبو کو اپنے اندر اتارنا چاہتی ہوں۔'' اس نے لاؤنج کی بڑی کھڑکی کا پردہ سرکا کر کہا۔

''ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی، میں آپ کے لیے بھاپ اڑاتی کافی بنا کر لاتی ہوں۔''

ثمینہ جلد ہی کافی بنا کر لے آئی اس نے بڑا خوب صورت سا مگ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ ''آپی آپ کافی سے لطف اندوز ہوں میں ابھی ضروری فون سن کر آتی ہوں۔'' اس نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا۔

شازیہ سمجھ چکی تھی کہ کس کا فون ہے۔ اس نے جواب میں صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ ثمینہ چلی گئی تو وہ سوچنے لگی کہ گھر کے ماحول میں بہت چینج آگیا ہے۔ کسی زمانے میں ہمیں تو کسی کزن سے بھی سلام کرنے

کی بھی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ بڑی آپا کی منگنی کے بعد تو مظہر بھائی کو سرگودھا کی حدود میں بھی آنے کی اجازت نہیں تھی حالانکہ مظہر بھائی پھپو کے بیٹے تھے آج ہماری ننھی سی بہن اپنے منگیتر کا فون بتا کر سننے جا رہی ہے۔ سوچتے، سوچتے وہ نہ جانے کتنے سال پیچھے چلی گئی تھی۔ بظاہر وہ کھڑکی میں کھڑی تھی لیکن آس پاس سے بے خبر تھی۔ کافی ٹھنڈ ہو چکی تھی۔

''شازیہ میری جان تمہاری کافی برف بن چکی ہے۔ تم کھڑکی میں کھڑی کیا سوچ رہی ہو؟'' امی جان ایک کاغذ ہاتھ میں پکڑے اندر آئیں اور بڑی محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''کچھ نہیں سوچ رہی ہوں، اپنی چھٹی اور نوکری کا خیال آ رہا ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''ہاں چندا اپنا ٹکٹ چیک کر لینا کہیں کوئی نقصان نہ ہو جائے۔'' امی نے کہا۔ شازیہ تڑپ کر ماں کو دیکھنے لگی۔ امی تو کبھی ایسی نہیں تھیں ماں تو ایسی نہیں ہوتی، اسے اپنے کانوں پر شک ہونے لگا۔

''جی، آپ کیا کہہ رہی ہیں امی جان؟'' وہ انجان بن کر پوچھنے لگی۔

''بیٹا میں یہ کہہ رہی تھی کہ اپنے کاغذات چیک کر لینا کہیں مغالطہ نہ رہے کوئی۔ اللہ نے اتنی اچھی جاب دی ہے جو نصیب والوں کو ملتی ہے۔''

''جی آپ فکر نہیں کریں امی، اگلے ماہ کی 21 تاریخ کو میری حاضری ہے آفس میں۔'' اس کے سینے میں تڑخ سے کچھ ٹوٹا تو کرچیاں آنکھوں میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے اپنا رخ کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔ اپنی آنکھوں سے بہتے پانیوں کو چھپانے کے لیے کھلی کھڑکی سے باہر دور دیکھنے لگی۔

امی جان نے کافی کا کپ اٹھایا اور کچن کی طرف چلی گئیں۔

☆☆☆

وہ رات بھر اپنے بیڈ پر لیٹی کروٹیں لیتی رہی۔

''آخر امی جان نے ایسا کیوں کہا؟ انہیں یہ فکر تھی کہ میری نوکری جاتی رہی تو ڈرافٹ آنا بند ہو جائیں گے۔ اور پیسے آنے بند ہو گئے تو ثمینہ کی شادی اس بڑے گھر میں کیسے ہو سکے گی۔ کیا کسی ماں کی سوچ اس طرح بھی ہو سکتی ہے؟'' وہ دکھ سے سوچتی رہی۔

''میری کسی کو فکر کیوں نہیں؟ ثمینہ تو مجھ سے تین سال چھوٹی ہے لیکن میرے بارے میں کسی نے بھول کر بھی نہیں سوچا کہ جسے دولت کمانے کی مشین سمجھ رکھا ہے، اس کے سینے میں بھی دل ہے۔ خوشیوں پر اس کا بھی حق ہے، امی جان نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ میں نے جو سات سال سے ایک خاندان کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا رکھا ہے، میں تھک بھی سکتی ہوں۔ میرے بھی کچھ جذبات و احساسات ہو سکتے ہیں۔'' درد کی اِک لہر سی اٹھتی ہوئی اسے محسوس ہوئی۔ اس نے درد کو سمیٹ کر اپنے دامن میں چھپا لیا۔

''ٹھیک ہے میں بھی کبھی اپنی خوشیوں کے لیے خود سے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گی۔ جب کسی کو میرا خیال نہیں تو میں کیوں اپنے آنسو ضائع کروں۔'' اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا فجر کا ٹائم ہو چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر وضو کیا اور جا نماز پر کھڑی ہو گئی۔ ہر مسلمان کا آخری سہارا ایک سجدہ ہی تو ہوتا ہے جس سجدے میں اپنے رب سے اپنے سارے دکھ بیان کیے جا سکتے ہیں، وہی ہے جو اپنے بندے کی سنتا ہے۔ اس سے محبت کرتا ہے اور پھر اسے نوازتا ہے۔

☆☆☆

ثمینہ کی شادی میں ابھی دو ماہ باقی تھے اور اس کی چھٹی ختم ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید امی جان اسے چھٹی بڑھانے کا کہیں گی۔ وہ آئی ہے تو شادی تک رکنے کی سب ضد کریں گے لیکن کئی بار انہوں نے افسوس کا اظہار کیا۔

''اگر تم آنے سے پہلے مشورہ کر لیتیں تو تمہیں میں کہتی کہ اگلے ماہ آنا تاکہ بہن کی شادی میں شرکت کر سکو لیکن میری بچی تم نے پہلے ذکر ہی نہیں کیا۔ اب دیکھو ناں، شادی میں ابھی ڈیڑھ ماہ ہے، تمہاری

چھٹی ختم ہو رہی ہے اگر تم شادی تک رکتی ہو تو تمہاری نوکری ہاتھ سے چلی جائے گی اور نئی نوکری ملنا آج کل بہت مشکل ہے۔ تم تو جانتی ہو میری جان کہ تم نوکری کرتی ہو تو اس گھر کا سارا انتظام چلتا ہے، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے تم میرا بیٹا ہو۔ تمہارے دم سے میری زندگی ہے، تم نے بہنوں کی شادیاں کیں، شادی شدہ بھائیوں کو پلاٹ لے دیے ہیں، چھوٹے بھائی کو دکان بنا دی ہے۔ میں بیوہ عورت کس کام کی تھی، میری بچی نے مجھے چوہدرانی بنا دیا ہے۔ تم میرا بیٹا نہیں تو کیا ہو۔ صرف دو سال اور لگا لو پھر ہمیشہ کے لیے پاکستان آ جانا میں اس دوران میں تمہاری شادی کی تیاری کر لوں گی۔ بس آتے ہی اپنی بیٹی کی شادی کروں گی۔ اور یہ گھر جو تمہارے باپ کا ہے ناں تمہارے نام کر دوں گی تم ساری عمر اسی گھر میں گزارنا۔ شازیہ نے ماں کے اتنے لمبے لیکچر کے جواب میں کچھ نہ کہا لیکن اسے یہ باور کرا دیا گیا تھا کہ اسے ابھی اور دو سال تک اپنے کندھوں پر یہ بوجھ اٹھائے رکھنا ہے۔ دو سال سے بھی بڑھ کر چار پانچ سال کی مدت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ ابھی چھوٹا خالد بھی غیر شادی شدہ تھا۔ پہلے وہ خاموش تھی لیکن دل کی ساری رگیں دکھنے لگیں۔ بھائی، بہنیں تو چلو دنیا میں ایسے ہو جاتے ہیں لیکن کیا کوئی ماں بھی اس قدر بے حس ہو سکتی ہے۔ میری ماں تو دنیا کی سب سے اچھی ماں تھی پھر یہ کیا ہوا کہ......

اس کو چھٹی نہ ملی
جس نے سبق یاد کیا

اور اس نے فوری واپسی کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

دبئی ائرپورٹ پر تایا، تائی موجود تھے۔ وہ دیر تک ان کے سینے سے لگی رہی۔ نہ جانے کتنے بے شمار موتی پلکوں سے ٹوٹ کر ان کے سوئیٹر میں جذب ہوتے رہے۔ تائی نے سینے سے لگایا تو وہ بے اختیار رو پڑی۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ لے کر بے اختیار کئی بار چوم لیا۔

''میں سمجھ گئی ہوں ملک صاحب میری بچی مزدوری کرتے، کرتے تھک گئی ہے۔ اب وہ پاکستان میں ہی رہنا چاہتی تھی لیکن حالات نے اسے پھر ناتواں کندھوں پر بوجھ اٹھانے کے لیے یہاں بھیج دیا۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا تم میرے بھائی ملک اسلم اعوان کا بیٹا ہو بیٹی نہیں۔ یہ تم نے ثابت کر دیا ہے۔ اللہ پاک تمہاری مدد کرے گا...... تم فکر مت کرو ان شاء اللہ۔''

گھر پہنچ کر تایا نے اسے آرام کرنے کے لیے اس کے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ ''تم دس دن اور آرام کر لو، جی بھر کر اپنی نیند پوری کرو پھر جاب پر چلی جانا۔''

''لیکن تایا میری چھٹی تو ختم ہو گئی ہے۔'' اس نے امید بھری نظروں سے تایا کی طرف دیکھا۔

''تم فکر مت کرو بیٹا، میں سنبھال لوں گا تم ریلیکس کرو کھاؤ، پیو جو جی چاہتا ہے اپنی بڑی ماں سے بولو، تمہیں تیار ملے گی جب تھکاوٹ اتر جائے تو بتانا میں تمہیں ساتھ لے کر آفس جاؤں گا۔'' انہوں نے گال تھپتھپائے اور کمرے سے نکل گئے۔ وہ کبھی، کبھی تائی کو بڑی ماں بھی کہہ دیتی تھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بڑی دیر سے بج رہی تھی۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی ہی تھی کہ بڑی ماں کمرے میں داخل ہوئیں۔

''شازی بیٹا، سلمہ کا فون ہے میں نے تو بہت کہا ہے کہ وہ سو رہی ہے لیکن وہ تمہارے اٹھنے تک کا انتظار نہیں کر سکی لو بات کر لو۔'' سلمہ اس کی کولیگ تھی۔

''اچھا بھئی ابھی تو تیسرا دن ہے، تایا تو ابھی بہت دن آرام کرنے کا کہہ رہے تھے۔'' سلمہ اس سے آفس آنے پر اصرار کر رہی تھی۔

''چلو ٹھیک ہے یار کل میں آفس آ جاؤں گی۔ ناراض مت ہو۔'' اس نے مسکرا کر خدا حافظ کہا اور فون رکھ دیا۔

☆☆☆

اگلی صبح اس نے شاور لیا۔ چینج کر کے خود کو فریش سا محسوس کرنے لگی۔ ناشتے کی ٹیبل پر ہری پیاز کا

آملیٹ اور گرما گرم پراٹھا اس کا منتظر تھا۔

''ہائے میری جان سے پیاری اماں......'' اس نے ان کا منہ چوم لیا۔ ''آپ کیوں میرے لیے تکلیف کرتی ہیں، اتنے مزے کا ناشتا کرکے تو میں بہت موٹی ہوجاؤں گی۔'' اس نے انتہائی خوشگوار موڈ میں تائی سے کہا۔ جنہیں وہ اب اماں ہی کہنے لگی تھی۔

''کوئی بات نہیں چندا بہت دن بعد تمہارے لیے ناشتا بنایا ہے۔ اس لیے تمہاری پسند کا آملیٹ ہے ویسے تو چکن کا سالن بھی ہے، پیٹ بھر کر ناشتا کرو' دوپہر کو صرف سلاد لے لینا۔ یا براؤن بریڈ اور ہاں چائے میں نے بڑے مگ میں ڈال دی ہے بغیر چینی کی۔''

''اماں آپ کس قدر اچھی ماں ہیں۔ پورا ڈائٹ چارٹ بنا کر دیتی ہیں، ویسے اس طرح کے کاغذی پراٹھے تو بندہ چار، پانچ بھی کھا سکتا ہے۔''

''کیوں نہیں بتا جب تمہارا دل کرے میں بنادوں گی' فی الحال جلدی سے ناشتا کرو اور بیگ لو، تمہارے ابا تیار بیٹھے ہیں۔'' پاکستان سے واپس آکر وہ تایا، تائی کو اب باقاعدہ اماں، ابا کہنے لگی تھی۔

☆☆☆

آفس پہنچ کر سب سے سلام دعا ہوئی اور وہ اپنی سیٹ پر آگئی۔ ابھی فائل نکال کر چیک کرنے لگی تھی کہ سلمہ دندناتی ہوئی اس کے سر پر آن پہنچی۔ شازیہ نے کھڑے ہوکر اسے گلے سے لگالیا۔ دونوں گلے سے ملیں تو سلمہ ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''چائے منگواتی ہوں۔'' شازیہ نے کہا۔

''نہیں یار تم آج حاضری لگواؤ اور چلو باہر کہیں چائے پیتے ہیں۔'' سلمہ اصرار کرنے لگی۔

''بس پھر تھوڑا سا صبر کرو، میں ضروری کام نمٹالوں......'' یوں کچھ دیر بعد آفس سے نکل کر وہ سلمہ کی گاڑی میں لانگ ڈرائیو پر چل پڑی ریسٹورنٹ جانے سے اس نے منع کردیا تھا۔

''اماں نے صبح بڑا ہیوی ناشتا کرایا ہے، اس لیے ہوٹل میں جانا نقصان دہ ہے بس...جو بھی چاہیے ہوگا گاڑی میں منگوالینا تم۔'' اس نے سلمہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

اس لانگ ڈرائیو میں جب باتوں کا سلسلہ چلا تو پھر نان اسٹاپ چلتا ہی گیا۔ شازیہ نے پاکستان میں گزارا ہوا ایک، ایک لمحہ اس کے گوش گزار کردیا۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی، بات ختم ہوئی تو سلمہ نے ایک طویل سانس لی۔

''تو یہ بات ہے۔''

''ہاں یار' مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ امی جان کیوں بے حس ہوگئی ہیں اگر پوری دنیا بھی بدل جائے تو ماں نہیں بدلتی۔ پھر میرے ساتھ ایسا کیوں۔'' اس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں...... چند لمحے خاموشی کی نذر ہوگئے۔

''یہ بات نہیں میری جان...... ماں ہمیشہ ماں ہی رہتی ہے، خالہ جان اصل میں جلد بازی میں پہلے بیٹوں کو پلاٹ لے کر دیتی رہیں پھر بیٹیوں کی شادیاں کرتی رہیں، انہوں نے بڑی تیزی... اس لیے دکھائی کہ کہیں اس دوران تمہاری نوکری چھوٹ گئی تو یہ نہ ہو کہ سب ضروری کام رہ جائیں۔''

''انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ جو بیٹی سب کے لیے کما رہی ہے، اس کے بھی کوئی جذبات ہیں۔ اس کی بھی شادی کی عمر نکلی جارہی ہے۔ جلدی میں دوسروں کی زندگیاں سنوارتے میری خوشیوں کا خیال بھلا بیٹھیں۔'' وہ شکایتاً کہہ رہی تھی۔

''خیر تم فکر نہیں کرو، تم بس شادی کے لیے تیار ہوجاؤ۔'' اس نے گاڑی کا رخ ایک جانی پہچانی سڑک کی طرف موڑ لیا۔

''اس طرف تو تمہارا گھر ہے سلمہ؟ اس نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں اس طرف میرا ہی گھر ہے اور میں تمہارے بڑے ابا کو بتا چکی ہوں کہ میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں گی۔'' سلمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم تو بڑی فراڈ نکلی ہو یار، مجھے بتایا ہی نہیں کہ تم نے ابا سے بات کرلی۔''

''تم کچھ بھی کہہ لو آج جو میں چاہوں گی وہی ہوگا۔'' سلمہ نے گاڑی گھر کی بلڈنگ کے آگے کھڑی کرتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

''میرا خیال ہے بیڈروم میں ہی آرام سے بیٹھتے ہیں۔'' سلمہ نے شولڈر سے بیگ اتار کر صوفے پر پھینکتے ہوئے کہا۔ شازیہ سیدھی اس کے بیڈروم میں گھستی چلی گئی اور جاکر بیڈ پر نیم دراز ہوگئی۔ آنکھیں بند کرلیں۔ یوں جیسے کسی بہت لمبے سفر سے تھک کر آرہی ہو اور ایسا ہی تھا اس کا سفر بہت لمبا تھا۔

''لو یار جوس پیو پھر کھانے کا بندوبست کرتے ہیں۔'' سلمہ پائن ایپل جوس لے کر اندر آئی۔ ''موٹا مت شازی یہ جوس لو اور پھر آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں آدھے گھنٹے میں کھانا لے کر آتی ہوں۔'' اس نے گلاس لبالب بھر دیا تھا۔

شازیہ تھکے، تھکے انداز میں اٹھی اور گلاس لبوں سے لگالیا۔ تازہ اور ٹھنڈا جوس جوں، جوں حلق سے اترتا گیا وجود کے روم، روم میں ٹھنڈ اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ آنکھوں میں تراوٹ کا احساس ہوا۔

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' گلاس خالی ہوا تو اس نے دوبارہ آدھا گلاس بھرا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گئی۔

سلمہ کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

''شازیہ تم اس قدر تھک گئی ہو کیا وجہ ہے؟''

''ہاں سلمہ، میں واقعی بہت تھک گئی مجھے لگتا ہے میرے پاؤں من، من بھر کے ہیں، قدم اٹھاتی کہیں ہوں، پڑتا کہیں اور ہے۔'' آنسو اس کے گالوں کو بھگونے لگے......

''اوہو یار میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھتی تھی۔'' اس نے آگے بڑھ کر شازیہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''تم کیوں رو رہی ہو، ایسا کیا مسئلہ ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں' تم تھوڑی دیر آرام کرلو۔ میں کھانے کا کچھ کرتی ہوں۔'' سلمہ نے اس کے آنسو صاف کیے اور اسے واپس لٹادیا۔

سلمہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھی۔ اپنے ماموں زاد سے پانچ سال پہلے شادی ہوئی وہ بھی ڈاکٹر تھا۔ شادی دونوں کی پسند سے ہوئی تھی لیکن شادی کے دوسرے سال پتا چلا کہ سہیل کو کینسر ہے، بہت علاج کرایا گیا لیکن وہ جانبر نہیں ہوسکا۔ سلمہ کی تو دنیا ہی اجڑ گئی۔ دل ایسا برباد ہوا کہ پھر آباد ہونے کا تصور ہی ختم ہوگیا۔ سہیل کی جدائی سے وجود اس قدر ٹوٹا کہ کرچیاں دور، دور تک بکھر گئیں۔ اور پھر اس نازک سی لڑکی سے کرچیاں سمیٹنا مشکل ہوگیا۔ انگلیاں لہولہان ہوگئیں تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ باقی زندگی اس ریزہ، ریزہ وجود کے ساتھ تنہا ہی گزار دے گی۔ اور رب سے اس نے اپنے آپ کو مضبوط رکھنے کی دعائیں کی تھیں۔

پھر تو جیسے اس کے رب نے اس کی انگلی تھام لی ہو۔ اسے بہت بڑا سہارا مل گیا، وجود میں زمانے سے لڑنے کی طاقت پیدا ہوگئی تو اس نے پھر سے ڈیوٹی جوائن کرلی۔ اب وہ اپنے رب کے سہارے مضبوط ہوگئی تھی۔

شازیہ نے ساری روداد شادی اور گھر والوں کے سلوک اور رویے کا بھی بتایا۔

''چلو جو ہوا بہر حال یہ تمہارے گھر والوں کی زیادتی ہے۔ دیکھو یعقوب چچا میرے والد صاحب کے چچازاد تھے ان کا چھوٹا بیٹا ایوب یہیں راس الخیمہ میں رہتا ہے۔ بڑا جی دار لڑکا ہے۔ پڑھا لکھا ہے' روپے پیسے کی کمی نہیں ہے، ایک مرتبہ وہ اسپتال آیا تھا تو ریسپشن پر تمہیں دیکھ کر مجھ سے پوچھنے لگا کہ وہ سانولی سی لڑکی بہت پرکشش اور سوبری ہے، اس کا بائیو ڈیٹا ہی بتادو' اصل میں سہیل کے بعد وہ مجھ میں انٹرسٹڈ تھا مگر میں نے انکار کردیا' میرے پاس سہیل کی یادیں کسی قیمتی خزانے سے کم نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے سلمہ آبدیدہ ہوگئی تھی۔

شازیہ نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''اس وقت تو میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اب ضرور کروں گی تمہارے لیے۔'' سلمہ بڑی

اماں بننے لگی۔

''ارے رکو سلمہ! اتنی جلدی مت کرو جلد بازی میں شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔''

''بھئی شرمندگی کیسی جب تمہارا فیصلہ مجھے ہی کرنا ہے تو پھر شرمندہ تم کیوں ہو رہی ہو۔ اور وہ بیچارہ تو مدتوں سے تمہارا امیدوار ہے، میں ابھی اسے خوشخبری سناتی ہوں کہ آپ کی درخواست منظور ہوگئی ہے۔'' وہ بہت خوش تھی۔

''ایک مرتبہ پھر سوچ لیتے ہیں سلمہ! یہ نہ ہو لینے کے دینے پڑ جائیں۔''

''بھئی تمہارے بڑے ابا اور اماں سے تو میں منٹوں میں نپٹ لوں گی اور پاکستان والوں کو دیکھا جائے گا۔'' اس نے چائے کا خالی کپ سائڈ ٹیبل پر رکھا اور ایوب کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔

تیسری بیل پر فون اٹھالیا گیا۔

''زہے نصیب سلمہ جی یہ آج ہمارے بھاگ کیسے جاگ گئے۔'' سلمہ کی آواز سن کر وہ جھٹ اٹھا۔

''ہاں بھئی واقعی تمہارے بھاگ جاگنے والے ہیں، تم نے پوچھا تھا ناں میری دوست شازیہ کے بارے میں۔ وہ سلونی سی پُرکشش نازک سی لڑکی۔''

''ہاں، ہاں بولو سلمہ کیا کہا اس سلونی نے؟'' وہ بے تابی سے پوچھنے لگا۔

''صبر کرو، حوصلے سے کام لو میرے بھائی...... اس نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے خود ہی سوچا کہ چلو تم پر رحم کردیا جائے، میں شازیہ کو منانے کی کوشش کررہی ہوں امید ہے کہ کامیاب ہوجاؤں گی۔'' وہ ایوں ہی شوخ ہوگئی۔

''ارے واہ تو کتنی بہترین کزن ہے میرے دل کے زخم بھرنے کے لیے تیار ہوگئی ہے، تمہارا بہت شکریہ کزن مانگو کیا چاہیے بدلے میں۔'' اس نے خوش ہوکر کہا۔

''بکومت میں رشوت خور نہیں ہوں، بس کبھی، کبھی تم جیسے غریبوں پر ترس کھانے کو دل کرتا ہے۔''

''شکریہ میڈم بس اب قرعۂ فال ہمارے نام نکال دیجیے ہم اور صبر نہیں کرسکتے۔'' وہ اور بھی شوخ ہونے لگا۔ ''بس ترس کھانے میں دیر مت کیجیے گا پلیز......''

''ٹھیک ہے میں کل تمہیں فون کروں گی تو مزید بات کروں گی۔'' سلمہ نے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

''ڈیئر کزن مجھے بس اتنا بتادیں مجھے کتنے دن، کتنی راتیں، کتنے گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ آپ کے فون کا انتظار کرنا ہے، مجھ غریب کا اتنا لمبا امتحان مت لیجیے گا۔''

''او کے اللہ حافظ!'' سلمہ نے جان چھڑانے کو فون بند کردیا۔

''سن لی ہیں ناں تم نے اس کی باتیں، میں نے اسی لیے اسپیکر کھول دیا تھا کہ تم بھی سن سکو۔''

''سلمہ مجھے تو ڈر لگتا ہے، بڑا شوخ سا بندہ ہے یار...... اور میں تو بزدل، ڈرپوک سی عورت کیسے اس کو خوش رکھ سکتی ہوں۔'' وہ واقعی سہمی ہوئی تھی۔

''ارے یار شازیہ، وہ شوخ ہے تو کیا ہوا۔ پاگل، سڑیل اور سخت مزاج بندے کے ساتھ زندگی گزارنا پڑے جوکھوں کا کام ہے، میں نے ایسی بہت سی شادیاں ناکام ہوتی اور گھر ٹوٹتے دیکھے ہیں، تم اب کسی وہم میں نہ پڑو...... اپنے رب سے بہتری کی دعا مانگو اور اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرو۔ میں بڑے ابا اور اماں سے کل ہی ملوں گی۔ جب تم آفس میں ہوگی، میں تمہارے گھر جا کر بات کرلوں گی۔ انشاء اللہ پاکستان والوں کو وہ مطمئن کرلیں گے، تم کوئی جرم کرنے نہیں جارہیں، تم بالغ ہو، یہ تمہارا شرعی اور قانونی حق ہے بس اب پریشان ہونا چھوڑ دو اور اٹھو میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔'' سلمہ نے اسکارف سر پر لیتے ہوئے گاڑی کی چابی اٹھائی اور اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔

☆☆☆

بڑے ابا کو قائل کرنے میں صرف چند منٹ لگے...... اور اماں تو ابا کی ہر بات پر لبیک کہنے کی شروع سے عادی تھیں۔

''سلمہ بیٹا تم نے تو بڑی عقل مندی کا فیصلہ کیا ہے، ہم سب تو اس بچی کو کولہو کا بیل بنائے ہوئے تھے، بیچاری دن رات محنت کرکے کھپتی جارہی تھی اور ادھر دیکھو اس کے گھر والے ہر ماہ ڈرافٹ سمیٹنے کے چکر میں رہتے ہیں۔ سب کی جائدادیں بن گئیں، لڑکیوں کی شادیاں ہوگئیں لیکن اس بچی کا کسی کو خیال نہیں آیا۔ حتیٰ کہ ماں نے بھی آنکھیں بند کر رکھی ہیں اس سے...... شاباش بیٹا تم نے ایک یتیم بچی کی زندگی کا فیصلہ کرکے بہت نیکی کمائی ہے۔'' بڑے ابا نے سلمہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑی محبت سے کہا۔

''میں نے کوئی احسان نہیں کیا، وہ میری بہن ہے اس کی عمر گزرتی چلی جارہی تھی۔ اس نے اپنے گھر والوں کے لیے بڑی محنت کی ہے اور یہ اس کا شرعی حق بھی ہے۔''

☆☆☆

اور پھر آناً فاناً ہی شازیہ کی شادی ایوب انصاری سے ہوگئی۔

ایوب انصاری نے اسے قیمتی زیورات اور ملبوسات سے لاددیا۔ جس گھر میں وہ دلہن بن کر گئی۔ وہ ایک محل نما گھر تھا۔ پنک اور وائٹ کلر کے کمبی نیشن سے گھر کو اس طرح آراستہ کیا گیا تھا کہ اِک خواب کا گمان ہونے لگتا۔

شازیہ کا شادی کا لہنگا بھی پنک تھا اور اس پر سلور اور گرے کام تھا۔ وہ شہزادیوں کی طرح اس گھر میں داخل ہوئی۔ ایوب خوشی سے پاگل ہورہا تھا۔ شازیہ کی طرف سے سارا انتظام سلمہ کی مرضی سے ہوا تھا۔ ملک اشرف صاحب نے بھی دل کھول کر خرچہ کیا اور اپنی سگی بیٹیوں کی طرح اسے گھر سے وداع کیا۔

اپنے گھر پہنچ کر اسے لگا جیسے وہ جیتے جی جنت میں پہنچ گئی ہے۔ ایوب بے پناہ محبت کرنے والا شوہر ثابت ہوا۔

☆☆☆

پھولوں بھری اس جنت میں پہنچ کر وہ ساری دنیا کو بھول جانا چاہتی تھی، وہ ہواؤں میں اُڑ رہی تھی، اسے ہر چیز ہنستی مسکراتی نظر آنے لگی۔

''جاب کو خیرباد کہہ دو اب تمہیں چند ہزار درہم کی نوکری کی ضرورت نہیں، یہ گھر اس گھر کی ایک، ایک چیز تمہاری مع اس معمولی انسان کے۔'' ایوب نے کافی کے بڑے مگ میں چمچ چلاتے ہوئے کہا۔

''ایسا تو مت کہیں...... آپ خود کو معمولی کیوں کہہ رہے ہیں؟'' شازیہ آہستہ سے بولی۔

''بھئی ایک عام سا بندہ ہوں۔ بلکہ ایک گناہ گار بندہ...... جس نے کبھی کچھ اچھا نہیں کیا لیکن قدرت نے ہمیشہ من چاہی مرادیں پوری کی ہیں۔'' وہ بولا۔

''اگر ہمیشہ آپ کی من چاہی مرادیں پوری ہوئی ہیں تو پھر آپ کو ہر وقت اوپر والے کا شکر ادا کرتے رہنا چاہیے۔''

''ہاں یار زبانی کلامی تو شکر ادا کرتا رہتا ہوں۔ ہاں، یہ تمہاری طرح پانچ وقت جانماز پر نہیں بیٹھتا۔'' وہ بڑی صاف گوئی سے کہنے لگا۔

''لیکن اب آپ بھی میرے ساتھ نماز پڑھا کریں گے۔'' اس نے ڈرتے، ڈرتے کہا۔

''نہ بھئی! یہ صبح سویرے اٹھ کر ہاتھ منہ دھونا اپنے بس میں نہیں۔''

''اسے ہاتھ منہ دھونا نہیں بلکہ وضو کرنا کہتے ہیں جو ہر نماز سے پہلے پانی سے ہی کیا جاتا ہے۔ ہم سب کو اپنے رب کے قریب جانے اور سجدۂ شکر ادا کرنے سے پہلے اپنے آپ کو پانی سے صاف کرنا پڑتا ہے اور پھر ہم نماز ادا کرسکتے ہیں اور یہ نماز ہم سب مسلمانوں پر فرض ہے۔'' اس نے دوپٹا سر پر اچھی طرح اوڑھتے ہوئے کہا۔

''نہ بھئی شازی جی، اس سے پہلے ہمیں کسی نے ایسا کرنے کو نہیں کہا...... ماں تو ہمیں چند دن کا چھوڑ کر اپنے رب کے پاس چلی گئی تھی۔ ہمیں کون کچھ سمجھاتا۔ بس زندگی اسی طرح گزرتی رہی... جس طرح ہم گزارتے رہے۔ ہمارے یار دوست بھی ہمارے جیسے ہی ہیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''اب آپ صرف یاروں کے یار نہیں ہیں، ایک بیوی کے شوہر اور اس خوب صورت جنت کے مالک

ہیں۔" ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ستارے سے جھلملانے لگے تھے۔

"اور جس کو قدرت نے مالک بنا دیا ہو اس کا فرض بنتا ہے کہ سب سے پہلے اپنے رب کا شکر ادا کرے۔ اس کے حضور میں سجدہ ریز ہو۔ اسی کا پیروکار ہو تو پھر اللہ پاک اس کی طرف زیادہ متوجہ ہو جاتے ہیں اس پر اپنا خاص کرم کرتے ہیں، اس کی ساری خواہشیں پوری کرتے ہیں۔" وہ آہستہ، آہستہ فری ہو کر بات کر رہی تھی۔

"بھئی شازو یہی بات تو یہ ہے ہماری خواہشیں تو پہلے بھی پوری ہوتی رہتی ہیں، دیکھیں ناں ہم نے تمہاری خواہش کی تھی تم مل گئیں۔ ہمارے پاس دنیا کی ہر آسائش ہے، ہماری اسٹیپ مدر نے بھی ہم سے بہت پیار کیا، ہمیں اپنے دوسرے بچوں کی طرح ہی پڑھایا لکھایا۔ حالانکہ ہم نے کبھی نماز ہی نہیں پڑھی کبھی، کبھار عید کی جمعہ کی نماز کا اتفاق ہو جاتا ہے۔" وہ سوالیہ نظروں سے شازیہ کو دیکھ رہا تھا۔

"لیکن اب آپ اور میں مل کر اس فرض کو ادا کریں گے کیونکہ اللہ پاک انسان کو زیادہ آسائشیں، زیادہ دولت دے کر آزماتے ہیں کہ میرا بندہ ان آسائشوں، ان کامیابیوں کے بعد آخر کب تک میرا شکر ادا کرتا ہے، اگر میں آپ کو مل گئی ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ پاک نے میری ڈیوٹی لگائی تھی کہ میں آپ کو یاد دلاؤں کہ آپ بہت اچھے انسان ہیں، پروردگار نے آپ کو نوازا ہے تو پھر بدلے میں انسان کو اپنا شکر ادا کرنے کی تلقین بھی کی ہے جو لوگ اس کا شکر ادا کرتے ہیں رب جلیل ان کا سہارا بن جاتا ہے اور یقین کیجیے جسے اس کا سہارا مل جاتا ہے وہ زندگی میں کبھی نہیں ڈگمگاتا۔ پروردگار نے مجھے اور آپ کو بہت نوازا ہے اور بدلے میں بس ایک سجدۂ شکر ہی تو ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ تو کیوں نہ ہم اس کی نوازشوں کا شکر ادا کریں۔"

"بھئی شازو تم تو بڑی اچھی باتیں کر لیتی ہو، اس وقت تو کوئی بڑی بی لگ رہی ہو۔ میرے دل پر تو تمہاری باتیں اثر کرنے لگی ہیں۔" وہ واقعی میں بہت متاثر لگ رہا تھا۔

"آپ کا بہت شکریہ کہ آپ کے دل پر میری باتیں اثر کرنے لگی ہیں ایوب صاحب میں تو ایک معمولی گناہ گار سی انسان ہوں، اگر میری باتیں آپ کو متاثر کر رہی ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کے اندر ایک انتہائی نیک انسان چھپا بیٹھا ہے۔ آپ بہترین والدین کی اولاد ہیں.... اگر آپ کو مذہب کی طرف رغبت نہیں تھی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ کو صحیح طور پر گائڈ نہیں کیا گیا تھا۔ اب انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔"

وہ بول رہی تھی تو اس کا چہرہ پُر نور نظر آ رہا تھا اور وہ اس نازک سی لڑکی کے سامنے گھٹنے ٹیکتا ہوا لگ رہا تھا۔

☆☆☆

ایوب انصاری کی سنگت میں زندگی بڑی خوب صورت ہو گئی تھی۔ جاب کا بوجھ سر سے اتر چکا تھا، محل نما بنگلے میں دنیا جہاں کے عیش و آرام کی دولت سے اس کی شخصیت نکھر آئی تھی وہ اور بھی پُرکشش لگنے لگی تھی۔

ایوب آفس سے کئی مرتبہ فون کرتا اور جب بھی وہ ریسیور اٹھاتی سب سے پہلے یہی شعر سنایا جاتا۔

"زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے"

اور جواب میں اس کا ایک مترنم سا قہقہہ ماؤتھ پیس میں گونج اٹھتا، زندگی میں ہر طرف بہاریں ہی بہاریں تھیں۔

بس صرف ایک بات کی کمی تھی یعنی ماں اور بہن، بھائیوں کی محبت کی۔ تایا اشرف کے اور سلمہ کے کہنے پر ابھی تک اس نے اپنی شادی کی اطلاع وہاں نہیں پہنچائی تھی۔ جس کا اکثر اسے خیال بھی آتا۔ اس روز سلمہ ان کے گھر آئی ہوئی تھی۔ دونوں میاں، بیوی بہت خوش تھے۔ سلمہ کو یہ سب دیکھ کر دلی خوشی ہوئی۔ بہت خوشگوار ماحول میں کافی پی گئی۔ تینوں آؤٹنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ راستے میں سلمہ نے بتایا کہ اس نے پاکستان شازیہ کے گھر والوں سے رابطہ کیا تھا اور انہیں اس کی شادی کا بتا دیا۔ بس یہ سننا تھا کہ خالہ جان تو آگ بگولا ہو گئیں۔ کہنے لگیں کہ اس نے شادی ہم سے پوچھے بغیر کیوں اور کس کی مرضی سے کی۔ میں نے بہت سمجھایا اور قائل کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا غصہ کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا اس لیے میں نے تو جلد ہی اجازت لے لی اور فون بند کر دیا۔

بے شمار لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ شازیہ کا دل زور، زور سے دھڑکنے لگا۔

"خالہ جان کس قدر غلط سوچتی ہیں، انہیں یہ احساس نہیں کہ وہ بیٹی جس نے اپنا سکھ، چین اپنے گھر والوں کی ضروریات اور خواہشوں پر قربان کر دیا' اس کا بھی خوشیوں پر حق ہے۔" سلمہ افسردہ لہجے میں بولی۔

"میں نے سلمہ تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ امی جان اور بھائیوں سے پہلے مشورہ کر لو پھر کوئی بات آگے بڑھانا۔" شازیہ خاموش نہ رہ سکی وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو شازیہ میری جان' میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر سلمہ پہلے بھی بات کرتی تو وہاں سے انکار ہو جاتا۔ کیونکہ تم تو ان کے لیے سونے کے انڈے دینے والی مرغی تھیں، تم نے تو گھر کی کایا پلٹ دی۔ پھر تمہیں بھلا شادی کی اجازت کیسے ملتی۔" وہ تو اس کے تمام حالات سے آگاہ تھا۔

"لیکن پھر بھی بیٹی ہونے کے ناتے مجھے اجازت لینی چاہیے تھی، بتانا چاہیے تھا۔" وہ بدستور افسردہ تھی۔

"فضول ٹینشن مت لو، تم نے مردوں کی طرح اس گھر کو بنایا سنوارا ہے، بڑے بیٹوں کی طرح تمام فرائض ادا کیے ہیں، تمہاری خوشیوں کا تو کسی کو احساس نہیں تھا کہ تم نے شادی کر کے اپنا حق حاصل کیا ہے کوئی جرم نہیں کیا۔ آخر کو تمہارے تایا کی بھی مرضی شامل تھی۔" سلمہ اسے دلاسا دے رہی تھی۔

"میں نے تو سمجھا تھا کہ خالہ جان ماں ہونے کی حیثیت سے تمہاری شادی پر خوش ہوں گی لیکن بھئی کمال ہے وہی سب سے پہلے آگ بگولا ہوئیں۔ چلو ٹھیک ہے جو ناراض ہوتا ہے سو مرتبہ ہوتا رہے تم کان بند کر لو اور ابھی پاکستان رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں، تم بالغ ہو کوئی تمہیں چیلنج نہیں کر سکتا۔" سلمہ بولی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی سامنے کوئی بہترین ہوٹل تھا۔

"چلو بھئی پہلے کچھ پیٹ پوجا ہو جائے کیا خیال ہے کزن؟"

"بھئی نیکی اور پوچھ، پوچھ...... بڑا بہترین خیال ہے ایوب بھائی۔"

"ڈیئر کزن تم دراصل پہلی بار ہم دونوں کی مہمان ہو اور تمہاری اچھی سی دعوت تو ہمارا فرض اور تمہارا حق ہے۔" وہ شوخی سے بولا۔

پھر پُرتکلف کھانے سے فارغ ہو کر وہ گھمانے پھرانے لے گیا تا کہ شازیہ کا دل لگا رہے۔

☆☆☆

اگلے دن وہ دونوں ابھی ناشتا کر رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔ چائے کا مگ اس نے ٹیبل پر رکھا اور ٹیلی فون کی طرف بڑھ گئی۔

"آداب بڑے ابا۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"میں آپ سے ناراض ہوں بڑے ابا، آپ مجھے بیاہ کر بھول چکے ہیں۔ مڑ کر میری خبر بھی نہیں لی۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی۔ "تو ٹھیک ہے' میں سارے گلے شکوے آپ کے آنے پر کروں گی بس جلدی سے آ جائیں۔ ٹھیک ہے آپ بڑی اماں کو ضرور لے کر آئیں میں انتظار کر رہی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

وہ مسکراتی ہوئی واپس ناشتے کی ٹیبل کی طرف آئی۔ ایوب نے اسے دیکھا تو ہنس دیا۔

"گالوں کی لالی بتاتی ہے کہ کوئی بہت پیارا آ رہا ہے۔"

"جی ہاں، وہ میرے بڑے ابا اور اماں آ رہی ہیں۔" وہ خوشی سے بتانے لگی۔

"بھئی بڑے ابا تو بڑے نصیب والے ہیں جن کے آنے کی خوشی میں ہماری شازی کے گالوں پر سرخی آ گئی ہے۔ ہم تو ان کے پاؤں پکڑ لیں گے کہ ہمارے

غریب خانے میں ہی رک جائیں، ہماری بیگم کا چہرہ کِھلا، کِھلا رہے گا۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ وہ شرماتے ہوئے اپنا کپ اٹھا کر چائے کے چھوٹے، چھوٹے سپ لینے لگی۔

☆☆☆

اس نے جلدی، جلدی گھر کی صفائی ستھرائی شروع کردی۔ نئی بیڈ شیٹیں نکال کر بدلنے لگی۔

"کھانے میں کیا بناؤ گی یا پھر ایسا کریں گے کہ کھانا باہر ہی کھالیں گے۔" اس نے اخبار ایک طرف رکھ کر اسے مخاطب کیا۔

"نہیں، بڑے ابا اور اماں ہوٹلنگ پسند نہیں کرتے۔ میں خود سب کچھ بناؤں گی۔" اس نے بڑی محبت سے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ ہاتھ بٹاؤں گا آج تو ویسے بھی چھٹی ہے۔ دونوں نے مل کر گھر کی صفائی ستھرائی کی اور پھر کچن میں گھس گئے۔

"آپ یہاں کیا کررہے ہیں؟"

ابھی وہ کچن میں برتن وغیرہ سمیٹ رہا تھا کہ شازیہ نے اس کے ہاتھ سے برتن لے لیے۔

"بھئی آپ کی مدد کررہا ہوں۔"

"نہیں بالکل نہیں، آپ واش روم جائیں، کپڑے میں نکال دیتی ہوں آج جمعہ ہے اور آپ نماز جمعہ کی ادائیگی کو جائیں گے۔"

"بیگم ہم تو آپ کا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں آپ خواہ مخواہ اپنے اوپر زیادہ کاموں کا بوجھ ڈال رہی ہیں۔ دیکھیں ناں آپ تو نازک سی ہیں تھک جائیں گی۔" وہ باقاعدہ منت کررہا تھا۔

"بالکل نہیں، آپ جمعہ کی نماز کے لیے جارہے ہیں اور میں کوکنگ کررہی ہوں انشاء اللہ دو بجے آپ کو ہر چیز ریڈی ملے گی۔" اس نے کٹنگ بورڈ پر لہسن کے جوے مسلتے ہوئے کہا۔

"دیکھو ناں شازی...... یار تم صبح، صبح نماز کے لیے اٹھادیتی ہو میری نیند بھی پوری نہیں ہوتی اور اب تم جمعہ کے لیے اصرار کررہی ہو، یار کیوں تنگ کرتی ہو؟"

"اللہ معاف کرے، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کو کچن کے کاموں کی ضرورت نہیں ہے، آپ مسجد جائیں بڑے ابا بھی نمازِ جمعہ کے بعد ہماری طرف آئیں گے۔ اس وقت تک کھانا آپ کو تیار ملے گا۔"

اس نے بڑی محبت سے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں اس کے چہرے کو تھام کر کہا تو وہ جھوم اٹھا۔

"واہ بھئی واہ بیگم صاحبہ آپ کو منانا خوب آتا ہے، یہ آج ہم پر اتنی عنایت بھی اسی لیے ورنہ...... چلو بھئی تم بھی کیا یاد کروگی کہ تم نے ماں کی طرح حکم چلایا اور آپ کا شوہر سرپٹ بھاگ پڑا۔" وہ کچن سے نکل کر واش روم کی طرف لپکا۔

اور پھر پندرہ، بیس منٹ بعد سر پر سفید ٹوپی رکھے، سفید کلف لگے شلوار سوٹ میں اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ...... آج تو چہرے پر نور ہی نور آرہا ہے۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔" اس کی آنکھوں سے محبت امڈ، امڈ کر آرہی تھی۔

"السلام علیکم...... ایوب صاحب مبارک ہو، سنا ہے آپ نے شادی کرلی ہے اور یہ اتنی بڑی تبدیلی بھئی ہماری بھابی جان تو بڑی بھاگوان ثابت ہوئی ہیں، زہے نصیب، آپ مسجد میں آئے ہیں تو گویا بہار آگئی ہے۔" ملک مشتاق نے آگے بڑھ کر مصافحہ کرتے ہوئے بڑی گرم جوشی کا اظہار کیا۔

"بس ملک صاحب بھی، کبھی انسان کو پتا بھی نہیں چلتا اور زندگی کا رخ بدل جاتا ہے۔" مسجد میں ایوب انصاری کی بہت لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ مبارک بادوں کا سلسلہ چل نکلا...... وعظ شریف اور نمازِ جمعہ کے علاوہ بہت سے دوستوں سے ملاقات اور پھر ان دیکھی بھابی کی تعریفیں دوستوں کی زبان سے سن کر وہ بڑا لطف لے رہا تھا۔ گھر پہنچا تو بڑے ابا اور اماں آچکی تھیں۔

"وہ میں ذرا مسجد میں لیٹ ہوگیا سوری۔" اشرف صاحب نے اسے گلے سے لگا کر پیار کیا۔ اس

نے سلام کرنے کے بعد معذرت کی۔

"تم نے تو خوش کردیا۔" اماں نے بھی گلے لگا کر پیار کیا۔

"آپ نے تو مسجد میں دل ہی لگالیا۔" شازیہ چھوٹی ٹرے میں پانی کا گلاس رکھے کچن سے نکل کر لاؤنج میں آئی اور ایوب کی طرف گلاس بڑھایا اس نے پانی کا گلاس پکڑا اور چیئر پر بیٹھ گیا...... ایک گھونٹ لیا اور پھر تائی اماں سے مخاطب ہوا۔

"اماں جی یہ سب آپ کی بیٹی کا کمال ہے ورنہ میں کہاں مسجدوں میں جاتا تھا۔" خوشی اور تشکر اس کے چہرے پر بکھر گیا۔

"الحمد للہ بیٹا...... وہ لوگ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں جن کو زندگی کا ساتھی اچھا ملتا ہے اور اس کی دنیا بدل جاتی ہے۔"

"کھانا تیار ہے اور ٹیبل پر آپ کا انتظار کررہا ہے۔" سب ڈائننگ روم کی جانب بڑھ گئے۔

ڈائننگ ٹیبل پر تو رنگوں اور خوشبوؤں کی بہار آچکی تھی۔

"آپ یہاں تشریف رکھیں ابا جی۔" ایوب نے چیئر نکال کر ملک اشرف کو اشارہ کیا اور دوسری چیئر پر تائی اماں کو بٹھایا۔ ایوب اور شازیہ بھی بیٹھ چکے تھے۔

"بیٹا یہ اتنا کچھ بنانے کی کیا ضرورت تھی کیوں ہلکان ہوتی رہی ہو۔ گھر میں تمہارے ابا کو میں پرہیزی کھانا دیتی ہوں لیکن جب کہیں مہمان جاتے ہیں تو پھر تو یہ مجھ سے نظریں نہیں ملاتے مبادا کہ میں انہیں کھانے سے روک لوں۔" بڑی اماں بڑے دھیمے انداز میں شازیہ کو بتارہی تھیں۔ مٹن بریانی، فرائڈ فش، چکن کے کوفتے، مرغ مسلم، دو طرح کا میٹھا بنایا تھا۔ چپل کباب، ایوب بازار سے لے آیا تھا۔

"میں نہ کہتا تھا کہ جس روز اپنی بیٹی کے گھر جاؤں گا پیٹ بھر کر کھاؤں گا، یہ ظالم عورت تو مجھ سے نوالہ بھی چھین لیتی ہے۔" بڑے ابا نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"جی ابا میں نے سب آپ کے لیے ہی بنایا ہے، مجھے پتا ہے اماں آپ کو ہر وقت پھیکے کھانے ہی بنا کر دیتی ہیں۔" اس نے بڑی پلیٹ میں ابا کے لیے بریانی نکالی اور ساتھ میں سلاد اور رائتہ رکھا۔ "آپ بسم اللہ کریں میں آپ کو فش نکال کر دیتی ہوں اماں آپ کو بھی نکال دوں؟"

"نہیں بیٹا، میں لے لوں گی تم اپنے ابا کے لاڈ اٹھاؤ۔" انہوں نے ہنستے ہوئے ہاٹ پاٹ میں سے ایک روٹی نکال کر پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

ایوب نے کولڈ ڈرنکس ٹیبل پر رکھیں تو اماں نے جھٹ منع کردیا۔

"بیٹا اپنے ابا کے سامنے نہ رکھو انہیں ڈاکٹر نے منع کررکھا ہے۔"

"ارے بھلی لوک آج کے دن سب جائز ہے، ہم سب دوائیں کھا چکے ہیں۔ انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔"

کھانے کے ساتھ چھوٹی موٹی نوک جھوک ہوتی رہی۔ سب کو بہت مزہ آرہا تھا۔ بزرگوں کے آنے سے گھر میں رونق ہوگئی تھی۔

کھانا ختم ہوا تو سب لاؤنج میں آبیٹھے۔ شازیہ نے کانچ کی چھوٹی، چھوٹی خوب صورت پیالیوں میں قہوہ لا کر ٹیبل پر رکھ دیا۔ گپ شپ لگاتے ہوئے سب قہوے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ فارغ ہو کر تائی اماں نے اپنے ساتھ لائے ہوئے گفٹ دونوں کو دے دیے۔ شازیہ بہت خوش تھی۔

"اماں میں آپ کو دو چار دن اپنے پاس رکھوں گی۔"

"نہیں بیٹا، تمہیں مل لیا ہے اب تم ہمارے ساتھ چلو۔ ایوب تم بھی ہماری طرف آنا۔ تم بیٹا شازیہ کو اب ایک ہفتہ ہماری طرف ہی رہنے دینا۔ آج ہم اسے لینے آئے ہیں، شادی کے بعد ہماری طرف رہنے نہیں آئی ناں۔"

"مگر اماں میرا کیا ہوگا؟ میں شازیہ کے بغیر کیسے رہ پاؤں گا۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"کچھ نہیں ہوتا، پہلے بھی تو تم زندگی گزار رہے تھے۔

بچی بہت دن سے تمہارے پاس ہے اب چند دن ہمارے پاس رہ لے، ہم دونوں اداس ہیں اس کے بغیر......"

"اماں میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں، صبح صبح سیدھا آفس پہنچ جاؤں گا۔" اس نے گویا بڑی حسرت سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"چلو بیٹا، تم بھی جب تک تمہارا دل کرتا ہے وہاں رہنا بلکہ گاڑی تمہارے پاس ہے، تم وہیں سے صبح ہر روز آفس چلے جایا کرنا ہمیں بھی رونق رہے گی۔" بڑے ابا نے ایوب کے دل کی بات کہہ دی تو وہ بچوں کی طرح اچھل پڑا اور بڑے ابا سے لپٹ گیا۔

"آپ بڑے گریٹ ہیں بڑے ابا......" اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں تیار تھے۔

☆☆☆

ملک اشرف اعوان کے دو بیٹے تھے۔ دونوں امریکا میں اپنی فیملیوں سمیت سیٹل تھے۔ بیٹی نہیں تھی اس لیے شازیہ کو بیٹیوں کی طرح ہی اپنے پاس رکھا اور پھر شادی بھی کی۔ لیکن پاکستان میں شازیہ کے گھر والے جو سالہا سال سے شازیہ کی کمائی کھا رہے تھے اس کی شادی ہو جانے پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خفا بیٹھے تھے اور شازیہ کو دلی دکھ تھا اس بات کا۔

"شازی بیٹا رات کو کیا کھانے کا پروگرام ہے، ایوب جو شوق سے کھاتا ہے تم بنا لو یا پھر باہر سے منگوا لو۔ تم پہلے ہی بہت تھک چکی ہو۔" اماں نے بڑی محبت سے اس کی پیشانی سے بالوں کی لٹ ہٹا کر کہا۔

"آپ ٹینشن نہ لیں اماں، میں کھانا ساتھ ہی پیک کرلائی ہوں، جب ایوب نے بھی تیاری پکڑ لی تو میں نے سوچا کہ کھانا کیوں فریج میں رکھوں ساتھ ہی لیے چلتے ہیں۔ میرے ابا جان کی پسند سے کھانا بنایا تھا میں نے۔"

"دیکھو لو بھئی بیگم ہماری بیٹی کو ہماری پسند کا کتنا خیال ہے۔" بڑے ابا نے نثار ہوتے ہوئے اسے ساتھ لگا کر کہا۔

"ملک صاحب بیٹیاں ہوتی ہی ایسی ہیں اپنے سے زیادہ ماں، باپ کا خیال رکھنے والی۔" شازی باسکٹ میں سے کھانے کے ڈبے فریج میں رکھنے شروع کرنے لگی تو ایک دم اس نے فریج کا سہارا لے کر آنکھیں بند کرلیں۔ ایوب سب کچھ چھوڑ چھاڑ تیزی سے شازی کی طرف بڑھا۔

"کیا بات ہے شازی؟" اس نے دونوں کندھوں سے تھام کر اسے سہارا دیا۔ اس نے سر ایوب کے کندھے سے لگا دیا۔ اماں دوڑ کر ان دونوں کی طرف بڑھیں۔

"اللہ خیر بیٹا اسے اٹھاؤ اور اِدھر میرے بیڈ پر لٹا دو۔" ایوب نے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور بیڈ پر لٹا دیا تائی اماں چمچ سے پانی اس کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"میں نہ کہتا تھا کہ بچی تھک جائے گی سارا دن کچن میں ہلکان ہوتی رہتی ہے۔" بڑے ابا فکر مندی سے بولے۔

"ملک صاحب آپ جائیں اپنے کمرے میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" تائی اماں نے تجربے کی آنکھ سے شازی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور ایوب ڈاکٹر صاحب کو لے کر اندر داخل ہوا۔ جو اُن کی ہی بلڈنگ میں رہتے تھے۔

"ماں جی کیسی ہیں آپ اور اس قدر پریشان کیوں ہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ڈاکٹر صاحب نے شازیہ کی کلائی ہاتھ میں لے کر نبض چیک کرتے ہوئے کہا...... پھر بلڈ پریشر چیک کرنے لگا پھر چند سوالات کیے اور کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیے۔

"مبارک ہو ماں جی......! آپ نانی بننے والی ہیں۔" ڈاکٹر نے جاتے، جاتے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خیر مبارک ڈاکٹر صاحب آپ میری بچی کے لیے بس طاقت کی دوائیں لکھ دیں۔ کمزوری بھی بہت ہے، اپنا خیال تو رکھتی ہی نہیں۔"

"جی بجا فرمایا آپ نے...... ان کا بہت خیال رکھنا پڑے گا بلڈ پریشر بھی کافی لو ہے۔" ڈاکٹر صاحب

نے دوائیں لکھتے ہوئے کہا۔ "کمزوری بہت ہے...، انشاءاللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔"

ایوب بھی خوشی سے کھل اٹھا جب شازیہ نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔

بڑا خوب صورت اور بڑے روشن، روشن دن کا آغاز ہوا تھا۔

تائی اماں نے چائے کے تین کپ ٹرے میں رکھے اور ایک گلاس دودھ میں چاکلیٹ گھول کر شازیہ کو دیا۔

"ملک صاحب آپ نانا بننے والے ہیں مبارک ہو۔" انہوں نے چائے کی پیالی سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"خیر مبارک بھئی، تم اس کا بہت خیال رکھو اسے ابھی گھر مت جانے دینا۔ ایوب کو اگر کوئی پرابلم نہیں تو ٹھیک ہے ورنہ وہ چلا جائے تاکہ جاب کا حرج نہ ہو لیکن شازیہ کو ہم ابھی نہیں جانے دیں گے۔" ملک صاحب نے چائے کا کپ ٹرے میں سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے کہہ دوں گی...... ویسے وہ آپ کے پاس ہی آ کر چائے پیے گا۔ خیر سے فجر کی نماز بھی پڑھی ہے اور سورۂ یاسین اور سورۂ رحمان بھی اس نے پڑھی ہے۔ نماز کی پابندی کرنے لگا ہے۔" اماں نے خوش ہو کر بتایا۔

"یہ تو اچھی بات ہے کوئی بھی عورت اپنے شوہر کو راہِ راست پر لا سکتی ہے اور کوئی بھی شوہر اپنی بیوی کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔"

"ماشاء اللہ ہماری بیٹی نے تو ایوب کی کایا ہی پلٹ دی۔" بڑی اماں نے بڑے فخر سے ایوب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"شکریہ بڑی امی آپ کا اور آپ کی بیٹی کا بھی جس نے میری زندگی بدل دی ہے۔"

☆☆☆

شازیہ کی زندگی میں مزید اِک نیا پن آ گیا تھا۔ اپنے آپ میں چینج آ گیا تھا۔ بڑی اماں نے پورے پندرہ دن اسے اپنے پاس رکھا۔ اس کی طبیعت بہت

بس نہیں آئی

میاں جی کا تبادلہ آزاد کشمیر ہوا، میں بچوں کی تعلیم کی وجہ سے اسلام آباد میں مقیم رہی۔ البتہ چھٹیوں میں دو ماہ کے لیے مظفر آباد گئے۔ واہ بھئی کئی کنال پر نیا بنگلا، خانساماں، ڈرائیور موجود مختصر سامان کے ساتھ اچھا وقت گزرا۔ گھر میں فریج نہ تھا سو کول باکس (cool box) سے گزارہ ہو گیا۔ سنا تھا پہلے افسران نے بھینس، بکریاں بھی پال رکھی تھیں۔ سبزے کی کمی نہ تھی۔ ہمارے میاں جی کتابی دنیا کے باسی دو وقت سادہ کھانا اور اچھی چائے ان کی پسند تھی۔

بچے ہمراہ تھے سو کھیلتے کودتے ان کو گیارہ بجے بھوک لگ جاتی۔ ادھر میں بار، بار کچن میں جاتی کہ کم از کم آلو کے قتلے ہی تل کے بچوں کو کھلا دوں...... خانساماں اکیلا کھانا پکانے کا عادی تھا۔ میری موجودگی اسے نہ بھاتی۔ "آپ جائیں میں کرلوں گا۔" جب کھانا بنانے کے آثار نظر نہ آئے تو آخر پوچھ ہی لیا کہ بھئی ابھی تک پیاز وغیرہ بھی نہیں کاٹی۔ اوہ جی! بس نہیں پنڈی سے آئی۔ ارے بابا، میرے کھانے کا بس سے کیا تعلق؟ بولے "جی وہ پنڈی سے روزانہ تازہ سبزی لے کر بس آتی ہے تو پھر میں جا کر لاتا ہوں اور پکاتا ہوں۔" ارے! کیا ٹماٹر، آلو بھی تم لوگ خود نہیں اگاتے؟ معلومات حاصل کیں، ڈرائیور سے پوچھا۔ پتا چلا مقامی طور پر لوگ صرف اپنی ضرورت کی سبزی، مکئی اگاتے ہیں بڑے پیمانے پر کاشتکاری نہیں ہوتی سوائے مکئی کے۔ اللہ رحم کرے، جو قوم خود کفیل نہیں ہو سکتی، دوسروں کے سہارے جیتی ہے ان کی بس اسی طرح آتی رہے گی۔ باقی آپ خود سمجھدار ہیں۔

تحریر و مشاہدہ...... فریدہ افتخار، اسلام آباد

خراب رہنے لگی تھی۔ کھانا پینا نہ ہونے کے برابر تھا۔ کوئی چیز اندر ٹھہرتی نہیں تھی۔ فوراً الٹی ہو جاتی، چہرہ بڑا کمزور ہو گیا تھا ایوب بہت خیال رکھتا گھر میں ہوتا تو ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی کوشش کرتا۔ اسے اپنے ہاتھ سے کھلانے کی کوشش کرتا لیکن جب آفس چلا جاتا تو وہ ادھ موئی بستر پر پڑی رہتی۔ ڈاکٹر سے مکمل چیک اپ اور دوائیں وغیرہ باقاعدگی سے دی جاتیں۔ بڑے ابا نے فون کیا تھا کہ اگر شازی کی طبیعت ٹھیک نہیں تو ہمارے پاس چھوڑ جاؤ لیکن وہ خود جانا نہیں چاہتی تھی اسے بڑے ابا کے سامنے یوں الٹیاں کرتے رہنا اور بستر پر لیٹے رہنا اچھا نہیں لگتا تھا اور ایوب بھی اسے خود سے دور نہیں بھیجنا چاہتا تھا۔ سلمہ سے اس نے کہہ دیا تھا کہ کسی میڈ کا بندوبست کر دے جو مستقل شازیہ کے پاس ہی رہے گھر کا کام اور شازیہ کی دیکھ بھال کرے۔

☆☆☆

وہ پائن ایپل اور سیب کا جوس نکال رہا تھا کہ سیل فون پر سلمہ کا نمبر روشن ہو گیا۔ اس نے جوسر کا سوئچ بند کر کے فون آن کیا۔

''ہیلو کزن...... کیسی ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں ایوب، شازیہ کا کیا حال ہے؟'' وہ بولی۔

''کزن تم اتنی بے حس تو ہرگز نہیں تھیں کیسی ڈاکٹر ہو کہ اپنی دوست کو دیکھنے نہیں آئیں؟'' وہ شکوہ کناں تھا۔

''فوراً گلے شکوے کرنے لگ جاتے ہو پہلے یہ پوچھو کہ میں نے کیا بتانے کے لیے فون کیا ہے؟'' وہ بولی۔

''جلدی سے کہہ بھی چکو کہ تم نے اب میرے لیے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے؟''

''تم تو اتنے بے صبرے ہو جاتے ہو اچھا سنو، میں دراصل شازیہ کے لیے ایک نوکرانی کا بندوبست کرنے میں لگی ہوئی ہوں۔ ایک تیرہ، چودہ سالہ بچی ہے جسے کوئی فیملی پاکستان سے بچے کی دیکھ بھال کے لیے لائی تھی لیکن ان کے اور بچی کے درمیان کوئی جھگڑا۔ ہوا ہے، لڑکی اب ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی اور پاکستان بھی نہیں جانا چاہتی۔ میں اس سے ملنے کے بعد فیصلہ کروں گی کہ اسے تمہارے گھر میں رکھا جا سکتا ہے کہ نہیں۔''

''اوہ ڈیئر کزن، تم تو ہر بار فرشتہ بن کر آتی ہو۔ بھئی تم جیسے لوگ جنت میں جانے والوں کی لائن میں سب سے آگے ہوں گے۔'' وہ خوش ہو کر کہہ رہا تھا۔

''مکھن مت لگایا کرو خواہ مخواہ میں...... تم بھی جنت میں جانے والے عمل کر لیا کرو، تمہارا دل نہیں کرتا جنت میں جانے کو؟'' سلمہ نے کہا۔

''مجھے دراصل شادی کے بعد جنت، دوزخ کا پتا چلا ہے۔ پہلے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا، یہ بیگم صاحبہ ہر وقت صراط مستقیم پر چلانے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔''

''بیگم کی باتوں کا کچھ اثر بھی لیتے ہو کہ بس باتیں بنانی ہی آتی ہیں۔'' سلمہ نے چھیڑنے کے لیے پوچھا۔

''محترمہ آپ خود آ کر اپنی فرینڈ سے پوچھ سکتی ہیں۔''

''اچھا چلو ٹھیک ہے، میں انشاء اللہ دو دن میں ہی اس بچی کا پتا لگا لوں کہ حقیقت کیا ہے پھر میں اسے ساتھ لے آؤں گی۔''

''تھینک یو سلمہ...... بہت شکریہ تمہارا...... میں تمہارا انتظار کروں گا۔'' اور فون بند ہو گیا۔

☆☆☆

ملک اشرف صاحب پھل اور اماں کے ہاتھ کے بنائے کھانے اور شازیہ کا فرمائشی اچار لے کر اور سلمہ آگے پیچھے ہی شازیہ کے گھر پہنچے۔ سلمہ ایک تیرہ، چودہ سالہ سانولی سی بچی کے ساتھ لے کر آئی تھی۔

''بڑے ابا یہ فرحت ہے، یہ بہاول پور، پاکستان سے آئی تھی...... ایک سال ابھی پورا نہیں ہوا کہ اس فیملی کے ساتھ اس کا جھگڑا ہو گیا ہے۔ غریب فیملی سے تعلق ہے اس لیے واپس نہیں جانا چاہتی۔ میں نے شازیہ کے لیے اسے لے لیا ہے۔''

''مگر سلمہ بیٹا تمہیں تسلی ہے؟ اس کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟'' بڑے ابا نے چائے کا کپ شازیہ

کے ہاتھ سے لیتے ہوئے سوال کیا۔

''جی بڑے ابا...... میں نے پورا ہفتہ کھوج لگائی ہے۔'' اور پھر وہ تفصیلات بتانے لگی۔

فرحت کے آ جانے سے گھر میں رونق ہو گئی شازیہ کا دل بھی لگ گیا۔ وہ گھر کا کام دل لگا کر کرتی تھی۔ جب فارغ ہوتی شازیہ کے سر میں تیل ڈال کر مالش کرتی، پیروں کے تلوؤں میں تیل لگاتی۔ کنگھی کرتی، کمر دباتی۔ شازیہ بہت خوش تھی کھانا ٹائم پر بناتی اور جب ایوب گھر میں آ جاتا تو شازیہ اور فرحت کو گپیں لگاتے دیکھ کر خوش ہوتا۔ ایک بات تھی جب ایوب گھر میں ہوتا تو فرحت اس کے کام شازیہ کے حوالے کر دیتی۔

''باجی آپ خود صاحب کو کپڑے دیں، کھانا دیں چائے دیں۔ بنا کر میں ہی دوں گی لیکن بھائی کو آپ ہی دیں گی۔'' فرحت نے پلیٹ میں سلاد سجاتے ہوئے کہا تو شازیہ ہنس پڑی۔

''بھئی یہ کیا منطق ہے تمہاری...... سارا دن کام تم کرو اور نمبر میرے بن جائیں؟''

''نہیں باجی، یہ بات نہیں آپ اپنے میاں کے سارے کام خود کریں گی تو محبت میں اضافہ ہوگا۔ صاحب کبھی غافل نہیں ہوں گے اور میں اپنی باجی کا گھر ہمیشہ آباد دیکھنا چاہتی ہوں، اللہ نظر بد سے محفوظ رکھے۔'' اس نے بڑی پتے کی بات بتائی۔

''فرحت تم خوش تو ہو، میرے گھر میں دل لگ گیا ہے کہ ایویں ہی مجھے خوش کرتی رہتی ہو۔'' شازیہ نے اچانک سوال کر دیا اور فرحت کا چہرہ بجھ سا گیا۔

''باجی ہم غریبوں کا دل ہوتا ہی کہاں ہے، جب ہم اپنی غربت سے تنگ آ کر اپنے گھر سے نکلتے ہیں تو اپنا دل نکال کر وہیں کہیں اینٹوں کے بھٹے میں ڈال دیتے ہیں اور اس ظالم آگ میں دل کے ساتھ، ساتھ ساری خواہشیں، آرزوئیں، محبتیں سب جل کر راکھ ہو جاتی ہیں پھر کبھی اپنی ذات، اپنے وجود کے بارے میں سوچنے کا خیال ہی نہیں آتا۔'' فرحت کی آنکھوں کے کٹورے چھلک جانے کو تیار نظر آنے لگے۔ شازیہ کو اس کی باتیں سن کر دھچکا سا لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جب وہ اپنے گھر والوں کی غربت مٹانے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ وہ بھی اپنی خواہشیں، اپنے جذبات، اپنی محبتیں جو اپنی فیملی سے وابستہ تھیں سب گروی رکھ کر آئی تھی۔ آج بھی وہ سارے جذبے وہیں گروی رکھے پڑے تھے۔ سود بمبرابر ادا کر رہی تھی۔ اس کا دل بھر آیا اور بڑھ کر فرحت کو گلے لگا لیا۔

''دل چھوٹا نہ کرو فرحت ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے زندگی ہر ایک سے خراج وصول کرتی ہے۔ بس اس کی شکلیں الگ، الگ ہوتی ہیں، اس امتحان سے سب گزرتے ہیں جن کے سینے کو ٹٹول کر دیکھو گی اسی میں دبی ہوئی چنگاریاں تمہارے ننھے ہاتھ جلا دیں گی۔ یہی زندگی ہے اور ہم اس سے بھاگ نہیں سکتے۔ یہ اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب موت اپنی آغوش کھولے ہمیں اپنی دامن میں سمیٹ لے گی پھر سکون ہی سکون ہوگا۔'' شازیہ کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا کن زخموں کے ٹانکے کھل گئے تھے کہ سارے وجود کو درد نے جکڑ لیا تھا آنکھیں بے آواز ہی برسنے کو تیار ہو گئی تھیں۔

فرحت کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے شازیہ کو دونوں کندھوں سے تھام لیا۔

''بس، بس باجی یہ آپ کو کیا ہوا ہے، میں تو سمجھتی تھی کہ آپ جیسے امیر لوگ بڑے خوش نصیب ہوتے کوئی دکھ ان کے قریب نہیں پھٹکتا۔ یہ تو آج پتا چلا کہ دکھوں کو ہر بندہ تھپکی دے کر سلا چکا ہوتا ہے۔'' یہ غمناک سی گفتگو ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ باہر ایوب کی گاڑی آ کر رکی شازیہ فوراً واش روم میں گھس گئی۔

فرحت نے دروازہ کھولا اور ٹیبل پر شیشے کی چھوٹی سی ٹرے میں پانی کا گلاس رکھ کر ایوب کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔

''سلام صاحب جی......!''

''شازی کدھر ہے؟'' ایوب نے بے چینی سے پوچھا۔

''باجی واش روم میں ہیں، آج آپ کچھ پہلے آ گئے

ہیں ورنہ اس وقت تک وہ چینج کر چکی ہوتی ہیں۔"

اتنے میں وہ لاؤنج میں آگئی تھی وہ بڑی کھلی، کھلی لگ رہی تھی پنک اور بلیک پرنٹڈ کرتا بلیک شلوار اور پنک دوپٹا اس پر بڑا نچ رہا تھا۔ برائے نام سا میک اپ اس کی شخصیت میں چار چاند لگا رہا تھا۔

"ماشاء اللہ...... چشم بدور...... بیگم صاحبہ آج تو آپ نے خوش کر دیا...... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" وہ دل و جان سے نثار ہونے کو تیار تھا۔

"آج ڈاکٹر کی طرف جانا تھا میں نے سوچا جلدی تیار ہو جاؤں۔"

"جی نہیں، ہم نہیں بلکہ ڈاکٹر سلمہ خود تشریف لا رہی ہیں وہ کہتی ہیں کہ میں گھر پر آجایا کروں گی تم لوگ خواہ مخواہ اسپتال کے چکر نہ لگاؤ۔ لہٰذا ہم کہیں نہیں جا رہے ہم یہیں پر آنکھوں کی پیاس بجھائیں گے۔" وہ شوخ ہونے لگا۔

"بس، بس اب اور مکھن مت لگائیں جوان بچی گھر میں موجود ہے اس لیے اتنا ہی کافی ہے۔" اس نے کچن کی طرف نظر دوڑائی جہاں فرحت مصروف تھی۔

"چلیں آپ چینج کر لیں۔ بس فرحت کھانا لگا رہی ہے۔"

☆☆☆

وقت بڑی تیزی سے منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ عجیب بات ہے کتنی ایمانداری سے ہر ایک کو اس کی منزل کی طرف پہنچاتا رہتا ہے لیکن خود اس کا کوئی ٹھکانا، کوئی منزل نہیں...... مسلسل سفر میں رہتا ہے۔

شازیہ کی گود میں ایک خوب صورت پھول آگیا۔ ایوب اور شازیہ بہت خوش تھے ان کا گھر کسی جنت کا منظر پیش کر رہا تھا۔ پیارا سا گوشی ان کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی اور بہت سی مصروفیت لے کر آیا۔ زینت بھی بہت خوش تھی بھی گھر کا کام بڑی تیزی سے کرتی پھر گوشی جانے اور زینت جانے......

فرحت کے گھر میں ہر ماہ باقاعدگی سے رقم جا رہی تھی اب اس کے باپ نے ایک پرانا موبائل کسی سے لیا تھا۔ فرحت سے جب بات کرنی ہوتی وہ شازیہ کے سیل فون پر مس کال کرتا شازیہ فوراً نمبر ڈائل کرتی اور فرحت کو پکڑا دیتی۔ فرحت کافی دیر تک ماں، باپ بہن، بھائیوں سے باتیں کرتی رہتی۔ بابا بتاتا تھا کہ "بیٹا ہم قرضہ اتار رہے ہیں، تم فکر نہ کرنا یہ سال پورا ہولے تو میں صاحب کو فون کروں گا کہ فرحت کو ایک ماہ کی چھٹی پر بھیج دے۔"

"نہیں بابا آپ فون نہ کرنا، میں خود بات کر لوں گی ویسے بھی میری بیگم صاحبہ کا بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے میں انہیں کس کے سہارے چھوڑ کر آؤں...... اس لیے اماں سے کہیں تھوڑا سا صبر کریں۔" اس طرح وہ خود ہی باپ کو ٹال دیتی۔

"فرحت تم اپنی عمر سے بہت بڑی سوچ کی مالک ہو۔ اتنی سوجھ بوجھ کہاں سے لی ہے۔" شازیہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"باجی میں ابھی چار پانچ سال کی تھی کہ اماں نے مجھے کسی گھر میں نوکرانی رکھوا دیا تھا۔ ایک جگہ اگر نوکری سے جواب ملتا تو کہیں دوسرے گھر میں نوکری مل جاتی۔ بس دھکے کھا، کھا کر عقل آگئی ہے۔ میں بچپن سے حساس تھی اگر کہیں بیگم سے تھپڑ کھائے تو کہیں پر گھر کے بچوں نے درگت بنا دی۔ کہیں صاحب نے ایک ٹانگ پر کھڑا کر کے سزا دی کہ میں نے استری سے کوئی کپڑا داغدار کر دیا تھا۔ بس یہ تھا کہ میں گھر میں نہیں بتایا کرتی تھی کیونکہ اس طرح بابا نوکری چھڑوا دیتا تو گھر کے اخراجات کیسے چلتے۔ اور اسی وقت نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا۔ وقت بہت بڑا استاد ہے شازیہ باجی...... لیکن اب میں پہلی مرتبہ کسی گھر میں دل سے خوش ہوں بہت...... باجی میں نماز میں سب سے پہلے گوشی اور پھر آپ دونوں کے لیے دعا کرتی ہوں کہ اللہ پاک آپ کا گلشن آباد رکھے جہاں مجھے عزت ملی، پیار ملا اور میرے گھر والوں کو آسودگی ملی ہے۔"

☆☆☆

اُدھر سرگودھا میں شازیہ کے گھر والے ابھی تک خفا تھے۔ ثمینہ کی شادی ہو چکی تھی۔ خالد کی دکان چل پڑی تھی پورے ایریا میں بس یہی خالد کی دکان تھی جو بہت چل نکلی تھی اور اب روز بروز سپر اسٹور کی شکل اختیار کرتی جا رہی تھی۔ گھر میں خوشحالی تھی اس لیے اب کسی کو بھی شازیہ کے ڈرافٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ زینت بیگم کبھی بیٹھ کر آنسو بہانے لگتیں تو بیٹے گلے پڑ جاتے کہ ہماری بہن نے اپنی مرضی سے شادی کر کے ہماری عزت برباد کر دی ہے اگر شادی اتنی ضروری تھی تو پاکستان آکر کرتی۔ یہی نہیں بلکہ تمام گھر والے بڑے ابا سے بھی ناراض تھے کہ انہوں نے ہماری..... بے عزتی کرانے کے لیے شازیہ کو اپنے ساتھ رکھا اور پھر اسے مرضی سے شادی کرنے کی چھوٹ دی۔

بہرحال جتنے منہ اتنی باتیں...... شازیہ نے دو، تین مرتبہ کوشش کی کہ امی سے بات کرے لیکن وہاں فون کا نمبر ہی چینج کر دیا گیا۔ اس طرح سارے رابطے ہی ختم ہوئے۔ ایوب نے اب شازیہ کو منع کر دیا تھا کہ تم خاموش رہو ایک دن خود انہیں تمہاری یاد آئے گی تو رابطہ کر لیں گے۔

☆☆☆

زندگی بڑی حسین لگ رہی تھی۔ فرحت اور گوشی ایک جان تھے بلکہ گوشی تو ماں کو بھی نظر انداز کر دیتا تھا۔ ماشاء اللہ دو سال کا ہو گیا تھا سلونی سی رنگت اور پُرکشش چہرہ...... فرحت سے اس قدر مانوس کہ اس کے بدلے میں سبھی کو چھوڑنے پر تیار...... ایوب اور شازیہ کو اگر کہیں جانا ہوتا تو وہ فرحت کے پاس گھر میں رہنے کو ترجیح دیتا۔ فرحت کا بھی کپڑے پہننے کا انداز، بات چیت، ہیئر اسٹائل ہر چیز میں اِک نفاست، اک سلیقہ نظر آتا تھا۔ اب وہ دیکھنے میں ایوب اور شازیہ کی بیٹی نظر آتی تھی۔ اجنبی لوگ نہیں پہچان سکتے تھے۔ اب اس کے پاس سیل فون اور شولڈر بیگ بھی ہوتا، کبھی مارکیٹ جانا ہوتا تو گوشی کی انگلی تھامے اس کی بڑی بہن ہی نظر آتی۔

ایوب کے گھر والے کراچی میں آباد تھے بہت سے افراد پر مشتمل یہ فیملی مالی لحاظ سے بہت اسٹرانگ تھی۔ انہیں ایوب کی شادی پر کوئی ناراضی نہیں تھی، وہ اپنی مرضی کا مالک تھا۔ اس لیے جلد ہی گھر والوں سے اس کا رابطہ ہوا تو شازیہ بھی فون پر اپنے سسرال والوں سے گپ شپ لگاتی خاص طور پر جب سے گوشی پیدا ہوا تھا سسرال والے اسے پاکستان آنے کا کہنے لگے تھے اور شازیہ بھی آئے دن سسرال جانے کی خواہش کا اظہار کرتی تو ایوب ٹال جاتا اور پھر ایک خوب صورت سی شام کو ایک اور ننھے مہمان کی آمد کا انکشاف ہو گیا، اس نے سلمہ کو فون کیا تو وہ خوشی سے پاگل ہو گئی۔ اور اسی رات شازیہ کے پاس پہنچ گئی۔

"ایوب بھائی مبارک ہو، سنا ہے گوشی کو ننھا کھلونا ملنے والا ہے۔"

"ڈیئر کزن ٹھیک سنا آپ نے، آپ کی دعاؤں اور مہربانیوں کا نتیجہ ہے ورنہ میرے جیسا لاابالی بندہ کہاں اس قابل تھا۔" وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔

"لیکن ایک بات میں آپ دونوں کے گوش گزار کر دوں کہ دوسرا بچہ بیٹی ہو یا بیٹا وہ میرا ہوگا۔ آپ مجھے دیں گے۔" وہ آنکھوں میں ستارے بھرے ہوئے بولی۔

"بھئی ہم نے کب انکار کیا ہے۔" شازیہ نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر انتہائی محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"سلمہ دونوں تمہارے ہیں اسے بھی لے جاؤ بے شک، تم سے کون کافر انکار کرے گا۔"

"نہیں میری جان، گوشی تمہارا ہی ہے، یہ پہلا بچہ ہے لیکن دوسرا میرا ہوگا یہ میں نے بہت دنوں سے سوچ رکھا تھا۔ اور اسی خوشی میں میری طرف سے آج ڈنر ہے۔" وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔

"کھانا تو تیار ہے سلمہ باجی......" فرحت نے گوشی کو شوز پہناتے ہوئے سلمہ کو دیکھ کر کہا۔

"وہ سب تم فریج میں رکھ دو فرحت، آج ہم کھانا باہر کھائیں گے۔" اور یوں باتوں، باتوں میں یہ ننھا سا قافلہ باہر جانے کو تیار تھا۔ دعوت آج سلمہ کی طرف تھی کھانے کے بعد خوب گھومے پھرے۔

آج رات سلمہ کو ایوب اور شازیہ نے یہیں روک لیا تھا۔ رات بھر گپ شپ ہوتی رہی چائے اور ڈرائی فروٹ بھی چلتا رہا۔

”سلمہ تمہیں شازیہ نے بتایا ہے کہ یہ کراچی جانے کے لیے بے چین ہے۔“ ایوب بولا۔

”تو کیا پرابلم ہے ایوب بھائی۔ سرگودھا والے بھی قطع تعلق کیے بیٹھے ہیں تو کراچی بھیج دو تم کیوں ضد کرتے ہو؟“ سلمہ نے کہا۔

”یار یہ چلی گئی تو میں کیا کروں گا۔ میں اب اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

”یہ غلط بات ہے، شازی کی طبیعت بھی خراب ہے اور کراچی والے بھی بلا رہے ہیں تو بھیج دو۔ فرحت اتنے دن میرے پاس رہ لیتی ہے۔ مجھے بھی رونق ہو جائے گی۔“

”لیکن سلمہ باجی میں چاہتی ہوں اسی بہانے میں بھی والدین کو مل آؤں گی۔ سنا ہے میرے بابا نے تین مرلے کا گھر بنا لیا ہے۔ میرا دل کرتا ہے جا کر دیکھوں کہ میرے والدین اور بہنیں پکی اینٹوں کے گھر میں کیسے رہتے ہیں۔ شازیہ باجی جب کہیں گی میں فوراً کراچی پہنچ جاؤں گی۔“

اس بحث و مباحثے کے بعد یہ فیصلہ طے پایا کہ ایک مہینہ کے لیے ایوب صاحب ان تین لوگوں کو چھٹی دے دیں گے۔

ٹھیک پندرہ دن بعد وہ تینوں ایوب انصاری کو اداس کر کے کراچی پہنچ گئے۔ کراچی والوں نے بڑا پروٹوکول دیا۔ سب نے اپنی بہو اور پوتے کو سر آنکھوں پر بٹھا لیا۔ شازیہ بہت خوش تھی اس بھرے پُرے گھر میں بڑی رونق تھی۔ گوشی کے باپ سے رابطہ کر کے اسے بہاول پوری کی ٹرین پر بیٹھا دیا گیا۔ وہ خوشی خوشی ماں، باپ کے پاس چلی گئی۔ شازیہ نے اسے ڈھیر ساری شاپنگ کرائی تھی اس کی بہنوں، ماں، باپ اور دادی کے لیے بھی تحائف لے کر دیے۔ اچھی خاصی رقم بھی اس کے پاس تھی۔ ویسے بھی ایوب اور شازیہ اسے تنخواہ کے علاوہ کچھ نہ کچھ دیتے رہتے تھے۔ بڑے ابا اور سلمہ باجی بھی دیتی تھیں۔ اور وہ پیسے وہ سنبھال کر رکھتی تھی ماہانہ تنخواہ جو گھر بھیجتی تھی اس میں سے بھی ہزار بارہ سو رکھ لیتی تھی، اس لیے اب وہ کماؤ بیٹوں کی طرح جیب میں خاصی رقم لے کر آئی تھی۔ بہاول پور ریلوے اسٹیشن پر اس کے سب گھر والے لینے آئے تھے۔ اس نے جانے سے پہلے ایک بات شازیہ سے تنہائی میں کی تھی کہ ”آپ لمبا عرصہ تک کراچی نہ رہنا، پیچھے ایوب بھائی اکیلے ہیں اور مردوں کو زیادہ عرصہ آزاد نہیں چھوڑنا چاہیے۔“ اس نے فکرمندی سے کہا تو شازیہ اس کا گال چھو کر ہنس پڑی تھی۔

”پاگل ایوب ایسے نہیں ہیں، پھر بھی تمہاری ہمدردی کا بہت شکریہ......“

☆☆☆

شازیہ اور گوشی کو خوب سیر سپاٹے کرائے جا رہے تھے۔ فلمیں دیکھی جا رہی تھیں، خوب ہلا گلا تھا شازیہ بہت خوش تھی، بڑے ابا اور تائی اماں کو بھی فون کرتی رہتی تھی۔ وہ بھی بہت خوش ہوتے تھے۔ گوشی اپنے چاچا، تایا کے کندھوں پر سوار رہتا اور کبھی بچوں کے ساتھ کھیل تماشے کرتا خوش رہتا، ایوب ہر رات فون پر گھنٹوں باتیں کرتا۔

کبھی کبھار سلمہ سے بھی بات ہو جاتی تھی۔ اس نے اپنے گھر سرگودھا بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن سب نمبرز تبدیل ہو چکے تھے۔ وہ بہت اداس ہو جاتی۔

شازیہ کو کراچی آئے چھٹا ہفتہ تھا اب ایوب کا فون کم، کم آنے لگا۔ اس کے دماغ میں کبھی کبھی فرحت کے کہے ہوئے الفاظ گردش کرتے لیکن وہ اس خیال کو جھٹک دیتی، دل نہیں مانتا تھا کہ ایوب بے پروا ہو سکتا ہے۔

اس رات فون آیا تو شازیہ نے فون کم آنے کا شکوہ کیا تو ایوب نے فوراً کام کی زیادتی کا کہہ دیا۔

وقت کی چرخی اپنی مخصوص رفتار سے گھوم رہی تھی۔ شازیہ اب اداس تھی یا تو سرگودھا والوں سے ملاقات ہو جاتی نہیں تو واپس دبئی جانا چاہتی تھی۔

ایوب سے بات ہوئی تو اس نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ شازی کے کان کھڑے ہو گئے۔

”ایوب میں واپس اپنے گھر آنا چاہتی ہوں؟“

”ضرور، ضرور میری جان کیوں نہیں تم سو بار آؤ، تمہارا اپنا گھر ہے لیکن میں اپنے آفس ٹور پر شہر سے باہر جا رہا ہوں بلکہ آؤٹ آف کنٹری جانا ہے، ہو سکتا ہے۔ ایک ماہ کے قریب رہنا پڑے اگر تم آنا چاہتی ہو آ جاؤ پھر فرحت کو بھی لے آنا تاکہ تمہیں اکیلے رہنے میں دشواری نہ ہو۔“ وہ اپنی دُھن میں بول رہا تھا۔ اور شازیہ کا دل زور، زور سے دھڑک رہا تھا۔

”لیکن میں اور گوشی آپ کے بغیر کیسے رہ پائیں گے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں مخاطب ہوئی۔

”میں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ ابھی کچھ دن ویٹ کرو، میں واپس آنے سے پہلے تمہیں بتا دوں گا تم بھی گھر پہنچ جانا اور میں بھی آ جاؤں گا۔ اچھا بتاؤ گوشی کیسا ہے، امی جان تمہیں کیسی لگیں، دیکھ لو کون کہہ سکا ہے کہ وہ ہماری اسٹیپ مدر ہیں......انہوں نے ساری زندگی اپنے سگے بچوں کی طرح ہی ہمیں بھی پیار دیا۔“

”ہاں بہت اچھی ہیں ندا بھی بڑی اچھی ہے، آپ کے بھائی اور بھابیاں سب ہی پیار کرنے والے ہیں۔“ وہ کہہ رہی تھی۔

”تو ٹھیک ہے میری جان! جہاں اتنا پیار مل رہا ہے وہاں تو ساری زندگی بندہ گزار سکتا ہے، میں تو اس لیے کہتا ہوں کہ میرے جانے کے بعد تم نے دبئی میں بھی تو اکیلے ہی رہنا ہے اس سے بہتر ہے کہ تم او کھے سوکھے ایک ماہ اور گزار لو...... میں جب واپس آؤں گا تو کچھ دن پہلے تمہیں بتا دوں گا، تم بھی اسی ڈیٹ کی سیٹ بک کروا لینا۔ ہم اکٹھے ہی اپنی جنت میں داخل ہوں گے۔“ وہ مسکا لگا رہا تھا۔

وہ خاموش ہو گئی فون بھی بند ہو گا۔ فون بند تھا زبان بند تھی لیکن دل اور دماغ میں اِک شور برپا تھا۔ فرحت چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ”شازیہ باجی آپ زیادہ عرصہ کراچی نہ رہنا، مردوں کو کبھی زیادہ دیر تنہا نہیں چھوڑتے۔“ چھوٹی سی فرحت نے کتنی بڑی بات کہہ دی......خدا کرے اس کی یہ بات غلط ثابت ہو۔

لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے وقت اور نصیب کی جنگ میں نصیب ہار جائے۔ ہرگز نہیں۔ وقت بہت بڑا استاد سہی لیکن مقدر اس پر حاوی ہو جاتا ہے اور نصیب وقت پر حاوی ہو رہا تھا۔ شازیہ کے اندر شک کا ناگ لہرا رہا تھا۔ اس نے تمام رات جاگ کر گزاری، صبح اٹھتے ہی سلمہ کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو شازی خیریت، اتنی صبح کیسے یاد کیا؟“ سلمہ نیند بھری آواز سے پوچھ رہی تھی؟

”سلمہ تم آج ہی ایوب کو ٹریس کرو، میں واپس آنا چاہتی ہوں اور وہ مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہا ہے۔“ اس کی آنکھیں برسنے کو تیار تھیں۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو شازی؟ ایوب تو تمہارا دیوانہ ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے، تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہو گی۔“ سلمہ نے اپنے بال سمیٹ کر کیچر میں قید کرتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

”تو تم میری غلط فہمی دور کر دو۔ اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔ سلمہ تم تو جانتی ہو میں بالکل اکیلی رہ جاؤں گی۔“ وہ فریاد کر رہی تھی۔

”چلو تم ٹینشن مت لو...... میں آج ہی ایوب کا پیچھا کرتی ہوں، انشاء اللہ ایسا کچھ بھی نہیں ہو گا، تم تسلی رکھو یار......ایوب تمہارا ہی ہے۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو، ٹھیک ہے تم تیار ہو جاؤ میں فون بند کرتی ہوں۔“

☆☆☆

آج گھر میں خوب رونق تھی، ندا کی منگنی کا فنکشن تھا۔ چار کنال کے گھر کا بہت بڑا لان تھا جس میں رنگ برنگے پھولوں کے قد آور گملے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ مگر اس کا دل کسی مرجھائے پھول کے مانند ہو رہا تھا۔

خوشبوؤں اور روشنیوں کی یہ پُر رونق تقریب رات گئے اپنے اختتام کو پہنچی اور مہمان آہستہ، آہستہ جانے لگے تو شازیہ کی اٹکی ہوئی سانسیں بحال ہونے

لگیں۔ پھر اس نے اپنے بیڈروم میں آکر چینج کیا اور فوراً سلمہ کا نمبر ملایا۔ نمبر بند تھا۔ ایوب کا نمبر بھی بند تھا۔ اس کا دل ہولنے لگا۔

ٹرن، ٹرن فون کی بیل نے اپنی موجودگی کا اعلان کیا تو شازیہ ایک ہی جست میں فون کے پاس پہنچ گئی۔

''السلام علیکم...... سلمہ کیا حال ہے؟ تم نے کس قدر انتظار کرایا ہے۔ میں نے رات کانٹوں پر بسر کی ہے۔'' وہ بے صبری سے بولی۔

''ریلیکس یار، کیوں بے صبری ہورہی ہو؟'' سلمہ نے پوچھا۔

''سلمہ! ایوب کا نمبر مسلسل بند جارہا ہے اور میرے دل میں وسوسے سے اٹھ رہے ہیں۔''

''دیکھو شازیہ! وقت کب کروٹ بدل لیتا ہے کسی کو کچھ نہیں معلوم لیکن ہوتا وہی ہے جو قدرت کو منظور...... رونے دھونے یا سر پیٹ لینے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا...... پروردگار نے جو پہلے دن سے لکھ دیا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو سلمہ؟ میں سمجھ نہیں پائی۔'' اس نے بے صبری سے پوچھا۔

''سنو شازیہ! تم بہت بہادر عورت ہو، پڑھی لکھی ہو، پردیس کی صعوبتوں نے صبر سے تمہارا دامن بھر دیا ہے۔ رشتوں کو کھو دینے کا دکھ کیا ہوتا ہے تم سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے۔'' سلمہ سانس لینے کو رکی۔

''کہہ بھی چکو سلمہ...... تم رک کیوں گئی ہو؟ کہہ دو کہ ایوب ابھی تک صرف میرا ہے، کہہ دو سلمہ ورنہ میرا کلیجا پھٹ جائے گا۔'' وہ رونے لگی تھی۔ آنسوؤں کی برسات نے اسے مزید بولنے سے روک دیا حلق میں گولا سا اٹک گیا۔

نہ جانے کتنے ہی لمحے چپ چاپ گزر گئے ائر پیس میں صرف سانس لینے کی ہلکی سی آواز تھی۔ وہ مزید کچھ پوچھنے سے ڈر رہی تھی۔

''شازیہ مجھے یہ کہتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا ہے کہ ایوب ایک آوارہ بادل ثابت ہوا ہے، میں نے کب چاہا تھا کہ وہ تم سے بے وفائی کا مرتکب ہو لیکن کسی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، اسے اپنے ماضی کی وہ فلپائنی عورت دوبارہ مل گئی ہے جو کبھی اس کی دوست تھی' امریکا سے صرف ایوب کو ڈھونڈتی ہوئی یہاں آئی تھی اور آخر کار ڈھونڈ ہی لیا۔ اور وہ شخص جو تمہارے لیے پاگل ہوا پھرتا تھا اس عورت کو ملتے ہی دنیا بھول گیا۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا سلمہ، ایوب ایسا بھی ہوسکتا ہے۔''

''مجھے بھی یقین نہیں آتا کہ ایوب جو تمہاری محبت میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا تھا ایسا بھی ہوسکتا ہے۔'' وہ بڑے دکھی دل سے کہہ رہی تھی۔

''پہلے تو میرا فون اٹینڈ نہیں کرتا تھا۔ پھر ایک دن میں صبح، صبح ہی اس کے گھر چلی گئی' وہ گھر میں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسے وہ کھری، کھری سنائیں کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کہنے لگا کہ یہ لڑکی دس سال پہلے میری زندگی میں آئی تھی، ہماری دوستی ہوگئی' ہم نے کورٹ میرج کرلی اور پھر یہ میرے کاغذات لے کر امریکا چلی گئی۔ اس کے والدین امریکا میں ہیں جب یہ امریکا گئی تو پھر اس نے پلٹ کر خبر نہیں لی۔ میں نے ہر حربہ آزمایا کہ اس کے بارے میں سن گن ملے لیکن کہیں سے کوئی سراغ نہیں ملا، میں نے دس سال تک اس کا انتظار کیا یہ کہیں نہیں ملی تو میں نے شازیہ سے شادی کرلی۔ تب پھر شازیہ کے کراچی جانے کے بعد اچانک یہ ایک روز میرے آفس آ پہنچی...... میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں میں نے اسے بتایا کہ اب میں ایک بچے کا باپ ہوں تو اس نے وہ پیپرز نکال کر میرے سامنے کر دیا جس پر تحریر تھا کہ ہم دونوں خدا کو حاضر جان کر حلف اٹھاتے ہیں کہ ہم کسی اور سے شادی ہرگز نہیں کریں گے اور یوں میں پکڑا گیا...... وہ اپنی کہانی سنا کر خاموش ہوگیا تو میں نے اسے گریبان سے پکڑ لیا اور اسے .... جھٹکے دینے شروع کردیے۔'' لیکن اس بے گناہ یتیم

لڑکی جو تمہارے دو بچوں کی ماں ہے اس کا کیا گناہ ہے، اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔'' میں چیخ، چیخ کر پوچھ رہی تھی تو وہ میرے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر رونے لگا۔ ''سلمہ تم جو سزا چاہو مجھے دے سکتی ہو لیکن میری مجبوری دیکھو میری زندگی کا رخ ہی بدل گیا ہے۔ واپسی کے سارے راستے بند ہوگئے ہیں میں کیا کروں؟'' سلمہ اب باقاعدہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔ اور شازیہ کی زبان کو تالا لگ گیا۔ وہ بالکل خاموش ہوگئی۔ آنسو اس کے گالوں پر جم گئے۔ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

☆☆☆

سلمہ ائرپورٹ پر اتری تو مسعود اپنی گاڑی لے کر وہاں موجود تھا۔ ایوب کا چھوٹا بھائی جو گھر میں تھا اسے سلمہ نے فون پر بتا دیا کہ وہ اتوار کو کراچی ائرپورٹ پر اترے گی۔

وہ ایوب کے والدین کے گھر پہنچی تو شازیہ اس سے لپٹ گئی اور یوں ٹوٹ کر روئی کہ ہر ایک کی آنکھ نم ہوگئی۔

''میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں کیونکہ میں نے ہی تمہارا رشتہ لیا تھا، یقین کرو مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ ایوب ایسا کرے گا۔'' وہ شازیہ کو دلاسا دیتے ہوئے خود بھی غم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔

رات کو کھانے کے بعد سلمہ نے بتایا کہ وہ شازیہ کو لے کر سرگودھا جائے گی تاکہ ان لوگوں سے شازیہ کی صلح کرا سکے جو اس کے خون کے رشتے ہیں' شازیہ نے بہت انکار کیا لیکن سلمہ نے اسے زبردستی تیار کرلیا۔

''گوشی کو یہیں چھوڑ جاتے ہیں اگر حالات سازگار ہوئے تو مسعود گوشی کو لے کر سرگودھا آجائے گا۔'' سلمہ نے ہی فیصلہ کیا۔

☆☆☆

بابل کا آنگن قریب آنے لگا تو اس کا دل زور، زور سے دھڑکنے لگا کہ جانے گھر میں داخل ہونے پر اس کے ساتھ کیا سلوک ہو۔

والدہ گھر میں اکیلی تھیں شازیہ کو دیکھا تو سینے سے لگالیا۔ دونوں ماں، بیٹی دیر تک آنسو بہاتی رہیں۔

سلمہ نے ایوب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ بس ماں کو یہی بتایا کہ سلمہ کو پاکستان میں کسی ضروری کام کے لیے آنا تھا تو اسے بھی ساتھ لے آئی۔ شازیہ بہت اداس تھی۔ یوں اس نے جھوٹ اور سچ کے مکسچر سے زینت بیگم کو قائل کرلیا خود سلمہ ایک ہفتہ سرگودھا رہی اور پھر اسلام آباد اپنی بہن کے پاس چلی گئی وہیں سے اس کی واپسی ہوئی۔

☆☆☆

ماں نے تو شازیہ کو قبول کرلیا لیکن بھائیوں، بھابیوں نے تو گھر میں جھانکنا بھی گوارا نہ کیا۔ بہنوں نے بھی فون پر ماں سے شازیہ کے آنے کا سن لیا تھا۔ کسی نے آکر ملنا گوارا نہیں کیا۔

''اماں شازیہ کس منہ سے پاکستان آئی ہے، اسے یہ احساس نہیں ہوا کہ اس کی بہنیں سسرال میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی ہیں۔'' شمشاد آپا نے فون پر خوب کھری کھری سنائیں۔

''لیکن شمشاد وہ میری بیٹی ہے، اس نے اس گھر کے لیے بہت محنت کی ہے اب اگر وہ پاکستان آئی ہے تو میں کیسے اس سے ناراض رہ سکتی ہوں۔ یہ اس کا بھی اتنا ہی گھر ہے جتنا تم سب کا۔''

''اس وقت تو آپ بھی آگ بگولا ہوگئی تھیں جب شازو کی شادی کی خبر سنی تھی، اب اس کا منہ دیکھا تو ایک دم آپ کی سوچ بدل گئی ہے۔'' شمشاد آپا کا غصہ کم نہیں ہوا۔

''میں اس وقت تم سب کی باتوں میں آگئی تھی، اعجاز نے سب کو بہکایا تھا لیکن میں ماں ہوں شمشاد...... اور ماں تو ہمیشہ سے ایک بے ایمان دکاندار کے ترازو کے مانند ہوتی ہے جس کا وہ پلڑا ہمیشہ وزنی ہوجاتا ہے جس پر کم سودا ہو۔ تم بھی ماں ہو اپنی بچیوں کے بارے میں غور کرو کہ کسی ایک کو چھوڑ سکتی ہو؟''

''ٹھیک ہے اماں' آپ جو مرضی ہے کریں لیکن

برائے کرم شازو کے آنے کا ابھی کسی سے ذکر نہیں کریں، جب تک بات چھپ سکتی چھپائے رکھیں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

شازیہ نے فون پر ماں کی ساری گفتگو سن لی تھی اور اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کی بڑی بہن ماں سے کیا گفتگو کر رہی تھی۔ امی جان نے فون بند کیا تو شازیہ نے صوفے پر لیٹے، لیٹتے ہی آنکھیں موند لیں۔ سوتی بن گئی۔ امی نے ماتھے پر ہاتھ رکھا ہلکی سی حرارت محسوس ہوئی۔

''شازیہ اٹھ میری بچی چل کر بیڈ پر لیٹ، میں تجھے چائے بنا کر دوں ساتھ میں بخار کی گولی لے لے۔'' شازیہ نے آنکھیں کھولیں اور چپ چاپ اٹھ کر امی جان کے بیڈ پر جا لیٹی۔ اوپر کمبل اوڑھ لیا۔ وہ سونا چاہتی تھی یا آنکھوں سے برستے پانیوں کو چھپانا چاہتی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس، کس محاذ پر لڑے۔ ایک طرف تو اس ظالم کا چہرہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹتا نہیں تھا جو فون کی ہر کال پر ایک ہی شعر سناتا تھا۔

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

''ایوب تم نے مجھ سے شادی ہی کیوں کی اگر مجھے اس طرح برباد کرنا تھا کہ میرے خون کے رشتے مجھ سے بچھڑ گئے۔'' آنسو بے آواز پانیوں کی طرح قطار در قطار بہتے چلے جا رہے تھے۔ وہ کسی سے کچھ نہیں کہتی تھی۔

''شازیہ اٹھ بیٹا، یہ گولی کھا لے اور پھر چائے کے ساتھ ابلا ہوا انڈا لے لے۔ ٹھنڈ سے بخار ہوا ہے۔'' ماں نے انتہائی محبت سے کہا تو شازیہ نے آنکھوں سے گرتے ستاروں کو اپنے آنچل میں جذب کر لیا۔

''گوشی تمہارے بغیر اداس تو ہوا ہوگا، تم اسے خواہ مخواہ ہی کراچی چھوڑ آئی ہو۔''

''نہیں امی جان' وہ دادی اور پھوپی سے بڑا مانوس ہے ان کے پاس زیادہ خوش رہتا ہے۔ ویسے بھی میری طبیعت خراب رہتی ہے۔ میں اس کے نخرے نہیں اٹھا سکتی۔'' اس نے کہنے کو تو یہ سب کہہ دیا لیکن اس کے سینے میں کچھ ٹوٹ کر بکھرا تھا کرچیاں دل کے اندر ہی کہیں دور، دور تک پھیل گئی تھیں دل کا ہر کونا لہو لہان ہو چکا تھا لیکن وہ خاموشی سے یہ درد سہہ رہی تھی۔ اس نے ماں کو بھی نہیں بتایا تھا کہ دو دن پہلے اس کے دیور مسعود نے اسے فون پر بتا دیا تھا کہ وہ گوشی کو بھول جائے کیونکہ گوشی اب اس کا بیٹا بن چکا تھا۔ ایوب نے ایسا کہا تھا اسے۔

☆☆☆

اسے سرگودھا آئے ساتواں مہینہ لگ چکا تھا۔ صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ امی کے ساتھ اسپتال چیک اپ کے لیے جاتی رہتی تھی، یہ آخری مہینہ چل رہا تھا۔ سلمہ کا فون وقتاً فوقتاً آتا رہا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ایوب امریکا چلا گیا ہے اپنی فلپائنی بیگم کے ہمراہ۔

شازیہ نے ماں سے کچھ نہیں کہا......بس یہی کہا کہ ڈلیوری کے بعد واپس دبئی چلی جائے گی۔

اور پھر وہ وقت بھی آن پہنچا جب ایک ننھا سا وجود اس دنیا میں اپنے ہونے کا احساس دلانے لگا۔ نانی نے اس کا نام عمر رکھا۔

نرس نے وہ کمزور سا بچہ کمبل میں لپیٹ کر شازیہ کی گود میں ڈال دیا۔

''مبارک ہو مسز ایوب اس کی شکل کس پر گئی ہے؟''

شازیہ نے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ بچہ بالکل ایوب کی دوسری کاپی تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں تو گویا تم میری زندگی سے نکل کر بھی یہیں پر موجود ہو۔

☆☆☆

وقت کو گویا پر لگ گئے تھے۔ عمر اس دنیا میں ماں کا طلاق نامہ ہاتھ میں لے کر آیا تھا۔ شازیہ نے کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ سوائے سلمہ کے کوئی نہیں جانتا تھا کہ شازیہ کی زندگی اجڑ گئی ہے۔ ابھی تو اس کی شادی کے ہو جانے کا زخم ہی ہرا تھا، اس کے بھائی بہن دل سے راضی نہیں ہوئے تھے کہ اس کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ کسی سے کچھ نہیں کہتی تھی لیکن اپنے اندر اپنے آپ سے ہی ایک جنگ کر رہی تھی۔ اپنے آپ سے جنگ کرنا کوئی آسان کام نہیں......اس عمل سے انسان اپنی ذات میں ریزہ، ریزہ ہو چکا ہوتا ہے لیکن دنیا کو صحیح و سالم نظر آتا ہوتا ہے۔ وہ مسلسل اس مشکل مرحلے سے گزر رہی تھی۔ امی جان اب اس کے جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

''شازیہ، یہ دیکھو میں تمہارے کپڑے لے کر آئی ہوں۔ بیٹا اب تم نے خیر سے جانا ہے تو خالی تو نہیں بھیجنا تجھے۔ یہ تمہاری ساڑی ہے اور تین سوٹ ہیں' دو جوڑے ایوب کے ہیں تمہارے سسرال والوں کے علاوہ سلمہ اور تمہارے بڑے ابا اور تائی اماں کے جوڑے بھی ہیں۔ تمہارے دونوں بیٹوں کے ایک، ایک جیسے چھ، چھ سوٹ ہیں۔'' اماں بتاتی جا رہی تھیں اور اس کے کلیجے پر گویا چھریاں چل رہی تھیں۔ وہ کیسے کہتی کہ میری بھولی ماں سب ختم ہو چکا ہے۔ تو کیوں اتنی مشکل میں پڑی ہوئی ہے۔

وہ خاموش تھی اور آگ کا اِک دریا عبور کر رہی تھی۔ جس میں اس کا وجود تو کیا اس کی روح تک جھلس گئی تھی۔

☆☆☆

''امی جان آج ایوب کا فون آیا تھا کہہ رہے تھے کہ میں اپنی کمپنی کے ہمراہ امریکا جا رہا ہوں۔ اس لیے تمہیں لینے نہیں آسکوں گا تمہیں ٹکٹ بھیج دیتا ہوں، تم واپس اپنے گھر آجاؤ۔ سلمہ کو کہہ دیا ہے وہ اس دوران تمہارے پاس آکر رہے گی اور بڑے ابا بھی آتے جاتے رہیں گے۔'' کتنا بڑا جھوٹ وہ کتنی صفائی سے بول گئی تھی۔ چند جملوں کو ادا کرتے ہوئے وہ دہکتے ہوئے کوئلوں پر سے ننگے پاؤں گزر گئی۔ تلوے آبلوں سے بھر گئے لیکن زبان سے سی تک کی آواز بھی نکالنی گویا ایک بہت بڑے طوفان کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

سلمہ باقاعدہ رابطے میں تھی اور مسلسل اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ اس نے ٹکٹ اور کچھ رقم شازیہ کو بھیج دی تاکہ تیاری کر کے واپس دبئی آجائے۔

☆☆☆

دبئی ائر پورٹ پر بڑے ابا اور تائی اماں بھی سلمہ کے ہمراہ موجود تھے۔ اسے یقین ہوگیا کہ وہ دونوں اس المناک حادثے سے باخبر ہیں۔ وہ ننھے عمر کو پرام میں ڈالے جب سامنے آئی تو بے اختیار بڑے ابا سے لپٹ گئی اور یوں ٹوٹ کر بکھری کہ آنسوؤں کے دریا بہہ نکلے۔ ضبط کے وہ سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ انہوں نے بہت دیر تک اسے سینے سے لگائے رونے دیا۔ بڑی اماں اور سلمہ سے بھی لپٹ کر دل کی بھڑاس نکالی۔ بڑے ابا نے عمر کو پرام سے اٹھا کر گود میں لے لیا اور بہت سا پیار کیا۔

سامان سارا بڑے ابا کی گاڑی میں رکھوا دیا گیا۔ بڑے ابا ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے اور تینوں خواتین ڈاکٹر سلمہ کی گاڑی میں بیٹھ گئیں تو ننھا سا قافلہ آگے پیچھے اعوان ولا کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

کھل کر رونے سے جی ذرا سا ہلکا تو ہوا تھا لیکن دل بجھا، بجھا سا تھا۔

سلمہ یہیں پر ٹھہر گئی تھی وقتی طور پر......اور گھر کے کام کاج میں بڑی اماں کا ہاتھ بٹا رہی تھی خاص طور پر کوکنگ میں اس کا جواب نہیں تھا۔ اسپتال سے اس نے ایک ہفتے کی چھٹی لے رکھی تھی۔

''شازیہ بیٹا تم اب کہیں نہیں جاؤ گی۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے، تم ہمیشہ یہیں پر رہو گی۔'' بڑے ابا نے اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے شازیہ کو مخاطب کر کے کہا۔

''لیکن بڑے ابا پاکستان میں کسی کو علم نہیں کہ میرا گھر ٹوٹ چکا ہے۔'' یہ بات کرتے ہوئے آنسوؤں کا اِک گولا سا حلق میں اٹک گیا۔

''تم فکر نہ کرو میری بچی میں اگر زندہ رہا تو ایوب سے تمہارے ایک، ایک آنسو کا حساب لوں گا۔ اگر مر گیا تو قیامت کے دن اس کا گریبان میرے ہاتھ میں ہوگا۔ میں اسے اتنی آسانی سے چھوڑنے والا نہیں......

پاکستان میں کسی کو علم نہیں تو بھلے نہ ہو......ہم کون سا کسی کو بتانے والے ہیں، بس تم سب بھول جاؤ......اپنی زندگی کا آغاز نئے سرے سے کرو......ایک شخص کے چلے جانے سے دنیا ختم نہیں ہو جاتی گڑیا...... تمہیں ابھی بہت سا جینا ہے۔ عمر نے بڑا ہونا ہے اور تم دونوں نے ایوب کو ڈھونڈ کر گریبان سے پکڑنا اور اپنا حساب مانگنا ہے۔ میں اپنی وصیت میں لکھ کر جاؤں گا کہ ایوب زندگی کے جس موڑ پر بھی ملے اسے کبھی معاف نہ کرنا۔ جس نے میری بیٹی کو رلایا ہے میں اسے گلیوں میں پتھر کھاتے اور روتے ہوئے دیکھنے کی بددعا دیتا ہوں۔"

بڑے ابا کی زبان سے نکلتی ہوئی بددعاؤں سے اس کے اندر کہیں دور ایک ٹیس سی اٹھی، وہ ایک دم اٹھی اور بڑے ابا کو دونوں کندھوں سے تھام لیا۔

"بس ابا جان آپ تو کبھی کسی کو بددعا نہیں دیتے، آج کیا ہو گیا ہے آپ کو...... کیوں اتنی ٹینشن لے رہے ہیں۔" وہ بے اختیار ہو کر کہہ اٹھی۔

"تم نہیں سمجھ سکتیں میری بچی، میری زندگی کا یہ سب سے بڑا دکھ ہے، میں اسے کیسے نظر انداز کر دوں۔" ان کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"میرا خیال ہے اس چیپٹر کو اب کلوز کر دیں، ایک برے انسان کو سوچتے رہنا ہی عقل مندی نہیں۔ باقی زندگی کے لیے بھی تو کچھ سوچیں بچا کر رکھنی ہیں، یہ لیجیے بڑے ابا میں نے اسپیشل آپ کے لیے ہی سوپ بنایا ذرا اسے چکھیں اور بتائیں کہ میں پاس ہوئی ہوں کہ نہیں......؟" سلمہ نے بڑی سی ٹرے میں سوپ کے پیالے سجا کر لاؤنج میں ہی سینٹر ٹیبل پر ابا کے قریب ہی رکھ دیے۔

چند منٹ خاموشی کی نذر ہو گئے۔

☆☆☆

سلمہ ایک ہفتہ کی چھٹی گزار کر واپس چلی گئی تو گھر میں خاموشی سی چھا گئی۔ عمر بھی بہت کم شور مچاتا تھا شاید اس نے دنیا میں آتے ہی ایک سمجھوتا کر لیا تھا۔ بڑی اماں زیادہ وقت عبادت میں گزار دیتی تھیں۔ ابا ناشتا کر کے آفس چلے جاتے۔ کام تو کوئی خاص نہیں کرتے تھے۔ بس اپنے آپ کو مصروف رکھنا چاہتے تھے اور شازیہ کے دل و دماغ میں سناٹوں کا راج تھا۔ اس قدر خاموشی کے سناٹے اسے روپ بدل، بدل کر ڈرانے لگے تھے۔ موسم اچھا خاصا ٹھنڈا تھا رات بھر ہلکی، ہلکی بوندا باندی رہی تھی۔ بارش کی رم جھم یا نینوں کی برسات......وہ دونوں میں امتیاز نہ کر سکی۔ رات بھر اپنے آپ سے لڑتی رہی۔

"بڑے ابا میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے نمازِ فجر کے بعد انہیں بیڈ ٹی دیتے ہوئے ہولے سے کہا۔

"بیٹا میرا تو دل چاہتا ہے کہ تم اب جاب نہ کرو، اپنے بچے کو سنبھالو اور آرام سے گھر میں رہو۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے تمہیں کیا فکر......؟" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"مگر ابا میں مصروف رہنا چاہتی ہوں، مجھے کام کی عادت ہو گئی ہے، آپ اجازت دیں تو میں سلمہ سے فون پر بات کر دوں......؟"

"ملک صاحب......شازی ٹھیک کہہ رہی ہے، اچھا ہے جاب کر لے گی تو دھیان بٹا رہے گا۔" بڑی امی بھی جانماز سے اٹھ کر ادھر ہی چائے پینے کے لیے بیٹھ گئیں۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں، ہاں عمر کو پھر تمہیں ہی سنبھالنا پڑے گا۔" وہ کسی گہری سوچ سے نکل کر بولے۔

"کوئی مشکل نہیں، عمر میرے پاس زیادہ خوش رہتا ہے۔" وہ کہنے لگیں۔ اور یوں پھر شازیہ کی جاب دوبارہ سے بحال ہو گئی۔

☆☆☆

وہی اسپتال وہی عملہ وہی لوگ وہی سیٹ اور وہی ہر چیز......لیکن وہ وہی نہیں رہی تھی۔ وہ خود کو بھی اجنبی سی لگ رہی تھی۔ اس کی جو بھی فیلنگز تھیں وہ برابر کمپرومائز کر رہی تھی کیونکہ اسے ہر صورت یہ جاب کرنی تھی۔ پہلے تو گھر والوں کے لیے کرتی تھی لیکن اب اسے اپنے بیٹے کے لیے جاب کرنی تھی اپنے ماضی کو بھلانے کے لیے مصروف رہنا تھا۔ اور وہ اس میں کامیاب ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

وقت کا سرپٹ گھوڑا اپنی مخصوص رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ عمر اب چار سال کا ہو گیا تھا۔ اسکول جانے لگا تھا۔ بڑی پیاری باتیں کرتا تھا۔ شازیہ اب تھکنے لگی تھی وجود میں طاقت کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ سلمہ نے اسے چند ٹسٹ لکھ کر دیے۔ جنہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ شازیہ شوگر کی مریض ہو گئی ہے۔ سلمہ نے اسے تمام دوائیں دیں اور باقاعدہ چارٹ بنا کر دیا۔

"شازو اپنا خیال رکھو، پہلے بلڈ پریشر اور اب شوگر...... یہ تم اچھا نہیں کر رہی ہو اپنے ساتھ۔"

"میں کبھی نہیں سلمہ؟" وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"تم سب سمجھ رہی ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں، تم خود بیماریوں کو دعوت دے رہی ہو۔" سلمہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر اس کا چہرہ تکنے لگی۔

"تم پریشان کیوں ہوتی ہو سلمہ یہ تمام بیماریاں اگر اکٹھی ہو کر بھی مجھ پر حملہ کریں تو اس ایک غم کو شکست نہیں دے سکتیں جو مجھے ایوب سے ملا ہے۔ یہ تمام دوائیں جو دنیا میں کسی نہ کسی بیماری کے لیے موجود ہیں کیا ان میں کوئی ایسی دوا ہے جو ایوب کے دیے گئے غم کو ختم کر دے؟ بس مجھے اپنی مرضی سے جینے دو سلمہ......" وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر سسک پڑی۔

سلمہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھی اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"شازیہ میری جان میں تمہیں مکمل صحت مند اور زندگی سے بھرپور دیکھنا چاہتی ہوں۔" وہ بہت دیر تک اس کا سر اپنے سینے سے چپکائے بیٹھی رہی۔

"تم بس دعا کرو، جینا اور خوش رہنا میرے لیے آسان ہو جائے۔" شازیہ بولی۔

"آمین......اور انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا شازیہ تم نے بہت سا جینا ہے، عمر کو پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا ہے اس کی اور گوشی کی خوشیاں دیکھنی ہیں، یار تم مایوسی کی باتیں نہ کیا کرو میرے سامنے۔ اپنے رب سے خوشیاں مانگو وہ ضرور تمہاری آرزو پوری کرے گا۔"

☆☆☆

نماز کی تو باقاعدگی وہ پہلے بھی کرتی اب وظائف میں تیزی آ گئی تھی۔ قرآن پاک کی تلاوت اور ترجمہ اس نے اپنا معمول بنا لیا۔ یوں آہستہ، آہستہ اس کے دل کو سکون محسوس ہونے لگا۔

عمر اب بڑی اماں کے زیادہ قریب ہو چکا تھا وہ بھی مصروف رہتی تھیں عمر کی توتلی زبان سے باتیں سنتیں اور اس کے چھوٹے موٹے کام کر کے خوش ہوتیں۔

وقت نے اِک اور جست لگائی۔ زخم اگرچہ بھرا نہیں تھا لیکن اس پر ہلکے، ہلکے کھرنڈ سے بن گئے تھے۔ درد کچھ ماٹھا ہوا تھا۔

عمر اب کلاس ٹو میں پڑھ رہا تھا۔ پاکستان سے امی کا اکثر فون آتا رہتا تھا۔ اب وہ بیمار رہنے لگی تھیں اور بار، بار اسے پاکستان آنے پر زور دیتی تھیں۔

"شازیہ بیٹا مجھے مل جاؤ آ کر، میں عمر اور گوشی سے اداس ہوں اور دوسری بات یہ کہ ایوب کو ضرور لے کر آنا۔ میں زندگی میں ایک دفعہ اپنے بچے سے مل

لوں۔ خدا جانے کب آنکھ بند ہوجائے اور یہ حسرت دل میں ہی رہ جائے۔'' شازیہ امی جان کے سوالوں سے پریشان ہوجاتی۔ اکثر بہانے کرلی رہتی لیکن اب امی جان نے ایک ہی رٹ... لگادی تھی کہ ''تم ایوب اور بچوں کو لے آؤ میں جیتے جی تمہاری صلح کرادوں تمہارے بھائیوں، بہنوں سے یہ نہ ہو کہ میرے بعد یوں بکھر کرہی تمہاری زندگی گزر جائے۔'' شازیہ پھر ایک بار ڈسٹرب ہوگئی۔

اس نے سلمہ کو بتایا اور گھر میں بڑے ابا، اماں سے بھی ذکر کیا کہ اب سرگودھا سے امی کے مسلسل فون آرہے ہیں، وہ کب تک ٹالتی رہے۔

''ٹھیک ہے بیٹا کچھ سوچتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ ہم بھی اب پاکستان ہوآئیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اب تو ہمیں پاکستان میں ہی رہنا چاہیے۔ بہت رولیا ہے باہر...... اب آخری وقت تو اپنے دیس میں آنا چاہیے۔ لیکن ایک دم یہ سارا سیٹ اپ کیسے پاکستان شفٹ ہوسکتا ہے۔ بچوں سے بات کرنی پڑے گی کہ یا تو ایک بھائی دبئی میں شفٹ ہوجائے ورنہ یہاں کا سلسلہ ختم کردیں سارا...... ہم اب اپنے وطن میں رہیں گے۔'' بڑے ابا اپنے لہجے میں اداسی سمیٹے بات کررہے تھے۔

''مگر میں اکیلی کیسے رہوں گی آپ کے بغیر ابا؟'' وہ پریشان ہوگئی۔

''ہم کون سا ابھی شفٹ کرنے لگے ہیں بچے۔ تم کیوں پریشان ہوتی ابھی تو تمہارے ساتھ پاکستان سے ہوکر آتے ہیں پھر کوئی فیصلہ کریں گے۔''

ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ اچانک وقت نے ایک اور کروٹ لی۔ سلمہ کی ایک پاکستانی دوست جو دبئی میں میرج بیورو چلارہی تھی وہ اسپتال میں سلمہ سے ملنے آئی بلکہ اپنے کچھ ٹیسٹ کرانے آئی تھی۔ باتوں، باتوں میں اچانک کہنے لگی کہ ''سلمہ یار تم بہت لکی ہو اگر شادی کے لیے راضی ہوجاؤ تو ایک بہترین رشتہ میرے پاس آیا ہے لڑکے نے ناروے میں شادی کی تھی لیکن شادی ناکام ہوگئی تو وہ واپس دبئی آگیا ہے اس کے والد چوہدری یعقوب مجھے فون پر کہہ رہے تھے کہ میڈم فرح آپ کوئی ایسا رشتہ بتائیں۔ لڑکی سمپل سی ہو۔ بے شک سیکنڈ میرج ہو لیکن کمپرومائز کرنے والی ہو میں چاہتا ہوں کہ جیتے جی بیٹے کا گھر آباد ہوجائے۔''

''لڑکے کا نام کیا بتایا ہے فرح......؟'' سلمہ نے بے یقینی کی کیفیت میں پوچھا۔

''نام تو میں نے بتایا ہی نہیں والد کا نام چوہدری یعقوب ہے۔ لڑکے کا نام میں تمہیں پوچھ کر ابھی بتادیتی ہوں اگر تم راضی ہو تو؟'' فرح بولی۔

''نہیں یار میں اب کیا شادی کروں گی، ایک لڑکی ہے لیکن تم لڑکے کا نام بتاؤ تو میں ایک کوشش کر دیکھتی ہوں اس کے گھر والوں سے۔''

فرح نے وہیں بیٹھے، بیٹھے فون پر سب معلومات لے لیں۔

''لو جی تمہارا مسئلہ حل ہوگیا اس کا نام ایوب چوہدری ہے اب بولو؟'' ایوب نام سن کر سلمہ تو اچھل ہی پڑی۔

''ٹھیک ہے فرح، میں شازیہ سے بات کرکے تمہیں فون کروں گی۔''

فرح کے جانے کے بعد فوراً فون کرکے بڑے ابا کو شازیہ کے لیے اس رشتے پر منانے کا مشورہ دیا اور یہ کہا کہ پاکستان جانے کے لیے اسے آسانی ہوجائے گی۔ شازیہ اسپتال میں موجود تھی لیکن سلمہ نے اسے اس ساری کارروائی کی بھنک نہ پڑنے دی، چھٹی ہونے پر وہ اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر اس کے گھر چلی گئی۔ اتنے میں بڑے ابا اور بڑی امی آپس میں ڈسکس کرچکے تھے۔ سلمہ پہنچی تو بات چھڑ گئی اور پھر شازیہ نے رو، رو کر سارا گھر سر پر اٹھالیا۔ پتا نہیں اسے کیا ہوگیا تھا خوب دل کی بھڑاس نکالی۔ پہلے تو بڑے ابا نے اسے خوب رونے دیا اور پھر اسے اپنے پاس بٹھا کر پیار کیا اور اسے سمجھانے لگے۔

''دیکھو تمہیں اپنی ماں سے ملنے کے لیے ایوب کی ضرورت تھی تو اللہ پاک نے بیٹھے بٹھائے تمہارا مسئلہ حل کردیا ہے۔''

''مگر بڑے ابا یہ کسی صورت بھی ممکن نہیں ہے۔ میں شادی بھی کرچکی ہوں اور محبت بھی کرچکی ہوں۔ بخدا بڑے ابا...... میں اب دوبارہ کسی طور پر افورڈ نہیں کرسکتی۔ میری دنیا اب میرا بیٹا عمر ہے پلیز مجھے اب چین سے زندگی گزارنے دیں۔''

''تمہاری سوچ سے میں اتفاق کرتا ہوں بیٹا لیکن تم ابھی چھوٹی ہو تم دنیا کو اتنا نہیں جانتی ہو جتنا ہم بزرگ جانتے ہیں، زندگی بہت مشکل ہوجاتی ہے جب انسان دنیا کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا ہے پھر کہیں سے راستہ نہیں ملتا۔''

''مگر ابا آپ بھول رہے ہیں میں پہلے بھی ایک غلط راستے کا انتخاب کرکے نتیجہ بھگت رہی ہوں دوبارہ یہ رسک نہیں لوں گی۔'' اس کی آنکھیں مسلسل چھلک رہی تھیں۔ بڑے ابا نے شازیہ کو اپنے ساتھ لگایا اپنے رومال سے اس کی آنکھیں صاف کیں اس کی پیشانی چوم لی۔

''میری جان میری بچی تمہارا دکھ کیا ہم سب محسوس نہیں کرتے تمہارے دکھ پر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے میرے بس میں ہو تو میں اپنی بیٹی کی آنکھ کبھی نہ بھیگنے نہ دوں، میں تم سے شرمندہ ہوں تم بے قصور ہو اور سزا بھگت رہی ہو۔ شاید میں اندر خانے تمہارے اس دکھ کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ اس کا سر اپنے شانے سے لگائے سہلا رہے تھے۔

سلمہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بڑے ابا کے قدموں کے قریب قالین پر بیٹھ گئی اور شازیہ کی کمر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''شازی میری جان تمہارا دکھ ہم سب کا سانجھا ہے تمہارے بارے میں سوچ کر کلیجا کٹتا ہے بس تم اپنے سارے دکھ میری جھولی میں ڈال دو۔ تم اس دکھ کو تاعمر سہنے کی سزا مجھے سنادو۔ میں خوشی سے قبول کرلوں گی۔ لیکن بخدا ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو قدرت کو شاید تم پر رحم آگیا ہے۔ میرے رب نے تجھے اپنے والدین اور بھائی بہنوں سے ملوانے کے لیے پھر اسی

نام کا شخص چن کردیا ہے کہ جس نام سے تمہاری عزت پر حرف نہیں آئے گا کسی کو یہ احساس بھی نہیں ہوگا کہ تم طلاق یافتہ بھی ہو۔ اور تو شاید کسی کی اتنی پروا نہیں لیکن تمہاری والدہ جن کے قدموں میں تمہاری جنت ہے وہ تمہیں ایوب کے ساتھ دیکھ کر مطمئن ہوجائیں گی، تمہاری عزت برقرار رہے گی۔ خالہ جان اب مہمان ہیں انہیں اب کوئی شاک نہیں لگنا چاہیے اس بات کا اجر تمہیں اللہ پاک ضرور دیں گے۔'' سلمہ اب اٹھ کر قریبی چیئر پر بیٹھ گئی تھی۔

''تمہارے پاس کیا گارنٹی ہے کہ میری یہ شادی کامیاب ہوجائے گی؟'' شازیہ نے آنکھیں پونچھتے ہوئے سلمہ سے مخاطب ہوئی۔

''شازو میری جان، گارنٹی تو کوئی بھی نہیں دے سکتا سوائے اس اوپر والے کے اور اوپر والا بھی اپنی زبان سے نہیں کہتا صرف سبب پیدا کرتا ہے۔'' سلمہ بولی۔

''سلمہ ٹھیک کہہ رہی ہے، بیٹے شادی کرنا کوئی گناہ نہیں۔'' بڑی اماں نے بھی حصہ لیا۔

''مگر اماں شادی کرنا اتنا ضروری بھی تو نہیں۔'' وہ سیدھی ہوکر بیٹھ چکی تھی۔

''ضروری ہے بیٹا بہت ضروری اور تمہارے لیے تو اور بھی ضروری...... کیونکہ تم اپنی والدہ سے کیسے مل سکتی ہو جبکہ وہ بضد ہیں کہ تم ایوب کے ساتھ پاکستان آؤ۔'' بڑے ابا نے بات کو ہی ختم کردیا۔

سب لوگ شازیہ کو دیکھنے لگے۔

''لیکن بڑے ابا جان مجھے سوچنے کا موقع تو دیں۔ میرا دل مسلسل انکار پر بضد ہے۔''

''ٹھیک ہے بیٹا تم سوچو خوب سوچو لیکن کچھ فیصلے دماغ سے بھی ہوتے ہیں۔ اپنے دماغ سے سوچو...... ہم دونوں اب بوڑھے ہوچکے ہیں، ہمیں بہرکیف اب واپس اپنے دیس جانا ہے تم ایک تو اکیلی رہ نہیں سکو گی اور دوسری بات یہ کہ اپنے گھر والوں سے ملنے کے لیے تمہیں ایوب کی ضرورت تھی جو تمہیں مل رہا ہے تمہیں اور کیا چاہیے......؟ تمہاری عزت برقرار رہنے کے لیے

بھی تو ضروری ہے شادی۔" اہا نے بات مکمل کر کے ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ پی لیا۔

یوں جیسے صدیوں کی پیاس بجھانا چاہتے ہوں۔

☆☆☆

ٹھیک ایک ماہ سوچنے کے بعد شازیہ نے سرِ تسلیم خم کر لیا۔

واہ رے عورت تیری مجبوری۔

پھولوں اور خوشبوؤں سے سجے ہوئے اس کمرے میں وہ عجیب سی بے چینی، بے کلی محسوس کر رہی تھی۔ عمر کو سلمہ اپنے ساتھ لے کر جا چکی تھی۔

بھاری بھرکم عروسی جوڑے اور زیورات سے لدی پھندی وہ نہ جانے کیوں اپنے اندر خوشی محسوس نہیں کر رہی تھی۔ خیالات کی یلغار نے اندر سے خوب ڈرا دیا کہ اس شادی کا انجام بھی نہ جانے کیا ہوگا۔

چوہدری ایوب کو اس نے تمام رُودادِ حیات سنا دی تھی تا کہ کوئی مغالطہ نہ رہے۔ بعد میں کوئی تلخی نہ بنے۔ ایوب کو کسی بات پر اعتراض نہیں تھا۔ وہ کھلے دل سے اپنی اور شازیہ کی مشترکہ زندگی سے کمپرومائز کر رہا تھا۔ اور اسے خوش رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمر بھی اب ایوب کو اپنا باپ سمجھ کر محبتوں کا تبادلہ کرتا رہتا۔ اور بہت خوش بھی تھا۔

☆☆☆

زندگی کا دھارا پھر ایک نئی سمت چل پڑا۔ سرد اور طویل راتیں اور چھوٹے دن پاکستان میں یہ موسم بڑا دلفریب لگتا ہے۔

"مجھے تو لحاف میں گھس کر ٹی وی دیکھنا یا کتاب پڑھنا بڑا اچھا لگتا تھا۔" وہ آج بڑے خوشگوار موڈ میں تھی۔ وہ اچانک ہی ایوب سے مخاطب ہوئی۔ لائٹ گرین شرٹ پر ڈارک گرین کڑھائی، ڈارک گرین شلوار اور ٹائی اینڈ ڈائی کا خوب صورت دوپٹا اس کے سلونے حسن پر بڑا جچ رہا تھا۔ خوب صورت آنکھیں جن میں ہلکا سا کاجل کا ڈورا، میرون شیڈ کی لپ اسٹک ہلکی سی تہ ہونٹوں پر...... بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا ماتھے پر بالوں کی اِک آوارہ لٹ...... دل موہ لینے کو کافی تھی۔

ایوب نے اخبار کو سائڈ ٹیبل پر رکھا اور بڑی بے تابی سے شازیہ کا سرتاپا جائزہ لینے لگا۔

"بھئی یہ آج ہم کیا دیکھ رہے ہیں، کیا ہمارے نصیب بھی جاگنے والے ہیں یا ہم کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔" اس نے اپنے ہاتھ شازیہ کی طرف پھیلاتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں، آپ خواب نہیں حقیقت کا سامنا کر رہے ہیں؟" اس نے اپنا نازک ہاتھ ایوب کے مضبوط ہاتھ پر رکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ نے ایک وعدہ کیا تھا؟" وہ اتنا کہہ پائی۔

"جی آپ حکم کیجیے بیگم صاحبہ، ہم ہزاروں وعدے پورے کرنے کو تیار ہیں۔" اس نے بڑی ادا سے دائیں ہاتھ کو سینے پر رکھ کر سر جھکا کر کہا۔

"آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

"جی نہیں، میرا مقصد آپ کو شرمندہ کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ میں تو اس لمحے کا انتظار کر رہا ہوں جب آپ کوئی فرمائش کریں اور ہم سر دھڑ کی بازی لگا دیں۔"

"اللہ نہ کرے کہ آپ کو سر دھڑ کی بازی لگانی پڑے، مجھے تو بس یہی پوچھنا تھا کہ ہم سب پاکستان کب جا رہے ہیں؟" شازیہ بڑے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"ارے واہ، آپ کہتی ہیں تو ابھی چل پڑتے ہیں، آپ بولیں تو سہی......"

"ابھی تو خیر نہیں...... آپ پروگرام بنا لیں۔ امی جان کا جب بھی فون آتا ہے تو یہی تکرار کرتی ہیں کہ تم ایوب کے ساتھ پاکستان آؤ دونوں بچوں کو بھی لاؤ۔ میں بیمار رہتی ہوں زندگی کا کچھ بھروسا نہیں کب اوپر سے بلاوا آ جائے۔" اس نے بات یہیں پر ختم کر دی اور بڑی اداس نظروں سے ایوب کو تکنے لگی۔

"بھئی اس میں اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں شازو میں کل ہی ٹریول ایجنسی جاتا ہوں اور انشاء اللہ اگلے ہفتے ہم لوگ پاکستان ہوں گے۔"

"آپ بہت اچھے ہیں ایوب آپ کا بے حد شکریہ۔" اس نے ایوب کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر چوم لیا گویا بہت بڑا معرکہ سر کر لیا ہو۔

اور ایوب اس کی اس معصوم حرکت پر اس کے گال چھو کر مسکرا دیا۔

☆☆☆

پاکستان روانہ ہونے سے پہلے اس نے ایوب کو تمام پٹی پڑھا دی تھی، سلمہ نے دبئی ائرپورٹ چھوڑا ایوب کو ایک، ایک بات واضح کر دی تھی کہ کہیں بھولے سے تم نے خود کو دوسرا ایوب ظاہر نہیں ہونے دیا۔

سرگودھا پہنچ کر جہاں وہ بہت خوش تھی وہاں ایک نامعلوم سی اداسی نے اسے گھیر لیا۔ امی واقعی بیمار تھیں، انہیں شوگر اور بلڈ پریشر کا موذی مرض لاحق تھا ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی تھیں۔ شازیہ کا دل جیسے اندر سے کسی نے مسل دیا ہو شمشاد آپا اور ثمینہ بھی پہلے سے امی جان کے پاس تھیں۔

ایوب نے خود کو بڑے اچھے طریقے سے پوز کیا۔ سب اسے عمر کا والد ہی سمجھ رہے تھے سب نے کوٹھی کے بارے میں دریافت کیا تو ایوب نے کہا کہ کوٹھی کو اس کے چچا مسعود نے گود لے لیا تھا اس لیے وہ اب ان کا ہی بیٹا ہے۔

"تم لوگ کتنے دن کے لیے پاکستان آئے ہو۔" شمشاد آپا نے کھانے کی ٹیبل پر پوچھا۔

"جی شمشاد آپا ہم لوگ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ رکنے کا پروگرام لے کر آئے ہیں کیونکہ ایوب صاحب کو اس سے زیادہ آفس سے چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔" شازیہ نے نپے تلے الفاظ میں کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے شازیہ لیکن امی جان کی طبیعت کوئی خاص تسلی بخش نہیں ہے۔ انہیں دل کا بھی عارضہ ہے۔ خدانخواستہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میرا رب میری اماں کو لمبی عمر دے لیکن میڈیکل رپورٹس کے مطابق اماں ہمارے پاس مہمان ہیں، ایسے میں تمہارا جلدی جانا اتنا مناسب نہیں۔" انہوں نے شازی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ شازیہ کی آنکھیں پانیوں سے لبریز ہو گئیں۔ وہ ایوب کی طرف دیکھنے لگی۔

"ڈونٹ وری شازو، تم جب تک چاہو رہ سکتی ہو، خالہ جان میری بھی ماں ہیں، میں کوشش کروں گا کہ چھٹی بڑھا لوں اگر نہ ملی تو تم یہیں ٹھہر جانا میں واپس چلا جاؤں گا۔ اور جب بھی ضرورت پڑی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔"

☆☆☆

لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔

والدہ اس دنیا سے رخصت ہو گئیں شازیہ نے ایوب کو پاکستان آنے کو نہیں کہا...... بلکہ خود بھی ہمیشہ کے لیے پاکستان رہنے کا ارادہ کر لیا۔

ایوب نے کئی مرتبہ فون کیا اور نہ آنے کی وجہ پوچھی۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول سے کام لیتی رہی لیکن پھر ایک روز اس نے بہت ساری ہمت جمع کر کے ایوب کو فون پر بتا دیا۔

"مجھے اس بات کا بہت دکھ ہے کہ میں آپ سے محبت نہیں کر سکی بلکہ ایک ڈرامائی زندگی آپ کے ساتھ گزارتی رہی ہوں۔ دراصل میں محبت پہلی اور آخری بار کر چکی ہوں وہ شخص جس نے بے وفائی کے سارے ریکارڈ توڑ دیے تھے میری محبت اس بے وفا شخص پر ہی ختم ہو چکی تھی۔ آپ بہت اچھے انسان ہیں لہٰذا میں آپ کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ میری طرف سے آپ کو اجازت ہے آپ اپنے لیے زندگی کا کوئی بہتر ساتھی چن سکتے ہیں۔" اس کی آواز گلے میں اٹک گئی۔

"یہ تم کیا بک رہی ہو شازیہ کیا تم میرے ساتھ ناٹک کر رہی تھیں؟"

"ایوب میں آپ سے محبت کرنا چاہتی تھی لیکن ناکام ہو چکی ہوں، میں بہت بری عورت ثابت ہوئی ہوں لیکن میں آپ کے ساتھ منافقت کی زندگی کیسے گزاروں؟" اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔

"اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے سوچ لو شازیہ تم ایک بار پھر ایک عذاب ناک زندگی کو ترجیح دے رہی

ہو۔ ابھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' وہ رو ہانسا ہو رہا تھا۔ بے شمار لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

''میں جانتی ہوں ایوب صاحب کہ میں نے آپ کی زندگی سے نکل کر اپنے..... لیے مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے کر لیے ہیں۔ ایک طویل پل صراط پر اپنے قدم رکھ دیے ہیں؛ اس پل صراط پر چلنا گویا کسی تیز دھار آلے پر چلنے کے مترادف ہے۔ میرے پاؤں لہولہان ہو جائیں گے لیکن میں سانس لینے کے لیے بھی رک نہیں پاؤں گی کیونکہ اس پل صراط کے نیچے آگ کا دریا ہے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''لیکن میں تمہیں اس پل صراط پر چلنے کی اجازت نہیں دوں گا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے میں شمشاد آپا سے بات کروں گا۔ تمہارے بھائیوں سے کہوں گا۔''

''آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ صرف میری ماں مجھ سے محبت کرتی تھی جواب اس دنیا میں نہیں ہے۔ میرے سب بھائی، بہنیں مجھ سے نفرت کرتے ہیں کہ میں نے دبئی میں اپنی پسند کی نہ سہی لیکن اپنے گھر والوں کی مرضی کے بغیر شادی کر لی تھی۔ میری شادی میرا جرم تھا اور اس کی سزا بھی میں اکیلے ہی بھگتنا چاہتی ہوں، آپ کا کیا قصور کہ آپ مجھ جیسے ایک پتھر سے سر ٹکراتے رہیں، آپ کو اپنی زندگی انجوائے کرنے کا پورا حق ہے۔''

وہ فلک کہ جس پر ملے تھے ہم کوئی اور تھا اسے بھول جا۔

☆☆☆

شازیہ باجی کا یہ فیصلہ غلط تھا یا صحیح مجھ سے ان کی ملاقات اس وقت ہوئی جب ان کے بیٹے عمر کی چوبیس ویں سالگرہ تھی؛ ہم لوگ پرواز فین کی کالونی میں رہائش پزیر تھے، مسز الیاس میرے گھر آئیں تو کہنے لگیں کہ ''نسرین تم شام کو آنا سرگودھا سے میری ایک دوست آئی ہوئی ہیں آج ان کے بیٹے کی چوبیس ویں سالگرہ ہے چھوٹا سا فنکشن ہے تم ضرور آنا میں تمہیں شازیہ سے ملواؤں گی۔''

برتھ ڈے کیا تھی بس مل بیٹھنے کا اِک بہانہ تھا، دھیمے لہجے میں ان کے بات کرنے کا انداز مجھے بہت بھایا اور نہ جانے کیسے میں اور شازیہ باجی بہت جلد دوست بن گئیں۔ اگلے روز وہ میرے گھر بھی آئیں۔

مسز الیاس اور شازیہ باجی سرگودھا کے چک 46 کی رہنے والی تھیں اور وہ مسز الیاس کی والدہ کی شاگرد بھی رہ چکی تھیں۔ دونوں گھروں کا آپس میں بہت لگاؤ تھا۔ اور اسی وجہ سے شازیہ باجی یہاں گجرات میں مسز الیاس کے گھر دو تین ماہ ٹھہری رہیں۔

ان کا زیادہ وقت میرے پاس گزرتا..... ان کی معلومات وسیع تھیں، ہر موضوع پر بات کر لیتی تھیں۔ ہم دونوں گھنٹوں باتیں کیا کرتے کبھی پرانی فلموں اور پرانے گانوں کو ڈسکس کیا جاتا۔ کبھی شاعری اور افسانوں پر بحث چھڑ جاتی۔ کبھی کوکنگ پر زور چلتا، میرے ہاتھ کا کھانا بہت شوق سے کھاتی تھیں۔ کتابیں پڑھنے کا شوق بھی ہمارا مشترک تھا۔

کبھی، کبھی میرے میاں جمیل اختر بھی ہم دونوں کی گفتگو میں شامل ہو جاتے، وہ بھی شازیہ باجی کی عزت سگی بہنوں کی طرح کرتے تھے۔ پھر یہ ہوا کہ باجی سرگودھا سے گجرات آتی جاتی رہتی تھیں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ سیدھی میری طرف ہی چلی آتیں اور پورا ہفتہ گزر جاتا کسی کو کالونی میں کانوں کان خبر نہیں ہوتی کہ شازیہ باجی آئی ہوئی ہیں۔

انہوں نے اپنی رُودادِ حیات مجھے سنائی تھی..... میں نے ان سے ضد کی کہ آپ ایوب بھائی سے صلح کر لیں وہ اب بھی دبئی میں موجود ہیں لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہو سکی تھیں، کہنے لگیں۔ ''یہ زنجیریں چوبیس سال پہلے میں نے خود اپنے پیروں میں ڈالی تھیں انہیں اب کھولنے کا کیا فائدہ..... اب تو جوانی بھی جا چکی ہے۔''

شازیہ باجی کے بھائی' بہنوں نے ابھی تک انہیں معاف نہیں کیا تھا عمر کو بھی ننھیال سے کوئی محبت نہ ملی۔ میں نے شازیہ باجی سے بہت کہا کہ آپ سرگودھا

سے گجرات میرے گھر میں شفٹ ہو جائیں لیکن نہیں مانی۔ سرگودھا میں بھائی کے گھر کے اوپر والے پورشن میں کرایہ دے کر رہتی رہیں۔

میں بھی ایک دو بار سرگودھا گئی۔ بیماری زور پکڑ رہی تھی بہت پرہیز کرتی تھیں اس کے باوجود شوگر نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا۔ اور دائیں پیر کا انگوٹھا ڈاکٹروں نے کاٹ دیا۔ میں سرگودھا گئی تو ان کی حالت دیکھ کر رو پڑی تو وہ مجھے ساتھ لگا کر ہنس پڑیں۔

''تم کیونکہ پریشان ہوتی ہو، تمہیں پتا ہے کہ میں نے خود ہی پل صراط پر چلنے کو ترجیح دی تھی اب پاؤں لہولہان ہوتے ہیں تو کسی کو دوش کیوں دوں.....''

میں نے ان کی ڈائری سے ایوب بھائی کا نمبر لے لیا اور انہیں فون کر کے حال احوال پوچھا اپنے بارے میں بتایا کہ میں ان کی دوست ہوں۔ وہ کہنے لگے کہ میں آج بھی شازیہ کے سامان کے ساتھ اسی گھر میں موجود ہوں، آپ شازیہ سے پوچھو میں اس کا سامان کارگو کرا دیتا ہوں۔ اگر شازیہ مانے تو کچھ رقم اسے بھجوا دیتا ہوں لیکن باجی نے انکار کر دیا۔

میں نے بہت کوشش کی کہ وہ ایوب بھائی کی طرف لوٹ جائیں لیکن وہ کہنے لگیں۔ ''پگلی میں مجبور ہوں آج بھی اس ایوب سے محبت کرتی ہوں جو مجھے دھوکا دے کر امریکا جا بسا ہے۔''

عمر نے ایف اے کے بعد تعلیم کو خیر آباد کہہ دیا۔ اس بات کا بھی باجی کو بہت غم تھا۔ مجھے ایک مرتبہ کراچی جانا پڑا میں نے کسی نہ کسی طرح سے امریکا والے ایوب صاحب کا ایڈریس باجی سے لے لیا تھا۔ اور کراچی میں مقیم نوید بھائی کو بھیج کر اس کے گھر ایوب بھائی کا فون نمبر منگوا لیا۔

اور جب امریکا رابطہ کیا تو ایوب بھائی کو ساری بات سنائی وہ کہنے لگے میں سرگودھا رابطہ کروں گا۔

انہوں نے سرگودھا فون کیا تو شازیہ باجی نے ریسیور اٹھاتے ہی اپنے بے وفا محبوب کی آواز کو پہچان لیا۔ السلام علیکم کہنے کے بعد باجی خاموش ہو گئیں ایوب بھائی نے جتنی بھی بات کی باجی نے جواب نہیں دیا بلکہ عمر کو آواز دے کر کہا کہ تمہارے پاپا کا فون ہے تم بات کر لو۔

اس طرح عمر کا رابطہ اپنے باپ سے ہو گیا کبھی کبھار وہ تھوڑی بہت رقم بھی عمر کو بھجوا دیتے لیکن باجی اسے اپنی ذات پر خرچ کرنا حرام سمجھتیں۔ جب بھی امریکا سے فون آتا وہ ریسیور اٹھا کر عمر کو آواز دیتیں کہ تمہارے پاپا فون پر ہیں۔ وہ 2014ء تک میرے ساتھ رابطے میں رہیں۔ بلکہ کبھی کبھار چکر لگا لیا کرتیں اب زیادہ بیمار رہنے لگیں بہت کمزور دکھائی دینے لگیں۔ اسی سال کے آخری مہینوں میں میرے پاس آئیں تو کہنے لگیں عمر کے لیے ایک رشتہ دیکھنے جانا ہے میں نے سوچا تمہیں ساتھ لے چلوں۔

اس وقت میں اس کالونی سے شادمان شفٹ ہو چکی تھی۔ وہیں پر میرے پاس پہنچ گئیں۔ اور کہنے لگیں کہ ''لڑکی امریکا میں سیٹ ہے میں چاہتی ہوں کہ عمر کی شادی کسی ایسی لڑکی سے ہو جائے جو اسے ساتھ امریکا لے جائے تاکہ یہ میری زندگی میں ہی اپنے باپ کے پاس پہنچ جائے۔''

ہم لوگ صبح سویرے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ عمر ہمارے ساتھ تھا۔ ہم مطلوبہ رہائش گاہ تک پہنچ گئے۔ اس گاؤں میں داخل ہوتے ہی ہمیں بہت سی عورتیں ایک دوسرے سے چہ مگوئیاں کرتی نظر آئیں یوں لگتا تھا کہ ہمارے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔

گاؤں کے سب سے بڑے گھر میں ہم داخل ہو گئے، ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا ڈرائنگ روم ڈیکو پینٹ کے خوب صورت فرنیچر سے سجایا گیا تھا، ایک، ایک چیز سے امارت ٹپک رہی تھی۔ ایک جوان لڑکی اپنے سوٹڈ بوٹڈ صاحب کے ساتھ کمرے میں آئی اور پھر جلدی ہی کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ بابو قسم کا بندہ کہنے لگا کہ یہ میری بیٹی ہے امریکا سے آئی ہے اور میں اسی کا رشتہ کرنا چاہتا ہوں۔

عمر جس جگہ پر بیٹھا اس طرف کا ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا میں نے ان صاحب سے کہا کہ

ہمیں سادہ پانی پلا دیں کیونکہ باجی بیمار ہیں تو انہیں پانی کی طلب محسوس ہو رہی ہے، وہ پانی لانے کا کہہ کر کمرے سے باہر نکلے تو ایک لڑکی نے گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے جھانک کر کہا کہ آپ سب لوگ یہاں سے بھاگ جائیں، یہ لوگ آپ کو بے ہوش کر کے لوٹ لیں گے۔

ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اس چھوٹے سے دروازے سے نکل بھاگے۔ عمر نے باجی شازیہ کا ہاتھ تھام لیا اور میں نے اپنے ساتھ آئی ہوئی کام والی کا ہاتھ پکڑا اور دوڑ لگا دی۔ کچھ دور دوڑنے کے بعد ایک بوسیدہ سے گھر کا دروازہ کھلا اور ایک عورت ہمیں تیزی سے اندر لانے لگی۔ ہم چاروں اس دروازے سے اندر داخل ہوئے تو اس عورت نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا اور ہمیں چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

ہمیں وہ ایک کمرے میں لے گئی جس میں کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ وہاں ایک پرانی چارپائی پر ہم بیٹھ گئے۔ اتنے میں گلی میں موٹر سائیکلیں چلنے اور تیز، تیز بولنے کی آوازیں آئیں۔ ہم لوگ دم سادھے بیٹھے رہے۔ پھر اس گھر میں رہنے والی ایک جوان لڑکی نے ہمیں پانی پلایا اور بتانے لگی کہ یہ لوگ ڈاکو ہیں جو ہر مہینے کسی مقامی اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دیتے ہیں جس میں لڑکی امریکا یا یورپ پلٹ بتائی جاتی ہے جس کے پیٹرول پمپ اور پلازے بتائے جاتے ہیں .... باہر کے رشتے کے لالچ میں سادہ لوح لوگ آجاتے ہیں جنہیں یہ لوگ شربت میں بے ہوشی کی دوا ملا کر بے ہوش کر کے لوٹ لیتے ہیں اور پھر پستولیں دکھا کر خاموش رہنے کی دھمکی دیتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہاں سے لٹ لٹا کر گئے ہیں آپ لوگ نصیب سے بچے ہیں۔ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا گزرنے کے بعد ہم لوگ گاؤں سے نکلے اور بڑی مشکل سے جی ٹی روڈ پہنچے جہاں اتفاق سے ایک کیری ڈبا راول پنڈی کی طرف سے آتا دکھائی دیا تو ہم لوگ سڑک کے درمیان ہو کر روکنے لگے اس بھلے مانس نے جلدی سے ہمیں بٹھایا اور گاڑی دوڑا دی جہلم تک کا کرایہ اس نے وصول کیا اور جہلم پہنچ کر ہم گجرات کی گاڑی پر بیٹھ گئے۔ گھر پہنچ کر خدا کا شکر ادا کیا اور صدقہ خیرات بھی دی۔

اگلے روز شازیہ باجی سرگودھا چلی گئیں۔

اس کے بعد ہمارے رابطے میں ایک لمبا وقفہ آگیا۔ کبھی کبھار ان کا فون آتا کبھی میں کر لیتی کئی بار مہینے گزر جاتے۔

ایک بار فون پر باجی نے بتایا کہ طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی ہے اور لاہور سے علاج کروا رہی ہوں۔

اس دوران میں بہت دفعہ بیمار ہوئی ٹھیک ہوئی مختلف قسم کی پریشانیاں زندگی میں شامل ہونے لگیں۔ ایک طویل مدت گزر گئی، میں لاکھ چاہنے کے باوجود فون نہ کر سکی۔ اس رمضان میں 2016ء میں قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھی کہ جمیل صاحب اپنے کمرے سے نکلے اور بولے تم نے شازیہ بہن کو عرصے سے فون نہیں کیا۔ یہ تو بہت غلط بات ہے ان کی خیر خیریت ہی معلوم کر لو۔ میں نے فارغ ہو کر ڈائری میں سے باجی کا نمبر نکال کر ڈائل کیا اور کافی دیر بعد عمر نے فون اٹھایا۔

”السلام علیکم نسرین آنٹی......“

”وعلیکم السلام...... بیٹا تم لوگوں کے کیا حال ہیں، آپ لوگ تو گجرات کو بھول ہی گئے ہو۔“

”نہیں آنٹی، گجرات کو کیسے بھول سکتے ہیں دراصل آپ کا نمبر گم ہو گیا تھا۔“

”چلو خیر ہے تم امی سے بات کراؤ۔“ میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔

”امی سے بات کیسے کراؤں وہ تو پچھلے ہفتے آپ کو یاد کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔“

عمر کی آواز بھرا گئی اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ کلیجا جیسے منہ کو آگیا۔ ”اوہ تو میری شازیہ باجی آخر کار آپ نے پل صراط عبور کر ہی لیا۔“



شمع ہدایت

اختر شجاعت

تواضع...... توفیقِ الٰہی

تمام تعریف، تمام حمد و ثنا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جو بہترین عطا کے ساتھ اپنے بندوں پر احسان کرنے والا ہے۔ کل کائنات میں صرف وہی عبادت کے لائق ہے۔ اس نے اپنی مہربانی سے ہمیں اپنا بندہ اور خادم بنا لیا ہے۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور کوئی شے اس کے مشابہ نہیں...... اس کے علاوہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اس نے اپنی رحمتِ کاملہ سے آپؐ کو حق عطا فرما کر تمام خلقت کی ہدایت کے لیے اس دنیا میں بھیجا، درود سلام ہو رسول برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر......

ہمارا آج کا موضوع تواضع ہے، تواضع کے لغوی معنی مہمان نوازی، خاطر مدارات کے ہیں...... لیکن تصوف کی اصطلاح میں تواضع کے معنی ہیں۔ جناب الٰہی میں بندے کا پست ہو جانا...... انسان کا اپنے جاہ و منصب اور بزرگی کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا اور اپنے مہاجرین میں خود کو ہیچ سمجھنا۔

اخلاقِ صوفیہ میں سب سے بہتر خلق تواضع ہے۔ بندے کے لیے تواضع سے بڑھ کر کوئی اور لباس نہیں ہے جو شخص تواضع کا خزانہ حاصل کر لیتا ہے وہ ہر شخص کے سامنے اپنی اپنی حیثیت کو ایک انداز سے پر قائم رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ دوسرے شخص کو بھی اس کے صحیح مقام اور مرتبے پر رکھتا ہے۔ جسے تواضع حاصل ہو گئی وہ خود بھی آرام سے رہتا ہے اور دوسروں کو بھی اس سے آرام پہنچتا ہے۔

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین و دنیا کے بادشاہ ہونے کے باوجود حد درجہ متواضع اور سادہ مزاج تھے۔ مجلس میں کبھی پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ چھوٹا ہو یا بڑا اسلام کرنے میں سبقت کرتے تھے۔ غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے اور غریب سے غریب آدمی کی عیادت کو تشریف لے جاتے...... صحابہ کرامؓ کے ساتھ گھل مل کر بیٹھ جاتے کسی امتیازی نشست یا نشانی کی ضرورت نہ ہوتی۔ بازار سے خود سودا خرید کر لاتے۔ اپنے جانوروں کو خود چارہ ڈالتے، ان کے بدن پر تیل ملتے اور گھر کے دوسرے کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔

ایک مرتبہ دورانِ سفر آپ کی نعلین کا تسمہ ٹوٹ گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم درست کرنے لگے تو ایک صحابیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لایئے میں ٹانک دوں...... اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... تشخص پسندی مجھے محبوب نہیں چنانچہ خود ہی تسمہ ٹانک دیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تواضع کو مقاماتِ قرب میں بھی اختیار فرماتے تھے۔ جب ایک روز حضرت بی بی عائشہؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حجرے میں نہ پایا تو آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ...... تلاش کرتی ہوئی مسجد تک جا پہنچیں وہاں مسجد میں آپؓ نے دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سربسجود تھے اور سجدے کی حالت میں یہ الفاظ فرما رہے تھے۔ ”اے اللہ! میرا دل اور خیال بھی تیرے آگے سربسجود ہے...... میرا دل تجھ پر ایمان لایا ہے اور میری زبان اس کا اقرار کر رہی ہے۔ اے عظمت والے رب! اے بڑے، بڑے گناہوں کو معاف کرنے والے میں تیرے سامنے ہوں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ ”میرا دل اور خیال تیرے آگے سربسجود ہے۔“ یہ قول تواضع کی انتہا ہے۔ یہ کہہ کر وجود کے آثار اس طرح محو کر دیے ہیں کہ ظاہر و باطن میں ایک ذرہ بھی سجدہ سے الگ نہیں ہے۔

☆☆☆

فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی نازل فرمائی۔

”تم تواضع کرو اور کوئی شخص ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے۔“

جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی......

”محبوب آپ فرما دیجیے اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔“ (سورۂ آل عمران) تو اس وقت حضور

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”یہ اتباع...... نیکی، تقویٰ، خوف اور تواضع کے ساتھ ہو۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تواضع کا یہ عالم تھا کہ آزاد اور غلام کی دعوت اور ان کا تحفہ قبول فرماتے تھے خواہ وہ دودھ کا ایک گھونٹ اور خرگوش کی ران ہی کیوں نہ ہو...... آپ اس کا صلہ بھی دیتے تھے اور خود بھی کھاتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا...... ”تواضع کی بنیاد یہ ہے کہ جس سے ملو اسے پہلے سلام کرو اور جو تمہیں سلام کرے اس کا جواب دو...... محفل میں کم درجے کی نشست کو پسند کرو۔ اور یہ نہ چاہو کہ کوئی تمہاری تعریف و توصیف کرے یا تم پر احسان کرے...... مزید فرمایا۔ وہ شخص کتنا اچھا ہے جو اپنی کوتاہی یا برائی کے بغیر تواضع اختیار کرے اور محتاجی کے بغیر اپنے آپ کو عاجز سمجھے۔“

حضرت جنید بغدادیؒ سے تواضع کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؒ نے فرمایا...... ”تواضع عاجزی اور نرم مروی ہے۔“

حضرت فضیلؒ نے تواضع کے بارے میں فرمایا۔ ”تم حق کے سامنے سر تسلیم خم کرو اور جو حق بات سنو تو اسے قبول کرو، جس نے اپنی قدر و قیمت کو محسوس کیا تو اس کا تواضع سے کوئی تعلق نہیں۔“

شیخ ابو حفصؒ کا قول ہے...... ”جو یہ چاہتا ہو کہ اس کا دل تواضع کرے وہ نیک بندوں کی صحبت اختیار کرے اور ان کی عزت کرے اسی طرح ان کی بے حد تواضع کی وجہ سے وہ ان کی اتباع کرے اور تکبر نہیں کرے۔“ حضرت لقمانؑ کا قول ہے۔

”ہر چیز کی سواری ہوتی ہے اور عمل کی سواری تواضع ہے۔“

حضرت شیخ ثوریؒ فرماتے ہیں...... ”دنیا میں معزز ترین انسان پانچ قسم کے ہیں۔

1) زاہد عالم
2) فقیہہ صوفی
3) متواضع دولت مند
4) شکر گزار درویش
5) روشن ضمیر شریف“

حضرت شیخ یوسف بن اسباطؒ سے پوچھا گیا کہ تواضع کی حد کیا ہے؟ فرمایا۔ ”جب اپنے گھر سے نکلو اور کسی سے ملاقات کرو تو اسے اپنے سے بہتر سمجھو۔“

حضرت شفیق بلخیؒ سے جب پوچھا گیا کہ انسان کس طرح سے پہچانا جاتا ہے کہ وہ اپنے رب سے وابستہ ہے؟ آپؒ نے ارشاد فرمایا۔ ”اس کی پہچان یہ ہے کہ جب دنیا کی کوئی چیز چھن جائے تو وہ اسے غنیمت سمجھے اور اگر کوئی چیز ملنے میں دیر ہو جائے تو وہ دیری اس کو ملنے سے بہتر لگے۔“

آپؒ فرماتے ہیں کہ ”میرے نزدیک مہمان سے بہتر کوئی چیز نہیں کیونکہ اس کا رزق اور ذمے داری تو اللہ کے سپرد ہے اور اس کا ثواب مجھے ملتا ہے۔“ حضرت منصور بن عمارؒ فرماتے ہیں کہ ”بندے کا بہترین لباس تواضع اور انکساری ہے۔“

حضرت احمد بن عاصم انطاکیؒ فرماتے ہیں کہ ”سب سے زیادہ مفید تواضع وہ ہے جو تجھ سے تکبر کو دور کر دے اور غصہ کو تجھ سے دور کرے۔“

☆☆☆

حضرت شیخ ابو الحبیب ضیا الدین سہروردیؒ کے پاس شام کے سفر کے دوران فرنگی قیدیوں کو جو صلیبی جنگ میں قید ہوئے تھے۔ بیڑیوں میں جکڑ کر ان کے سروں پر کھانا رکھوا کر لایا گیا۔ جب دستر خوان بچھایا گیا تو قیدی برتنوں کے خالی ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ اس وقت آپؒ نے خادموں کو حکم دیا کہ قیدیوں کو لایا جائے تاکہ وہ بھی ان درویشوں کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھیں چنانچہ جب انہیں لا کر ایک ہی صف میں دستر خوان پر بٹھا دیا گیا تو آپؒ سجادہ سے اٹھ کر ان کے ہی ایک فرد کی طرح ان کے درمیان بیٹھ گئے اور ان ہی کے ساتھ کھانا کھایا...... اس وقت ان کے چہرے پر سے باطنی خلوص، تواضع اور عاجزی و انکساری جھلک رہی تھی۔ جس سے ان کے ایمان اور وسیع علم و عمل کا پتا چلتا تھا۔

حضرت یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں۔ ”تواضع ہر ایک کے لیے اچھی ہے مگر دولت مندوں کے لیے زیادہ اچھی ہے۔ تکبر ہر ایک کے لیے برا ہے مگر درویش کے لیے تکبر کرنا بدترین ہے۔“

مہمانوں کے سامنے تواضع کے طور پر کھانا پیش کرنے کے بہت فضائل ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ ”فرشتے تم میں سے ایک شخص کے لیے رحمت کی دعا میں مشغول رہتے ہیں جب تک اس کا دستر خوان اس کے سامنے بچھا رہے اور اٹھ نہ جائے۔“

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ”جو خرچ برادرانِ اسلام کو کھانا کھلانے میں ہوتا ہے اس کا محاسبہ نہ ہوگا۔“

خراسان کے بعض علما کے متعلق منقول ہے کہ وہ اپنے ملنے والوں کے سامنے اتنا کھانا رکھتے تھے کہ ان سے کھایا نہیں جاتا تھا۔ فرماتے تھے کہ ہمیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا علم ہے کہ ”جب بھائی کھانے سے ہاتھ روک لیں تو جو شخص ان کا بچا ہوا کھانا کھائے گا تو اس کا محاسبہ نہ ہوگا۔“ اسی لیے ہم مہمانوں کی خدمت میں زیادہ سے زیادہ کھانا

حاضر کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ہم ان کا ہی بچا ہوا کھانا کھائیں اور احتساب سے محفوظ رہیں۔“

ایک حدیث میں ہے کہ ”بندے سے تین کھانوں کا حساب نہیں لیا جائے گا...... ایک سحر کا کھانا دوسرا افطار کا کھانا تیسرا وہ کھانا جو مہمانوں کے ساتھ کھائے۔“ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ”اگر میں اپنے بھائیوں کو صاع کے بقدر کھانے پر مدعو کروں تو یہ عمل میرے نزدیک ایک غلام آزاد کرنے سے بہتر ہے۔“ عہد صحابہ میں یہ بھی دستور تھا کہ لوگ قرآن کریم کی تلاوت کے لیے جمع ہوتے اور کچھ نہ کچھ کھا کر رخصت ہوتے۔ کہتے ہیں کہ ”محبت و اخلاص کے ساتھ بھائیوں کا اجتماع دنیاوی عمل نہیں بلکہ دینی عبادت ہے۔“

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں......

”جب تمہارے پاس کوئی ملنے آئے تو اس کی عزت کرو۔“

”تم میں سے بہتر وہ ہے جو کھانا کھلائے۔“

”جو شخص اپنے بھائی کو اتنا کھلا دے کہ وہ شکم سیر ہو جائے اور اتنا پانی پلا دے کہ اس کی پیاس باقی نہ رہے تو اللہ تعالیٰ اسے دوزخ سے سات خندقیں دور کر دے گا اور وہ خندقیں ایسی ہوں گی کہ ہر دو خندقوں کے درمیان پانچ سو برس کا فاصلہ ہوگا۔“

☆☆☆

حضرت خواجہ حسن بصریؒ کی تواضع اس قدر تھی کہ ہر کسی کو اپنے سے بہتر سمجھتے تھے۔ ایک دن دریائے دجلہ کے کنارے ایک حبشی کو ایک عورت کے ہمراہ دیکھا جو شیشے سے کچھ پی رہا تھا۔ آپؒ کے دل میں خیال آیا کہ اگرچہ میں گناہ گار ہوں لیکن اس شخص سے ضرور اچھا ہوں اسی خیال میں تھے کہ سامنے سے ایک کشتی آئی اور وہ غرق ہو گئی جس میں سات آدمی سوار تھے۔ حبشی یہ دیکھ کر فوراً دریا میں کودا اور چھ آدمی باہر نکال لایا۔ پھر خواجہ حسن بصریؒ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم اپنے آپ کو بہتر سمجھتے ہو چھ کو میں نے غرق ہونے سے بچا لیا باقی ماندہ ایک آدمی کو تم بچاؤ...... امام المسلمین! میں تو تمہارا امتحان لے رہا تھا کہ آیا تم اندھے ہو یا کچھ دکھائی بھی دیتا ہے۔ یہ عورت میری ماں ہے اور شیشے میں شراب نہیں بلکہ پانی ہے۔ یہ سن کر آپؒ اس کے پاؤں میں گر پڑے اور عرض کیا کہ جس طرح چھ آدمیوں کو تم نے غرق ہونے سے بچا لیا اسی طرح کرو یعنی کے دریا میں غرق ہونے سے مجھے بچاؤ...... اس کے بعد کبھی کسی کو حقیر نہ سمجھا۔

☆☆☆

حضرت وہب بن منبہؒ فرماتے ہیں۔ ”اللہ تعالیٰ کی کتابوں میں مکتوب ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب میں نے آدم کی پشت سے ذروں کو برآمد کیا اس وقت میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل سے زیادہ متواضع کسی قلب کو نہ پایا اس لیے میں نے ان کو منتخب کر کے ان سے کلام کیا۔ (کلیم اللہ بنایا)

حضرت بایزید بسطامیؒ سے دریافت کیا گیا کہ انسان کب متواضع ہوتا ہے؟ آپؒ نے جواب دیا کہ ”جب اپنی ذات پر اپنے نفس کا کوئی حق نہ سمجھے اور خود کو مخلوق میں سب سے بدتر سمجھے۔“

ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دکان سے کچھ خریدا اٹھنے لگے تو دکاندار نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دست مبارک چومنا چاہا...... تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ اور فرمایا...... ”یہ تو اہلِ عجم کا دستور تھا۔ میں بادشاہ نہیں ہوں تم ہی میں سے ایک ہوں۔“

جنگ حنین کے بعد جب اسیرانِ جنگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوئے تو ان میں سے ایک خاتون نے عرض کی۔ میں حلیمہ سعدیہؓ کی دختر شیما ہوں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ردائے مبارک زمین پر بچھا دی اس پر نہایت عزت سے بٹھا دیا اور فرمایا۔ ”میں تمہارا بھائی ہوں میرے پاس رہو یا اپنے قبیلے میں جانا پسند کرو تمہاری توقیر میں فرق نہیں آئے گا۔“ شیما نے عرض کی۔ میں قبیلے میں جانا پسند کروں گی...... حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ایک کنیز، ایک غلام اور بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ عنایت فرمایا...... وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تواضع سے حد درجہ متاثر ہوئی۔

☆☆☆

تواضع ہمارے بزرگوں کی شخصیت کا اہم خاصہ رہی ہے...... حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے والد بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے۔ والد کی موت سے ابھی سنبھلے بھی نہ تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا...... اور یوں آپؒ دنیا میں اکیلے رہ گئے...... والد گرامی کی وفات کے بعد ایک باغ اور ایک چکی آپ کو ورثے میں ملی تھی۔ معیشت کا بوجھ آپؒ کے کاندھوں پر آپڑا...... آپؒ نے باغبانی کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا سارے کام باغ کے آپ کو خود ہی کرنا ہوتے تھے جس کی وجہ سے آپ کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا جس کا آپ کو بڑا دکھ تھا۔

ایک دن حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اپنے باغ کے درختوں کو پانی دے رہے تھے کہ ادھر سے ایک مشہور بزرگ حضرت ابراہیم قندوزی کا گزر ہوا...... حضرت خواجہ نے جب ایک بزرگ کو دیکھا تو دوڑ کر ان کے پاس گئے ان کے ہاتھوں کو

بوسہ دیا۔ بزرگ ایک لڑکے کی اس عقیدت پر بہت خوش ہوئے پھر آپؒ نے خواجہ صاحب کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعائیں دیں اور آگے جانے لگے تب خواجہ صاحب نے حضرت ابراہیم قندوزیؒ کا دامن تھام لیا..... انہوں نے پلٹ کر پوچھا.....''اب کیا چاہتے ہو؟'' آپؒ نے بہت ادب سے کہا کہ ''یہ ایک گزارش ہے کہ آپ چند لمحوں کے لیے میرے باغ میں قیام فرمالیں۔ کون جانے پھر یہ نیک ساعت لوٹ کر آتی ہے یا نہیں؟''

آپؒ کا لہجہ اس قدر عقیدت مندانہ تھا کہ حضرت ابراہیمؒ انکار نہ کر سکے اور باغ کے اندر چلے آئے۔ خواجہ معین الدینؒ نے ان کو نہایت احترام سے بٹھایا اور پھر اجازت لے کر باغ کے ایک گوشے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد آپؒ واپس آئے تو آپ کے ہاتھوں میں انگوروں سے بھرے ہوئے دو طباق تھے۔ آپؒ نے عاجزی کے ساتھ انگور کے وہ تازہ خوشے حضرت ابراہیم قندوزیؒ کے سامنے رکھ دیے اور خود دست بستہ کھڑے ہو گئے۔

''خادم کے پاس آپ کی تواضع کے لیے بس یہی کچھ تھا اگر آپ اسے قبول فرمالیں گے تو میں اپنی خوش قسمتی پر فخر کروں گا۔'' حضرت خواجہؒ نے اس نوعمری میں سعادت مندی کا وہ مظاہرہ کیا تھا کہ ابراہیم قندوزیؒ بھی حیران تھے۔ بزرگ نے ایک بار پھر حضرت خواجہ کو محبت آمیز نظر سے دیکھا اور آپ کی دلجوئی کے لیے چند انگور اٹھا کر منہ میں رکھ لیے۔ حضرت ابراہیم قندوزیؒ کے اس عمل سے حضرت خواجہؒ کے چہرے پر انتہائی خوشی کے رنگ بکھر گئے۔ انہوں نے آپ کی اس کیفیت کا جائزہ لیا۔ پھر فرمایا۔ ''معین الدین بیٹھ جاؤ۔'' آپؒ دوزانو ہو کر بیٹھ گئے۔ تب آپؒ نے بہت والہانہ انداز میں کہا کہ ''فرزند! تم نے ایک فقیر کی خوب مہمان نوازی کی۔ یہ سرسبز درخت یہ لذیذ پھل یہ ملکیت یہ جائداد سب کچھ فنا ہونے والا ہے، آج یہاں بہار ہے مگر کل یہاں خزاں ہوگی، تیرا یہ باغ بھی وقت کے ہاتھوں اجڑ جائے گا۔ پھر خدا تجھے ایک اور باغ عطا کرے گا۔ جس کے پھلوں کا ذائقہ اتنا لذت بھرا ہوگا کہ کبھی کسی نے چکھا نہیں ہوگا۔''

اتنا کہنے کے بعد حضرت ابراہیم قندوزیؒ نے اپنے پیراہن کی جیب میں ہاتھ ڈالا جب آپ کا ہاتھ پیراہن سے باہر آیا تو انگلیوں میں دبا ہوا سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا صاف نظر آرہا تھا۔

''وہ تیری مہمان نوازی تھی یہ فقیر کی دعوت ہے۔'' اتنا کہہ کر حضرت ابراہیم قندوزیؒ نے روٹی کا ٹکڑا حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے منہ میں ڈال دیا..... اور پھر تیزی کے ساتھ باغ سے نکل کر کسی طرف چلے گئے۔

روٹی اس قدر خشک تھی کہ اس کا چبانا دشوار تھا مگر حضرت خواجہؒ نے اسے ایک بزرگ کا تحفۂ عظیم سمجھ کر رکھ لیا۔ بس اس ٹکڑے کا حلق سے اترنا تھا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دل کی دنیا ہی بدل گئی آپ کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کائنات کی ہر شے فضول ہے..... اور پھر حضرت خواجہ کے دل پر کیا گزری اور ذہن کے کس گوشے سے روشنی کی وہ لکیر پھوٹی جس نے ہندوستان میں بہت فیض پہنچایا۔

☆☆☆

خواجہ معین الدین چشتیؒ فرماتے ہیں۔ ''جس شخص میں تین باتیں ہوں سمجھ لو وہ اللہ کا دوست ہے۔ اول، سمندر جیسی سخاوت، دوئم آفتاب جیسی شفقت سوئم زمین جیسی تواضع.....''

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں۔ ''ولی کی علامت یہ ہے کہ جب اس کی عمر بڑھے تو اس کے عمل بڑھ جائیں اور جب اس کا فقر بڑھے تو اس کی سخاوت بڑھ جائے اور اور اس کا علم بڑھے تو اس کی تواضع بڑھ جائے۔''

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے لوگوں نے دریافت کیا کہ تواضع کسے کہتے ہیں؟

آپؒ فرماتے ہیں کہ ''تواضع اس کا نام ہے جو شخص دولت و امارت میں تجھ سے کم درجے کا ہو اور وہ تیرے پاس آئے تو تو اپنے آپ کو اس سے کم درجہ کا سمجھے تاکہ یہ بات ظاہر ہو سکے کہ تو اپنی زیادتی دینار پر نازاں نہیں ہے اور اپنے آپ کو اس سے بڑا تصور نہیں کرتا ہے اور مہمان سے زیادہ تجھے دنیا میں کوئی عزیز نہیں ہے۔''

حقیقت میں تواضع ایک سعادت ہے جب یہ کسی کو نصیب ہوتی ہے تو کامل نصیب ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ تواضع فضائل اخلاق میں ایک شریف خلق ہے..... اور ان کے اخلاق کا اہم حصہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی تواضع کی سعادت نصیب فرمائے..... اور ہم اس کے پسندیدہ بندے بن سکیں۔ (آمین)

حرفِ آخر.....

اپنے رحیم اللہ اپنے کریم اللہ کی بارگاہ میں انتہائی عاجزی سے دعا گو ہوں کہ اس مضمون میں کہیں کوئی غلطی کوئی کوتاہی ہو گئی ہو..... تو اے میرے مہربان رب مجھے معاف فرما دے..... اور وہ وصف خاص عطا فرما جو تیرا قرب عطا کر دے..... آمین۔ آخر میں ان تمام عظیم ہستیوں کی تہ دل سے شکر گزار ہوں جن کی کتب سے میں نے یہ مضامین منتخب کیے..... اللہ تعالیٰ ان پر اپنی خاص رحمتوں کا نزول فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے پڑھنے والوں کو بھی علمی و عملی منافع عطا فرمائے۔ آمین

وہ آئے بزم میں.....

نزہت اصغر



ہماری بے حد پیاری اور مشاق رائٹر

دلشاد نسیم

سے دلنشیں گفتگو



سب سے پہلے تو شائقینِ بزم کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ پاک کے حضور دعا گو ہیں کہ یہ سال ہمارے اور پوری قوم کے لیے بے حد خوش آئند اور خوش بخت ثابت ہو آمین! اپنے باذوق پڑھنے والوں کے لیے نہایت قابلِ صد احترام مصنفات سے بات چیت کے اس سلسلے میں آج ماہنامہ پاکیزہ کی ایک اور دیرینہ اور مشاق لکھاری کو مدعو کیا گیا ہے۔ جن کی دل نشیں گفتگو آپ کا دل و دماغ شاد کر دے گی.. اپنے

معزز قلم کاروں کی پزیرائی اور قدردانی جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کا ہمیشہ طرۂ امتیاز رہا ہے انہی ادب نوازوں کی بدولت بہترین تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں جو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ضرور رہنمائی کرتی ہیں...... تو پیارے قارئین آج کی ہماری مہمان' مایہ ناز مصنفہ دلشاد نسیم صاحبہ ہیں جن کے افسانے اور ناولٹ آج بھی اسی ذوق شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔ آئیں ان سے دلچسپ گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ نے ہماری بزم میں آنے کی ہامی بھری اس کے لیے بہت نوازش...... اب سنائیں کیسی ہیں اور آج کل کیا ہو رہا ہے؟

دلشاد نسیم ✥...... شکر اللہ کا اور آج کل بھی وہی کر رہی ہوں جو کل ہو رہا تھا مطلب لکھنا...... لکھنا اور بس لکھنا۔ (اللہ کرے یہ لکھنا چلتا رہے)

پاکیزہ ✧...... جی آپ سے کئی ماہ پہلے کا وعدہ تھا جو آج تکمیل ہونے جا رہا ہے۔ ہمارے قارئین بھی بے چینی سے



آپ کے انٹرویو کے منتظر تھے۔ آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

دلشاد نسیم ✥...... مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے کیونکہ میرا اور پاکیزہ کا ساتھ آج کا نہیں ہے دوسرے لفظوں میں کہیں کہ پاکیزہ نے میرے نوآموز افسانوں کو سہا ہے...... تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ✧...... معروفیات تو رہتی ہیں، اپنے شب و روز کے کاموں میں لکھنے پڑھنے کے لیے کیسے وقت نکالتی ہیں؟

دلشاد نسیم ✥...... لکھنے پڑھنے کے لیے وقت نکالنا نہیں پڑتا...... خود بخود نکل آتا ہے۔ جس طرح شکر خورے کو شکر مل جاتی ہے اسی طرح پڑھنے والوں کو وقت مل جاتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... چلیں اپنی کہانیوں کا اگر آغاز سنانا چاہیں تو کہاں سے شروع کریں گی...... کب یہ صلاحیت منظرِ عام پر آئی؟

دلشاد نسیم ✥...... مزے کی بات یہ ہے کہ میں نے بچوں کی کہانیاں بہت پڑھی ہیں سارے نامی گرامی پرچے ہم خرید کر پڑھا کرتے تھے...... لیکن جب افسانے پڑھنا شروع کیے تو اندر کا ادیب ہمک ہمک کر خود کو منوانے کے لیے مچلنے لگا...... لکھا اور بہت لکھا...... پہلا افسانہ 9th کلاس میں لکھا تھا مگر بہت بیکار سوچا جو چیز مجھے بیکار لگ رہی ہے اوروں کو کیا لگے گی لہٰذا پھاڑ کر پھینک دیا پہلا افسانہ جنگ کے خواتین کے صفحے میں چھپا، ہمت بندھی پھر ماہناموں میں باقاعدگی سے چھپنے لگے۔

پاکیزہ ✧...... صلاحیت یا کسی بھی ہنر کا رجحان شاید قدرتی ہوتا ہے، ماحول کس حد تک اس میں معاون ثابت ہوتا ہے؟

دلشاد نسیم ✥...... سب سے پہلے صلاحیت کا موجود ہونا ضروری ہے۔ جس طرح پانی اپنا راستہ آپ بناتا ہے اسی طرح صلاحیت اپنا احساس خود دلاتی ہے ماحول تو سونے پر سہاگا کا کام کرتا ہے۔ (جی یہ تو ہے)

پاکیزہ ✧...... آپ کو کس حد تک تعاون ملا...... گھر والوں یا سینئرز کی طرف سے کیسی رہنمائی ملی؟



دلشاد نسیم اپنے ہونہار بیٹوں حسن خالد اور حمزہ خالد کے ہمراہ

دلشاد نسیم ✥...... میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں کیونکہ میرے سینئر اور گھر والے دونوں ہی بہت معاون رہے، سینئر سراہتے تھے اور گھر والے لکھنے کے لیے اکساتے تھے۔ نئی نئی کہانیاں سناتے تھے اور میری سوچ کو نئے نئے زاویے ملتے تھے۔

پاکیزہ ✧...... نثر نگاری میں صرف افسانے، ناول ناولٹ لکھے یا مقالے، کالم، کوئی انشائیہ، مضمون وغیرہ بھی؟

دلشاد نسیم ✥...... نثر میں میں نے صرف افسانے، ناول اور ناولٹ ہی لکھے اور بس...... لیکن وہ اتنے نمایاں نہیں ہیں۔

پاکیزہ ✧...... شاعری سے کس حد تک دلچسپی ہے، آپ کیا سمجھتی ہیں اپنے افسانے کو...... پُراثر بنانے کے لیے اشعار شامل کرنے چاہئیں؟

دلشاد نسیم ✥...... شعروں سے دلچسپی کا اس سے اندازہ لگائیں کہ افسانے سے زیادہ ڈرامے میں شعری رجحان اثر انداز ہوتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... ہاں اکثر نئی رائٹرز پوری، پوری نظمیں ڈالتی ہیں یا سچویشن کے حساب سے خود ہی تُک بندی کر لیتی ہیں۔ آپ کیا کہیں گی اس بارے میں؟

دلشاد نسیم ✥...... اگر افسانے کی رائٹر خود تُک بندی نہ کرے تو بھلا کون کرے گا۔ یہاں ڈراموں میں ڈائریکٹر سچویشن کے مطابق غزل یا شعر ڈال دیتے ہیں۔ میرے خیال سے اس میں کوئی حرج نہیں۔

پاکیزہ ✧...... ماہنامہ پاکیزہ سے ملن کی کیا کہانی ہے؟ ہمارے پڑھنے والوں کو بھی سنائیں۔

دلشاد نسیم ✥...... پاکیزہ سے میرا رشتہ بہت پرانا

ہے۔ 1981ء میں میرا پہلا افسانہ شائع ہوا تھا۔ کہانی بہت عام سی تھی...... افسانہ بھیجا اور چھپ گیا لیکن اس کے بعد میرا تعلق حسین سے حسین تر ہوتا گیا۔ عذرا آپا، انجم آپا اور اب آپ سب مجھے بہت پیارے ہیں۔ (بہت شکریہ)

پاکیزہ ✧...... اب کیوں کم کم لکھ رہی ہیں؟ دل نہیں چاہتا یا دیگر مصروفیات ہیں؟

دلشاد نسیم ✧...... صرف مصروفیت ہے وہ بھی ٹی وی کی ورنہ میری پہلی محبت افسانہ ہی ہے۔ (بس پہلی محبت بھول نہ جایئے گا)

پاکیزہ ✧...... اپنی گھریلو زندگی کو لکھنے کے اس شوق کے ساتھ کس طرح سنبھالا؟

دلشاد نسیم ✧...... وقت کو تقسیم کرنا پڑتا ہے پھر ہی یہ دو کشتیاں ایک ساتھ چلتی ہیں ورنہ بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... کیا آپ کے بچوں میں بھی آپ کی یہ صلاحیت آئی ہے؟

دلشاد نسیم ✧...... مجھے لگتا ہے کہ میرے دونوں بیٹوں میں یہ حس جسے آپ صلاحیت کہہ رہی ہیں موجود ہے لیکن وہ انگلش میں لکھتے ہیں۔ اگر کہوں کہ بیٹا اردو میں لکھ کر دو تو وہ رومن میں لکھ دیتے ہیں یہ کیمبرج سسٹم کا مسئلہ ہے۔ (ہاں کیا کر سکتے ہیں مگر اردو زبان سے نابلد نہیں ہونا چاہیے)

پاکیزہ ✧...... آج کل اسکرپٹ رائٹنگ کا رجحان ہے، آپ نے کتنے ڈرامے لکھے؟

دلشاد نسیم ✧...... بس پچھلے دس سالوں سے ڈرامے ہی لکھ رہی ہوں درمیان میں آٹے میں نمک کے برابر افسانہ لکھا ہے میرا پہلا سوپ سیریل "تیرے پہلو میں" میرا نمایاں سیریل تھا۔ اب تک کافی ڈرامے لکھ چکی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... ویسے ناولوں کی ڈرامائی تشکیل تو فاطمہ ثریا بجیا نے کمال کی، کی ہے آپ نے اس طرف دھیان نہیں دیا؟

دلشاد نسیم ✧...... جی! بجیا نے ڈرامائی تشکیل میں بہت نام کمایا۔ میں نے صرف ایک ناول کی ڈرامائی تشکیل کی تھی اور وہ ناول تھا متاعِ جاں جو کہ پاکیزہ میں 26 ماہ تک میرے پیارے قاری پڑھتے رہے تھے پھر انہوں نے اس ڈرامے کو اے پلس پر "تیرے پیار میں" کے روپ میں دیکھا۔

پاکیزہ ✧...... اپنی کہانیوں کو، ناولوں کو مجموعے کی شکل میں کب لائیں؟

دلشاد نسیم ✧...... ایک مجموعہ اسیر ذات کی شکل میں آ چکا ہے اگلے مجموعے کے لیے کمیٹی ڈال دی ہے۔ (اوہ اچھا)

پاکیزہ ✧...... آج کی رائٹرز کے بارے میں کیا کہیں گی، کیا ان کی تحریریں یادگار تحریریں بن سکتی ہیں؟

دلشاد نسیم ✧...... کیوں نہیں بن سکتیں، اچھی تحریر اپنا آپ منواتی ہے۔ آج کا مصنف بہت ذہین ہے اس کی نظر ماضی پر ہی نہیں مستقبل پر بھی ہے، اس لیے میرا یقین ہے ہر خوب صورت تحریر اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔ (جی بالکل)

پاکیزہ ✧...... آپ کی ہم عصروں میں کس طرح کے مقابلے کا رجحان تھا؟ مطلب آج کی طرح لابیز یا گروپ بندیاں؟

دلشاد نسیم ✧...... میرا خیال ہے کہ میرے ہم عمر آج بھی وہی ہیں۔ جو چند سال پہلے تھے اور مقابلے کی فضا بہت ضروری ہے۔ مگر یہ ہوا تیز ہونی چاہیے۔ ہر ایک کی صلاحیت دوسرے سے مختلف ہے اس لیے نہ آپ کسی کو پرکھ سکتے ہیں نہ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ (ہاں تعمیری مقابلہ بازی تو اچھی چیز ہے)

پاکیزہ ✧...... اسکول کالج کے زمانے کی کوئی خوشگوار، کوئی تلخ، کوئی ناقابل فراموش یاد؟

دلشاد نسیم ✧...... کالج کے زمانے میں کئی واقعات ..... ہوئے لیکن پروین شاکر سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جو ایک حسین یاد ہے۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ✧...... آپ نے اپنے اس شوق کے ساتھ رشتے داریاں اور دیگر مصروفیات کس حد تک کامیابی سے نبھائیں؟

دلشاد نسیم ✧...... تعلقات کو نبھانا مجھے اچھا لگتا ہے۔ بلکہ میرے بھائی بہن جو کہ دوسرے ملک میں رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ باجی تو ہر جگہ فرض کی طرح شرکت کرتی ہیں اور میرے بقیہ فرائض وہ بھی میرے لیے اہم ہیں۔ (جی یہ تو ہے)

پاکیزہ ✧...... آپ مزاجاً کیسی ہیں، اکثر کیا دل چاہتا ہے، اپنی ذات اور اپنے نام کے مفہوم کی کس حد تک لاج رکھی مطلب دوسروں کا بھی دل شاد کیا یا اپنے ہی بارے میں حساس ہیں؟

دلشاد نسیم ✧...... ہا ہا ہا..... اچھا سوال ہے۔ اس سوال کا... جواب آپ میری سہیلیوں، کولیگز اور پڑوسیوں سے پوچھیں۔ ویسے میری کوشش تو یہی رہتی ہے کہ سب کا دل شاد رہے۔ معلوم نہیں کس حد تک کامیاب رہی ہوں لیکن دنیا میں ایسا کون ہوگا جس کی لوگ برائی نہ کرتے ہوں گے۔ (ہاں جی بالکل)

پاکیزہ ✧...... کس موضوع پر آج بھی بار، بار لکھنا چاہیں گی؟

دلشاد نسیم ✧...... محبت ......

محبت ایک ایسا موضوع ہے جس پر بار، بار لکھنا اچھا لگتا ہے۔ یہ جذبہ بہت وسیع معنی رکھتا ہے۔ زندگی میں اس جذبے کی ضرورت بھی بہت رہتی ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے بعد زندگی کے کئی در کھولتے ہیں۔ جس پر لکھنے لگو تو... موضوعات کا دفتر کھلنے لگتا ہے۔ (جی محبت نہیں تو کچھ بھی نہیں)

پاکیزہ ✧...... چلیں کچھ اپنی پسند ناپسند بھی بتائیں؟ پسندیدہ رنگ، موسم، خوشبو، ذائقہ، ڈش، تفریحی مقام، کوئی جملہ، شخصیت، لمحہ، کتاب، شعر، رشتہ......؟

دلشاد نسیم ✧...... پسندیدہ رنگ...... جو مجھ کو سجا دے۔

موسم...... محبت کا موسم

خوشبو...... مٹی کی خوشبو



دلشاد نسیم اپنی والدہ محترمہ کے ساتھ

ذائقہ...... امی کے ہاتھ کا ذائقہ

ڈش...... دال چاول

تفریحی مقام...... کراچی کا سمندر...... لاہور
کالارنس گارڈن۔ مری اور اس کے بعد پہاڑی علاقے
خوش رہو...... خوشیاں تقسیم کرو......
شخصیت...... میرے اباجی میرا رول ماڈل ہیں۔
کتاب...... کتاب نہیں کتابیں۔ بانو آپا۔ اشفاق
... صاحب کی ساری کتابیں۔ خلیل صاحب کی ساری
کتابیں۔ شعر

ایک خط آپ ہی کی جانب سے
خود ہی پڑھتے ہیں خود ہی لکھتے ہیں

رشتہ۔ لمس کا رشتہ

پاکیزہ ✧...... دوسروں کی خوشیوں میں کس طرح شامل ہوتی ہیں مطلب کہ آپ کے اظہار کا کیا طریقہ ہے؟

دلشاد نسیم ❖...... دوسرے کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھ کر...... ان کی خوشیوں میں شامل ہوجاتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... تحفہ لینا اور دینا...... کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیے؟

دلشاد نسیم ❖...... دونوں ہاتھوں کا...... یہ واقعی محبت بڑھاتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... ہمارا معاشرہ رشتوں سے گندھا ہوا ہے، آپ درجہ بدرجہ یا حسب مراتب کس طرح نبھاتی ہیں؟

دلشاد نسیم ❖...... رشتے نبھانے چاہئیں...... ان کے بغیر ہم نامکمل ہیں لیکن انسان ہیں ناں بھول چوک بھی ہو جاتی ہے...... انسان تو صرف کوشش کرسکتا ہے اور کرتے رہنا چاہیے۔

پاکیزہ ✧...... بارش کے موسم میں سب سے پہلا خیال کیا آتا ہے؟

دلشاد نسیم ❖...... بارش کے موسم میں تو کچے مکانوں کی چھت کا خیال آتا ہے اور ان میں سے ٹپکتے پانی کا خیال آتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... لوگوں کے تلخ رویے، طنزیہ باتیں کس حد تک برداشت کرسکتی ہیں یا کرلیتی ہیں؟

دلشاد نسیم ❖...... اللہ کا شکر ہے مجھ میں برداشت بہت ہے۔ میں طنز کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں اور اس سے بھی زیادہ اچھی طرح برداشت کرتی ہوں بھولتی نہیں ہوں۔ اس کو زندگی کا سبق سمجھ کر کتاب زیست کا حصہ بنالیتی ہوں۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ✧...... میاں، بیوی کے تعلقات خوشگوار رہنے کے کوئی تین اصول یا گر کہہ لیں، بتائیں؟

دلشاد نسیم ❖...... میاں بیوی کے تعلق میں کوئی گر...... یا اصول نہیں یہ الجبرا یا ریاضی کا سوال نہیں ہے کہ 4=2+2 ہی ہوں گے مگر پھر بھی ایک دوسرے کی غلطیوں کو معاف کرنا سیکھیں، برداشت پیدا کریں اور وہ رویہ نہ اپنائیں جو دوسرے کو irritate کرے۔ ایک دوسرے کی عزت کریں...... وہ رشتہ جس کو اللہ رب العزت نے افضل مقام دیا ہے اس کی حفاظت کریں۔ (جی بے شک)

پاکیزہ ✧...... آج کی نوجوان نسل کو کیا نصیحت کریں گی؟

دلشاد نسیم ❖...... آج کے بچے بہت ذہین ہیں بہت سمجھدار اور ایکٹو بھی ضرورت ان کو درست سمت پر چلانے کی ہے۔ میرا بچوں سے یہی کہنا ہے کہ اپنے راستے کو خود منتخب کریں۔ پہلے خود پر منکشف ہوں کہ آپ کے اندر کیا چل رہا ہے پھر دنیا کو بتائیں کہ کرنا کیا چاہتے ہیں اپنے اندر کی آواز سنے بغیر معاملہ حل نہیں ہوتا۔

پاکیزہ ✧...... نئی لکھنے والیوں کے لیے کوئی پیغام، کوئی مشورہ، بات؟

دلشاد نسیم ❖...... نئی لکھنے والیوں کے لیے میں نے ہمیشہ ایک ہی بات کہی ہے اور وہ یہ کہ پڑھیں اور بہت پڑھیں۔ آج ایک نئی بات اور کہنا چاہتی ہوں کہ جب وہ کہانی لکھنے بیٹھیں تو صرف اپنی کہانی نہ لکھیں دنیا کو دیکھیں دنیا کی کہانیاں لکھیں اگر اللہ نے آپ کو لکھنے کی صلاحیت دی ہے تو اسے محدود نہ کریں۔

پاکیزہ ✧...... آپ کے خیال میں مطالعے کا شوق بچوں میں کیسے اور کس عمر سے پیدا کیا جائے؟

دلشاد نسیم ❖...... جس عمر میں بچوں میں مطالعے کا شوق پیدا کیا جاسکتا ہے اس عمر میں بچوں کے ہاتھ میں پلے اسٹیشن اور موبائل آجاتا ہے ہمارے ہاں بچپن میں مائیں کہا کرتی تھیں کہ نزدیک سے ٹی وی نہیں دیکھنا نظر کمزور ہو جاتی ہے۔ آج چھ ماہ کا بچہ موبائل پر کارٹون دیکھ رہا ہوتا ہے...... تو کیا کہا جائے پھر۔ (ہاں یہ تو ماؤں کی اور بڑوں کی ذمے داری بنتی ہے)

پاکیزہ ✧...... ٹی وی اور سینما بینی کس حد تک ہے؟

دلشاد نسیم ❖...... ٹی وی بہت کم دیکھتی ہوں فلم کا شوق مگر بہت شور شرابے والی نہ ہوں کامیڈی پکچرز اچھی لگتی ہیں۔

پاکیزہ ✧...... شدید بوریت کے عالم میں کیا کرنے کا دل چاہتا ہے؟

دلشاد نسیم ❖...... مجھے بور ہونے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ (قارئین اس جملے پر ضرور غور کریں مطلب مصروف رہنا اور تعمیری کاموں میں مصروف رہنا ضروری ہے۔)

پاکیزہ ✧...... مگر یہ بھی بتائیں بوریت کیا ہے اور کیوں ہوتی ہے؟ کیونکہ آج کل بچہ، بچہ کہنے لگا ہے کہ یار بوریت ہو رہی ہے، کیسے دور کی جائے؟

دلشاد نسیم ❖...... یکسانیت اور فرصت بوریت کو جنم دیتے ہیں جو شخص ان دونوں مسائل سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے بور نہیں ہوتا۔ بچپن میں کبھی ایک یا دو بار کہا ہوگا کہ بور ہو رہے ہیں تو امی نے کہنا کہ ہم تو نہیں جانتے کہ بوریت کس کو کہتے ہیں فرصت ہی نہیں ملتی یہ سوچنے کی تو میں نے اس سے اندازہ لگایا کہ بوریت کا دوسرا لفظ فراغت اور طویل فراغت ہے۔ (جی ہاں بالکل)

پاکیزہ ✧...... اچھا یہ بتائیں کہ ہماری بزم میں آنا کیسا لگا؟

دلشاد نسیم ❖...... اس بزم کو میں اپنی بزم سمجھ کے آئی ہوں آپ بتائیں آپ سب کو مجھ سے ملنا کیسا لگا۔ (ہمیں تو بہت، بہت اچھا لگا)

پاکیزہ ✧...... ماہنامہ پاکیزہ کے لیے کیا کہنا چاہیں گی، کوئی مشورہ، تجویز، کوئی تنقید؟

دلشاد نسیم ❖...... ماہنامہ پاکیزہ کے لیے صرف ایک بات کہنا چاہوں گی...... pakiza I love you کوئی مشورہ نہیں کوئی تجویز نہیں آپ سب کی محنت سے پاکیزہ آج بھی دلوں میں گھر بنائے ہوئے ہے۔ (آپ کی محبت اور قدر دانی ہے ڈیئر)

پاکیزہ ✧...... ہمارے قارئین کے لیے کوئی نصیحت، کوئی بات تحریر فرمادیں؟

دلشاد نسیم ❖...... قارئین کے لیے میرا پیغام......
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے...... آپ سب کو اللہ سلامت رکھے ایک دوسرے کی عزت کیجیے...... زندگی کا حسن یہی ہے کہ آپ دوسرے کو کتنا مان دیتے ہیں۔
(بہت شکریہ دلشاد نسیم کہ آپ نے ہمیں بھی پیار بھرا مان دیا اور اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکالا)

☆☆☆

معزز قارئین! رائٹر برسوں بعد بھی اپنے چاہنے والوں سے مخاطب ہو تو اس کے اپنائیت بھرے لہجے میں کوئی کمی نہیں آتی جس محبت اور خلوص سے دلشاد صاحبہ ہماری بزم میں آئیں۔ یقینا آپ محظوظ ہوئے ہوں گے۔ رائٹرز سے گفتگو کا یہ سلسلہ انشاء اللہ جاری رہے گا۔ آپ سے اتنا تعاون درکار ہے کہ اپنے تبصرے اور تجاویز سے نوازتے رہیں اور اردگرد بسنے والوں میں بھی ادبی ذوق اور مطالعے کی لگن بڑھاتے رہیں۔ اس چھوٹی سی پیاری سی بات کے ساتھ اجازت کہ اپنا خیال تو ضرور رکھیں مگر اپنے خیال میں وسعت بھی پیدا کریں اور بوڑھوں، ہم سنوں، جوانوں اور بچوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئیں۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

سال بھر کے متوازن گھریلو بجٹ کے لیے خواتین کی حکمتِ عملی

شائستہ زریں

گزشتہ برس کی طرح نئے سال میں بھی مہنگائی آئی تو بن بلائے ہے لیکن گئی بھگانے سے بھی نہیں۔ کہیں پڑھا تھا کہ ''دولت محنت سے حاصل ہوتی ہے' کفایت شعاری سے قائم رہتی ہے اور کوشش و استقلال سے بڑھتی ہے۔'' ہماری بیشتر خواتین محنت سے حاصل کی جانے والی دولت کو کفایت شعاری سے پس انداز کر ہی لیتی ہیں اُن کا یہ جذبہ صاحب جی کو استقلال کے ساتھ محنت کی جانب مائل کرتا ہے۔ کسی بھی خاتونِ خانہ کے سلیقے کا اندازہ گھریلو اخراجات کی مد میں اس کی کفایت شعاری اور بچت کی عادت سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی نے گھریلو اخراجات میں توازن برقرار رکھنا محال کردیا ایسے میں رقم پس انداز کرنا بڑے کمال کی بات ہے اور اس سے بھی بڑا ہنر یہ ہے کہ بچت کے معاملات کو اکثر خواتین صیغۂ راز میں رکھ لیتی ہیں۔ اور بڑی خاموشی سے سال بھر کا گھریلو بجٹ متوازن رکھنے کے لیے نہ صرف منصوبہ بندی کر لیتی ہیں بلکہ حسبِ توفیق بچت بھی کر لیتی ہیں۔ ایک قول ہے کہ ''اپنی آمدنی سے زیادہ خرچ کرنا اور کسی خدائی عطیے کا اُمیدوار رہنا خطرناک غلطی ہے۔'' اور ہمارے معاشرے میں خواتین کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو اس خطرناک غلطی کی مرتکب ہوئی ہے اور نقصان بھی اُٹھائی ہے۔ بچت ایک اچھی عادت ہے کہ پس انداز کی گئی رقم کبھی رائگاں نہیں جاتی، کبھی، کبھی تو مایوسی کے اندھیرے میں اُمید کی کرن بن کر اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ ہر خاتونِ خانہ اپنے طریقے سے اپنا گھر چلاتی ہے خواہ خوش اسلوبی سے چلائے یا بدامنی و بے اطمینانی کی فضا میں سانس لیتے ہوئے یہ اُس کی اپنی سوچ ہے۔ جس طرح بچت کا طریقہ ہر ایک کا الگ، الگ ہوتا ہے اسی طرح ہر خاتون کی بچت کے مقاصد بھی الگ ہوتے ہیں۔ کسی کے راز فاش کرنا کوئی اچھی بات نہیں لیکن اگر اس فعل سے بہت سوں کا بھلا ہو جائے تو پھر یہ برائی بھی اچھائی میں بدل جاتی ہے کیونکہ بسا اوقات اوروں کے تجربوں سے بھی ہم بہت سیکھ لیتے ہیں۔ اور اسی سوچ کے پیشِ نظر ہم نے سالِ نو نمبر کے لیے ایک سروے کے ذریعے معلوم کیا کہ

سوال ۱: نئے سال کے آغاز میں سال بھر کا گھریلو بجٹ متوازن رکھنے کے لیے آپ کا کیا منصوبہ ہے؟

سوال ۲: ہر ماہ بچت کی رقم محفوظ رکھنے کے لیے آپ کیا حکمتِ عملی اختیار کریں گی؟

☆☆☆

تو آیئے پڑھتے ہیں سروے میں شریک خواتین کی آرا۔

اختر شجاعت
(قلمکار)

۱: آج کل لفظ بجٹ مذاق بن کر رہ گیا ہے۔ بجٹ بنا کر سوچتے ہیں کہ اس کے مطابق چلیں مگر بڑھتی ہوئی مہنگائی نے دماغ کی چولیں ہلادی ہیں۔ باوجود کوشش کے ہر ماہ بجٹ آؤٹ ہو جاتا ہے اور بچت کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ پھر بھی ہر سال کے آغاز پر ہم خواتین کی یہی سوچ ہوتی ہے کوئی غیر ضروری خرچ نہ کیا جائے۔ اہم ضرورتوں کو مدِنظر رکھا جائے۔ اسراف سے گریز کیا جائے۔ مگر یہ صرف سوچ ہی رہ جاتی ہے ورنہ تو اس قدر غیر متوقع خرچے آجاتے ہیں جو کسی طور پر بھی ہمارے بجٹ میں شامل نہیں ہوتے مگر بڑے غیر محسوس طریقے سے مہنگائی کا بوجھ بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

۲: بچت؟ شائستہ بی بی! بچت، اب یہ لفظ تو نایاب ہو کر رہ گیا ہے۔ سننے میں بڑا بھلا لگتا ہے مگر ہاں کسی زمانے میں ٹھیک ٹھاک بچت کر لیا کرلیتے تھے مگر اب تو اس قدر مہنگائی کا دور دورہ ہے کہ انسان عزت سے گزارہ کرلے تو شکر ہے پروردگار کا۔ ہاں یہ طریقہ ہے کہ تنخواہ میں سے رقم کا ایک مخصوص حصہ ایک لفافے میں محفوظ کرکے اپنی پہنچ سے دور رکھا جائے تو ممکن ہو جاتا ہے کہ تھوڑی بہت رقم تو محفوظ کرلی جائے اور ہمیشہ کی طرح 2018ء میں بھی بچت کے لیے میری حکمتِ عملی یہی ہوگی۔

فرزانہ انجم
(گھریلو خاتون)



۱: ہر ماہ کے آغاز میں آنے والی تنخواہ کو متوازن کر کے میں ہمیشہ روزمرہ کھانے پینے، سودا سلف، ٹیوشن فیس، بجلی کے بل و دیگر اخراجات کا گزشتہ دو ماہ سے تناسب نکال کر آنے والے ماہ کے بجٹ کی تیاری کرتی ہوں اور کچھ نہ کچھ محفوظ بھی کرلیتی ہوں۔

۲: گھریلو اخراجات تو ہر ماہ ہی کا معمول ہے ایسے میں میری ہمیشہ یہی کوشش رہتی ہے کہ آنے والے برسوں کے لیے بجٹ سے محفوظ شدہ رقم کو اچھی جگہ لگا سکوں، اس کے لیے میں سیونگ اکاؤنٹ کا سہارا لیتی ہوں اور اس کے علاوہ میں گولڈ کوائن بھی خرید لیتی ہوں تاکہ میں اپنی فیملی کو ایک اچھا مستقبل دے سکوں۔

راحیلہ مغل
(صحافی)



۱: اس سال کا بجٹ متوازن رکھنے کے لیے غیر ضروری شاپنگ سے گریز کروں گی اور کوشش کروں گی کہ زیادہ رشتے داروں کی طرف نہ جاؤں۔

۲: رقم محفوظ کرنے کے لیے میں ایک کمیٹی ڈالنے کا سوچ رہی ہوں۔

بشریٰ پرویز
(گھریلو خاتون)

۱: سالانہ بجٹ؟ آپ کے اس سوال سے تو مجھے وہ لطیفہ یاد آگیا کہ ایک خاتون کو ان کے شوہر نے ایک ڈائری لا کردی کہ اس میں ماہانہ حساب لکھ لیا کرو۔ جب ایک مہینہ گزر گیا تو انہوں نے ڈائری مانگی اور دیکھا کہ ایک صفحے پر لکھا تھا کہ 20ہزار روپے وصول ہوئے دوسرے صفحے پر لکھا تھا کہ 20ہزار خرچ ہوگئے۔ بتایئے یہ لطیفہ ہے کہ حقیقت؟ اسی طرح میرا نہیں خیال کہ کوئی خاتونِ خانہ سالانہ بجٹ تیار کرسکتی ہے اور کرے بھی تو کیسے؟ جنوری میں چیزوں کی جو قیمتیں ہیں۔ وہ جون اور دسمبر تک تو پتا نہیں کتنی بڑھ جائیں۔ البتہ سال کے دوران آنے والے بعض خصوصی اخراجات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ مثلاً کسی بہت قریبی عزیز کی شادی جس کے لیے شہر سے باہر جانا ہو یا بہت قیمتی تحفہ دینا ہو اسی طرح کسی متوقع تقریب کے لیے یا کسی بچے کے تعلیمی اخراجات (سمسٹر فیس، داخلہ فیس) وغیرہ۔ ان کے لیے ہر ماہ کچھ نہ کچھ بچت کرکے رکھنی پڑتی ہے۔ باقی تو ماہانہ حساب ہی چلتا ہے۔ خاص طور پر جن گھروں میں

ماہانہ آمدنی (تنخواہ) کا سلسلہ ہے۔

۲: ماہانہ بچت کا ایک طریقہ تو بینک اکاؤنٹ ہوتا ہے۔ وہ بھی بچت اگر ہزاروں میں ہو لیکن میرا تو کئی برسوں سے بچت کا طریقہ کمیٹی ڈالنے والا ہی ہے اور الحمدللہ اس سے بہت سے کام بنے ہیں پھر ہمارے مخصوص ممبرز ہیں جو ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ جیسے اگر کسی کو ایمرجنسی ضرورت پڑ جائے تو اپنے نمبر کی کمیٹی پوری یا آدھی اسے دے دیتے ہیں ورنہ اپنی، اپنی باری پر سب کو مل جاتی ہے۔ اور اس کو اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ کس وقت کیا ضرورت ہو۔ عام طور پر یہ کمیٹی ڈیڑھ سے دو سال کے عرصے کی ہوتی ہے جو نہ بہت طویل ہے اور نہ بہت مختصر اس طرح سود کے چکر سے بھی بچ جاتے ہیں۔ اور ہمیشہ کی طرح میں اب بھی یہی طریقہ اختیار کروں گی۔

نجمہ شکیل
(گھریلو خاتون)

۱: اپنی ذاتی خواہشات کو نظر انداز کر کے کوشش یہی ہوگی کہ کم خرچ میں کفایت شعاری سے کام لیا جائے، ماہانہ خرچ کم کیا جائے، غیر ضروری کام نہ کیے جائیں، بہت ضروری کاموں کو نمٹایا جائے۔ یہی صورت



حال بچوں کے ساتھ رکھنی پڑے گی۔ بجٹ متوازن رکھنے کے لیے اپنے آپ پر کنٹرول کرنا پڑے گا۔ یوں سال بھر کا گھریلو بجٹ خود بخود متوازن ہو جائے گا۔

۲: ہر ماہ بچت ہو جائے تو یہ بڑی بات ہے۔ آپ لاکھ حکمتِ عملی کر لیں۔ مہینے کے آخر یا سال کے دوران کوئی بھی تقریب یا موقع آ جائے تو ساری بچت نکل جاتی ہے۔ ہاں حکمتِ عملی کمیٹی کی صورت میں ہو جاتی ہے۔ یا ہر مہینے کے شروع میں کچھ پیسے اٹھا کر رکھ لو تو شاید بچت ہو جائے۔ بینک میں جمع رقم محفوظ رہ سکتی ہے۔ میرا ایک گلک بنا ہوا ہے جس میں کچھ پیسے جمع ہو جاتے ہیں پر اتنے نہیں ہوتے کہ دل خوش ہو جائے اس لیے میرے خیال میں میری بچت کی رقم کو محفوظ رکھنے کا واحد ذریعہ کمیٹی ہو گی۔

بسمہ آصف
(معلمہ)

۱: نئے سال کے آغاز میں سال بھر کا گھریلو بجٹ متوازن رکھنے کے لیے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن پھر بھی میری پوری کوشش یہی ہوتی ہے کہ میانہ روی اختیار کروں، مہینے بھر کا سامان، بچوں کے تعلیمی اخراجات وغیرہ کے لیے الگ، الگ لفافے بنا کر رکھتی ہوں تاکہ یہ معلوم ہو کہ مہینے کے حساب سے کتنے اخراجات ہیں۔ اسی

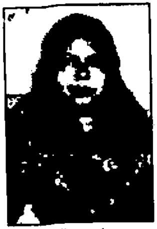


طرح سال میں عید بقرعید میں جتنے بھی خرچ ہوتے ہیں۔ اس کا بھی الگ حساب کر کے لفافے میں ہر مہینے ایک مخصوص رقم رکھتی ہوں۔ رمضان میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے رقم کا حساب کر کے الگ لفافے میں رکھتی ہوں تو بچت ہو پاتی ہے اور 2018ء کے لیے بھی میری یہی منصوبہ بندی ہے۔

۲: ہر مہینے بچت کی رقم محفوظ رکھنے کے لیے ایک لفافہ رکھا ہوا ہے جس میں رقم جمع کرتی ہوں اور کچھ عرصے بعد سیونگ سرٹیفکیٹ خرید لیتی ہوں۔ اس طرح رقم محفوظ ہو جاتی ہے اور جب کبھی کیش کروانا ہو تو آسانی سے کیش بھی ہو جاتی ہے۔ میری پوری کوشش ہوتی ہے

کہ میانہ روی سے کام لوں اور اسراف نہ کروں اور اسلام بھی ہمیں یہی سکھاتا ہے سو میں ہمیشہ کی طرح 2018ء میں بچت کی رقم محفوظ رکھنے کے لیے یہی حکمتِ عملی اختیار کروں گی۔

شگفتہ سعید
(گھریلو خاتون)



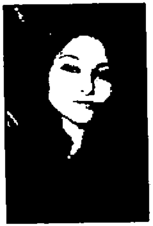
سال بھر کا بجٹ چلانے اور مہینے کے خرچ کو ٹھیک سے چلانے کے لیے میں کمیٹی ڈالتی ہوں جس سے ہر ماہ کچھ پیسے نکالنا آسان بھی ہوتا ہے اور ضرورت کے وقت کام بھی آ جاتے ہیں اور کسی سے مانگنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ گزشتہ کئی برسوں کی طرح اس سال بھی یہی طریقہ اختیار کر کے اپنا گھریلو بجٹ متوازن رکھتے ہوئے بچت بھی کروں گی۔

خدیجہ رزاق
(گھریلو خاتون)

۱: سالانہ بجٹ کے بعد منی بجٹ کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ جس کے نتیجے میں آئے دن قیمتوں میں تبدیلی بھی آتی رہتی ہے۔ ایسے میں خاتونِ خانہ کو بجٹ بنانے میں بہت مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں یہی خیال آتا ہے کہ

مرنا تو اس جہاں میں کوئی حادثہ نہیں
اس دورِ ناگوار میں جینا کمال ہے

جہاں تک میرا تعلق ہے تو اب میرے بچے ان عمروں کو پہنچ چکے ہیں کہ وہ اپنے ہر کام کے لیے میرے محتاج نہیں رہے۔ میرا منصوبہ ہے کہ کوئی ایسا کام جس سے گھریلو اخراجات بھی معتدل رہ سکیں اور کوئی معروفیت بھی ہاتھ آ جائے تو اس کو اپنا لوں۔ اپنے کسی شوق ہنر یا



صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے گھریلو اخراجات کو نہ صرف متوازن رکھ سکوں بلکہ مزید بہتر بنانے میں اپنا کردار ادا کر سکوں۔

۲: سیانے کہتے ہیں کہ پیسہ کمانا آسان ہے اور خرچ کرنا مشکل۔ کامیاب کاروباری حضرات کا کہنا ہے کہ آمدنی کا کم از کم 20% حصہ ہر ماہ بچت کرنی چاہیے اس کے لیے مجھے جو طریقہ بہتر لگتا ہے میں اس پر عمل بھی کرتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ تمام اخراجات کا ماہوار تخمینہ لگا کر پہلے سے وہ رقم الگ کر دیتی ہوں۔ جس میں بچوں کی فیس، گیس، بجلی کے بل گھر کا سودا سلف کام کاج میں معاونت کرنے والوں کی تنخواہیں حتیٰ کہ تفریحی اور تہنیتی اخراجات کا لفافہ بھی بنا کر الگ رکھ دیتے ہیں فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی مہینے اخراجات کم ہو سکتے ہیں تو وہ رقم محفوظ ہو جاتی ہے اور اس رقم کو تھوڑا تھوڑا جوڑ کر سونے کی کوئی چیز بھی خرید لیتی ہوں۔

☆☆☆

معزز قارئین:

گھریلو بجٹ متوازن رکھنے کے لیے بچت اور بچت کے تحفظ کی خواہش میں گزشتہ کئی دہائیوں سے ہنرمند اور سگھڑ خواتین کمیٹی ڈال کر اپنی خواہشات اور ضروریات کی تکمیل کر رہی ہیں۔ سروے کی شرکا خواتین بھی اسی رجحان کے زیرِ اثر نظر آئیں۔ سلیقہ شعار خواتین کی سال بھر کی گھریلو بجٹ کی منصوبہ بندی اور بچت کی حکمتِ عملی بہت خوش آئند ہے۔ یقیناً خواتین کی اکثریت اپنی سمجھداری اور سلیقہ مندی سے اس میدان کی فاتح ثابت ہوں گی۔

☆☆☆

مزاح نگاری، کمال کی صنف ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں...... مگر ایسی نشتر زنی بخاطر اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

اس ماہ ملک کے مشہور و معروف مزاح نگار ڈاکٹر محمد یونس بٹ کی کتاب مزاحیات سے انتخاب...... آپ کے ذوق مطالعے کی نذر ہے

قرض حسنا

بینک سے قرض لینے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ پہلے آپ یہ ثابت کریں کہ آپ کو اس کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک بینک کو قرض لوٹانے کی بات ہے تو بینک قرض دینے کے لیے ہوتے ہیں لینے کے لیے نہیں۔ ایک بڑے بینک آفیسر کے بقول تو قرضِ حسنہ اب قرضِ ہسنا بن گیا ہے کیونکہ جب بھی کسی بڑے مقروض کو قرض واپس کرنے کے لیے کہا جائے تو وہ جواب میں ہنسنے لگتا ہے لیکن ادارے کے جنرل منیجر صاحب نے مقروضان سے قرض واپس لینے کا جدید طریقہ نکالا ہے۔ انہوں نے اخبار میں اشتہار دیا جس کی سرخی تھی۔

''نادہند مقروضان کے لیے خوشخبری......''

اگرچہ بینک کی ساری خوشخبریاں ایسے ہی لوگوں کے لیے ہوتی ہیں لیکن یہ خوشخبری یوں ہے کہ پچاس ہزار تک کی مالیت کے انفرادی قرضہ جات لوٹانے والوں کو سود مارک اپ کلعدم معاف جبکہ ایک لاکھ پر پچاس فیصد معافی...... صاحب یہ اشتہارات کا دور ہے، پولیس والے مجرموں کی گرفتاری کے لیے چھاپے کے بجائے چھاپے خانے جا کر اشتہار چھپواتے ہیں۔ جن میں پکڑوانے والے کے لیے اتنے، اتنے بڑے انعام ہوتے ہیں کہ اگر ہم مجرم ہوتے تو ہم فوراً خود کو پکڑ کر ان کے حوالے کر دیتے۔ ہمارے ایک شاعر دوست کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن چھپا تو ایک ستم ظریف نے یہ خوشخبری دی کہ جو اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی ایک کتاب خریدے گا اسے پہلے ایڈیشن کی دو کتابیں مفت دی جائیں گی۔ اگرچہ کچھ لوگ یہ پوچھتے ملتے کہ یہ خوشخبری ہے یا دھمکی۔ ایک ڈاکٹر نے ایسا اعلان کیا کہ جو میرے اسپتال سے اپنے پتے اور گردے کا آپریشن کروائے گا اس کا اپنڈکس...... کا آپریشن مفت کیا جائے گا۔ ہر کسی کا پبلسٹی کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ امریکا میں ایک عینک ساز کی دکان پر یہ اشتہار لگا تھا۔ ''اگر آپ نہیں دیکھ سکتے کہ آپ کیا چاہتے ہیں تو پھر آپ ٹھیک جگہ پر پہنچے ہیں۔'' ہوسکتا ہے کل کسی بینک کی طرف سے ایسا اعلان چھپے کہ جو شخص کل سود ادا کرے اس کا قرضہ معاف کر دیا جائے گا اور جو آدھا سود دے گا اس کا آدھا قرضہ معاف، ویسے بھی اچھا بینکر وہ ہوتا ہے جو سود کی رقم نہ ڈوبنے دے اصل رقم بھلے ڈوب جائے۔

امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ کہتا ہے کہ بینک وہ جگہ ہے جہاں سے آپ کو صاف موسم میں چھتری ادھار ملتی ہے اور جونہی بارش ہونے لگے وہ چھتری کی واپسی کا تقاضا شروع کر دیتے ہیں۔ بینک سے اگر آپ تھوڑی رقم لیں تو آپ بینک کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں، اگر زیادہ رقم لیں تو، تو بینک آپ کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ ول راجرز کہتا ہے کہ جب سے دنیا بنی ہے اس میں تین بنیادی

ایجادیں ہوئیں ایک آگ، دوسرا پہیہ اور تیسری مرکزی بینکاری۔ روپیہ، پیسہ سود پر لینا دنیا کا دوسرا قدیم ترین پیشہ ہے پہلے قدیم ترین پیشے سے اس کی کون سی قدر مشترک ہے، ہمیں معلوم نہیں کیونکہ اس میں ادھار سے کام چلتا ہے اور اس میں ادھار نہیں چلتا کیونکہ اس میں ادھار تو دراصل ...... ہار ہے۔ بینک میں بگ گن وہ ہوتا ہے جسے کبھی فائرڈ نہ کیا جاسکے۔ جبکہ بینک آفیسر وہ ہوتا ہے جو ایک ہفتے کی چھٹی پر جائے تو سات دن بعد ہی واپس آجائے۔

ہمارے ہاں 1947ء سے اب تک بینکوں سے جتنی رقم ڈاکوؤں نے لوٹی وہ اس رقم کا دسواں حصہ بھی نہیں جو سیاست دانوں نے قرض لے کر نہیں لوٹائی۔ دولت سیاست دان کی چھٹی حس ہوتی ہے۔ ایک دفعہ ہم ایک سیاست دان کے بارے میں لکھ بیٹھے کہ ہمارے یہ سیاست دان بڑے قیمتی ہیں تو ہر کوئی ہم سے ان کی قیمت پوچھنے لگا۔ شاید اسی لیے سیاست دان گاڑی میں جا رہے ہوں تو ان کے آگے پیچھے اتنے گن مین ہوتے ہیں کہ لگتا ہے کہ بینک والوں کی کیش ویگن جا رہی ہے۔ بینکوں میں ان کے سیونگ اکاؤنٹ نہیں اسپنڈنگ اکاؤنٹ ہوتے ہیں۔ ان کی مقدس کتاب چیک بک ہوتی ہے۔ اللہ انہیں دولت کی دولتی سے بچائے۔ دولت کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ یہ بولتی بھی ہے کیونکہ ہم نے اسے خود بولتے سنا ہے۔ ہمیں خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ دولت سے سب خریدا جاسکتا ہے صرف ایک چیز نہیں خریدی جاسکتی، وہ ہے غریبی۔ اس کے لیے اسٹاک ایکسچینج جانا پڑتا ہے۔ پرانی کہاوت ہے کہ اگر آپ جاننا چاہتے ہیں کہ اللہ کی نظر میں دولت کا کیا مقابلہ ہے تو اس کا اندازہ آپ کو ان لوگوں کو دیکھ کر ہوجائے گا جنہیں وہ دولت دیتا ہے۔ دولت ہونے سے بندہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے نہ ہونے سے لوگ اسے بھول جاتے ہیں۔

ایک صاحب سے ہم نے پوچھا۔ ''کیا تمہارے غریب رشتے دار ہیں؟''

''ہوں گے لیکن میں انہیں نہیں جانتا۔''

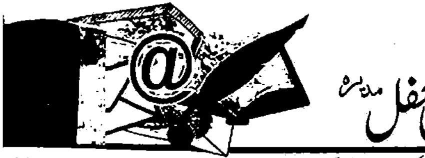
''امیر رشتے دار ہیں؟''

''ہوں گے لیکن وہ مجھے نہیں جانتے۔''

عام زندگی میں کسی کو تھوڑے سے پیسے دیے جائیں تو وہ آپ کا مقروض بن جاتا ہے۔ اگر بہت پیسے دیے جائیں تو آپ کا دشمن بن جائے گا۔ ہمارے ہاں بہت کم سننے میں آتا ہے کہ کسی نے ہنستے مسکراتے قرض لوٹایا ہو۔ البتہ ہماری ایک اداکارہ نے کہا تھا کہ میں بینک کا قرضہ مسکرا کر ادا کروں گی جس پر بینک والوں نے کہا آپ مسکرا کر نہیں پیسے دے کر قرض لوٹائیں۔

بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جو جس شخص سے قرض لے سے ادا کرنے کے باوجود خود کو اس بندے کا مقروض سمجھے۔ ہم تو اس پر یقین رکھتے ہیں کہ بندے کو اپنی تنخواہ میں گزارہ کرنا چاہیے، چاہے اس کے لیے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ جہاں تک ہم سے قرض واپس لینے کا تعلق ہے تو اکثر دوست یہ دھمکی دے کر کر لیتے ہیں کہ اگر تم نے میرا قرض واپس نہ کیا تو میں دوسرے قرض خواہوں کو بتادوں گا کہ تم نے میرا قرضہ لوٹا دیا ہے۔ لیکن ہمارے شاعر اقبال ساجد صاحب کے ساتھ تو اور ہی واقعہ پیش آیا۔ انہوں نے کسی کے دس روپے دینا تھے۔ کئی سال تک واپس نہ کیے لیکن ایک دن اچانک دس روپے نکال کر قرض خواہ کو دے دیے تو اس نے یہ کہہ کر دس روپے لینے سے انکار کر دیا کہ میں نے کئی سال لگا کر تمہارے بارے میں جو رائے قائم کی تھی تم چاہتے ہو میں دس روپوں میں اسے بدل دوں۔ ہم تو سمجھتے ہیں جس نے بینک کا جتنا زیادہ قرضہ دینا ہو وہ اتنا بڑا آدمی ہوتا ہے اور جس نے جتنا چھوٹا قرضہ دینا ہو وہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے۔ یہ تو اچھا ہوا گورنر اسٹیٹ بینک نے ہمیں مزید چھوٹا ہونے سے بچالیا۔ انہوں نے کہا ہے کہ پاکستان کا ہر گھرانہ 53 ہزار کا مقروض ہے۔ کوئی اس قرض کو چکانے کی کوشش نہیں کر رہا سوائے ہمارے محلے کے مولوی صاحب کے...... ان کے گھر کے پانچ افراد تھے۔ یوں فی فرد تقریباً دس ہزار قرضہ بنتا تھا۔ انہوں نے ذاتی محنت سے یہ قرضہ کم کر کے پانچ ہزار فی فرد کر لیا ہے۔ وہ یوں کہ اب ان کے گھر کے افراد دس ہوگئے ہیں۔ ویسے اگر اسی طرح سب... کوشش کریں تو فی فرد قرض ہزاروں سے روپوں میں آسکتا ہے۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

معزز قارئین پاکیزہ! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

بے شک تمام حمد وثنا اس ذات والا صفات، رب العزت اللہ جل شانہ کو زیبا...... جو کُل کائنات کا پروردگار اور آفریدگار ہے..... یکتا و وحدہ لاشریک ہے اور کروڑ ہا درود وسلام ختم المرسلین، حبیب رب العالمین، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر کہ جن کو تمام مخلوقات کے لیے رحمتہ اللعالمین بنا کر بھیجا گیا۔ عیسوی سالِ نو کے آغاز پر رب کائنات کی بارگاہ میں خصوصی دعائیں کرتے ہیں کہ ہم سب کا خاتمہ ایمانِ کامل پر ہو، دنیا و آخرت میں رضائے پروردگار کے تحت کامیابیاں اور کامرانیاں نصیب ہوں اور یہ سال تمام امتِ اسلامیہ اور خصوصیت کے ساتھ ہمارے وطن عزیز کے لیے خوشحالی، امن، مسرت اور کامیابیوں کا سال ہو، الٰہی آمین۔

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری بہنو! سلام اور پُرخلوص دعاؤں کا تحفہ لیے آپ کی اس ہردلعزیز محفل میں حاضر ہوں۔ موسم سرما عروج پر ہے، سنائیں آپ سب لوگ کیسے ہیں؟ ہر نئے سال کے آغاز میں لوگ اپنے آپ سے کچھ عہد کرتے ہیں کہ اس سال اپنی خامیوں میں ہر ممکن کمی کریں گے اور خوبیوں میں اضافہ کریں گے لیکن اس کے باوجود معاشرے میں برائیوں میں کس قدر اضافہ اور اچھائیوں میں کمی ہوتی چلی جارہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص یہ اچھائیاں دوسروں کے لیے بہت ضروری سمجھتا ہے اور خود اس پر عمل نہیں کرتا مثلاً جھوٹ، غیبت، دھوکا دہی، کسی کا دل دکھانا...... اور ساتھ ہی اس بات کی تکرار جاری رہتی ہے کہ آج کل تو نیکی کا زمانہ ہی نہیں ہے...... لیکن عزیز بہنو نیکی بھی اس لیے ہی کی جائے کہ اس کا اجر اللہ پاک کے علاوہ کوئی نہیں دیتا جیسا کہ ہمارے چوتھے خلیفہؓ نے فرمایا۔ ”ہر انسان کی خوشی کی وجہ بنو خوشی کا حصہ نہیں اور ہر انسان کے دکھ کا حصہ بنو دکھ کی وجہ نہیں......“

کچھ دن پہلے ہماری بہت پیاری رائٹر طیبہ عنصر مغل سے فون پر بات ہو رہی تھی تو انہوں نے کہا کہ عذرا آپی ایسی باتیں آپ لکھا بھی تو کریں شاید کچھ لوگوں پر اثر ہو جائے تو پیاری طیبہ نصیحتیں تو ہر ایک کو ہر وقت سننے کو مل رہی ہوتی ہیں بس اس پر عمل کرنے کی اللہ تعالیٰ توفیق بھی عطا فرمائے۔ یہاں خاص طور پر بہت پیاری اینہ عندلیب، سلانوالی کا بے حد، بے حد شکریہ ادا کرنا چاہوں گی کہ جب اس کی طبیعت کچھ بہتر ہوتی ہے تو وہ ضرور فون کرتی ہے۔ اس دفعہ جب اس نے فون کیا تو کسی مصروفیت کی وجہ سے میری اس وقت اینہ سے بات نہ ہو سکی اور جب میں نے فون کیا تو یہ ریکارڈنگ آتی رہی کہ اس وقت رابطہ ممکن نہیں...... پیاری اینہ تمہارا خیال تو دل سے کسی وقت نکلتا ہی نہیں ہے، ہر وقت تمہاری صحت و تندرستی کی دعائیں دل سے نکلتی ہیں، اللہ تعالیٰ ان تمام دعاؤں کو قبول فرمائے اور تمہیں جلد صحت عطا ہو، آمین۔

سلمٰی غزل تمہارا خط شاملِ اشاعت تو ہے، اب تمہاری تجویز پر دیکھو، بہنیں اپنی کیا رائے دیتی ہیں۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ عید ملن تو ادارۂ پاکیزہ کی طرف سے ہی ہوگی جو بہنیں شرکت کرنا چاہتی ہیں وہ اپنا نام لکھوا دیا کریں پھر فہرست مرتب کرتے وقت انہیں یاد رکھیں گے۔ رضوانہ پرنس تمہارا خط بھی شامل ہے مگر ذاتی طور پر فون کر کے تم نے جو پیاری، پیاری باتیں کی ہیں، اب وہ ساری تو نہیں لگائی جاسکتیں ہاں دماغ میں ضرور ریکارڈ ہیں، اللہ تعالیٰ تمہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ عقیلہ پیاری تمہارا وقتاً فوقتاً پاکیزہ کے سلسلے میں حوصلہ افزائی کرتے رہنا قابلِ قدر ہے اس کے لیے دل سے شکریہ...... اور وہ

تمام بہنیں جو مسلسل رابطہ رکھتی ہیں اور دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں، اللہ ان سب کو جزائے خیر دے اور اپنی حفظ و امان میں رکھے...... انشاء اللہ اگلے ماہ پھر بہت سی باتیں ہوں گی اب اجازت...... اپنا، اپنے پیاروں کا اور اپنے وطن عزیز کا بے حد خیال رکھیں......

اللہ نگہبان......

دعا گو: عذرا رسول

☆☆☆

اچھی، اچھی پیاری، پیاری بہنو...... ا نئے سال کے اوّل ماہ میں کیا، کیا پلان بنائے ہیں کچھ ہمیں بھی بتایئے گا، آپ سب کے لیے پُرخلوص تمنائیں اور دعائیں تو ہر پل ہی ہیں، بس اس سال کے آغاز میں اتنا ہی کہنا ہے کہ اپنے ادھورے کاموں کو جلد سے جلد مکمل کرلیں جس میں ایفائے عہد بھی بہت ضروری ہے، مثلاً کسی کی مزاج پرسی کا وعدہ، کسی کو تحفہ دینے کا وعدہ اور کسی کی مدد کرنے کا ارادہ وقت تیزی سے گزرتا چلا جارہا ہے لہٰذا موجود لمحوں کو غنیمت سمجھنا بھی وقت کا حق ادا کرنا ہوتا ہے۔

امسال پاکیزہ مصنفات کی لہرست میں بہت خوشگوار اضافے ہوئے ہیں جس کی بنا پر اور آپ کی آرا کے مطابق موضوعات میں تنوع بھی آیا ہے، بس آپ سب کی پزیرائی اور حوصلہ افزائی ہی ہمارا ایندھن ہے، آپ سب کے خطوط اور ٹیلی فون کالز مسلسل موصول ہو رہی ہیں، اگر کسی ماہ کسی بہن کا نامہ یا ٹیلی فونک گفتگو کا ذکر ہم سے رہ جایا کرے تو اسے درگزر کردیا کریں۔ ہمارے دل میں آپ کی محبت و قدر اور خلوص یکساں ہے آپ جیسے معزز، باشعور اور سمجھدار قاری ہی تو ہمارے لیے ترقی کی راہیں ممکن بناتے ہیں، ماہنامہ پاکیزہ کی قیمت میں اضافے کا ذکر اگرچہ ہم نے اداریے میں بھی کردیا ہے مگر ایک دفعہ پھر آپ کو بتاتے چلیں کہ دس روپے کے اضافے کے ساتھ یہ پرچا اب 70 روپے ماہانہ بک اسٹال پر اور زرسالانہ 900 روپے کے ساتھ آپ کے گھر پر بھی دستیاب ہوسکتا ہے۔ آپ کے پُرخلوص تعاون کا شکریہ۔

اللہ آپ سب کو خوش باش اور پُرسکون رکھے۔ اور خوشحال اور خوش مزاج بھی رکھے، الٰہی آمین...... براہ راست رابطہ نمبرز نوٹ فرمالیں۔ 107-021.35802552-Ext:122 -0331626612,021.35386783

☆☆☆

اب مختلف خبروں اور سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوصِ دل سے درود ابراہیمی اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہلِ وطن کو بھی ضرور یاد رکھیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ موسم سرما کی چھٹیوں میں آج کل ذیشان رسول اور ڈاکٹر فاطمہ ذیشان کراچی آئے ہوئے ہیں اور یہاں باقاعدگی سے آفس بھی آرہے ہیں۔ لندن میں بھی ذیشان اور فاطمہ ادارے کے تحت شائع ہونے والے تمام پرچوں کے قارئین سے ملاقاتیں کرتے رہتے ہیں۔ پاکستان سے باہر بھی الحمدللہ ہمارے چاروں پرچوں پاکیزہ، سسپنس، جاسوسی اور سرگزشت کی بہت مانگ ہے اور اردو پڑھنے لکھنے بولنے اور سمجھنے والے نہایت ذوق شوق سے پڑھتے ہیں اسی طرح ان میں چھپنے والے تمام رائٹرز، وہاں بھی بہت مقبول ہیں۔

☆ مصنفہ سلمٰی غزل کے بیٹا، بہو آج کل امریکا سے پاکستان آئے ہوئے ہیں۔

☆ آرٹس کونسل، کراچی میں عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں ملکی اور بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب، نقاد، مصنفین اور شعرا کرام نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔

☆ رائٹر ثمر کاظمی، ڈی آئی خان کی ہمشیرہ کے ہاں شادی کے چار سال بعد بیٹے کی ولادت ہوئی ہے۔ (مبارک باد)

☆ مصنفہ شیریں حیدر، اسلام آباد آج کل اپنی بیٹی اور نواسے، نواسی کی خاطر داریوں میں مصروف ہیں۔ (اللہ سلامت رکھے)

☆ ماہنامہ پاکیزہ میں کئی ماہ تک قسط وار چھپنے والا مصنفہ سحر ساجد کا خوب صورت ناول من جاں بازم کتابی شکل میں شائع ہوگیا ہے۔ 327 صفحات پر مشتمل یہ ناول بہت متاثر کُن سرورق کے ساتھ شائع ہوا ہے...... کتاب کا انتساب پاک فوج

کے ہیروز کے نام ہے۔ اس کی قیمت صرف 600 روپے ہے جسے ناشر محمد علی قریشی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے ملنے کا پتا القریش پبلی کیشنز سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور ہے فون نمبر 04237668958 -04237652546

☆ مصنفہ مصباح نوشین کا ناول عشق مجذوب شائع ہوگیا ہے۔ جسے ناشر محمد علی قریشی اور فہد حسن قریشی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، صفحات کی تعداد 224 ہے اور اس کی قیمت صرف 500 روپے ہے۔ اس خوب صورت عشق زدہ ناول کا انتساب انہوں نے اپنی پیاری سہیلی صائمہ اکرم چوہدری کے نام کیا ہے۔ کتاب کے ملنے کا پتا القریش پبلی کیشنز لاہور ہے (فون نمبرز اوپر درج ہیں)

☆ القریش پبلی کیشنز کے بینر تلے مصنفہ مصباح علی سید کا حسین ناول حاصل کشت وخوں شائع ہوگیا ہے۔ اس کا سرورق نہایت پُرکشش ہے، ناول کا متن پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کی قیمت صرف 500 روپے ہے۔

دعائے صحت کی التماس ہے

☆ پاکیزہ کی ایک مستقل قاری بہن بنت حوا جن کا تعلق حیدرآباد سے ہے۔ اپنے جوان بیٹے کی کلی صحت کے لیے دعا کی طلب گار ہیں۔

☆ مستقل قاری بیگم محمد سلیم، پشاور کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ان کی لیے خصوصی دعائے صحت کی درخواست ہے۔

☆ شاعرہ فریدہ خانم، لاہور کے والد صاحب کی طبیعت اب قدرے بہتر ہے۔ (الحمدللہ)

☆ مستقل قاری گل شاد نذیر، اسلام آباد کے لیے دعائے صحت کی درخواست ہے۔

انتقالِ پُرملال

☆ مسز یٰسین، لیہ، کی کزن شہناز کا گزشتہ دنوں انتقال ہوگیا ہے۔ وہ بریسٹ کینسر میں مبتلا تھیں۔

☆ مصنفہ نگہت سیما، چکوال کی چھوٹی بھابی برضائے ربی انتقال کرگئیں۔

☆ مستقل قاری حسینہ ممتاز خان، اسلام آباد کی ساس امی کا انتقال ہوگیا ہے۔

☆ مستقل قاری فلک نواز بنگش جو نگینہ ضیا بنگش کی چھوٹی بہن ہیں ان کی ساس محترمہ وفات پاگئیں۔

☆☆☆☆

بہنوں! اب آتے ہیں آپ کے کھٹے میٹھے خطوط کی جانب......

✉ رضوانہ پرنس کا خوب صورت اظہار خیال...... "ڈیئرسٹ عذرا تمہارے محبت بھرے شکریے کے جواب میں دوستی کا وہ حق ادا ہی نہیں کر سکتے جو ہمیں کرنا چاہیے لیکن تم اتنی اچھی ہو کہ ہماری معروفیات کو سمجھتے ہوئے شکوہ کرنا تو دور کی بات اپنی حوصلہ افزائی سے ہمیشہ ہماری ہمت اور حوصلہ بڑھاتی رہتی ہو۔ ویسے تمہاری محبت بھری ڈانٹ بھی ہمیں بہت بھاتی ہے، جنہیں اور نزہت کو ہماری ڈھیر ساری دعائیں اور پیارا اللہ یہ نیا سال سب کے لیے صرف خوشیاں ہی خوشیاں لائے اور پاکیزہ ڈائجسٹ کی جگمگاہٹ مزید بڑھتی جائے۔" (بہت نوازش رضوانہ ڈیئر)

✉ نگہت سیما، چکوال سے۔ "امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ ہر بار جب پاکیزہ ملتا ہے تو سوچتی ہوں کہ اس بار تو پاکیزہ پڑھ کر خط لکھوں گی۔ لیکن ہر بار ہی تاخیر ہو جاتی ہے۔ ستمبر میں صبیحہ شاہ سے ملاقات بہت اچھی لگی تھی اور ان کی باتوں نے مزہ دیا۔ وقت کے ساتھ انسان کی ترجیحات بدل جاتی ہیں لوگ تو برسوں پرانے تعلق بھول جاتے ہیں لیکن آپ نے یاد رکھا کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا...... بہت شکریہ، پیاری صبیحہ، ادھر بھی یہی حال ہے۔ خطوطی رابطے تو ٹوٹے ہی فون کرنے کے لیے بھی مہینوں سوچتے رہتے ہیں کہ فلاں کو فون کرلیں۔ (جی بالکل آج کی معروفیات وقت ہی نہیں دیتیں) میں ستمبر میں ہی خط لکھنا چاہ رہی تھی لیکن ستمبر میں میری چھوٹی بھابی جو یہاں ہمارے ساتھ ہی رہتی تھیں ان کا انتقال ہوگیا اس سے پہلے مئی میں بڑی بھابی کا لاہور میں انتقال ہوگیا تھا تب شاید نزہت آپ سے بات ہوئی تھی۔ ابھی نومبر کا پاکیزہ ملا دونوں ناول کی اقساط اچھی جا رہی ہیں۔ باقی کا پاکیزہ جانے کب پڑھوں گی اس کے لیے باقی تبصرہ پھر کبھی سہی...... عذرا رسول صاحبہ اور آمنہ حماد کے لیے ڈھیروں دعائیں اور سلام۔ (مختصر خط کا شکریہ نگہت...... اللہ پاک آپ کی بھابی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور لواحقین کو صبر جمیل دے۔) خط تو بہت پہلے لکھا تھا لیکن پوسٹ ہی نہیں کرسکی...... کیا کہوں۔ ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا۔" (چلیں

سیما حاضری تو لگ گئی ناں)

✉ تسنیم منیر علوی، دبئی سے۔ "آج ایک عرصے کے بعد پاکیزہ سے مخاطب ہوں اور آپ سے پہلی بار...... دراصل والد کی وفات کے بعد قلم سے رشتہ ایک دم کمزور ہوگیا تھا...... پھر اب دوستوں کا اصرار بڑھا تو دوبارہ قلم سے رشتہ بحال کرنے کی کوشش کی...... اب اس میں کتنی کامیابی ہوئی...... یہ تو آپ ہی بتائیں گی۔ ...ایک کہانی جو کہ سچی بھی ہے افسانے کی صورت میں ارسال کررہے ہیں۔ "سورج کی طرفداری" امید ہے پسند آئے گی اور جلد کسی قریبی اشاعت میں جگہ پائے گی۔ (کہانی تو یقیناً سچی ہوگی مگر کچھ قباحتیں ہیں کسی وقت فون پر بات کرلیں تسنیم آپا) تبصرے بہت مشکل ہے کہ وقت پر ارسال کرسکوں...... کیونکہ یہاں بہت دیر سے پرچہ موصول ہوتا ہے۔ انجم تو تاخیر سے بھیجنے پر بھی شائع کردیتی تھیں۔ اب نہیں معلوم ایسا ہوسکتا ہے کہ نہیں (تسنیم، پاکیزہ ویسا ہی وضع دار ہے آپ تبصرہ بھیجیں تو) کیونکہ آپ تک پہنچتے پہنچتے تبصرے باسی ہوچکیں گے...... انجم انصار سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر رابطہ نہیں ہوسکا۔ خدا کرے ان کی صحت اب بالکل ٹھیک ہو اگر آپ سے بات ہو تو مزاج پرسی کے ساتھ، ساتھ سلام بھی عرض کردیں۔ (جی ضرور الحمدللہ وہ بخیریت ہیں) اب اجازت چاہوں گی۔ آپ سب کی محبتوں کی مشکور ہوں کہ ابو کی تعزیت بھی کی اور حوصلہ بھی دیا۔" (یہ تو ہم سب کا اخلاقی اور اسلامی فریضہ ہے۔)

✉ رابعہ یاسمین، کوئٹہ، بلوچستان سے۔ "آپ کو بہت مبارک ہو کہ آپ نے بہترین انداز میں پاکیزہ سنبھال لیا ہے۔ مگر اس بار آپ نے کسی رائٹر سے ملاقات نہیں کرائی...... آپ صرف رائٹرز کے انٹرویو لیا کریں پاکیزہ یہاں دیر سے ملتا ہے۔ جب پڑھ لیتی ہوں تو خط لکھنے کی ڈیٹ گزر جاتی ہے۔ اس لیے تبصرہ نہیں کرسکتی۔ (آپ تبصرہ لکھ دیا کریں ہم اگلے ماہ لگا لیتے ہیں) مستقل سلسلے تو بہترین ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ رفعت سراج اور شیریں حیدر کے ناول کمال کے ہیں، میں سب سے پہلے وہی پڑھتی ہوں۔ (شکریہ) افسانے بھی اس ماہ بہترین تھے خاص کر خواب گزیدہ اور سر دیوار لکھتا ہوں تو بے حد پسند آئے۔ ہاجرہ ریحان صاحبہ تو مختصر افسانے میں بڑی بات کہہ جاتی ہیں، سنبل ملک اعوان کو بہت مبارک ہو کہ انہوں نے عمرے کی سعادت حاصل کرلی۔ دنیا میں اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوسکتی ہے۔ (جی بالکل) ڈاکٹر ممتاز ضیا، نرگس نسیم اور سلمیٰ غزل کے تبصرے بہت شاندار ہوتے ہیں۔ نرگس نسیم کو تبصروں پر انعام ملنا چاہیے" (جی صحیح کہا، مختصر تبصرے کا شکریہ)

✉ ناعمہ تحریم، کراچی سے۔ "میں اور میری کئی ساتھی ماہنامہ پاکیزہ ذوق وشوق سے پڑھتی ہیں اور اس میں شائع ہونے والے انعامی مقابلوں میں بھی حصہ لیتی رہتی ہیں اور ساتھ خوب صورت تحفے بھی۔ میں نے بھی آپ کی بزم پاکیزہ میں حصہ لیا اور میرے بھیجے ہوئے سوال کو دوسرے انعام سے نوازا، میں آپ کی اور پاکیزہ کے ان تمام ساتھیوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں جنہوں نے میرے سوال کو پسند کیا اور انعام سے نوازا۔" (انعام تو انعام ہوتا ہے چاہے ایک کتاب ہی ہو۔ رسالہ پسند کرنے کا شکریہ آپ تبصرہ بھی بھیجیں)

✉ شاہدہ، ملتان سے۔ "میں عرصہ چالیس سال سے پاکیزہ نہایت ذوق شوق سے پڑھ رہی ہوں۔ اس میں شامل دعاؤں کا ورد بھی رکھتی ہوں۔ آپ سب لوگ بہت اچھی، اچھی باتیں بتاتے ہیں مجھے ذکیہ آپا سے اپنے بچوں کے لیے دعا کروانی ہے، وہ اکثر بیمار رہتے ہیں اس کے علاوہ سب بہنوں کا ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنا بہت اچھا لگتا ہے۔ میری پُرخلوص دعائیں آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔" (بہت شکریہ اور دعاؤں کے لیے جزاک اللہ ذکیہ آپا تو سب بہنوں کو دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں)

☆ فریدہ ہاشمی مخلی، کراچی سے۔ "سب سے پہلے آپ کو بلکہ ساری پاکیزہ بہنوں کو عید میلادالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ خدا کرے اس مبارک مہینے میں ہم تجدید وفا کریں اس عہد کی جو ہم نے کلمہ پڑھ کر اپنے اللہ اور اپنے پیارے نبی سے کیا ہے۔ میرے خیال سے صرف نعتیں پڑھنا ہی میلاد نہیں ہے۔ خاص طور سے اس ماہ میں ہمیں سیکھنا ہے، رحم دلی، سخاوت، صبر وشکر، تحمل وبرداشت اور سب سے زیادہ معاف کرنے کی عادت کیونکہ یہی سب صفات تھیں جن کی وجہ سے اسلام دنیا میں پھیلا۔ شاید ہم یہ سب بھول گئے ہیں، آئیے پھر سے تجدید وفا کریں۔ (جی بالکل درست کہا آپ نے) اس بار بہن اختر شجاعت کا مضمون بے حد اچھا لگا۔ یہی میلاد ہے، خدا ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ پاکیزہ ڈائری میں میلاد سے متعلق نعتیں اور تحریریں بے حد عمدہ ہیں۔ نرمین سرمیو کی عورت، جیا عباس کی محبت سے نفرت...... مسز یٰسین کی غزل اور فریدہ فری کی پکی بہت پسند آئی۔ بہنوں کے مختصر مضامین سب اچھے ہیں۔ شاہدہ ذاکر کی کہانی میں ماں کا کردار بہت اچھی طرح

دکھایا ہے۔ واقعی ماں ہمیشہ معاف کرنے والی اور دعا دینے والی ہوتی ہے۔ ہما بیگ نے آج کی دنیا کے مسئلے کو بہت اچھی طرح بیان کیا ہے۔ ہالہ احمد کا مختصر افسانہ اچھا لگا۔ آہ انسان اور اس کی ہوس شائلہ دلعباد کا افسانہ بھی اچھا تھا۔ عقیلہ حق کی کہانی آنکھیں کھولنے والی ہے مگر کتنوں کی آنکھیں کھلیں گی۔ بہنوں کی محفل میں سعیدہ منان کا خط بہت خوب صورتی سے لکھا گیا ہے۔ واہ سعیدہ بہن۔ فریدہ فری نے اپنی ہم نام پر جو کچھ لکھا ہے پڑھ کر مزہ آیا۔ شکریہ...... آپ کو بھی میرا اسلام پہنچے۔ عذرا آفتاب نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں بھی لکھنے والی تھی مگر خط کی طوالت کی وجہ سے نہ لکھ سکی۔ واقعی میں رشتوں کا تقدس بہت پامال ہو رہا ہے۔ اور ڈراموں میں بہنیں تو معلوم ہوتا ہے ایک دوسرے کی جانی دشمن ہیں۔ خدا رحم فرمائے، آمین۔" (تبصرے کا شکریہ، اللہ ہم سب کو راہِ ہدایت دے)

✉ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ "اس بار دسمبر کا شمارہ نادیہ علوی کے دلکش سرورق سے سجا ملا بہت ہی پسند آیا۔ سب سے پہلے میری طرف سے اور پاکیزہ کی ہردلعزیز شاعرہ یعنی فریدہ جاوید فری کی طرف سے پاکیزہ کے سارے اسٹاف کو اور پاکیزہ پڑھنے والی بہنوں کو نیا سال 2018ء بہت، بہت مبارک ہو۔ کہانیوں پر تبصرہ اس لیے نہیں کرسکتی کہ میں وقفوں، وقفوں سے پاکیزہ پڑھتی ہوں۔ اگر کہانیوں پر تبصرہ کروں تو خط لیٹ ہو جائے گا اور شائع نہیں ہوگا۔ دین کی باتیں پڑھ کر ایمان کو تازگی بخشی، آپ نے اپنے اداریے میں خوب لکھا ہے کہ ہم امت محمدیؐ کہلانے کے حقدار اس وقت ہوسکتے ہیں جب ہم حضور پاکؐ کی سیرت طیبہ پر مکمل عمل کریں۔ (جی بالکل) بہت خوشی ہوئی کہ میری پیاری لاڈلی نند فریدہ جاوید فری صحت یاب ہوگئی ہیں، اللہ انہیں مکمل تندرستی عطا فرمائے۔ آمین۔ شائستہ زریں کے سروے میں دلچسپ غلطیاں حماقتیں پڑھ کر مزہ آگیا۔ سیما رضا ردا کی پُرتکلف ضیافت کا پڑھا تو ہمارے منہ میں بھی پانی آگیا۔" (آپ بھی یہاں آئیں تو ایسی ہی ضیافت ہوگی)

✉ شازیہ ہاشم، میوانی، کھڈیاں قصور۔ آپ کے خط کے لیے ممنون ہیں آپ جو چاہتی تھیں وہ ہوگیا۔ اللہ پاک ہم سب کا ایمان کامل رکھے، آپ کا بہت شکریہ کہ پاکیزہ سے اتنی محبت کرتی ہیں)

✉ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ، چکوال سے۔ "سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے میری خواہش کا پاس کرتے ہوئے فون پر عذرا باجی سے بات کروائی۔ میں کافی خوش ہوں، ایک کوتاہی کا احساس بھی ہوا۔ ان سے بات کے دوران...... واقعی کسی بھی ادارے کی ترقی میں صرف فردِ واحد کا ہاتھ نہیں ہوتا بلکہ ٹیم ورک ہوتا ہے۔ بہرحال ہم سے بہت بڑی کوتاہی ہوئی واقعی ہم نے کبھی آمنہ حماد کو نہیں سراہا سوسوری اگر دیکھا جائے تو معاون کا کام زیادہ ہوتا ہے۔ (جی ہاں) آپ بھی تو دلکش کو ایسے چلاتی تھیں تو ہمیں آپ کی جدائی بڑی مشکل سے قبول ہوئی تھی۔ آپ کی دوبارہ آمد پر کتنی خوشی ہوئی ہے ہم انجم آپی کی پاکیزہ سے علیحدگی کے بعد شاید پاکیزہ پڑھنا چھوڑ دیتے جو آپ نہ ایڈیٹر بنتیں یہ آپ ہیں ناں جس کی وجہ سے ہم کو کچھ حوصلہ ملا۔ ایک بات کا میں برملا اعتراف کرتی ہوں کہ پچھلے دو سالوں سے پاکیزہ کا معیار گرتا جارہا تھا اور اب پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ آپ نے جو تبدیلیاں کروائی ہیں اس سے پاکیزہ رسالے میں نیاپن اور اچھوتا منفرد تاثر پیدا ہوا ہے اور میری نظر میں پاکیزہ کی مقبولیت میں پہلے سے بڑھ کر اضافہ ہوا ہے کہ اب تو پاکیزہ ایک ماہ کے اندر، اندر دکانوں سے ختم ہو جاتا ہے۔ (یہ سب آپ لوگوں کی محبت اور ہماری رائٹرز کی محنت ہے، آمنہ حماد شکریہ کہہ رہی ہیں) میری شدت سے خواہش ہے کہ پاکیزہ مصنفات میں میرا نام بھی شامل ہو۔" (جی یہ بھی ہو جائے گا)

✉ نگہت غفار، کراچی سے۔ "ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ مجھے کچھ کہنا ہے ہمیشہ کی طرح توجہ طلب۔ واہ کس عقیدت، محبت و اپنائیت، عزت و احترام اور مسرت کے ساتھ کتنے حسین مہکتے چمکتے جھلملاتے موتیوں کی مالا بنا کر لفظوں کی صورت ہمارے پیارے رسول پاکؐ کی دنیا میں تشریف آوری کے بارے میں جن لفظوں کا چناؤ کیا ہے وہ قابلِ ستائش اور عزت و احترام کے قابل .... ہیں، واہ سبحان اللہ! ہم ان فخرِ انسانیت کی امت ہونے کا اعزاز رکھتے ہیں مگر صد افسوس کہ ان کے قول و فعل اور سنت کا رتی بھر خیال نہیں رکھتے اور ان سے شفاعت کی امید رکھتے ہیں۔ یہ ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے۔ دین کی باتیں، اللہ اور اس کا نور ان مقدس اور خوب صورت تحریروں کے متعلق ان کے اوصاف، ان کی عزت و حرمت بیان کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ کہانیاں میرے خواب چھین لو بہت زبردست تحریر تھی جیتی رہو عقیلہ بڑی دردناک سچائی بیان کی ہے بالکل حقیقت سے قریب دل کو دکھی کر گئی۔ عروسی جوڑا بہت خوب طیبہ سدا سلامت رہو بہت ہی بہترین کہانی لکھی ہے۔ شہرِ گل میں تمنا بہار

کی۔ غزالہ راؤ کی تحریر بھی بڑی سبق آموز اور خوب صورت تحریر تھی۔ عقلمند اور شریف بہو، بیٹیاں ایسے ہی فیصلے کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر شادی شدہ لڑکی کو ایسی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین) وہ آئے بزم میں، سیما مناف سے ملاقات اچھی لگی۔ نگینہ ضیا بخش بیٹی کی کامیابی بہت مبارک ہو اللہ تعالیٰ بیٹی کو زندگی اور تعلیم کے ہر امتحان میں کامیاب کرے، آمین۔ اللہ ہمارے وطن پاکستان کو اپنی رحمتوں کے حصار میں رکھے۔ شرپسندوں اور دشمنوں سے محفوظ رکھے، آمین۔ اس کے ساتھ تمام بہنوں کے لیے شفایابی کی دعا۔" (بہت پیارے دعائیہ اور توصیفی تبصرے کا شکریہ)

✉ ڈاکٹر زاہدہ پروین، بہاول پور سے۔ "میں ضلع لودھراں کی ڈسٹرکٹ اسپتال میں شعبۂ امراضِ نسواں کی سربراہ کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے رہی ہوں، کچھ عرصہ قبل بچیوں میں لیکوریا کے موضوع پر ایک مضمون بھیجا تھا جو کافی کاٹ چھانٹ کر پاکیزہ میں شائع ہوا تھا۔ (ضروری امور شائع کر دیتے ہیں) گزشتہ دنوں تھیلیسیمیا کے موضوع پر ایک کہانی لکھی تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس طرح کسی بیماری کو کہانی کی شکل میں پیش کرنا یقیناً قاری بہنوں کے لیے مفید اور دلچسپ ہوگا انٹرنیٹ، رسالے تک تو رسائی کم ہی بہنوں کی ہوگی یہی سوچ کر یہ کہانی آپ کو بھیج رہی ہوں کہ یہ زیادہ مؤثر رسالہ ہے (جی بالکل) آپ یہ پڑھ کر رائے ضرور دیں کیونکہ میں اس سلسلے میں مزید تحاریر لکھنا چاہ رہی ہوں کچھ نئے موضوعات میرے ذہن میں ہیں۔" (ضرور لکھیں اسی بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہما بیگ اور شہلا جمال کی کہانیاں گزشتہ مہینے میں لگائی تھیں۔)

✉ یاسمین کنول، پسرور سے۔ "دسمبر 2017ء کا آخری شمارہ ماہنامہ پاکیزہ نظر نواز ہوا۔ اپنے اشعار اور سوالات دیکھ کر خوشی ہوئی بہت شکریہ...... آئندہ شمارہ 2018ء کا ہوگا تمام قارئین بہنوں اور پاکیزہ اسٹاف ممبران کو نیا سال مبارک ہو اللہ کرے یہ سال تمام عالم اسلام کے لیے امن و سکون کا باعث بنے، آمین۔ باقی سرمایۂ بہارِ زیست ہے دردانہ نوشین کی مختصر تحریر بہت اچھی لگی بالکل اپنے جذبات کی غمازی لگی۔ علاوہ ازیں مایہ ناز رائٹر سیما مناف سے ملاقات بہت زیادہ پسند آئی ملاقات کروانے کا شکریہ...... سرورق شادیوں کے حوالے سے خوب رہا آج کل شادیوں کا زور ہے اور لڑکیاں ایسے ہی بناؤ سنگھار میں مصروف نظر آرہی ہیں جیسے پاکیزہ کے سرورق کی ماڈل کا ہے۔ افسانوں میں عروسی جوڑا اور جیون کہانی پسند آئی۔ سدرۃ المنتہیٰ کی تحریر متاثر کن رہی۔ شمعِ ہدایت ہمیشہ کی طرح روشنی لٹاتی نظر آئی۔ اللہ اور اس کا نور پسندیدہ سلسلہ ہے۔ سروے بھی اچھا لگا اور بہنوں کی محفل میں تو ہماری جان ہے معلومات حاصل ہوتی ہیں کہانیوں کی پسند ناپسند کا پتا چلتا ہے اور اکثر جو کہانیاں ہمیں پسند ہوتی ہیں ان کی تعریف لکھی نظر آتی ہے تو محاورہ یاد آتا ہے کہ زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو، روحانی مشورے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ ایک بار پھر پاکیزہ کے کنبے کو نیا سال مبارک اور اللہ کرے یہ کنبہ سدا آباد رہے اور محبت و اخوت کے پھول ہمیشہ کھلے رہیں اور ان پر کبھی خزاں نہ آئے۔" (آمین۔ مختصر مگر جامع تبصرے کا شکریہ آپ کو بھی نیا سال مبارک ہو)

✉ تسنیم کوثر، کراچی سے۔ "پاکیزہ کی تو کیا بات کریں یہ تو خوب ہے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں (یہ تو ٹیم ورک ہوتا ہے) اور ہاں بھئی رفعت سراج کے یہ کہاں بچپن کے دل ہے میں بھی اب دل لگنے لگا ہے لگتا ہے ناول نے خوب صورت کروٹ بدلی ہے۔ اسی طرح امرت بھی کچھ، کچھ اچھا لگنے لگا ہے۔ شہرِ گل میں تمنا بہار کی غزالہ جلیل راؤ نے زبردست لکھا ہے ان کا ناول قابلِ تعریف ہے۔ اس کے برعکس حیا بخاری کا محبت لفظ ہے لیکن معذرت کے ساتھ یہ تو گویا سر سے گزر گیا۔ ہماری ناقص عقل میں اسٹوری سمجھ ہی نہیں آئی۔ (آجائے گی فکر نہ کریں) البتہ بنت سحر کا جو حرف کا وہ دل تھا بہت دلکش ناول ہے دل سے پسند آیا۔ سحر کو بہت مبارک باد...... اور یہ ایسی ہی خوب صورتی سے سجا بشریٰ سیال کا حسین ناول رازِ الفت بہت، بہت اچھا لگا بلکہ پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ بدلتے رشتے غزالہ عزیز نے عمدگی سے لکھا ہے۔ محبت مانگ میں تارا بس مناسب تھا یعنی نہ اچھا نہ برا بس گوارا سدرہ کا تیری چاہ سے کیا کہوں اس بارے میں باپ بیٹی کی اتنی محبت کہ بیٹی اپنے ابا کو نام سے پکارے اچھا نہیں لگا۔ ویسے کہانی کے لحاظ سے ناول بہتر لگا۔ ویسے اس بار پاکیزہ کے افسانے نہایت ہی شاندار تھے۔ (بہت، بہت شکریہ) خاص کر عقیلہ حق کا میرے خواب چھین لو جواب نہیں اس کا حقیقت سے قریب تر عقیلہ حق کی تحریر نے رُلا دیا۔ طیبہ عنصر مغل کا عروسی جوڑا نے بہت مزہ دیا۔ وہ آئے بزم میں سیما مناف کا بھرپور انٹرویو دل کو لگا۔ پیاری نزہت آپ کے انٹرویو لینے کا انداز بہت خوب ہوتا ہے۔ اس دفعہ محفل میں ہمیں یاد رکھیے گا۔" (ڈیئر صفحات کی کمی آڑے

آ گئی تھی تو آپ کا پچھلا تبصرہ رہ گیا اس بار آپ نے صحیح ٹائم پر بھیجا۔)

☒ نفضہ خان، ہری پور، آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی۔ آپ تفصیلی تبصرہ بھی ضرور لکھیں۔

☒ فاطمہ عبدالخالق، فیصل آباد، پاکیزہ پسند کرنے کا شکریہ..... آپ کی کہانی آپانا قابلِ اشاعت ہے۔

☒ نشاۃ ثانیہ، آپ کی یہ کہانی نا قابلِ اشاعت ہے۔

☒ عائشہ تنویر، کراچی۔ اس دفعہ تو آپ کی تحریر شائع ہوگئی ہے خوش ہو جائیے۔ مائے نی نا قابلِ اشاعت ہے۔

✉ نورین شہزاد، کراچی سے۔ ''غلطی تھوڑا ہٹ کے تھی معمول کی کہانیوں سے دھڑکا جو دل تھا۔ سوفٹ سا اثر چھوڑ گئی۔ لکا ہیہ کالم گوشۂ ظرافت اچھا سلسلہ ہے۔ شائستہ زریں کے دلچسپ سلسلے میں جانے انجانے میں سرزد ہونے والی سالِ رواں کی دلچسپ غلطی یا حماقت پڑھ کر مزہ آیا۔ باجی لوگ اکثر کہتے ہیں کہ ان کا ہاتھ بہت کھلا ہے۔ ان کا دل بڑا ہے، جب ہوتا ہے پیسہ تو دل کھول کے خرچ کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں سوراخ ہیں نہیں ہوتا تو مجبور ہو جاتے ہیں بیچارے، یہ بات لوگ فخریہ بتاتے ہیں چاہے وہ کسی کے بارے میں بات کر رہے ہوں چاہے اپنے بارے میں۔ دراصل یہ فخر کی بات نہیں۔ بہت پریشانی کی بات ہے جسے لوگ فخر سمجھتے ہیں۔ وہ اللہ اور رسول اللہ کے نزدیک اسراف میں آتا ہے دین میں سخاوت کرنا جائز ہے اسراف نہیں کھلا کھانا کھلا خرچہ لوگوں نے سمجھا ہے کہ یہ بڑا دل ہے آس پاس نظر دوڑا لیں کھانوں کی چیزوں پر ہی لوگ سب سے زیادہ خرچ کر رہے ہوتے ہیں اور اسی کو سمجھتے ہیں کہ بڑے دل کے ہیں۔ کرنا یہ ہے کہ اس کو فخر نہ سمجھیں بلکہ بجٹ بنا کے چلیں غیر ضروری چیزیں نہ خریدیں لسٹ بنائیں دیکھیں کیا بہت زیادہ ضروری ہے۔ اس طرح ہمیشہ ہی پیسہ آپ کی جیب میں، والٹ میں رہے گا۔ (بہت اچھی بات بتائی اسی موضوع پر تو جنوری کا سروے شائستہ زریں نے کیا ہے) کھانے کا زیاں نہ کریں، بہت ساری چیزیں کھائے بغیر بھی ہم زندہ رہ سکتے ہیں۔ ضروری نہیں ہر سپر مارکیٹ سے خوب صورت پیکنگ کی ہر چیز خرید لی جائے جو کافی عرصے گھر میں رکھے رہنے پر بھی شاید استعمال میں نہ آئے گی۔'' (جی بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔ بہت اچھی باتوں کے لیے جزاک اللہ خیر......)

✉ فریدہ جاوید فری، لاہور سے۔ ''دسمبر کا شمارہ پاکیزہ ملا ٹائٹل دلفریب لگا مجھے کچھ کہنا ہے بے حد اچھا لکھا۔ دین کی باتیں پڑھ کر حسبِ سابق ذکیہ بلگرامی صاحبہ کا اللہ اور اس کا نور پڑھ کر دلی سکون ملا۔ افسانوں میں غزالہ جلیل کا شہرِ گل میں تمنا بہار کی بے حد اچھا افسانہ لگا۔ ہما بیگ کا چاند کا داغ...... ناولٹ جو دھڑکا وہ دل تھا بہترین تھا۔ رازِ الفت مزہ دے گیا۔ بدلتے رشتے واہ کیا ناولٹ تھا خوش رہو غزالہ عزیز...... کوثر خالد کی نظم بے حد پسند آئی۔ عقیلہ حق کا افسانہ میرے خواب چھین لو پڑھ کر مزہ آ گیا...... طیبہ عنصر مغل کا افسانہ تو پاکیزہ کے ماتھے کا جھومر تھا واہ جی ایسے، ایسے افسانے لکھتی ہو پڑھ کر دل خوش ہو جاتا ہے شہزادی کیسے لکھ لیتی ہو ایسی بہترین تحریریں میں تو تمہارے افسانے ڈھونڈ کر پڑھتی ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو صحت مند زندگی دے آمین۔ مکمل ناول تیری چاہ سے بہترین تحریر تھی۔ جن کا انتقال ہوا ان کو اللہ جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔ اپنی نظم اور غزل پڑھ کر خوشی ہوئی۔'' (چلیں آپ خوش تو ہم بھی خوش...... تبصرے کا شکریہ)

✉ فائزہ فاروق سحر، ماڈل ٹاؤن، لاہور سے۔ ''دسمبر کا پاکیزہ ملا حسبِ عادت حسبِ معمول سب سے پہلے اپنا خط ڈھونڈنے کی کوشش کی جو ایک آدھ لائن پر مشتمل ہی ملتا ہے۔ کوئی شکوہ نہیں گلہ نہیں مگر دو چار لائنیں تو ملنی چاہئیں مجھے۔ (ڈیئر آپ جتنا لکھتی ہیں اتنا ہی ہوگا ناں) عشق وہ جو سر چڑھ کر بولے اور آج کل امرت سے ہو گیا ہے بہت ہی اچھی تحریر ہے خیریں حیدر کی۔ دوسری محبت ہماری رفعت آپا سے ہے۔ جلترنگ کی بک مجھے چاہیے طریقہ کار بتا دیں۔ ان کی ہر سطر قابلِ داد ہوتی ہے۔ پاکیزہ ڈائری کے لیے اپنی تحریر بھیج رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں شاملِ محفل ہوگی۔ (القریش والوں کو فون کریں۔ نمبر اسی محفل کے شروع میں ہیں)

☒ نرمین سرھیو، ٹھٹھہ سندھ۔ آپ کی کہانیاں اور مراسلے قابلِ اشاعت ہیں گاہے بگاہے جگہ پاتے رہیں گے۔

✉ رابعہ نورین، راولپنڈی سے۔ ''باجی مجھے پاکیزہ بہت پسند ہے۔ بہت عرصے سے پڑھ رہی ہوں بس کبھی کبھی رسالہ وقت پر نہیں ملتا۔ کراچی سے یہ کب تک جاری ہوتا ہے۔'' (کراچی سے 28,29 کو دوسرے شہروں کے لیے نکل جاتا ہے۔ آپ 900 روپے زرِ سالانہ کی ادائیگی پر رسالہ گھر پر لگوا سکتی ہیں تاکہ بروقت پڑھ کر تبصرہ کر سکیں)

✉ عاصمہ، راولپنڈی سے۔ ''پاکیزہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ میں اس کا مستقل حصہ رہنا چاہتی ہوں۔ میری ایک کہانی آپ کے پاس ہے کب تک لگے گی۔'' (رسالے کو پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ اس کا حصہ ہی ہیں تو کہانی بھی جلد لگے گی)

☒ سعیدہ منان، شکر گڑھ مردان۔ پاکیزہ پسند کرنے کا شکریہ..... آپ کی محبتوں کا بھی بہت شکریہ..... آپ کی تحریر قابلِ اشاعت ہے۔ بس اِک ذرا سا انتظار......

✉ ملاحت، ڈیفنس، کراچی سے۔ ''میں عرصہ بائیس سال سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں، پورا رسالہ بہت پسند آتا ہے۔ ہر ہر لفظ پڑھتی ہوں ویسے تو سب کچھ بہترین ہے مگر ایک چیز کھٹکتی ہے اور وہ ہے ٹائٹل بھی، کبھی تو دوپٹا سر پر ہوتا ہی نہیں اگر اس میں کوئی تبدیلی لاسکیں، کوئی قدرتی نظارہ یا آیت قرآنی وغیرہ ہوں تو...... باقی آپ لوگوں کی مرضی۔'' (تجویز کا بہت شکریہ...... پاکیزہ کے مطالب پسند کرنے کا شکریہ)

✉ خوشبو نور محمد، کلفٹن سے۔ ''پاکیزہ پورے کا پورا بے حد شاندار ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ کچھ کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی مول نہیں ہوتا، اور بالکل اسی طرح کچھ لوگوں کی شخصیت، لہجہ، انداز اور اخلاق اتنا شائستہ ہوتا ہے کہ بندہ جب بھی ان سے ملے، دیکھے نظریں خود بخود ادب سے جھک جاتی ہیں۔ مجھے آپ بھی انہی لوگوں میں سے محسوس ہوتی ہیں۔ آپ کے نرم لہجے، شائستہ اندازِ گفتگو نے متاثر کر کے پاکیزہ کو پہلی بار پڑھنے پر مجبور کیا۔ جو یہ سلسلہ اب تک جاری و ساری ہے اس بار پاکیزہ کی کہانیوں پر رائے دینے کے بجائے میں اِک درخواست کے لیے حاضر ہوں کہ میں نے اکتوبر 2016ء میں اک کہانی رتبہ بھیجی تھی وہ اور اب اِک کہانی سر پھرے بھیج رہی ہوں امید ہے مایوس نہیں لوٹائی جائے گی۔'' (آپ کو نا قابلِ اشاعت ہونے کی وجہ بھی بتائی ہوگی۔ ابھی آپ تمام رائٹرز کو پڑھیں اور پھر لکھنے کی کوشش کریں۔)

☒ حنا دیہ احمد، کراچی۔ آپ کی کہانیاں اچھی ہیں تبھی تو قابلِ اشاعت ہیں۔ انشاء اللہ لگتی رہیں گی۔ آپ سینئر رائٹرز کی تحریریں ضرور پڑھتی رہیں۔ رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

☒ اسما طاہر، اسلام آباد۔ اب تو آپ خوش ہو گئی ہوں گی۔ پرچہ پڑھتی رہیے اور تبصرہ بھی لکھیں۔

☒ نگہت یاسمین، کراچی۔ رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ..... کہانیاں بھی قابلِ اشاعت ہونے پر ضرور لگتی ہیں۔ تھوڑا انتظار تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

✉ مسرت رانی خلیل، کراچی سے۔ ''نزہت کافی عرصے بعد تبصرہ کر رہی ہوں بس کچھ معروفیت تھی۔ پاکیزہ تو باقاعدگی سے پڑھتی رہی ہوں بے حد اچھا جا رہا ہے کسی کمی بیشی کی کوئی گنجائش نہیں ہر سلسلہ اپنی مثال آپ ہے تمام رائٹرز بہت ہی عمدہ لکھ رہی ہیں۔ ناولوں میں بھی تیزی آئی ہے۔ اداریے سے لے کر آخری صفحہ تک متاثر کن ہے۔ نزہت تمہارے لیے اور تمام اسٹاف کے لیے عذرا صاحبہ اور معراج صاحب کے لیے بہت ساری دعائیں۔ پاکیزہ روز افزوں ترقی کرے ایک فرمائش پوری کردو اپنا انٹرویو بھی کسی سے کروا ڈالو۔ تم بہت اچھے مزیدار تیکھے سوالات اٹھاتی ہو۔ اس مرتبہ سیما مناف کے جوابات بڑے بھرپور تھے، مزہ آ گیا۔ (اللہ پڑھنے والوں کو سلامت رکھے۔ بہت ساری تعریف کا شکریہ۔ دو کلو وزن جھٹ سے بڑھ گیا مسرت)

☒ فرح بھٹو سندھ۔ آپ کی کہانیاں جلد شائع ہوں گی، خوب اچھا موضوع چنا ہے۔

✉ افتخار شوق، میاں چنوں سے۔ ''نزہت آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگتا ہے۔ میں تو پاکیزہ ہاتھ میں آتے ہی ختم کرنے کی کرتی ہوں۔ مطلب کہ جلد سے جلد پڑھ لینا چاہتی ہوں مگر اسکول کی معروفیات اور سرکاری میٹنگز بھی چلتی رہتی ہیں۔ رسالہ ہاتھ سے نہیں چھوٹتا (واہ بھئی) سلسلے وار ناول تو آئے دن ہیں۔ رفعت سراج کی منظر نگاری اور کرداروں کا فکری تجزیہ بہت عمدہ ہے۔ ڈاکٹر ذکیہ اور اختر شجاعت تو ہماری آخرت سنوارنے کا انتظام کرتی ہیں اللہ جزائے خیر دے (آمین)۔ تمام بیمار بہنوں کی شفایابی کے لیے دعائیں ہیں۔ پاکیزہ تو ہمارا فیملی رسالہ ہے۔ میرے بھانجے بھتیجے تو انتظار میں رہتے ہیں۔ دسمبر کا شمارہ بہت اچھا رہا۔ تمام افسانے ناولٹ بہترین تھے۔ موسمِ سرما میں گرما گرم کہانیاں مزہ آ گیا۔ اللہ آپ کے تمام رائٹرز کی عمر اور

صلاحیتوں میں اضافہ ہو۔ ہاں سالِ نو کی مبارک باد بھی لے لیں۔ شائستہ زریں کا سروے بھی دلچسپ موضوع لیے ہوئے تھا۔ (بہت شکریہ افگار)

✿ شاہینہ مبارک، ہالہ سے۔ ''باجی پاکیزہ تو ہم سب کا پسندیدہ رسالہ ہے۔ آپ لوگ بہت محنت سے اسے سنوارتے ہیں۔ اس میں شامل تمام کہانیاں اور سلسلے ہمیں بے حد پسند ہیں۔ آپ بھی بہت محبت اور محنت سے محفل سجاتی ہیں۔ مجھے ناول بھی بہت پسند آرہے ہیں کافی تیزی آگئی ہے۔ حیا بخاری کا تو ابھی شروع ہوا ہے وہ بھی اچھا ہی ہوگا۔ (شکریہ چھولے سے تبصرے کا)

✿ صبا آصف خان، کراچی سے۔ ''پچھلے دنوں میری طبیعت کافی خراب رہی ابو کے انتقال کے بعد ابھی تک میری اور بہنوں کی حالت سنبھلی نہیں ظاہر ہے ماں، باپ ایسی ہستی ہوتے ہیں کہ جدائی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ آپ سب بھی انہیں دعاؤں میں یادر کھے ہوئے ہیں۔ بہت شکریہ۔ (ماں، باپ تو سب کے سانجھے ہوتے ہیں) دسمبر کا پاکیزہ حسین سرورق کے ساتھ دیکھ کر دیری کی ساری کوفت دور ہوگئی۔ سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے سنا، سنا اس لیے کہ کہنا، سنا ہی جاتا ہے۔ ایک، ایک لفظ دل میں اتر گیا خصوصاً یہ جملہ کہ یہ سال 2017ء کے ڈھلتے سورج کے ساتھ، ساتھ کیوں نہ ہم اپنے روحانی عیبوں، اخلاقی کمزوریوں اور شخصی برائیوں کو بھی رخصت کردیں کاش ایسا ہو جائے۔ رفعت سراج کا ناول ہمیشہ کی طرح شاندار رہا امرت بس بیچاری امرت اپنی ساس اور شوہر کے ہاتھوں دکھ اٹھا رہی ہے مگر زیبا اور حسنہ کے رویے میں تبدیلی کا محور امرت کا فوجی کیرئیر کا بھائی ہے۔ لگتا تو یہی ہے۔ شاہدہ ذاکر کا افسانہ جیون کہانی حقیقت پر مبنی ہے عموماً ایسا ہی ہوتا ہے خاص طور پر اپر کلاس میں بزرگ ایسے ہوجاتے ہیں سحر بیگم نے معافی تلافی کر تو دی بہت اچھا لگا۔ سارے افسانے شاندار، دل کو چھو گئے۔ ہما بیگ کا چاند کا داغ بھی کسی حد تک حقیقت پر مبنی تھا۔ بنت سحر خوب صورت ناولٹ کے ساتھ بہت عرصے بعد آئیں۔ زویا نے حسن کی محبت ٹھکرائے جانے کو زندگی کا روگ نہیں بنایا، نانی کا کردار بھی بہت مثبت تھا ہالہ احمد کا افسانہ ایسا بھی ہوتا ہے کسی حد تک حقیقت کے قریب تھا ہم سب سے خراب چیز ہی ضرورت مند کو دیتے ہیں وہ بھی احسان جتا کر مریم شہزاد کا غلطی بہت اچھا افسانہ تھا۔ شائستہ بیگم جیسی خواتین کم ہی ہوتی ہیں مگر ہوتی ضرور ہیں جبھی تو اس جہان کا توازن قائم ہے، کس، کس پر تبصرہ کروں ہر افسانہ ناولٹ کچھ نہ کچھ سبق سکھاتا ہوا ہے، سدرۃ المنتہیٰ کا ناول تیری چاہ سے اداس دسمبر کو کچھ اور اداس کر گیا لیکن اینڈ نے دل خوش کردیا۔ پورے کا پورا پاکیزہ ہی زبردست رہا۔ گوشۂ ظرافت کا تو کہنا ہی کیا تپتی دھوپ میں خوشگوار سایہ سا لگتا ہے۔ سیما مناف سے ملاقات بہت دلچسپ رہی آپ نے بھی خوب گھیر گھار کے سوال کیے لکھنے کو تو اور بھی بہت کچھ ہے مگر تبصرہ طویل ہوگیا ہے۔'' (ہاں وہ تو ہوگیا ہے مگر کبھی، کبھی ایک آدھ تبصرہ طویل ہو ہی جاتا ہے، نہایت باریک بینی سے پڑھنے کا شکریہ)

✿ آسیہ عامر، کراچی سے۔ ''باجی پاکیزہ مجھے بہت پسند ہے۔ یہ میری سہیلی ہے آپ لوگ بہت اچھی طرح بات کرتے ہیں۔ اس لیے بلاجھجک فون کر لیتی ہوں۔ آپ کے رسالے میں صفحے کے کونے پر کہانی کا نام لکھا ہوتا ہے یہ بہت اچھا کرتے ہیں آپ لوگ۔ میں تو رات سونے سے پہلے پاکیزہ ضرور پڑھتی ہوں۔ اس میں سب ہی کہانیاں اچھی ہوتی ہیں...... بہنوں کی محفل پڑھ کر مزہ آتا ہے اسی لیے میں بھی شامل ہونا چاہتی ہوں۔'' (بہت شکریہ آسیہ)

✿ سلمٰی غزل، کراچی سے۔ ''یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے۔ اس کے مصداق بہنوں کی محفل میں حاضری لگا رہی ہوں۔ شہرِ گل میں تمنا بہار کی...... غزالہ جلیل نے خوب لکھا۔ حیا بخاری کے ناولٹ کی بُنت اور اٹھان لاجواب لیکن سلسلہ وار دیکھ کر دل جل گیا۔ جیون کہانی، شاہدہ ذاکر نے بامقصد لکھا کاش حقیقت میں بھی ایسا ہو جائے۔ ہما بیگ نے خاندانی شادیوں کے نقصانات پر اچھا لکھا لیکن جانتے بوجھتے بھی لوگ عمل کم ہی کرتے ہیں ایک جگہ رہنے کی وجہ سے کزنز میں پسندیدگی پروان چڑھ جاتی ہے اور پھر ماں، باپ شادی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جو دھڑکا وہ دل تھا۔ بنت سحر نے خوب لکھا۔ لیکن ہالہ احمد تو چھا گئیں نباہ کر کے ایسا بھی ہوتا ہے۔ حقیقت سے بے حد قریب اور کوزے میں دریا کو بند کرنے والی کہانی۔ ہر گھر میں یہی حال ہے۔ مریم نے بھی غلطی لکھ کر حق ادا کردیا اور واقعی اس زمانے میں مجھے ایسا لگتا ہے کہ سا سیں زیادہ اچھی ہوگئی ہیں (سمجھا کریں آخر میں بھی تو ساس ہوں، دو بہوؤں کی) بشریٰ سیال نے بھی اچھا لکھا۔ (جی بالکل) عقیلہ حق، ہمیشہ تلخ سچ لکھتی ہیں مگر اس کہانی

کی سچائی حقیقت میں دکھ دے گئی حالانکہ اس کا اینڈ positive ہو سکتا تھا مگر پھر وہ حقیقت نہ ہوتا۔ کینسر کے موضوع پر شہلا جمال کا افسانہ بھی اچھا تھا مگر یہ بھی، حقیقت کہ جیتی جاگتی کبھی کوئی نہیں نکلتا، اور پھر کینسر کا تو نام ہی ڈرا دینے والا ہے۔ ویسے آپ کو اگر میری تجویز اچھی لگی ہو تو بہنوں کی رائے بھی لے لیں، اس طرح ایک دوسرے سے مل بیٹھنے کا موقع بھی ملے گا اور نہ ادارے پر بوجھ پڑے گا نہ انفرادی طور پر بہنوں پر یوں تو ہم ہزاروں روپے بیوٹی پارلر میک اپ اور کپڑوں پر بھی خرچ کر دیتے ہیں۔ اس لیے مل بیٹھنے کے بہانے پر تو خرچ کر ہی سکتے ہیں یہ میری ذاتی رائے ہے۔'' (سلمٰی مختصر تبصرے کا شکریہ۔ جی آپ نے گزشتہ ماہ تقریب کے حوالے سے یہ تجویز دی تھی کہ رائٹرز بھی کچھ contribution کردیں صرف ادارے پر بوجھ نہ پڑے تو یہ آپ کی ہمدردانہ اور پُرخلوص تجویز ہے مگر ادارے پر بھی تو سب کا ایک مان ہے۔ اپنے طور پر آپ لوگ جمع ہوں تو ٹھیک ہے مگر سالانہ گیٹ ٹو گیدر تو انشاء اللہ ادارے کی جانب سے ہی ہوگا جس کا تفصیلی ذکر عذرا صاحبہ نے بھی اپنی گفتگو میں کیا ہے۔)

✿ خدیجہ شہوار، پنجاب سے۔ '' میں کہانیاں لکھتی ہوں اور پاکیزہ میں دینا چاہ رہی ہوں۔ طریقۂ کار بتا دیں۔'' (خدیجہ آپ لائنوں والے صفحے پر ایک سطر چھوڑ کر اور صرف ...... صفحے کے ایک طرف پر لکھیں پہلی کہانی مختصر، پُراثر اور بامقصد ہو۔ کہانی کی ایک عدد فوٹو اسٹیٹ اپنے پاس رکھیں۔ اصل مسودہ ہمیں ارسال کردیں اور اپنا رابطہ نمبر بھی ضرور لکھیں)

✿ صائمہ سید، کراچی سے۔ ''سب سے پہلے عید ملن پارٹی کا احوال پڑھا خوشی ہوئی مگر تھوڑا سا افسوس بھی ہوا کہ ہم نہیں تھے۔ اب تھوڑا سا تبصرہ ابھی تک صرف بہنوں کی محفل اور شہناز وسیم کی بوجھ ہی پڑھ پائی ہوں، نہایت بہترین تحریر منفرد موضوع واقعی ہر اولاد کو ایسا ہی ہونا چاہیے، ویلڈن شہناز سب سے پہلے تو پیاری نگہت غفار کا تہہ دل سے شکریہ کہ جنہوں نے میرا نام لے کر میرے بھائی کو دعاؤں میں یاد رکھا خدا نگہت کی تمام دعاؤں کو شرفِ قبولیت بخشے، آمین...... نزہت آنٹی، انجم انصار اور تمام میری پاکیزہ بہنوں کی دعاؤں کے طفیل میرے بھائی کی بہترین جاب ہوگئی ہے۔'' (شکر الحمدللہ صائمہ، ایک مسلمان بھائی کا دوسرے پر حق ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں سب کو یاد رکھے۔)

✿ کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔ ''آپ کی معیت میں کاروانِ پاکیزہ خوب چل نکلا ہے۔ اس بار لکھاریوں سے مل کر خوشی ہوئی۔ سنبل ملک اعوان، عمرے کی روداد پڑھی۔ بہت مبارک ہو، ہماری بھی نند 19 کو جا رہی ہیں، کیا وہ بھی اپنی روداد شائع کرواسکتی ہے۔ (جی بالکل) تمام دینی سلسلے، پاکیزہ ڈائری کارنر، سروے کے علاوہ رفعت سراج کا ناول ہم ضرور پڑھتے ہیں۔ یہ محفل سدا سلامت رہے۔ غمزدوں کو حوصلہ اور خوش باشوں کو مبارک باد، اللہ حافظ و ناصر......'' (اللہ آپ کو بھی صحت سے رکھے)

✿ نگینہ ضیا بخش، کیماڑی، کراچی سے۔ ''نومبر کا پاکیزہ بے حد پسند آیا کیونکہ ساری تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے بہت کچھ اچھا لکھا۔ دین کی باتوں سے روح کو سراب کیا، ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی صاحبہ اللہ اور اس کا نور سے فیضیاب ہوئے، جزاک اللہ...... زورِ قلم اور زیادہ سلسلے وار ناولز بڑی خوب صورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں، شہناز وسیم کا بوجھ، رفاقت جاوید کی فصلِ محبت، ریحانہ آفتاب، نکلے جو قدم سبق آموز تحریریں ہیں، دشمن، ہاجرہ ریحان، بلاعنوان، ام ایمان، خواب گزیدہ دردانہ نوشین، اکو کی شادی، شمیم فضل خالق، بس اتنی سی بات، ناہید چوہدری خصوصی طور پر پسند آئی۔ شمع ہدایت، اختر شجاعت صاحبہ آپ کے ہاتھ چومنے کو دل کرتا ہے اللہ پاک آپ کو اس کارِ خیر کی جزا دے، آمین۔ احوالِ تقریب زبردست رخ چوہدری کے قلم سے۔ واہ کیا بات ہے اور بہت، بہت شکریہ کہ آپ نے مجھ ناچیز کو بھی یاد رکھا خوش رہیں، باقی سب مستقل سلسلے اے ون ہیں، شائستہ زریں بہت محنت سے کام کررہی ہیں، اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ شائستہ ویری ویل ڈن ہر سروے ایک سے بڑھ کر ایک ہوتا ہے، آپ کا شکریہ کہ دسمبر میں مجھے بھی شامل کیا۔ میری پُرخلوص دعائیں آپ کے عذرا باجی معراج صاحب اور پاکیزہ کے پورے اسٹاف کے ساتھ ہیں اللہ پاک آپ سب کو صحت و تندرستی کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے، آمین۔'' (دعاؤں کے لیے جزاک اللہ نگینہ اور آپ کی اور ہماری طرف سے میڈم شاہینہ شیخ کو سالِ نو کی خصوصی مبارک باد اور دعائیں)

✿ ثمینہ کوکب، ضلع جہلم سے۔ ''حسبِ معمول اس ماہ کا پاکیزہ نمبرون ہے، دین کی باتیں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسم گرامی سیدنا رسول اپنے معنی و فضائل کے اعتبار سے بہت گہرا اثر چھوڑ گیا۔ ذکیہ بلگرامی صاحبہ کا اللہ اور اس کا نور تو

ہر طرح سے بے مثال ولاجواب ہے، اختر شجاعت صاحبہ کا مضمون حُبِ دنیا ہم جیسے دین دار لوگوں کے لیے ایک سبق آموز دل کی دنیا کو روشن کرنے والی تحریر ہے۔ تمام بیمار بہنوں کی صحتِ کاملہ کے لیے بارگاہِ الٰہی میں دعا کے لیے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں، درخ چوہدری صاحبہ کے احوال کلیوں کی مہک کا نے ہر طرف اپنی مہک پھیلا دی ہے۔ حسبِ معمول تمام ناولز اور افسانے بہترین ہیں۔" (مختصر تبصرے کا شکریہ)

★ نازنین آفریدی، پشاور سے۔ "بہنوں کی محفل سے آغاز کیا۔ پاکیزہ کی یہ فیس بک تو بہت ہی زبردست ہے، آپ نے تجاویز مانگیں تو ماضی سے متعلق بھی اگر کچھ معلومات عظیم شخصیات کی سوانح عمری، ان کے کارہائے نمایاں اور دوسری چیزوں سے متعلق بھی دیے جانے کا کوئی سلسلہ رکھا جائے۔ سرورے اچھا رہا۔ شمع ہدایت بہت زبردست...... رائٹرز ریڈرز کی تقریب کا احوال پڑھ کر خوشی ہوئی، کاش ہم بھی حصہ بن سکتے۔" (آپ بھی تو شامل ہی ہیں ناں) "یہ کہاں پہنچیں کہ دل ہے اور امرت زبردست جا رہے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا...ختم ہوا، اینڈ اچھا تھا مگر بے جا طوالت دو یا تین اقساط میں بھی لکھا جاسکتا تھا۔ بوجھ نکلے جو قدم اکو کی شادی، دیا جلتا رہا، بہت اچھے رہے، محبت زادِ راہ، آخر میں ایسا اکثر ہی ہوتا ہے۔ پردیسیوں کی لاشیں ہی آتی دیکھی ہیں، خواب گزیدہ کی جانے کیوں سمجھ نہیں آسکی۔ فصل محبت بس مناسب تھا۔ بلاعنوان کے بارے میں کیا کہوں...... ایسی عورتوں کا حشر نشر ہوتے بہت دفعہ دکھایا جاچکا ہے سو معذرت کے ساتھ کافی پرانا موضوع ہوگیا اب (ہر زمانے کے لیے سبق تو دینا پڑتا ہے ناں) عورت کتھا، سقوطِ انا اور سرِ دیوار لکھتا ہوں بھی اچھی کاوش رہیں، منتخب غزلیں کے لیے کبھی ابن انشا کو بھی منتخب کیجیے (جی ضرور) اللہ اور اس کا نور اس بار معلوماتی رہا۔ آنٹی مذہب سے متعلق کوئی سلسلہ میرا مطلب ہے شرعی مسائل پوچھنے کے لیے بھی اگر دو ماہ بعد سہی یا کبھی کبھار کوئی سلسلہ شروع کیا جائے۔ جیسے ہم عورتیں کسی مفتی مولوی سے کوئی مسئلہ پوچھنے ان کے پاس نہیں جاسکتیں تو جب بہنوں کے خطوط کی تعداد اچھی خاصی ہوجایا کرے اس ضمن میں تب ان کے جوابات لگا دیا کریں۔ مع سوال تاکہ سب کی راہنمائی ہوسکے تو کیا خیال ہے۔ یہ میری ایک تجویز ہے۔ آپ کا متفق ہونا ضروری نہیں (اس کے لیے اخبار اور ٹی وی پروگرام کافی کام کررہے ہیں) عمیرہ احمد نے کافی پہلے اپنا ایک اور ناول پاکیزہ کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ کب آرہا ہے؟ (انشاء اللہ بہت جلد، نازنین آپ کی نگارشات ردی کی ٹوکری میں نہیں جاتیں، ہم وقتاً فوقتاً دیتے رہتے ہیں)

★ نسرین اختر نینا، لاہور سے۔ "بچپن سے پاکیزہ پڑھ رہے ہیں، کوشش کررہی ہوں کہ پاکیزہ کے لیے بھی ضرور لکھوں اور وہ سب کو پسند بھی آئے۔ مجھے تو پاکیزہ بہت پسند ہے، اس میں کہانی آنا میرے لیے اعزاز ہے۔" (جی ضرور لکھیں مگر بہت مطالعہ کرکے)

پاکیزہ کے پیارے راج دلارے پڑھنے والو! اب اس ماہ کی محفل کے اختتام کا وقت آگیا ہے۔ لہٰذا اگلے ماہ تک کے لیے اجازت چاہیں گے۔ نئے سال میں نئی امنگوں، نئی امیدوں اور نئی خواہشوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی دعائیں اور اس سب میں اپنے پیاروں اور تمام اہلِ وطن کو بھی ضرور یاد رکھیں۔ وقت اور صحت نے مہلت دی تو آپ سب کے مشوروں سے مزید بہتر محفل سجائیں گے۔ ربِ کائنات کے حضور دعاگو ہیں کہ یہ نیا سال ہم سب کے لیے، عالمِ اسلام کے لیے اور پیارے اہلِ وطن کے لیے اسلامی تعلیمات واحکامات کے مطابق کامیابیوں اور کامرانیوں کا سال ہو۔

پروردگارِ عالم ہمیں راہِ ہدایت پر چلا، اپنی عطا اپنے کرم اپنے جود وسخا کو ہم پر جاری وساری رکھ اور ہمارا خاتمہ بالخیر ہو، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے تو ہی علیم ہے، حکیم ہے، خبیر ہے۔

آپ کی خیر خواہ
نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,118



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

دعائیہ کلام

میرے مولا میرے حرفوں کو شناسائی دے
میرے عرفاں کو گہرائی و گیرائی دے
جس طرح پھول گلستاں کو سجاتے آئے
اس طرح شعر کو میرے بھی پزیرائی دے
میری اس دل کی تمنا ہے فقط اتنی سی
میرے افکار کو مالک مرے رعنائی دے
یہ نہ بھٹکیں کہیں بے راہ مسافر کی طرح
میرے الفاظ کو دانائی و بینائی دے
مجھ کو سوغات محبت کی عطا ہو یارب
میرے کردار کو، گفتار کو رعنائی دے
ہاتھ پھیلائے تیرے در پہ کنول بیٹھی ہے
اس کو کچھ اور نہ دے جوشِ توانائی دے

عقیدت گزار: یاسمین کنول، پسرور

نذرانۂ عقیدت بحضور سید کونینؐ

درِ حبیبؐ پہ جھک کر سلام کرتے ہیں
مرا شمار بھی ہوتا ہے ان غلاموں میں
شفاعت ان کی مجھے بھی نصیب ہو یارب
جو روزِ حشر کھڑی ہوں گی ان قطاروں میں
جو بے شمار درود و سلام پڑھتے ہیں
مرا سلام بھی شامل ہو ان سلاموں میں
خوشا نصیب جہاں جس سے فیضیاب ہوا
اذاں جو گونجی ہے مکہ کے ریگ زاروں میں
وہ اپنے ہاتھ سے کوثر پلائیں گے مجھ کو
میں بے قرار کھڑی ہوں نبیؐ کے پیاروں میں

کاوش: فریدہ افتخار، اسلام آباد

فکرِ آخرت

☆ اپنی آخرت کی فکر خود کرو۔ سخاوت سے، رحم دلی سے اور اللہ کے ذکر سے، آج زندہ کو کوئی نہیں پوچھتا...... کل مٹی کے ڈھیر کو کون پوچھے گا۔

☆ زندگی ضرورت کی طرح گزارو، خواہش کی طرح نہیں کیونکہ ضرورت فقیر کی بھی پوری ہوجاتی ہے...... لیکن خواہش بادشاہ کی بھی پوری نہیں ہوتی۔

☆ عزت اور رزق کا انحصار صرف رب کی مہربانی اور عطا پر ہے۔ اللہ کی مخلوق پر مہربانی کرتے رہو تاکہ اللہ آپ پر مہربان رہے۔

از: مہرین ضیا بخش، کراچی

دعا

میرے رب داج فضل ہووے
لہلہاندی نیکیاں دی فصل ہووے
رب نال کراں دعاواں میں
محمدیؐ میری نسل ہووے
ڈورے ہوں اکھیاں وچ غلاف کعبہ دے
آبِ زم، زم دے نال غسل ہووے
بیڑا لگ جائے پار یاسمین دا
بقیع دی مٹی میرا کفن ہووے

شاعرہ: یاسمین اقبال، لاہور

غم

غم اس لیے نہیں ہوتے کہ ان کو اپنے چہرے پر سجالو بلکہ یہ تو دل میں بسانے کے لیے ہوتے ہیں۔ غم تو سب کی زندگی میں آتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی تو غم کا اظہار کرتا ہے اور کوئی خود اپنے غم میں چپ

چاپ رہتا ہے۔ یہ عقل مندی ہے کہ اپنے غم میں کسی کو شامل نہ کرو، اگر ایسا کرو گے تو تمہارے دوست تم سے جلد بیزار ہو جائیں گے اور اگر غموں کو چہرے پر سجاؤ گے تو خود کمزور پڑ جاؤ گے۔

یاد رکھو! یہ بھاگتی دوڑتی دنیا ہے، یہاں آنسوؤں کا ساتھ کوئی نہیں دیتا، خود کو آنسو نہ بناؤ بلکہ سرتاپا ایک مسکراہٹ بن جاؤ، نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے۔ آنسو بہاؤ اور خوب بہاؤ یہ سوچ کر نہیں کہ کاش ہماری خواہشات پوری ہوتیں بلکہ یہ سوچ کر کہ ہم بہت زیادہ گناہ گار ہیں، ہوسکتا ہے کہ گناہوں کے ملال سے نکلا کوئی آنسو ہماری مغفرت کا سبب بن جائے۔ اور ہماری آخرت سنور جائے۔

از: نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

سردیوں کے موسم میں

اور کتنی دیر ہے
جان کو جلانے میں
سردیوں کے چاند تم
مجھ کو زہر لگتے ہو
چھپ کیوں نہیں جاتے
کسی کے سرد آنچل میں
مجھے کہ سرد موسم میں
بالکل تنہا رہنا ہے
اک تمہارے ساتھ سے
ممکن نہیں ہے اب یہ بھی
سو بس یہی گزارش ہے
کہ اب کے سردیوں میں تم
کوئی بدلی اوڑھ سو جانا
کہ مجھ کو تنہا رہنا ہے
سردیوں کے موسم میں

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

غزل

اکثر اپنے کام کی باتیں کرتا تھا
دن میں بھی وہ شام کی باتیں کرتا تھا
اپنوں نے کچھ زخم دیے تھے یادوں کے
کون تھا جو الزام کی باتیں کرتا تھا
اس کی قسمت میں کانٹے ہی لکھے تھے
ہر اک سے گلفام کی باتیں کرتا تھا
شاید اسے تیرا گھر ہی یاد رہا
اور وہ تیرے بام کی باتیں کرتا تھا
عشق تھا اس کو یار فریدہ فری سے
وہ رنج و آلام کی باتیں کرتا تھا

کلام: فریدہ فری، لاہور

لاٹھی

ایک آدمی گھبرایا ہوا پولیس اسٹیشن پر آیا اور انسپکٹر سے بولا۔ ''مجھے گرفتار کر لیجیے میں نے اپنی بیوی کے سر پر لاٹھی ماری ہے۔''

انسپکٹر نے پوچھا۔ ''کیا وہ مر گئی ہے؟'' وہ آدمی کانپتے ہوئے بولا۔ ''نہیں! بلکہ وہی لاٹھی لے کر وہ میرے پیچھے آ رہی ہے۔''

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

بیڑا غرق

شوہر: ''ہیلو سویٹ ہارٹ آئی مس یو یار۔ بس ابھی پندرہ منٹ میں تمہارے پاس آ رہا ہوں، بتاؤ پکوڑے لاؤں یا جلیبی؟''

بیوی: ''خبیث انسان، ابھی آدھا گھنٹہ پہلے تم مجھ سے لڑ کر گالیاں دیتے ہوئے گھر سے گئے۔ اب اتنا پیار آ رہا ہے؟''

شوہر: ''اوئے تیرا بیڑا غرق پھر تیرا نمبر مل گیا۔''

مرسلہ: رابعہ شبیر، راول پنڈی

غزل

بے سبب پیار میں کمی پہ نہ آ
اے مرے دوست! دشمنی پہ نہ آ
رہ روِ عشق! کچھ ڈگر کا خیال
اتنی دور آ کے کج روی پہ نہ آ

ہم نشیں! حرمتِ سخن تک رہ
اس میں امکان بے زری پہ نہ آ
چشمِ مغرور اختیار پلٹ دیکھ
یوں میری بے بسی پہ نہ آ
دلبرِ شوخ! دلبری پہ رک
آتے، آتے تو دل لگی پہ نہ آ
کیا خبر کل کدھر چلا جائے۔ دلِ
بس مری مان، اجنبی پہ نہ آ
دلبرا! دل میں کچھ قیام ذرا
مطربا! سازِ رخصتی پہ نہ آ
جانِ آشفتہ طوالتِ ہجر
بے قراری سے بے دلی پہ نہ آ
حرف رکھنا ہے تو مجھی پر رکھ
نکتہ چیں! میری شاعری پہ نہ آ

کلام: میجر شہزاد نیر
پسند: ماہ نور خان، بہارہ کہو

بھیگی یادیں

آج یاد، بہت تم آئے ہو
آج ہلکی، ہلکی بارش تھی
آج سرد ہوا کا رقص بھی تھا
آج پھول بھی بکھرے بکھرے تھے
آج ان میں تیرا عکس بھی تھا
آج بادل کالے گہرے تھے
آج چاند پہ لاکھوں پہرے تھے
اور تذکرے تری یادوں کے
بڑی دیر سے دل میں ٹھہرے تھے
جو کہنا تھا وہ کہہ نہ سکے
جو سننا تھا وہ سن نہ سکے
یوں لگتا ہے آج دل میں مرے
بس تم ہی تم سمائے ہو
آج یاد بہت تم آئے ہو

از: مسز یٰسین، لیہ

غور کیجیے

☆ ساس، نندوں، شوہر کے ماتھے کے بل سیدھے کرتے، کرتے، بہو کے اپنے کس بل نکل جاتے ہیں۔

☆ دل کا آئینہ صاف و شفاف رکھیے، یہ میلا ہو تو دوسروں کے شفاف چہرے بھی میلے، دھندلے نظر آتے ہیں۔

جال

جال بہت سنہرے ہیں
ناداں پنچھی پھنس گئے آخر

خیال: فریدہ افتخار، اسلام آباد

وزیر صحت

ایک ان پڑھ ایم پی اے کو وزیر صحت بنا دیا گیا۔ وزیر بنتے ہی اس نے میڈیا کے ساتھ سرکاری اسپتال پر چھاپا مارا، وارڈ میں دو مریضوں کو آکسیجن لگی ہوئی تھی جبکہ تیسرے مریض کو نہیں لگی ہوئی تھی۔

وزیر صحت نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''دو مریضوں کو سی این جی لگی ہوئی ہے۔ تیسرے کو کیوں نہیں لگائی؟''
ڈاکٹر نے معنی خیز نظروں سے وزیر کو دیکھا اور پھر ڈرپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''سر یہ مریض پٹرول پر چل رہا ہے۔''

مرسلہ: نازنین آفریدی، پشاور

نصیب

کیا خوشیاں کسی، کسی کا نصیب ہیں
کیا غم ہی ہیں نصیب سب کا
میں تو خیر محبتوں کی ماری تھی
وہ کب رہا سب کا
مری تنہائیوں نے مجھ سے آ کر کہا تھا
جو اپنے ساتھ نہیں، وہ نہیں سب کا
کسی، کسی کو محبتیں بھی مل جاتی ہیں
دکھ، درد ہوتا نہیں نصیب سب کا
یہ سب مقدروں کی بات ہے

ایک سا نصیب ہوتا نہیں سب کا

از: فائزہ فاروق، لاہور

مجھ سے ملیے

میرا نام زریں فاطمہ ہے، میرا تعلق کشمیر سے ہے۔ رہتی کراچی میں ہوں۔ میں نے میٹرک سائنس میں کیا اور انٹر کامرس میں...... اب گریجویشن پولیٹکل سائنس اور ہسٹری میں کر رہی ہوں۔ آج کل پڑھنے کے ساتھ، ساتھ ایک اسکول میں ناینتھ کو انگلش بھی پڑھا رہی ہوں۔ انگلش میرا فیورٹ سبجیکٹ ہے۔ انگلش لرننگ کا کورس بھی کر رکھا ہے۔ میرا ایئر آف برتھ 1998 ہے۔ میری فرسٹ کزن بھی رائٹر ہیں۔ وہ بچوں کے میگزین میں بھی لکھتی ہیں۔ جبکہ ایک کزن رائٹر، شاعرہ اور کالم نگار بھی ہے۔

پاکیزہ پڑھتے ہوئے مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ یہاں کی رائٹرز اور اسٹاف سب اے ون ہیں۔ مجھے مطالعہ کرنا اچھا لگتا ہے۔ انشاء اللہ پاکیزہ سے ساتھ جڑا رہے گا...... مجھے پاکیزہ نام بہت اٹریکٹ کرتا ہے۔ پاکیزہ تم جیو ہزاروں سال......

خود کی تلاش

وقت جس رفتار سے دوڑ رہا ہے اس رفتار سے انسان کی زندگی بھی گزر رہی ہے اور انسان وقت کی اسی دوڑ میں اس قدر دوڑ رہا ہے کہ وہ اپنا آپ بھول چکا ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں وہ ایک پل کے لیے بھی اپنے آپ سے مخاطب نہیں ہوتا۔ اپنے آپ سے بات نہیں کرتا بلکہ ہر وقت دوڑتا ہی رہتا ہے۔ صبح شام کی اسی دوڑ میں وہ زندگی ہار بیٹھتا ہے۔ انسان کا سب سے ہمدرد دوست اس کا ضمیر ہے۔ انسان کو چند پل دن میں اپنے ضمیر سے باتیں ضرور کرنی چاہئیں۔

وہی اس کی اصلاح کرے گا کہ انسان جس راستے پر گزر رہا ہے وہ صحیح ہے یا غلط مگر افسوس زندگی کی اس دوڑ میں ہم اپنا آپ بھول بیٹھتے ہیں۔ انسان کو اپنے اندر جھانک کر سوچنا چاہیے کہ وہ کیا ہے؟ اور وہ کیوں ہے؟

دنیا میں انسان کا کام پیدا ہونا، زندگی کے دنوں کی گنتی پوری کرنا اور پھر مرنا نہیں بلکہ انسان کو رب نے زندگی کے بھیس میں ایک ایسا تحفہ دیا ہے جس کی انسان کو قدر کرنی چاہیے اور زندگی کے اک، اک پل کو صحیح استعمال کرنا چاہیے، یہی وہ موقع ہے جس سے انسان رب کی بندگی کر کے رب کے پیار کو پا سکتا ہے۔

اپنے اندر جھانک کر انسان کو اپنے آپ کو ڈھونڈنا چاہیے کیونکہ باہر کی دنیا میں انسان کھو کر اپنی حقیقت بھول چکا ہے۔

مرسلہ نگار: جبیں نیاز، ملتان

روز کا چکر

از دواجی جھگڑے!
دودھ میں ابال کے مانند
غصہ آیا!
ٹھنڈا ہو گیا
شام کو میاں بیوی نے
ایک ہی گھر میں جانا ہے
جھگڑے کو بھلانا ہے
بچوں کو بہلانا ہے
کھانا بھی پکانا ہے

شاعرہ: افتخار شوق

پسند: مس فاخرہ، میاں چنوں

بہت خوب

اللہ تعالیٰ ٹوٹی ہوئی چیزوں کو بھی بہت خوب صورتی سے استعمال کرتے ہیں۔

☆ بادلوں کے ٹوٹنے پر بارش۔

☆ زمین کے ٹوٹنے (ہل چلانے سے) پر فصل۔

☆ فصل کی کٹائی سے بیج اور......

☆ ٹوٹے ہوئے بیج خوراک بنتے ہیں۔

☆ مشکل میں جب بھی آپ کو لگے آپ کا دل ٹوٹ چکا ہے تو سمجھ جائیں اللہ تعالیٰ آپ کو کسی نوبل پرائز کے لیے تیار کرنا چاہتے ہیں۔

از: فریحہ شبیر، شاہ کلدر

نئے سال کی آمد پر

نئے سال کی آمد پر
پیارے پڑھنے والو
آپ کو نیا سال 2018 مبارک ہو
خدا کرے یہ پچھلے سال سے بہتر ہو
ہم سب کو خوشیاں دے اور بلاؤں سے دور رکھے
خدا کرے ہمارے حالات بدلیں، ہمیں مشکلات سے نجات ملے۔
اور ہمارا پاکستان قائد اعظم کے خوابوں کی تعبیر بن جائے
الٰہی آمین......

نتیجہ پھر وہی ہوگا سنا ہے سال بدلے گا
پرندے پھر وہی ہوں گے شکاری جال بدلے گا
بدلنا ہے تو دن بدلو بدلتے کیوں ہو ہندسے کو
مہینے پھر وہی ہوں گے سنا ہے سال بدلے گا
چلو ہم مان لیتے ہیں مہینہ ساٹھ سالوں کا
بتاؤ کتنے سالوں میں ہمارا حال بدلے گا

از: سعدیہ بشیر، اسلام آباد

اسے کہنا

اسے کہنا!
مکمل کچھ نہیں ہوتا
ملن بھی نامکمل ہے
جدائی بھی ادھوری ہے
یہاں اک موت پوری ہے
اسے کہنا!
اداسی جب رگوں میں
خون کے مانند اترتی ہے
بہت نقصان کرتی ہے
اسے کہنا!
بساطِ عشق پر جب مات ہوتی ہے
دکھوں کے شہر میں جب رات ہوتی ہے
تو مکمل بس
خدا کی ذات ہوتی ہے

انتخاب: اقصیٰ امجد، گرین ٹاؤن، لاہور

نئے سال پر

زندگی اے زندگی
کاش تو نئے سال کی طرح ہوتی
ہر سال ختم ہوتی ہر سال شروع ہوتی
خزاں کے بعد بہار آتی
اور نئے گلوں کے کھلنے کی نوید لاتی
آرزوؤں اور امیدوں کے دیپ جلاتی
زندگی اے زندگی کاش تو نیا سال ہوتی

از: صائمہ سید، کراچی

اقوالِ حکما

☆ جو علم کو دنیا کمانے کے لیے حاصل کرتا ہے وہ اس کے قلب میں جگہ نہیں پاتا۔

☆ جب تک کوئی تمہیں سامنے سے نہ پکارے جواب مت دو کیونکہ پیچھے سے جانوروں کو پکارنا مخصوص ہے۔

☆ اے بیٹے زیادہ مت بول جو زیادہ بولتا ہے اس کی خطائیں بڑھ جاتی ہیں جس کی خطائیں بڑھ جائیں اس کی شرم کم ہو جاتی ہے اور جس کی شرم کم ہو جاتی ہے اس کا ایمان جاتا رہتا ہے جس کا ایمان نہ ہو وہ جہنم داخل ہوا۔

☆ فقیر کو صدقہ دے کر احسان نہ جتلاؤ بلکہ اس کے قبول کرنے کا خود احسان مند ہو۔

☆ گری ہوئی چیز کا بغیر اطلاع قبضے میں کر لینا لوٹنے کے مانند ہے۔

☆ خالی پیٹ شیطان کا قید خانہ...... اور بھرا ہوا پیٹ اس کا اکھاڑا ہے۔

☆ ان کے سر پر افلاس، مرض، موت نہ ہوتی تو وہ خدا کے حضور سجدہ ریز ہونے میں اور کوتاہیاں کرتے۔

☆ نماز میں قلب کی اور مسجد میں زبان کی حفاظت کر۔

مرسلہ: نگہت غفار، کراچی



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆ غزالہ طارق......سرگودھا
بہتر ہے اسے گھر کے کسی طاق میں رکھ دو
ٹوٹا ہوا دل لے کے کہاں جانے لگے ہو
آشوبِ نظر سے بھی پھڑکتی ہے کبھی آنکھ
تم یہ نہ سمجھنا اسے یاد آنے لگے ہو

☆ نازنین آفریدی......پشاور
فتور ہوتا ہے ہر عمر میں جدا، جدا
کھلونے، عشق، پیسہ اور پھر خدا، خدا

☆ پروین افضل شاہین......بہاول نگر
نہ لوٹے گا کوئی محنت کسی کی
ملے گی سب کو دولت زندگی کی
نہ جائیں گی ہمارا خوں مشینیں
بنے گی رشکِ جنت یہ زمینیں

☆ عروبہ ناز......کوٹلی
میں گرا تھا تو بہت لوگ رکے تھے لیکن
سوچتا یہ ہوں کہ آئے تھے اٹھانے کتنے
بھیڑ لگ جاتی ہے جلتے ہوئے گھر کے آگے
لوگ آتے ہیں مگر آگ بجھانے کتنے

☆ سیدہ حیا عباس......تلہ گنگ
اس نے بھی بے دلی سے کیا تھا مجھے سلام
میں نے بھی حال پوچھ کے حجت تمام کی

☆ امبر نوشین......گوجرانوالہ
مجھے سمجھاؤ گے ٹھوکر کا مطلب
میں اک عرصے تلک پتھر رہا ہوں

☆ امینہ مشیر......نئی دہلی
دستِ تقدیر میں ہر شخص نے حصہ پایا
میرے حصے میں تیرے ساتھ کی حسرت آئی

☆ نگہت اعوان......سرگودھا
تم قیامت بھی اٹھاؤ گے تو ہوگا نہیں کچھ
ہم صرف آنکھ اٹھائیں گے تو چھا جائیں گے

☆ شازیہ ہاشم میوانی......کھڈیاں قصور
خدا تجھ کو شعورِ امتیازِ حق و باطل دے
نظر جلوؤں کی طالب دے جبیں سجدوں پہ مائل دے

☆ ثمینہ کوکب......جہلم
شہرِ احساس میں پتھراؤ بہت ہے محسن
دل کو شیشوں کے جھروکوں میں سجایا نہ کرو

☆ کوثر خالد......جڑانوالہ
بہت اداس نہ ہو شام بے چراغ کہ ہم
سحر کی روشنیاں چشمِ تر میں رکھتے ہیں
ہمارے سچ کی گواہی پہ انگلیاں نہ اٹھا
یہی تو عیب ہم اپنے ہنر میں رکھتے ہیں

☆ شمع حسن......فیصل آباد
اندھیرے سے لڑائی کا یہی احسن طریقہ ہے
تمہاری دسترس میں جو دیا ہو وہ جلا دینا

☆ ناظمہ شاہین اعوان......واہ کینٹ
ممکن جو اگر ہوتا ہم تم کو بھلا دیتے
یادوں کو کفن دے کر بے وقت سلا دیتے
تنہائی میں جی لیتے تم کو نہ صدا دیتے
اس دل سے اس دل تک دیوار اٹھا دیتے

☆ رابعہ شبیر......مورگاہ راولپنڈی
تیری آمد کے یہ دیتے ہیں اشارے کتنے
میرے ہمدرد ہیں دیکھو تو ستارے کتنے
دیکھنا خود کو ہے تو لے لو ہماری آنکھیں
تم کو معلوم ہے کیا تم ہو پیارے کتنے

☆ ساجدہ ظفر......کمالیہ
سالِ نو میں ایک ایسی بارش ہو میرے شہر پہ جو
سارے دل، سارے دریچے دھو ڈالے

☆ کوثر نایاب......ٹوبہ ٹیک سنگھ
وفا سرشت تھے وقفِ ملال ہم بھی ہوئے
تیرے خیال میں خواب و خیال ہم بھی ہوئے
چلے تھے ہم بھی سفر پر کسی ستارے کی سمت
سو خاکِ رہ گزر، ماہ و سال ہم بھی ہوئے

☆ ایمن رانی......کمالیہ
گو کہ تم بہت دور بس رہے ہو مگر
ان ہواؤں پہ اعتبار کرلینا
نئے سال کی ابتدا ہے جانِ جاناں
تھوڑی دیر ہم کو بھی یاد کرلینا

☆ نغمہ بتول......بھارہ کہو
کھیتوں میں پھر سرسوں کی رُت آ پہنچی
آج تمہیں دیکھے پھر ایک سال ہوا

☆ ایلیا شیراز......لاہور
ملے گا پھر کبھی اس وہم سے نکال گیا
وہ شخص اب کے یہ اندازِ ماہ و سال گیا

☆ حمنیٰ قندیل......کمالیہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ
محبت ہی محبت کاشت اب کے سال کرتے ہیں
چلو پھر آنے والی رت کا استقبال کرتے ہیں

☆ آمنہ فاروق......ضلع چکوال
میں نے کہا کب سپنوں میں بھی شکل نہ مجھ کو دکھائی
اس نے کہا بھلا مجھ بن تجھ کو نیند ہی کیسے آئی

☆ ارم خان......ڈیرا غازی خان
ہوتی جو رہ و رسم بڑے لوگوں سے اس کی
فنکار آج کا یونہی گم نام نہ ہوتا

☆ یاسمین کنول......پسرور
سبزہ و گل سے مرا اک مالک
ساری دھرتی کو سجانے والا
میرے اللہ تیری حمد و ثنا
کیا کرے شعر بنانے والا

☆ سعیدہ بانو......مری
وہ اتفاق سے مل جائے کہیں رستے میں
بس اسی آس نے آوارہ بنا رکھا ہے

☆ رابعہ یاسمین......راولپنڈی
اب بھی الزامِ محبت ہے ہمارے سر پر
اب تو بنتی بھی نہیں یار، ہماری اس کی

☆ فرح طاہر......ملتان
بات کیا ہے کہ بات بھی ہم سے
آپ کو دیکھ کر نہیں ہوتی

☆ بتول رضا......جرمنی
اس نے تب، تب نہیں سنا مجھ کو
میں نے جب، جب کہا محبت ہے

☆ جبیں ناز......ملتان
خواب لفظوں میں ڈھل نہیں سکتے
کاش آنکھیں پڑھا کرے کوئی

☆ زرینہ خان......بھارہ کہو
عکس، عکس گماں، گماں خیال سارے مسترد
تو نہیں تو کچھ نہیں، سارے سہارے مسترد

☆ شہلا محمود......واہ کینٹ
تمام جذبوں سے معتبر ہے
اداس آنکھوں سے مسکرانا

☆ مسرت پرویز......کراچی
تو میرے شوقِ ملاقات پہ تنقید نہ کر
اچھے لگتے ہیں مجھے تیری شباہت والے

☆ ماریہ......میرپور خاص
متاعِ زیست میں شامل رہے ہزاروں رفیق
وہ جس کی چاہ تھی دل کو وہی مگر نہ ملا

☆ ماہا خان......نوشہرہ
کبھی حیات کی ضامن کبھی وسیلۂ مرگ
نگاہِ یار تیرا کوئی اعتبار نہیں

☆ حنا اقبال......کراچی
اس نے قد کاٹھ نکالا ہے زمانے میں بہت
وہ مگر سوچ کا بونا ہے یہی رونا ہے

منتخب غزلیں

طنزومزاح کے پیرائے میں کی گئی شاعری میں ہمیں چند ہی نام ملتے ہیں جن میں دلاور فگار کا نام بے حد نمایاں ہے۔ اردگرد کے مسائل کو مزاح کے پیرائے میں اجاگر کرنا انہی کے فن کا کمال ہے۔ ماہ جنوری اس مقبول شاعر کا ماہِ وفات ہے۔ اسی کی مناسبت سے۔ ان کی شاعری آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر۔۔۔

یارب مرے نصیب میں اکلِ حلال ہو
کھانے کو قورمہ ہو کھلانے کو دال ہو

لے کر برات کون سپر ہائی وے پہ جائے
ایسی بھی کیا خوشی کہ سڑک پہ وصال ہو

جلدی میں منہ سے لفظ جمالو نکل گیا
کہنا یہ چاہتا تھا کہ تم مہ جمال ہو

عورت کو چاہیے کہ عدالت کا رخ کرے
جب آدمی کو صرف خدا کا خیال ہو

اِک بار ہم بھی راہنما بن کے دیکھ لیں
پھر اس کے بعد قوم کا جو کچھ بھی حال ہو

ہم تو کسی سے بھیک نہیں مانگتے فگار
لیکن اگر فقیر کی صورت سوال ہو

زہر بیمار کو مُردے کو دوا دی جائے
ہے یہی رسم تو یہ رسم اٹھا دی جائے

وصل کی رات جو محبوب کہے گڈ نائٹ
قاعدہ یہ ہے کہ انگلش میں دعا دی جائے

آج جلسے ہیں بہت شہر میں لیڈر کم ہیں
احتیاطاً مجھے تقریر رٹا دی جائے

مار کھانے سے مجھے عار نہیں ہے لیکن
پِٹ چکوں میں تو کوئی وجہ بتا دی جائے

میری وحشت کی خبر گھر کو ہوئی ہے جب سے
چھت یہ کہتی ہے کہ دیوار ہٹا دی جائے

بس میں بیٹھی ہے مرے پاس جو اِک زہرہ جبیں
مرد لگے گی اگر زلف منڈا دی جائے

08 جولائی 1929ء تا 25 جنوری 1998ء

خوش ذائقہ
پاکیزہ بہنیں

انگلش فرائیڈ فش

اشیا﴿ مچھلی، بغیر کانٹے کی، آدھا کلو۔ (چوکور قتلے بنالیں) نمک، حسب ذائقہ۔ کارن فلاور، دو کھانے کے چمچ۔ انڈے، دو عدد۔ سرکہ، دو کھانے کے چمچ۔ سیاہ مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ رائی، ایک چائے کا چمچ۔ سرخ مرچ، حسب ذائقہ۔ ڈبل روٹی کا چورا، تیل فرائی کرنے کے لیے۔

ترکیب﴿ مچھلی کو صاف کر کے ٹکڑے کاٹ لیں اور نمک اور سرکہ ملا کر رکھ دیں۔ پھر جالی میں رکھ کر خشک کر لیں۔ انڈے میں آٹا، نمک، کالی مرچ، سرخ مرچ اور سرکہ ملا کر ان سب کو پھینٹ لیں۔ مچھلی کو اس میں الٹ پلٹ لیں۔ پھر مچھلی کو ڈبل روٹی کے چورے میں رول کر کے ڈیپ فرائی کر لیں۔ بہترین اور مزیدار انگلش فرائیڈ فش تیار ہے۔

از: سامعہ تبسم، ملتان

کھٹی اروی

اشیا﴿ اروی، ایک پاؤ۔ ہری مرچیں، دو عدد۔ ادرک، دو انچ کا ٹکڑے۔ (باریک پیس لیں) تل، کھانے کا ایک چمچ۔ (پسے ہوئے) نمک، حسب ذائقہ۔ لیموں کا رس ایک کھانے کا چمچ۔ گرم مسالا، چائے کا آدھی چمچ۔ تیل تلنے کے لیے۔

ترکیب﴿ پکانے کے لیے لمبے سائز کی اروی منتخب کریں، انہیں ابال کر چھیل لیں اور ہر اروی کو لمبائی میں چار ٹکڑے کر لیں۔ گرم تیل میں اروی کے ٹکڑوں کو تل کر سنہرا کر لیں تاکہ وہ کرکری ہو جائیں، ایک فرائی پین میں تھوڑا سا تیل گرم کریں اور اس میں ادرک کا پیسٹ پسے ہوئے تل، لیموں کا رس اور ہری مرچیں ڈال کر اچھی طرح چمچ چلائیں تاکہ لگنے نہ پائے، دو تین منٹ کے بعد اس میں اروی ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں، تیار ہونے پر گرم مسالا چھڑک کر سرو کریں۔

از: زرینہ خان، بہارہ کہو

مٹن مغز مسالا

اشیا﴿ مغز، دو عدد۔ اچھی طرح صاف کر لیں۔ پیاز، آدھا پاؤ۔ ٹماٹر، دو عدد۔ لونگ، چار عدد۔ سرخ مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ضرورت۔ ہرا دھنیا، ایک گٹھی۔ ہری مرچ، پانچ سے چھ عدد۔ گھی حسب پسند۔ سبز میتھی، آدھی گٹھی۔

ترکیب﴿ پیاز باریک کاٹ لیں۔ چند جوئے لہسن پیس لیں اور ایک دیگچی میں پیاز، لہسن، ادرک ڈال کر نمک اور سرخ مرچ ملا کر دو کپ پانی ڈال کر پکائیں۔ جب پانی خشک ہو جائے اور پیاز بھی گل جائے تو گھی ڈال کر مسالا اتنا بھونیں کہ گھی چھوڑنے لگے۔ اب دو عدد مغز دھو کر مسالے میں ڈال کر ڈھانپ دیں اور دھیمی آنچ پر چند منٹ پکنے کے بعد بھونیں۔ پھر ہرا مسالا ڈال دیں اور ایک چمچ پانی کا چھینٹا دے کر دم پر رکھ دیں۔ پانچ منٹ بعد ڈھکن اٹھا کر ایک چائے کا چمچ گرم مسالا ڈال کر دو منٹ مزید دم دیں اور ہرا دھنیا، ہری مرچ اور باریک ادرک سے گارنش کر کے نوش فرمائیں۔

از: سنبل ملک اعوان، لاہور

فرینکی رول

اشیا﴿ مرغی، بون لیس آدھا کلو۔ نمک، ایک چائے کا چمچ۔ ادرک، ایک چائے کا چمچ۔ لہسن، ایک چائے کا چمچ۔ کالی مرچ پاؤڈر کوارٹر چائے کا چمچ۔ گرم مسالا، آدھی چائے کا چمچ۔ ہری مرچ، چار عدد (باریک کٹی ہوئی) دھنیا پتی، تھوڑی سی (باریک کٹی ہوئی) پیاز، دو عدد۔ (آملیٹ کی طرح کٹی ہوئی) انڈے، تین عدد۔ پھینٹ لیں۔ املی کا گودا، دو ٹیبل اسپون۔ میدہ، آدھا کلو...... گھی، تین کھانے کے چمچ۔

ترکیب﴿ میدہ میں حسب ضرورت نمک اور گھی ڈال کر اچھی طرح مکس کریں پھر پانی ڈال کر میدہ گوندھ لیں۔ مرغی میں ادرک، لہسن، نمک اور کالی مرچ ڈال کر ابال لیں اور ریشے کر لیں اب اس میں دھنیا، ہری مرچ اور گرم مسالا ڈال کر مکس کر لیں۔ میدہ کے چھوٹے، چھوٹے (پوری جتنے) پیڑے بنالیں۔ کٹی ہوئی پیاز کو چھلنی میں ڈال کر دھو لیں اور اس کا پانی نکال لیں۔ انڈے میں چٹکی نمک ڈال کر پھینٹ لیں۔ توا اچھی

آنچ پر گرم کریں اور چھوٹی چھوٹی روٹیاں بیل لیں۔ ان کو توے پر گھی ڈال کر سینکیں پھر توے پر ہی روٹی سائیڈ پر کریں اور دو کھانے کے چمچ انڈا اسی پر ڈالیں اور روٹی اس پر پلٹ دیں جب انڈا روٹی پر لگ جائے اور پک جائے تو انڈے والی طرف سے پلٹ لیں اور مرغی کے ریشے بیچ میں لمبائی میں ڈالیں، اس پر پیاز ڈالیں، املی کا گودا ایک کھانے کا چمچ ڈالیں اور رول کی طرح لپیٹ لیں، چاہیں تو چیڈر چیز بھی لگا سکتی ہیں پھر چھوٹے سائز کے بٹر پیپر میں لپیٹ کر سرو کر سکتی ہیں۔

از: بینا عباس، کراچی

گاجر کا حلوا

اشیا ← گاجر، تین کلو۔ دودھ، دو کلو۔ کھویا، ماوا، پاؤ یا حسب پسند، خشک میوہ، اخروٹ، بادام، مغز، پستے، کاجو، کشمش حسب پسند اور حسب استطاعت، چینی، 750 گرام اپنی پسند کے مطابق کم یا زیادہ کر سکتے ہیں۔ چھوٹی الائچی تین سے چار عدد۔ لونگ، تین سے چار عدد۔ گھی، پاؤ بھر۔

ترکیب ← گاجروں کو دھو کر کدوکش کر کے دودھ میں ابال لیں۔ گلنے کے قریب ہوں تو بھونتی رہیں اب اس پر اوپر سے گھی میں الائچی اور لونگ کڑکڑا کر ڈالیں اور بھونتی رہیں۔ جب سوندھی سی خوشبو آنے لگے اور تیل الگ ہونے لگے تو کھوئے اور میوے کا اضافہ کر کے ایک آدھ بار چمچ چلائیں اور چولھا بند کر دیں۔ مزیدار حلوا تیار ہے اگر پسند ہو تو کیوڑہ ایسنس کے چند قطرے ڈال سکتی ہیں۔

از: نفضہ بتول، بہارہ کہو

کانسومی

یہ مختلف قسم کے گوشت سے تیار کردہ ایک قسم کی چینی یخنی ہے۔ اس میں بکرے، گائے، مرغی، بٹیر اور بطخ کا گوشت شامل کیا جاتا ہے۔ خیال رہے کہ بطخ کے گوشت میں ایک قسم کی باس ہوتی ہے جو ہر ایک کو نہیں بھاتی۔

اشیا ← آدھا کلو، ہڈی دار گوشت۔ لہسن، ایک گٹھی۔ چھیل لیں۔ نمک، کالی مرچ، حسب ذائقہ۔ اجوائن چٹکی بھر۔ آئل، دو کھانے کے چمچے۔ دار چینی، دو ٹکڑے۔ (گوشت کی قسم کے حساب سے نمک ڈالیں۔ بطخ کا گوشت خود ہی تھوڑا نمکین ہوتا ہے)

ترکیب ← نمک ڈال کر گوشت کی یخنی نکال لیں۔ ایک پین میں آئل گرم کر کے لہسن، دار چینی اور اجوائن ڈال کر فرائی کریں۔ یہ براؤن ہو جائے تو صرف یخنی ڈال دیں اور بوٹیاں الگ کر لیں اور دو تین جوش دے کر چولھے سے اتار لیں۔ مزیدار کانسومی تیار ہے، یہ ہلکی غذا کھانے والوں کے لیے بہترین ہے اسے نرم پھلکے کے ساتھ بھی کھا سکتے ہیں۔ گوشت کے شوقین افراد ابلے گوشت پر کالی مرچ اور زیرہ چھڑک کر کھائیں۔

از: بتول رضا، جرمنی

ادرک والی گوشت کی چانپ

اشیا ← گوشت کی چانپ، بارہ عدد۔ پسا ہوا پپیتا، دو کھانے کے چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ ادرک کا پیسٹ، تین کھانے کے چمچ۔ پسا ہوا لہسن، چار چائے کے چمچ۔ کالی مرچ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ کریم، تین کھانے کے چمچ۔ زیرہ پاؤڈر، ایک کھانے کا چمچ۔ لال مرچ پاؤڈر، دو چائے کے چمچ۔ گرم مسالا، دو چائے کے چمچ۔ لیموں کا رس، دو کھانے کے چمچ۔ تیل یا مکھن، لگانے کے لیے۔

ترکیب ← چانپ کو صاف کر لیں اور چھری کے دستے سے قدرے چپٹا کر لیں۔ اس کے بعد پسا ہوا پپیتا، نمک، ادرک اور لہسن کا پیسٹ اور کالی مرچ کو ایک ساتھ ملا کر آمیزہ بنا لیں اور اس آمیزے کو چانپ کے اوپر لگا کر تین سے چار گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ کریم کو پھینٹ لیں اور اس میں زیرہ پاؤڈر، لال مرچ پاؤڈر، گرم مسالا اور لیموں کا رس ڈال کر ملا لیں پھر چانپ کو اس میں ڈال کر اچھی طرح سے لپیٹ لیں اور مزید ایک گھنٹے کے لیے اس کو رکھ دیں۔

اوون کو 35 ڈگری فارن ہائیٹ 175.c پر گرم کر لیں۔ چانپوں کو سلاخ میں لگا لیں اور پھر اس کو اوون گرل پر دس، بارہ منٹ تک روسٹ کریں۔ اس کے بعد سلاخوں کو چند منٹ کے لیے لٹکا کر رکھ دیں تاکہ زائد پانی نکل جائے۔ اس کے بعد چانپوں پر مکھن لگائیے اور اسے تین سے چار منٹ تک پکائیے یہاں تک کہ چانپ ہلکی براؤن ہو جائے۔ اس پر ہرا دھنیا کاٹ کر سجائیں اور گرم گرم پیش کریں۔

از: عروبہ ناز، کوٹلی



بزم پاکیزہ پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ نسیم احمد...... کراچی

سوال ← کوئی ایسا فارمولا جس سے لوگوں کی نیتوں کا اثر چہروں پر نظر آنے لگے؟

جواب ← نظر آتا ہے...... کبھی غور سے دیکھو...... یہاں تک کہ ہاتھ پاؤں کی حرکت سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ ثمنی قندیل...... کمالیہ

سوال ← نئے سال میں پہلا نیا انکشاف کیا ہوگا؟

جواب ← پہلی جنوری 2018ء کی فجر میں آنکھ کھلی تو لائٹ آ رہی ہو گی...... چائے بنانے کے لیے چولھا جلاؤ گی تو فل گیس آ رہی ہو گی۔ ٹی وی کھولو گی تو سب خواتین اینکرز سروں پر دوپٹے جمائے نئے سال کو خوش آمدید کہہ رہی ہوں گی...... کیسا......!

☆ فلک بنت ندیم...... حیدرآباد

سوال ← بے بھاؤ کے جوتے کب پڑتے ہیں؟

جواب ← آخری جس بات پر تمہیں پڑے تھے وہ وقت یاد کرو۔

سوال ← دھنک کے سات رنگ ہوتے ہیں اور میک اپ زدہ خواتین کے چہروں پر؟

جواب ← ان گنت رنگ...... ان کا حق ہے بھئی بجنا سنورنا۔

سوال ← بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی کیوں نظر آتے ہیں؟

جواب ← جو لوگ اسے دیتے ہیں وہی تو نظر آئیں گے ناں۔

☆ نسیم منظر...... کراچی

سوال ← اپنی ساس کو سال نو پر کیا تحفہ دوں؟

جواب ← دل بڑا کر کے خوب صورت سی شال دے دو۔

سوال ← کتابی چہرے کیسے ہوتے ہیں؟

جواب ← وہی جن پر الف، ب، پ اور 1,2,3 لکھا ہوتا ہے۔

سوال ← آنکھوں پر چربی کب چھاتی ہے؟

جواب ← یہ منحوس حرام دولت بھی ناں...... کہاں، کہاں چربی نہیں چڑھاتی سو آنکھیں کیسے بچیں۔

سوال ← میں جب بھی کچن میں جاتی ہوں تو میری ساس آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر مجھے کیوں دیکھتی ہیں؟

جواب ← تم کھلے بال لے کر اور سر کھجاتے کھجاتے جو داخل ہوتی ہو تو وہ بیچاری کیا کریں۔

☆ پروین افضل شاہین...... لاہور

سوال ← ماں، باپ کے لیے سب سے بھاری بوجھ کون سا ہوتا ہے؟

جواب ← اولاد کی اسلامی تعلیمات کے مطابق بہترین تربیت......

سوال ← میری سالگرہ پر میرے میاں کے ہاتھ میں تحفہ ہونا چاہیے تھا مگر...... مگر وہ سر کھجاتے ہوئے آئے اور مجھ سے کہا؟

جواب ← یار وہ گن پوائنٹ پر والٹ چھن گیا۔

سوال: نہ چاہتے ہوئے بھی میں بارش میں بھیگ جاتی ہوں؟
جواب: آپ کے اندر کی نوعمر لڑکی بھیگنے پر مجبور جو کر دیتی ہے۔

☆ ماہ رخ...... حیدرآباد

سوال: نیو ایئر پر میرے میاں تحفے کے طور پر نئے سال کا کیلنڈر ہی کیوں دیتے ہیں اور بھی تو بہت تحفے ہیں؟
جواب: بھئی تم دن، تاریخیں پوچھ، پوچھ کران کا ستیاناس جو کر دیتی ہو۔

سوال: میرے شوہر منگنی سے پہلے قصداً مسکراتے تھے، منگنی کے بعد وقتاً فوقتاً مسکراتے تھے مگر اب شادی کے بعد جبراً مسکراتے ہیں، کیوں؟
جواب: شکر کرو مسکراتا تو ہے چاہے جبراً ہی سہی تم نے تو کوئی کسر چھوڑی نہیں۔

سوال: میں چلتی ہوں تو میرا ایک پاؤں دوسرے پاؤں سے آگے آجاتا ہے بھلا کیوں؟
جواب: تمہارا مشاہدہ کمزور ہے، دراصل ایک پاؤں پیچھے رہ جاتا ہے۔

☆ نسرین یاسمین...... لطیف آباد

سوال: نیو ایئر پر وہ ہمیشہ جوکر کا روپ بھر کر کیوں آتے ہیں؟
جواب: تم ہی تو فرمائش کرتی ہو کسی نئے روپ میں آنا۔

سوال: کوئی ایسا فارمولا بتادیں جس سے میرے برتن خودبخود صاف ہو جائیں۔
جواب: چٹکی بجاؤ ٹی وی ماڈل کی طرح...... اور برتن صاف۔

سوال: ذرا جلدی سے بتائیں کہ دنیا گول کیوں ہے؟
جواب: اسی لیے تم سائنس اور میتھس میں فیل ہوتی آرہی ہو۔ اتنی بھی معلومات نہیں۔

☆ ایمن رانی...... ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال: نئے سال میں کہاں کا سفر اختیار کروں کہ ہم سفر مل جائے اور زندگی بھر ساتھ نبھائے؟
جواب: عبادت کے رتھ پر عرشِ معلی کا سفر کہ وہیں سے ساری مرادیں ملتی ہیں۔

☆ حمنیٰ قندیل...... کمالیہ

سوال: نئے سال میں نئے کپڑے، نئے جوتے اور نئے خیالات مگر......؟
جواب: تم تو وہی پرانی ہوگی ناں مگر گھبراؤ نہیں...... بداخلاقی اور سستی کا لبادہ اتار پھینکو گی تو تم بھی نئی نئی ہی لگو گی۔

☆ ساجدہ ظفر...... کمالیہ

سوال: اگر اس سال بھی وہ خالی جیب، خالی دماغ اور خالی پیٹ میری سالگرہ پر آیا تو میں کیا کروں؟
جواب: اور کچھ "خالی" کے ساتھ آتا ہو تو وہ بھی لگادو...... ویسے اب تو تمہیں عادی ہو جانا چاہیے ناں......!

سوال: نئے سال کو پچھلے سال سے مختلف کیسے بنایا جاسکتا ہے؟
جواب: پچھلی غلطیاں نہ دہرا کر......

☆ شمیم احمد...... کراچی

سوال: وہ ہر سالِ نو کے موقع پر میرے مہمانوں کے سامنے میری عمر پوچھنا شروع کر دیتے ہیں، کیا کروں؟
جواب: اب اس "بچپن" کی عادت کو ہم کیا بدلیں، یہ تو خدا ہی بدلے گا۔

سوال: آج کل ٹماٹر، پیاز کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں؟ یہ آسمان سے کیا باتیں کرتی ہیں؟
جواب: بیچارے آسمان سے کہتے ہیں یا تو، تو نے ہمیں اتارا ہی نہ ہوتا یا پھر انسان کو فرعون نہ بنایا ہوتا۔

☆☆☆



سوال: نازنین آفریدی...... پشاور
باجی پچھلی دفعہ آپ نے گھریلو نسخے بھی بتائے اور معیاری میک اپ پروڈکٹس کے استعمال کا کہا تو آپ کوئی کمپنی بتاسکتی ہیں؟
جواب: نازنین بیٹی اول تو گھریلو اور قدرتی اشیا سے فائدہ اٹھائیں، آج کل تو خوب ترکیبیں بتائی جاتی ہیں دوسرے دو چار کمپنیز اچھی ہیں اب کسی ایک کا نام تو نہیں بتاسکتے، اپنے شہر کے کسی اچھی ساکھ والے پارلر سے پتا کرسکتی ہیں۔ بس ذرا قیمت زیادہ ہوگی مگر ان کی کم ہی مقدار استعمال کی جاتی ہے۔

☆ زرینہ خان...... بہارہ کہو

سوال: باجی آپ ہمارے مسائل کے حل بھی بتایا کریں، اب مجھے خشک جلد کا مسئلہ ہے کوئی گھریلو چیز بتادیں۔
جواب: پیاری بیٹی ہم تو گزشتہ کئی مہینوں سے گھریلو نسخے ہی بتارہے ہیں، خیر آج کل کے موسم کے لحاظ سے خشکی ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں...... نیم گرم پانی سے چہرہ ہاتھ پاؤں دھو کر گلیسرین، عرقِ لیموں اور عرقِ گلاب کا ہم وزن آمیزہ بنا کر رکھ لیں اور وہ لگایا کریں۔ اس کے علاوہ بیسن، دودھ میں گھول کر اس سے چہرہ اور ہاتھ دھولیں رات میں ہم وزن ملایا ہوا روغنِ بادام، روغنِ زیتون اور سفید تل کا تیل تھوڑا سا لے کر مساج کرلیا کریں...... یہ تیل ایک، الگ شیشی میں بنا کر رکھ لیں، آدھی، آدھی پیالی تینوں مکس کر کے رکھ لیں۔ دو تین مہینے آرام سے چلے گا۔ اس کے علاوہ اپنی غذا میں خشک میوے اور دیسی گھی کا بھی استعمال رکھیں مگر اعتدال کے ساتھ...... جوان بچے، بچیوں کے لیے یہ چیزیں ضروری ہیں، یاد رکھیں دیسی گھی چربی نہیں بڑھاتا مگر بے قاعدگی اور زیادتی تو ہر چیز کی نقصان دہ ہوتی ہے ناں...... مصنوعی غذا کے اجزا سے پرہیز کریں۔

☆☆☆

☆ آج کل گاجر اور چقندر کا موسم ہے، ان سبزیوں کو کچی حالت میں بھی کھائیں اور بالکل ہلکی بھاپ دے کر بھی...... دوپہر کا کھانا سلاد پر بھی ہو تو بہت اچھا ہے۔

☆ مالٹے، کینو کے چھلکے سکھا کر دودھ کے ساتھ ابٹن کی طرح لگائیں، یہ برسوں کا آزمودہ نسخہ ہے۔

ہاتھ بھی توجہ چاہتے ہیں

ہاتھ انسان کی شخصیت کی کافی حد تک عکاسی کرتے ہیں۔ اس اہم ترین اور خوب صورت حصے کو اکثر بے پروائی کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ اپنے ہاتھوں کی نگہداشت کو معمول بنالیں۔ اس سلسلے میں چند اصول ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں۔ تمام کاموں سے فارغ ہو کر ہاتھ دھولیں اور کریم یا لوشن کا استعمال کریں۔ اس کے علاوہ لیموں کا عرق بھی آپ کے ہاتھوں کی رنگت کو بہتر بناسکتا ہے۔ اس میں گلیسرین اور عرقِ گلاب ملا کر رکھ لیں۔ ہاتھوں کو نرم اور نازک رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل ورزشیں بھی مفید ثابت ہوسکتی ہیں۔

☆ انگلیوں کو میز پر رکھ کر باری، باری ہر انگلی سے میز کو دس دفعہ بجائیں لیکن اس طرح کے باقی انگلیاں حرکت نہ کریں۔

☆ مٹھی کو مضبوطی سے بند کرلیجیے اور پھر کھول کر انگلیوں میں کھنچاؤ پیدا کریں، یہ عمل پانچ مرتبہ کیجیے۔

اس عمل سے آپ خوب صورت ہاتھوں اور نرم و نازک ہاتھوں کی مالک ہوسکتی ہیں، یاد رکھیں تخلیق اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور اس کی نگہداشت کرنا ہمارا فرض ہوتا ہے۔

☆☆☆



روحانی مشورے

ادارہ

محبوبِ خدا کی پیاری، پیاری سنتیں

سونے کے سلسلے میں آپؐ کے اسوۂ حسنہ کا بیان

دعائیں قبولیت کا درجہ جب پاتی ہیں جب طرز زندگی بھی مسنون طریقے پر ہو خود پروردگار کی نافرمانی کے اعمال انجام دے کر دعا کی قبولیت کی امید رکھنا نادانی کے سوا کچھ نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب رات کو بستر پر تشریف لاتے تو مسواک کرتے اور کنگھی فرماتے۔ (سیرت الشامی)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب تم سونے کے لیے جاؤ تو نماز کی طرح وضو کرو پھر دائیں کروٹ پر لیٹو۔ (بخاری شریف)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو حالت طہارت (وضو کی حالت میں سویا) پھر اسی رات انتقال کر جائے تو شہید ہوگا۔ (ابن سنی، کنز العمال)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وضو کے ساتھ سونے والا روزہ دار شب گزار کی طرح ہے۔ (فیض القدیر)

روحیں نیند کی حالت میں عالم بالا کی طرف جاتی ہیں جو باوضو ہوتی ہے عرش کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

سونے میں مسواک کا اہتمام

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت تک آرام نہ فرماتے جب تک مسواک نہ کرتے۔ (شرح مواہب)

سو کر اٹھنے کے بعد مسواک کرنا سنت ہے۔ (بخاری)

مسواک سرہانے رکھنا سنت ہے۔ (مسند احمد)

سونے سے قبل چند امور

سونے سے پہلے چراغ روشنی وغیرہ گل کرنا سنت ہے۔ (مطالب عالیہ)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جب تم سونے کا ارادہ کرو تو چراغ بجھا دو، دروازہ بند کردو، مشکیزہ کا منہ باندھ دو، کھانا پینا چھوڑ دو۔ (بخاری)

رات میں دروازہ بند کرنا سنت ہے۔ (مجمع)

سونے سے پہلے کنگھی کرنا سنت ہے۔ (سیرت الشامی)

سونے سے قبل سرمہ لگانا سنت ہے۔ (ترمذی)

سونے سے قبل بستر جھاڑ لینا سنت ہے۔ (ابوداؤد)

بستر پر لیٹنے کے بعد دن بھر کے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے اور اپنے گناہوں، کوتاہیوں پر ندامت محسوس کریں اور استغفار پڑھیں اور اپنے پروردگار کا شکر ادا کریں کہ اس نے یہ توفیق دی۔ چہار قل اور آیت الکرسی پڑھ کر حصار کریں اور دعاؤں میں اپنے پیاروں کو یاد رکھیں۔

شادی کے لیے مجرب عمل

شادی کے خواہش مند حضرات و خواتین بعد اول د آخر گیارہ، گیارہ مرتبہ درود ابراہیمی سورۂ آل عمران کی ابتدائی تین آیات مسلسل اکیس روز تک وقت و جگہ کا

تعین کر کے پابندی کے ساتھ 319 بار پڑھیں۔ اہل خانہ ایک دوسرے کے لیے پڑھ سکتے ہیں۔ پرہیز گاری، تقویٰ اور رزق حلال کی صورت میں خوشخبری جلدی مل جائے گی، ان شاء اللہ۔

غم ہلکا کرنے کا مجرب عمل

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مرتبہ کفار کی ایذا رسانیوں کی وجہ سے بہت مغموم تھے۔ اللہ رب العزت نے کتنے پیارے انداز میں فرمایا۔

واصبر وما صبرک الا باللہ ولا تحزن علیھم ولا تک فی ضیق مما یمکرون ان اللہ مع الذین اتقو والذین ھم محسنون۔ سورۂ نحل (127.128)

بڑے بڑے غم اور پریشانیاں اللہ رب العزت اس آیت کے پڑھنے سے بندے سے دور فرما دے گا اور دل میں ٹھنڈک آجائے گی۔ کبھی بھی کوئی پریشانی آئے ان آیات کو پڑھیے۔ دیکھیے پھر اللہ تعالیٰ دل کی حالت کو کیسے بدلتا ہے۔

کشادگی رزق کے لیے مجرب عمل

طبرانی میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص سورۂ اخلاص کو گھر میں داخل ہوتے وقت پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اس گھر والوں سے اور اس کے پڑوسیوں سے فقیری دور کر دے گا۔ (تفسیر ابن کثیر جلد ۵، ص: ۷۱۶)

رنج و غم دور کرنے اور غیبی مدد کے لیے

وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد

(پارہ نمبر ۲۴ سورۂ مومن آیت نمبر ۴۴) عشا کی نماز کے بعد ۱۰۱ مرتبہ پڑھنے سے ہر رنج و غم دور کرنے کے لیے غیب سے مدد کا دروازہ کھلتا ہے۔

نماز تہجد کی برکتیں:

صلوٰۃ تہجد ایک مسلمان کے لیے دینی اہمیت کی حامل ہے جیسا کہ آیت قرآنی باور کروا رہی ہے۔

(ومن الیل فتہجد بہ نافلۃ لک) اور رات کے کچھ حصے میں تہجد بھی پڑھ لیا کریں جو کہ آپ کے حق میں زائد چیز ہے۔ یہاں یہ بات خاص طور پر توجہ طلب ہے کہ مسلمانوں کا ایمان بلکہ یقین ہے کہ مصیبت اللہ کی جانب سے ہے جب ہم سچے دل اور خلوص نیت سے غلطیوں کا اعتراف کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی کے طالب ہوں گے اور مکمل صحت یابی کے لیے دعا کریں گے تو یقیناً رب کریم غفور و رحیم ہے، اللہ کے ہاں مغفرت بھی ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہماری مشکلات اور مصائب دور ہو جائیں گے۔ تہجد کی نماز سے طویل تحقیقات کے بعد مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوئے ہیں جو کہ ماہرین نے بیان کیے ہیں۔

1۔ بے سکونی اور نیند کی کمی کا علاج ہے اور دل کے امراض کے لیے تریاق اعظم ہے۔

2۔ اعصابی کھچاؤ اور جکڑاؤ کے لیے مفید ہے۔

3۔ دماغی امراض میں خاص طور پر پاگل پن کی خطرناک کیفیت کے لیے آخری علاج ہے۔

4۔ نگاہوں میں خاص طور پر جن کی نگاہ میں دو چیزیں نظر آتی ہوں ان کا علاج ہے۔

5۔ انسانی جسم میں نشاط و فرحت اور غیر معمولی طاقت پیدا کرتی ہے اسے سارا دن ہشاش بشاش رکھتی ہے۔

6۔ دلی سکون ملتا ہے۔

☆☆☆

شوابے ہومیو کلینک

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جا سکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

کالی رنگت اور بدبودار پسینا

انجم...... کھاریاں

میری عمر 18 سال ہے۔ پہلے چہرے کا رنگ بہت صاف تھا۔ پھر میرا رنگ سانولا ہونے لگا اب کافی ڈارک ہو گیا ہے۔ چہرہ تو سانولا ہے لیکن جسم کا رنگ بہت ڈارک ہو گیا ہے۔ میں چہرہ دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہوں۔ چکنائی کا استعمال کم کرتا ہوں۔ روزانہ ناشتے میں سادہ بریڈ لیتا ہوں، ہفتہ، اتوار کو پراٹھا۔ سینے میں جلن بھی کبھی کبھی ہوتی ہے۔ قد، جسم ماشاء اللہ اچھا ہے، ہاں مجھے پسینا بہت آتا ہے۔ 2 سے 3 بار نہاتا ہوں کیونکہ پسینے میں بدبو بہت ہے۔ جسم کی رنگت اور پسینے کی بدبو کے لیے کوئی دوا بتا دیں۔ کھانے میں میٹھا بہت پسند ہے۔ پیاس بھی بہت لگتی ہے۔ کھانے پینے کا بہت شوقین ہوں۔

جواب: آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دوا Sulphur200 کی ایک خوراک ہفتہ میں ایک بار، ایک ہفتہ چھوڑ کر لیں۔ پھر ایک دن بعد Arsenic30, Lycopodium30 کے 5'5 قطرے، Graphites30 کے 5,5 قطرے دن میں 3 مرتبہ لیں لیکن جس دن Sulphur لی ہو اس سے پہلے اور بعد میں

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

فروری 2018ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

____

کوئی دوا نہ لیں۔ دو ماہ بعد حال بتائیں۔

لیکوریا

سلمٰی...... ڈیرہ غازی خان

میں پاکیزہ کی مستقل قاری ہوں۔ عرصہ چار سال سے مجھے لیکوریا کی شکایت ہے۔ جسمانی کمزوری بھی ہے، بہت دبلی پتلی ہوں اور ذرا سا کام کرنے سے کمزوری اور نقاہت محسوس ہوتی ہے۔ چہرے پر چھائیاں بھی ہیں اور بال بھی اُگ رہے ہیں۔ اسٹوڈنٹ ہوں۔ میری کمر میں بھی درد رہتا ہے اور سر اور پٹھوں میں بھی۔ آپ برائے مہربانی مجھے دوا تجویز کر دیں۔ آپ کی مشکور رہوں گی۔

جواب: ذہنی ٹینشن سے بچیں۔ اس کے لیے صبر، شکر اور قناعت کریں اور نماز کی پابندی کریں۔ صبح کی چہل قدمی کریں۔ متوازن غذا لیں۔ آپ لیکوریا کی تفصیل لکھیں اور ڈاکٹر ولمار شوابے کی مندرجہ ذیل ادویات لیں۔ Alfalfa Q کے 15 قطرے آدھا گلاس پانی میں 3 مرتبہ کھانے کے بعد Kali.Phos30, Calc. Carb30, Rhustox30 کے 7,7 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ کسی بھی وقت لیں۔ ایک ماہ بعد دوبارہ کیفیت سے آگاہ کریں۔

نسوانی حُسن

ملکہ کوثر...... حیدرآباد

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا نسوانی حُسن بالکل نہ ہونے کے برابر ہے۔ ماہانہ نظام بالکل درست ہے، لیکوریا بھی نہیں ہے۔ برائے مہربانی ایسی دوا بتائیں کہ بالکل ٹھیک ہو جاؤں۔

جواب: بی بی آپ کو کوئی اور بیماری تو نہیں، ہارمونز چیک کرائیں Serum Prolectin, T3, T4, TSH۔ یہ مسئلہ شروع سے ہے یا بعد میں کسی وجہ سے ہوا ہے۔ تفصیل ضرور لکھیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Onosmodium CM کی ایک خوراک 5 قطرے آدھا کپ پانی میں صرف ایک بار لیں۔ اس کے 3 دن بعد Iodium30 کے 5,5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ لیں۔ دو ماہ بعد حال بتائیں۔

کمزوری و یادداشت

رخشندہ...... لاہور

ڈاکٹر صاحب میری بیٹی کی عمر ۹ سال ہے، صحت زیادہ اچھی نہیں ہے، چہرے کا رنگ ہمیشہ پیلا سا رہتا ہے۔ اپنا پڑھا ہوا سبق ہمیشہ بھول جاتی ہے۔ کھانا بھی نہیں کھاتی ہے، دودھ بھی نہیں پیتی ہے اور باہر کی چیزیں بہت شوق سے کھاتی ہے۔ طبیعت میں جنون پن بہت ہے۔ میں نے ماہنامہ پاکیزہ میں (کریٹکس) کے بارے میں پڑھا تھا۔ کیا یہ دوا میں اپنی بیٹی کو دے سکتی ہوں۔ میری بیٹی کے لیے کوئی ایسی دوا بتائیں جس سے اس کی دماغی صلاحیت میں اضافہ ہو اور اپنا سبق یاد رکھ سکے۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔

جواب: بہت زیادہ لاڈ پیار اور ڈانٹ ڈپٹ بچوں کو بگاڑ دیتی ہے۔ بچی جب کھاتی ہے تو پھر رنگ کیوں پیلا ہے۔ صحت اچھی کیوں نہیں ہے۔ تفصیل سے لکھیں۔ دے سکتی ہیں کریٹکس لیکن ساتھ میں مندرجہ ذیل ادویات بھی استعمال کرائیں۔ Kali.Phos30, Calc.Phos30, Ferr.Phos30 کے 5'5 قطرے آدھا کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔

تیزابیت

محمد امین...... ٹنڈو آدم

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے شدید قسم کی تیزابیت ہے، سینے اور معدے میں جلن محسوس ہوتی ہے جو کہ عرصہ 15

سال سے ہے۔ مختلف دیسی ادویات استعمال کیں مگر افاقہ نہیں ہوا۔ دودھ اور پھلوں کا بکثرت استعمال کرتا ہوں، پانی بھی پیتا ہوں۔ قبض کی بھی شکایت ہے۔

جواب: کھانا خوشگوار ماحول میں پرسکون ہو کر کھایا کریں۔ کھانا آہستہ آہستہ خوب چبا کر کھائیں لیکن کھانے کے بعد پانی نہ پیا کریں اور رات کو کھانے کے بعد چہل قدمی کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Bismutum Pentarkan Ptk 16 کی ایک گولی سادے پانی کے ساتھ دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

چھوٹا قد

لائبہ...... کوئٹہ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا قد بہت چھوٹا ہے۔ خاندان والوں کی بہ نسبت میرا قد بہت چھوٹا ہے جس کی وجہ سے میں احساسِ کمتری کا شکار ہوں۔ مہربانی فرما کر میری پریشانی دور کر دیں۔ اگر اس ماہ نہ ہو سکے تو اگلے ماہ میرا مسئلہ ضرور حل کر دیں۔

جواب: متوازن غذا لیں، اچھلنے والی ورزش کیا کریں، بیڈمنٹن، والی بال، باسکٹ بال، لان ٹینس وغیرہ۔ Calc.Phos 30 Thyroidine 6, Iodium30 کے 7,7 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں۔ 3 ماہ بعد دوبارہ حال بتائیں۔ تمام ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی لیں۔

غلط تشخیص اور غلط علاج

رقیہ اظفر...... اوکاڑہ

میری کمر کے قریب درد ہوا تو ڈاکٹر نے گردے کی تکلیف بتائی۔ ڈرپ لگائی اور تین چار قسم کی گولیاں دیں۔ عارضی طور پر آرام آ گیا تھا پھر کچھ دنوں بعد دوبارہ ہی درد دوبارہ شروع ہو گیا۔ دوسرے ڈاکٹر سے چیک کروایا تو انہوں نے پھر الٹرا ساؤنڈ کرایا۔ الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ دیکھ کر ڈاکٹر نے کہا کہ گردے کی تکلیف تو ہے ہی نہیں۔ پٹھے کمزور ہیں۔ اور طاقت کی دوائیں دیں مگر دوا کھانے تک آرام رہتا ہے۔ جب دوا چھوڑ دو تو دوبارہ درد ہو جاتا ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے بھی کمر میں بے حد تکلیف ہوتی ہے اور گردن تھوڑی دیر جھکنے پر ہی تھک جاتی ہے۔ اسی طرح تھوڑا سا کام کر لو تو تھکن محسوس ہونے لگتی ہے۔ آج کل کندھوں میں بھی درد رہنے لگا ہے۔ سر میں درد اور چکر بھی آتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہاتھ پاؤں کی ہڈیاں بھی مڑ جاتی ہیں۔

جواب: وزن زیادہ ہے، کم کریں۔ صبح یا شام کو باغ کی سیر کیا کریں۔ پہلے چہل قدمی کریں پھر جاگنگ کریں۔ X-Ray,CBC Profile, whole spine AP & Lateral view کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Rhustox30, Pulsatilla30, Ferr.Met30, Calc.Phos30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

وزن کی زیادتی

سعدیہ...... راولاکوٹ

میری بیٹی میں خون کی کمی ہے۔ پہلے رنگ سرخ اور سفید تھا، اب رنگ بھی خراب ہو گیا ہے۔ سر کے بال بھی کم ہو گئے ہیں۔ 3 ماہ پہلے جو آپ نے دوائیں تجویز کی تھیں اس سے بہت فائدہ ہوا، اب وزن زیادہ ہو گیا ہے۔ پیٹ مزید پھول گیا ہے۔ سانس بھی پھول جاتا ہے۔ میں بہت پریشانی کے عالم میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔

جواب: آپ کی بیٹی میں ہارمونز بہت زیادہ ڈسٹرب ہیں، چکنائی اور میٹھی ہر قسم کی چیزوں سے پرہیز کروائیں۔ ورزش بھی کرائیں، کم از کم ایک گھنٹے روزانہ،

دوائیاں اسی طرح استعمال کریں جس طرح بتائی جا رہی ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Ferrum Pentarkan Ptk 45 کی 2 گولیاں تھوڑے پانی کے ساتھ 3 مرتبہ دیں۔ Magnesium Phos Pentarkan Ptk60 ایک گولی دن میں 3 مرتبہ، Phytolaca-e-BaccusQ کے 15 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔ Oleum Jecoris 30 کے 7 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ دیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

چہرے پر بال اور ایام میں بے قاعدگی

یاسمین...... راولپنڈی

میری شادی 6 ماہ بعد ہونے والی ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ایام میں بے قاعدگی ہے۔ ایک ماہ ہوتے ہیں پھر دو ماہ نہیں ہوتے۔ یہ سلسلہ 12 سال سے ہے۔ میرے جسم خاص طور پر چہرے پر بہت زیادہ بال ہیں۔ وزن بھی بڑھ رہا ہے اور رنگت بھی خراب ہو رہی ہے۔ مہربانی کر کے کوئی اچھی دوائی بتا دیں جس سے یہ مسئلہ حل ہو جائے۔

جواب: اللہ آپ کو صحت دے آمین۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc Carb 200 کے 5 قطرے ہفتے میں ایک دفعہ لیں جبکہ روزانہ Pulsatilla 30 کے 5,5 قطرے دن میں تین مرتبہ اور Oleum Jec30 کے بھی 5 قطرے دن میں تین مرتبہ لیں۔ ایک گھونٹ پانی میں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

قد اور جسم پر بال

امینہ رحمان...... حیدرآباد

مسئلہ میری بچی کا ہے۔ میری بچی کے پورے جسم پر بال ہیں جو پیدائش کے وقت سے ہیں۔ بچی جوں جوں بڑی ہوتی گئی کالے اور لمبے بال ہوتے گئے۔ ٹانگوں پر رانوں تک اور کمر پر بھی ہیں لیکن ذرا چھوٹے ہیں، بازوؤں پر کلائی سے لے کر کاندھے تک آدھا آدھا انچ لمبے بال ہیں، زیادہ بازو پر ہیں اور ٹخنے بھی۔ میری بچی کا قد بھی چھوٹا ہے۔

جواب: امینہ صاحبہ آپ اپنی بچی کی غذا کا خیال رکھیں۔ اسے متوازن غذا دیں ورزش کرائیں یا کھیل کود کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc Carb 200 کے 4 قطرے تھوڑے سے پانی میں ایک دن چھوڑ کر دیں اور اسی کمپنی کی Acid Phos 30 کے 5 قطرے تھوڑے سے پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں۔ 3 ماہ بعد دوبارہ حال بتائیے گا۔

جلد کی بیماری اور نشوونما

بسمہ عبداللہ...... لاہور

میں جو مسئلہ بھیج رہی ہوں وہ میری بھتیجی کا ہے۔ اس کی عمر 15 سال ہے، اسکول میں پڑھتی ہے۔ بہت کمزور ہے صحت کے لحاظ سے بھی اور پڑھائی میں بھی۔ اس کے قد میں بھی اضافہ نہیں ہو رہا، گھر میں سب کا قد ٹھیک ہے۔ مزاج میں چڑچڑاہٹ بھی ہے۔ اس کی ٹانگوں پر کالے کالے داغ ہیں اور ران پر خارش بھی ہوتی ہے۔ سر میں جگہ جگہ سے بال اترے ہوئے ہیں، دائرے کی شکل میں اور چہرے پر بھی سفید داغ ہیں۔ ایک ماہ سے لیکوریا کی شکایت ہو رہی ہے نہ کھانا کھاتی ہے اور نہ دودھ پیتی ہے اور پھل بھی نہیں کھاتی۔ والدین بہت پریشان ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر ان کی مدد کریں۔ بچی رات کو پیشاب کر دیتی ہے اور دن میں زیادہ کرتی ہے۔ چھ سال سے اس کی یہی حالت ہے بچی کے بہت سے علاج کروائے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

جواب: LFT, Urine D/R, CBC Profile کرائیں اور بچی کو پہلے ایک خوراک یعنی 5

قطرے آدھے کپ پانی میں Sulphur200 دیں اس کے ایک دن بعد Acidcrysophanic 6 Ferr.Met30, Graphites 30 کے 5,5 قطرے آدھے کپ پانی میں دن میں 3 مرتبہ دیں، ایک ماہ بعد دوبارہ حال بتائیں۔

بدبودار پسینا

ایاز......سکھر

مجھے عرصہ 7 سال سے بدبودار پسینا آتا ہے۔ جس سے خود مجھے اور قریب دوسرے لوگوں کو ناگوار بو کو برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اس کے لیے دوا تجویز کر دیں۔

جواب: آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی دوا Sulphur200 کی ایک خوراک ہفتہ میں ایک بار، ایک ہفتہ چھوڑ کر لیں۔ ایک ماہ بعد حال بتائیں۔

نسوانی مسائل اور رنگت

ارتقا......فیصل آباد

بچپن میں میرا رنگ بہت گورا تھا۔ اب بھی منہ اور گردن کے علاوہ پورا جسم گورا ہے۔ مگر ایسا لگتا ہے جیسے منہ پر کسی نے مٹی مل دی ہو یا سیل جی ہو۔ نظر بھی سیکنڈ کلاس سے کمزور ہے۔ عینک کے بغیر بالکل نظر نہیں آتا۔ عینک پہننے کی وجہ سے ناک بھی ٹیڑھی ہو رہی ہے۔ پیریڈ بھی عام طور پر لیٹ ہوتے ہیں اور تکلیف سے ہوتے ہیں۔ لیکوریا کی بھی تکلیف ہے۔ پیٹ بھی تھوڑا سا باہر نکل آیا ہے جیسے سوجا ہوا ہو۔ بال بھی باریک اور پتلے ہیں۔ بڑھتے بھی نہیں ہیں۔ سر کی جلد بالوں سے صاف نظر آتی ہے۔ گنجا پن صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کوئی اچھی دوا تجویز کریں کہ میں ٹھیک ہو جاؤں۔

جواب: تازہ پھل اور سبزیاں استعمال کریں، تازہ ہوا لیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات لیں Rhustox30, Pulsatilla30, Ferr.Met30, Calc.Phos30 کے 5,5 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ لیں۔ اور Magnesium Phos Pentarkan PTK 60 کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ لیں۔ 3 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

چھوٹا قد

نسرین......اسلام آباد

میری عمر 13 سال ہے اور قد 5 فٹ ہے۔ مینسز گیارہ سال کی عمر سے ہو رہے ہیں، باقاعدہ اور ٹھیک ہیں کوئی مسئلہ نہیں۔ جسامت درمیانی ہے نہ بہت پتلی نہ بہت موٹی۔ برائے مہربانی یہ بتائیں کہ قد کتنی عمر تک بڑھ سکتا ہے۔ کیا اب میرا قد بڑھ سکتا ہے تو پلیز کوئی دوا تجویز کر دیں۔ یہ بھی بتائیں کہ دوائی کتنے عرصے تک لینی ہے۔

جواب: بی بی خاندانی پس منظر نہیں لکھا کہ آپ کے خاندان میں ماں باپ کی طرف سے لوگوں کا قد کتنا ہے؟ بہرحال آپ اپنی غذا کا خیال رکھیں۔ متوازن غذا لیں۔ چکنی اور میٹھی چیزیں زیادہ نہ لیں۔ ورزش یا کھیل کود ضرور کریں۔ بھاری وزن نہ اُٹھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Baryta Carb 200 کے 4 قطرے ہر صبح لیں اور اسی کمپنی کی Ferum PentarkanPtk45 کی دو گولیاں تھوڑے سے پانی کے ساتھ دن میں تین مرتبہ لیں اور تین ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔